ماشاء اللہ

إن من البيان لسحرا

خطبات حکیم الاسلام

جلد دوم

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی رحمۃ اللہ

مہتمم دار العلوم دیوبند

مرتبہ

محمد ادریس ہوشیارپوری

کتب خانہ مجیدیہ

بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

اللہ اکبر

خطباتِ حکیم الاسلام

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قاسمی

مہتمم دارالعلوم دیوبند (انڈیا)

مرتبہ

محمد ادریس ہوشیارپوری

ناشر

کتب خانہ مجیدیہ ملتان

پاکستان - فون ۷۶۸۴۱

ماشاءاللہ

اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحرًا

خطباتِ حکیم الاسلام

جلد دوم

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مدظلہ العالی

مہتمم دار العلوم دیوبند

مرتبہ

محمد ادریس ہوشیارپوری

کتب خانہ مجیدیہ

بیرون بوہڑ گیٹ ○ ملتان

عرضِ ناشر

حامداً و مصلیاً۔

آپ کے ہاتھوں میں موجود کتاب حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مدظلہم (مدیر دارالعلوم دیوبند انڈیا) کے سلسلۂ خطبات و مواعظ کی دوسری جلد ہے، جو علوم و معارف کی حامل اور اس لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے کہ حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے مواعظ کے بعد علماء دیوبند میں سے حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ کی شخصیت ہے جن کے مواعظ اس طرح قلمبند ہو کر اہلِ علم تک پہنچ سکے۔

الحمد للہ جلد اوّل کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا، اور کتاب کی مقبولیت کے پیشِ نظر طبعِ دوم کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

—— مکرم و محترم حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب زید مجدہٗ (خطیب مسجد غفوریہ، حسن پروانہ کالونی ملتان) کو اللہ تبارک و تعالیٰ جزائے خیر نصیب فرمائے کہ انہوں نے اپنی گرانقدر مصروفیات کے باوجود جلد دوم کی ترتیب جلد مکمل کر کے اشاعت کے لئے اس کا مسودہ ہمیں عنایت فرمایا۔ حق تعالیٰ شانہٗ ان کی جانفشانی اور محنت و کاوش کو سعیٔ مشکور بنائے۔ اور شرفِ قبولیت سے نواز کر ہم سب کے لئے ذریعۂ نجات اور وسیلۂ فلاحِ دارین بنائے۔ آمین

یہ سن کر قارئین کرام کو یقیناً خوشی ہوگی کہ مرتب موصوف خطباتِ حکیم الاسلام کی تیسری اور چوتھی جلد بھی ترتیب دے چکے ہیں اور کتابت کا کام جاری ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ کتب خانہ مجیدیہ ان خطبات و مواعظ کی تمام جلدیں اپنے معاونین تک جلد پہنچانے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ امید ہے کہ آپ حضرات کا تعاون اسی طرح جاری رہے گا۔

والسلام

(حافظ) بلال احمد شاہد (مالک کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان)

شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

فہرست خطبات

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

نذرانۂ عقیدت

از امیر شریعت خطیب ملت حضرۃ سید عطاء اللہ شاہ بخاری (مرحوم ومغفور)

المتخلص بہ ندیم

بخدمت حکیم الاسلام حضرۃ العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مدظلہ

بخت اگر رسا شود دست دہد سبوئے خوش
از نگہ سمن برے لالہ رخے نکوئے خوش

باغ و بہار ما ندیمؔ یعنی کہ جنۃ النعیم
روئے خوش است خوئے خوش بوئے خوش و گلوئے خوش

(از سواطع الالہام صـ ۹۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

حامداً اللہ العظیم و مصلیاً علی رسولہ الکریم

امابعد :-

خطباتِ حضرۃ حکیم الاسلام مدظلہٗ کے سلسلہ کی دوسری جلد حاضرِ خدمت ہے۔ اہلِ علم کی طرف سے جلد اوّل کی پذیرائی اور مقبولیت نے دوسری جلد کی ترتیب کو میرے لئے آسان تر کر دیا - اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جلد دوم ضخامت میں بڑھ گئی - (مجموعی طور پر اس میں چودہ ۱۴ خطبات شامل کئے گئے ہیں)

حضرات علماءِ دیوبند شریعت و طریقت دونوں کے جامع ہیں۔ جہاں یہ تعلیمِ شریعت کے لئے حجت تسلیم کئے جاتے ہیں، وہاں تزکیۂ باطن کے لئے بھی رہبرِ کامل مانے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں سے دونوں چشمے جاری ہیں ——

تزکیۂ باطن کے لئے جہاں اذکار و مجاہدے بتلائے اور کرائے جاتے ہیں اسی سلسلہ میں تذکیر و تبلیغ بھی ایک مؤثر حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے ایک طرف یہ انما بعثت معلما کا پرتو نظر آتے ہیں تو ساتھ بلغوا عنی ولو آیۃ کی عملی تفسیر بھی نظر پڑتے ہیں۔

—— تاثیرِ وعظ کا تعلق الفاظ سے نہیں، جذباتِ قلب سے ہے۔ اور جذباتِ قلب کی اصلاح

ع پیشِ مردِ کاملے پامال شو

کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے خطبات کا یہ مجموعہ جہاں علمی لطائف و نکات کا حامل اور ہر قسم کے رطب و یابس سے پاک ہے، وہاں اصلاحِ باطن اور تزکیۂ قلوب کے لیے نسخۂ اکسیر بھی ہے۔

اس لئے یہ کہنا بے جا اور مبالغہ نہ ہوگا کہ اس مجموعہ سے جہاں علماء، فضلاء اور خطباء بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔ وہاں راہِ سلوک و احسان کا طالب اپنی تشنگی کا ساماں بھی کر سکتا ہے۔ جہاں ایمان و یقین سے بہرہ ور دیندار اس کی لذت و شیرینی سے فیضیاب ہو سکتا ہے۔ وہاں عقل و فلسفہ اور جدید روشنی کا بھٹکا ہوا خیرہ چشم و مرعوب بھی اپنے آئینہ قلب کو جلابخش سکتا ہے ــــــ

قحط الرجال کے اس دور میں بزرگانِ دین کے ملفوظات و مواعظ ان کی صحبت کے قائم مقام ہیں، جن کو پڑھتے رہنے سے قلب میں نورانیت اور عملِ صالح کا جذبہ زندہ رہتا ہے۔ ورنہ حوادثِ زمانہ نے ایمانی چنگاری کو زائل کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس لئے یہ صحبت و معیت کا بہترین بدل بھی ہیں اور حفاظتِ ایمان کا ذریعہ بھی۔

ــــــ جغرافیائی حدود حائل ہونے کے باعث میرے لئے یہ ممکن نہ ہوا کہ میں جلد اول و دوم کے مسودات حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی کی خدمت میں پیش کر سکتا، اور ان سے نظرِ ثانی کی درخواست کرتا ــــ البتہ استاذ الاساتذہ امام القراء آیت من آیات اللہ حضرت مولانا القاری المقری فتح محمد صاحب دامت برکاتہم، مہاجر مدنی سے بذریعہ مکتوب چند اقتباسات ارسال کر کے تحسین و تائید حاصل ہوئی ــــ اور پاکستان کے جید اور ممتاز و مستند علماء اپنے اساتذہ کرام کی خدمت میں اس مسودہ کو پیش کر کے ان سے اس بارے میں کچھ لکھنے کی درخواست کی، جسے انہوں نے منظور فرمایا۔ چنانچہ مخدوم العلماء حضرت مولانا محمد شریف صاحب مدظلہ خلیفہ ارشد حضرت حکیم الاسلام مدظلہ (مہتمم مدرسہ عربیہ خیر المدارس ملتان) اور اسوۃ الصلحاء حضرت العلام مولانا مفتی عبدالستار صاحب زید مجدہم (خیر المدارس ملتان) نے مختلف مقامات سے پڑھا اور تحسین فرمائی۔ نیز کتاب کے بارے میں کلماتِ تبرک ارقام فرمائے، جو کتاب میں شامل کر دیئے گئے۔

علاوہ ازیں والد محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ (استاذ دار العلوم کراچی) نے بالاستیعاب پورے مسودے کا مطالعہ فرمایا، اور قابلِ اصلاح عبارت کی نشاندہی فرمائی۔ خصوصاً احادیث کی عبارت نقل کرنے میں احتیاط سے کام لیا گیا ــــ اس کے باوجود بندے کا علم ناقص ہے خطا کا احتمال باقی ہے۔ اگر کوئی غلطی نظر آئے تو اہلِ علم اس کی اصلاح فرماویں اور بندہ کو بھی مطلع فرمائیں۔ بندہ اس کا شکر گزار اور ممنون ہوگا ــــــ

اس اظہارِ حقیقت کے بغیر چارۂ کار نہیں کہ اس مجموعہ کی تمام تر خوبیاں علوم قاسمی کے حامل اور وارث و امین کے لئے زیبا ہیں۔ اور بندہ کی حیثیت محض ایک نا اہل مرتب کی ہے، اور بس ——— ؎

من ہیچم و کم ز ہیچ بسیارے ٭ وز ہیچ کم از ہیچ نیاید کارے

——— آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جلد دوم میں بیشتر تقاریر کیسٹ ٹیپ سے لی گئی ہیں، جو مختلف مقامات پر ریکارڈ کی گئیں ——— اس سلسلہ میں بندہ برادر محترم حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب مدّ ظلہٗ اور مولانا قاری سیف الدین صاحب زید مجدہٗ (مقیم سعودی عرب) کا خاص طور پر شکر گزار اور ممنون ہے کہ انہوں نے بندۂ ناچیز کو یہ تقاریر مہیا فرمائیں۔ اور جلدِ اوّل کی طرح اس مجموعہ میں بھی تعاون فرمایا ———

میں ان دو حضرات کے حق میں کلماتِ تشکر و امتنان کے سوا اور کیا عرض کر سکتا ہوں۔ حقیقی صلہ تو حق تعالیٰ شانہٗ ہی دے سکتے ہیں ———

بہر حال یہ مجموعہ حاضرِ خدمت ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ محض اپنے فضل و کرم سے اس کو شرفِ قبولیت سے نواز کر اس کے منافع کو عام و تام فرماویں۔ اور ہم سب کے لئے دین و دنیا کے لحاظ سے خیر و برکت، صلاح و فلاح اور ذریعۂ نجاتِ اخروی بنائیں۔

اٰمین یا رب العٰلمین۔ بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

؎ چشم دارم کہ دہد رقم مرا حسنِ قبول
آنکہ دُرّ ساختہ است قطرۂ بارانی را

بندۂ نابکار:۔

محمد ادریس ہوشیار پوری غفر لہٗ۔ ۲۹ رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۱ھ

یکم اگست سنہ ۱۹۸۱ء

اَلاِھدَاء

"خُطباتِ حکیمُ الاسلام"

کی ترتیب تدوین کے اس ذرۂ محنت کو اپنے عظیم المرتبت استاذ گرامی
—— مجدد القرآت، استاذ الاساتذہ، عارف باللہ حضرت الحاج سیدی و
مولائی المقری القاری رحیم بخش صاحب ادام اللہ تعالیٰ فیوض برکاتہم
(خلیفہ مجاز بیعت حضرتِ اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب
دامت برکاتہم) —— کی خدمتِ عالیہ میں پیش کرنے کی سعادت
حاصل کرتا ہوں جن کی بے پایاں عنایات اور خصوصی ادعیہ سے بندۂ ناچیز
یہ کام کر پایا ...... اور حضرۃ موصوف مدظلہ العالی کی دعواتِ صالحہ کی بھرپور امید
رکھتا ہوں ——

ع : شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

محمد ادریس ہوشیارپوری (غفرلہ)

عارفِ ربانی حجۃ القراء، شارح شاطبی حضرت الحاج مولٰینا المقری القاری فتح محمد صاحب دام اللہ بقاءہٗ بالعزو الجمال کا

مکتوبِ گرامی

از:- حضرت قاری فتح محمد صاحب
ص-ب ۱۴۴۳ مدینہ منورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دل وجان کی طرح میرے پیارے عزیز مولوی قاری محمد ادریس صاحب سلمہٗ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

مفلوج ہونے کے باوجود الحمد للہ خیریت سے ہوں صحتِ عافیت کا اللہ تعالیٰ سے متمنی و ملتجی ہوں احباب کی مخلصانہ وغائبانہ دعائیں ان شاء اللہ تعالیٰ دونوں جہاں میں میرے لئے مفید ثابت ہونگی۔ اور بہترین رنگ لائیں گی۔

رمضان المبارک سے چند روز پہلے آپ کا مرسلہ ہدیہ "خطبات حکیم الاسلام" حصہ اول پہنچا۔ مضامین کی مکمل فہرست اور کتاب کے ابتدائی چند اوراق سنے دل بہت خوش ہوا۔ چند روز ہوئے کہ "خطبات حکیم الاسلام" حصہ دوم کے مرتب ہو جانے کا مسرت نامہ عزیز قاری احمد اللہ صاحب سلمہٗ کے زبانی سنا جس میں کتاب کے چند عنوانات اور مضامین کا خلاصہ مذکور تھا اور آپ کی طرف سے مجھے کتاب کے متعلق چند کلمات لکھوانے کی فرمائش بھی کی گئی۔

میرے پیارے! کسی کتاب کے متعلق تقریظ یا تائید اس کی قدر و منزلت بڑھانے کے لئے لکھائی جاتی ہے۔ "خطبات حکیم الاسلام" کی قدر و منزلت کے لئے تو بس حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم کا نامِ نامی ہی کافی و وافی ہے۔ اس کے لئے کسی تقریظ، پیش لفظ کی ضرورت نہیں، البتہ حسبۃً للہ دل کی گہرائی سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپکی اور تمام معاونین کی محنت و مساعی حسنہ کو قبول فرما کر اپنی شایانِ شان سب کو جزائے خیر نصیب فرمائے اور عوام و خواص کو ان مواعظ حسنہ سے مستفید و مستفیض ہونے کی توفیق بخشے۔

آمین یارب العٰلمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم

بقلم عبد القادر بن محمد متقی عفی اللہ عنہما
بعد مغرب شب یکشنبہ حرم نبوی شریف ۱۰/ شوال ۱۴۰۱ھ / ۸۱ء

بذریعہ ڈاک بوساطت اخی الکریم القاری المقری احمد اللہ صاحب زید مجدہٗ (شکر اللہ سعیہٗ)

تقریظ مبارک

مخدوم العلماء حضرت العلام مولانا محمد شریف صاحب مدظلہم۔ خلیفہ ارشد حضرت حکیم الاسلام دامت برکاتہم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اما بعد:۔

اکابر اولیاء اللہ کے ارشادات وفرمودات روحانی زندگی کی بقاء وترقی کے لئے عظیم سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کی عدم موجودگی میں ان کی صحبت وبیعت کے قائم مقام ہیں جس کے بارے میں فرمایا گیا:۔

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء ٭ بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

آج کے پُرفتن دور میں اس چیز کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ علوم ظاہریہ کی تکمیل کے باوجود تکمیلِ باطن کے بغیر انسان کی انسانیت اُجاگر نہیں ہو سکتی۔ اور تکمیلِ باطن کے سلسلہ میں بزرگان دین کے اقوال وملفوظات اور مواعظ وخطبات نسخۂ اکسیر ہیں۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی کی علمی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اور دار العلوم دیوبند کی نسبت سے ان کی خدماتِ جلیلہ سے پورا عالمِ اسلام آگاہ اور ایک زمانہ آشنا ہے۔ آپ کے ارشاد فرمودہ مواعظ کو عام مواعظ کی نسبت ایک خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے جہاں عامۃ الناس آپ کے مواعظِ طیبہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ وہاں اہلِ علم بھی خصوصیت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ عزیز القدر قاری محمد ادریس سلمہٗ کو جزائے خیر نصیب فرمائے۔ انہوں نے حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم کے مواعظ کو

یکجا کر دیا اور جگہ جگہ مفید عنوانات کے اضافے سے مرتب کر دیا۔

اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل میں برکت و ترقی نصیب فرمادے۔ اور اس محنت کو قبول فرما کر اپنی رضا کا ذریعہ بنائے۔ اور دین و دنیا میں کامیابی کا ذریعہ بنا کر نجاتِ آخرت کا وسیلہ بنائے۔

آمین یارب العالمین۔ بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

بندہ محمد شریف جالندھری

۱۴۰۱/۱۰/۷ھ

مہتمم

مدرسہ خیر المدارس رجسٹرڈ ملتان شہر

تقریظ مُبارک

از حضرت العلام مولانا مفتی عبدُالستار صاحب مدظلہ العالی
(خیر المدارس ملتان شہر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً اما بعد دعوت الی اللہ فریضۂ نبوت ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے دعوت الی اللہ پر مشتمل مواعظ کا ایک حصّہ ہمیشہ کے لئے قرآن کریم میں محفوظ کر دیا گیا ہے، تاکہ لوگوں کی ہدایت کا باعث ہو۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد اُمّت کے کاملین مشائخ عظام و علماء کرام اپنے اپنے ظرف و استعداد کے مطابق اس میراثِ نبوت میں سے حصّہ پاتے ہیں۔ اللہ پاک ان کے کلام، ملفوظات و مکتوبات کے ذریعہ اپنی مخلوق کو ہدایت بخشتے ہیں۔ زندگیوں میں انفرادی و اجتماعی انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ مردہ دلوں میں زندگی کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔ بند دل ہدایتِ ربّانی کے لئے کھل جاتے ہیں۔ لکھوکھا اندھے، بینا، اور بہرے، شنوا ہو جاتے ہیں۔ کفر و شرک، بدعات و معاصی کی ظلمتیں چھٹ جاتی ہیں، ایمان و یقین اور اتباعِ سنت کے انوار سے قلب و قالب جگمگا اٹھتے ہیں ——

دعوت الی اللہ اور نالہائے صبحگاہی کی تاثیرات معاشرہ میں ضرور ظہور پذیر

ہوتی ہیں ۔

عارف رومی فرماتے ہیں :۔

گر نبودے نالۂ نے را ثمر
نے جہاں را پر نکردی از شکر

تاریخ شاہد ہے کہ حضور پاک صلے اللہ علیہ وسلم سے لے کر بصدقہ و فیضِ ختمِ نبوت ، دعوت الی اللہ کا یہ کام سلسل جاری ہے اور ان شاء اللہ تا قیامت جاری رہے گا ۔ اِس گئے گزرے زمانے میں بھی دین جو کچھ امت کے پاس موجود ہے ۔ یہ اسی تعلیم و تبلیغ اور اہل اللہ کے نالہائے صبحگاہی کا ثمرہ ہے ۔

بسلسلہ وعظ و دعوۃ الی اللہ کی ایک کڑی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی دامت برکاتہم کے حکیمانہ مواعظ و خطبات ہیں ، جو آپ نے مختلف مواقع پر نہ صرف پاک و ہند بلکہ حرمین شریفین افریقی ممالک یورپ تک میں ارشاد فرمائے اور تشنگان علوم و معارف نبویہ کو سیراب فرمایا ۔

جن حضرات کو موصوف کے حکیمانہ خطبات سُننے کا کبھی اتفاق ہوا ہے ۔ وہی اس کی حقیقت کو جان سکتے ہیں کہ آپ کا بیان علمی ، ادبی ، عملی ، اخلاقی ، روحانی و معنوی اعتبار سے کتنا اعلےٰ ہوتا ہے ۔ سُنا ہے ، کہ خیر المدارس جالندھر کے سالانہ جلسہ میں جب حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم کا بیان ہوتا ، تو حضرت شاہ عطاء اللہ صاحب بخاری نور اللہ مرقدہ اسٹیج سے نیچے سامنے بیٹھ کر عجیب والہانہ شان سے آپ کا بیان سنا کرتے ، اور مخصوص انداز میں داد دیتے اور فرماتے :۔

"یہ طیب نہیں بول رہا بلکہ حضرت قاسم نانوتوی رح کی روح بول رہی ہے"

حضرت قاری صاحب مدظلہم کے ایسے سینکڑوں مواعظ و خطبات ہوں گے جو سامعین

ے نالۂ نے سے مراد ملفوظات و مواعظ بزرگان ہے ۔ ۱۲

نے سُنے۔ اور فضا میں تحلیل ہو گئے، اور بہت سے مواعظ کو بعض خوش قسمتوں نے ٹیپ بھی کیا۔ لیکن ان کے افادہ عوام کی صورت نہ تھی، کیونکہ یا ہوا میں منتشر ہیں یا ٹیپ میں بند۔

——— اللہ پاک نے فاضل نوجوان عزیز مکرم جناب قاری محمد ادریس صاحب سلمہ کے قلب میں ان کے جمع و اشاعت کا داعیہ پیدا فرمایا۔ چنانچہ اپنے طبعی ضعف اور ذمیہ فرائض کے باوجود اس اضافی بارگراں کو اپنے ذمہ توکلاً علی اللہ لے لیا۔ موصوف نے نہ معلوم کہاں کہاں سے مواعظ کی کیسٹیں جمع کیں ..... پھر ان کو کاغذوں پر منتقل کیا، ترتیب کے دوران موقعہ بہ موقعہ مفید عنوانات کا اضافہ فرمایا۔ اور پھر بہترین کتابت و طباعت سے مزیّن کر کے یہ نادر تحفہ ہدیۂ ناظرین کیا۔ موصوف کی اس مساعی جمیلہ کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ اللہ پاک آں عزیز کی اس محنت و جانفشانی کو قبول فرما کر خلعتِ رضا و سعادتِ دارین سے نوازیں — آمین

فقط

امیدوارِ دُعا

بندہ عبدالستار عفا اللہ عنہ

۱۵ / ۷ / ۱۴۰۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلماتِ تبرک

الحمد لولیہٖ والصلوٰۃ والسلام علی نبیہٖ

امابعد :۔۔۔۔۔ برکۃ السلف، حجۃ الخلف، حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی کی علمی وروحانی شخصیت کا نام نامی آجانا مواعظ وخطبات کی اہمیت وافادیت کے لئے کافی ووافی ہے ۔۔۔۔۔ علوم ومعارف پر مشتمل یہ گرانقدر مجموعہ اہلِ علم، خطبار، آئمہ مساجد اور مقررین ومبلغین کے لئے علم وحکمت کا عظیم سرمایہ ہے، عنوانات کے اضافے سے مضامین کا استحضار نہایت سہل ہوگیا ۔۔۔۔۔

الحمد للہ بندہ نے شروع سے آخر تک تمام مسودہ بنظرِ عمیق دیکھا، اور متعدد مقامات پر برائے اصلاح نشاندہی کی۔ وفوق کل ذی علم علیم۔

۔۔۔۔۔ عزیزم مولوی حافظ قاری محمد ادریس سلمہٗ (فاضل خیر المدارس ملتان) نے شبانہ روز محنت وکاوش سے اسے مرتب کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بالآخر کتاب موجودہ شکل میں منظرِ عام پر آگئی۔ دِل سے دُعا ہے اللہ تعالیٰ میرے پیارے عزیز سلمہٗ کی اس محنت وجانفشانی کو اپنی رضا کا ذریعہ بنائے، اور اپنی جنابِ خاص سے اس کا اجرِ بے پایاں عنایت فرمائے۔ نیز علم وعمل، صحت وعمر میں برکت نصیب فرماکر خلوص وللّٰہیت کے ساتھ مزید برمزید خدمتِ دینِ متین کے مواقع فراہم فرمائے، اور ہم سب کا ایمان پر خاتمہ نصیب فرمائے۔ آمین۔

وھو یھدی السبیل

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہٗ

۱۳-۱۰-۱۴۰۱ھ

حرفِ سپاس

ناسپاسی ہو گی اگر اس مجموعۂ صد رنگ کا سر نقطۂ آغاز اس بزرگ و مہربان شخصیّت کو قرار نہ دوں جس نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں مجھے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود بھرپور تعاون سے نوازا اور اس مشکل کام کو میرے لئے آسان کر دیا۔ تشکر و امتنان کے جذبات کا اظہار یوں بھی ایک دشوار گزار مرحلہ ہے مگر جب یہ تعاون ایک ایسی شخصیّت کی جانب سے ہو جو بوقلموں فضائل کے ساتھ ساتھ والد گرامی کی نسبت و عظمت بھی رکھتی ہو تو ان جذبات کا اظہار جس نزاکت اسلوب کا تقاضا کرتا ہے اس کی استعداد کہاں سے لائی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ والد گرامی قبلۂ محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم کی علمی رہ نمائی اور عملی شفقت و عنایت سے میں اس قابل ہوا کہ اس گلدستۂ پند و حکمت کو مرتب کر سکوں .... دست بدعا ہوں کہ حق تعالےٰ بتصدق حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم ان کے ظلِ عاطفت کو ہمارے سروں پر تادیر سایہ فگن رکھے، اور اپنی جنابِ خاص سے انہیں اپنی اور ان کی شایانِ شان اجر و ثواب سے خوش وقت اور شاد کام فرمائے۔ اور اس کوشش ناکام کو سعی مشکور سے مبدل فرمائے۔ آمین

معارف القرآن

قرآن کریم کے ایک تو الفاظ ہیں، ایک معانی ہیں، جو الفاظ میں پوشیدہ ہیں۔ پھر ان معانی کی تہہ میں حقائق ہیں۔ حقائق کے تحت معارف ہیں، اور معارف میں کیفیات ہیں، جو قلوب پر طاری ہوتی ہیں ـــــ کتاب اللہ کے نزول کا مقصد محض الفاظ و معانی کی سمجھ بوجھ ہی نہیں، بلکہ اس کا مقصد ایسے قلوب و اذہان کی تربیت و تزکیہ بھی ہے، جو الفاظ و معانی کی تہہ میں چھپے ہوئے حقائق و معارف کے ادراک کے قابل بھی ہوں، اور ان معارف کی کیفیات کا محل بھی بن سکیں۔

از۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

ترتیب

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ
ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور
انفسنا ومن سیئات اعمالنا - من یھدہ اللہ فلا مضل
لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہ - ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ
وحدہٗ لا شریک لہ - ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولانا
محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ - ارسلہ اللہ اِلیٰ کافۃ للناس
بشیرًا ونذیرًا - وداعیًا الیہ باذنہٖ وسراجًا منیرًا -
امابعد :- فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
خیرکم من تعلم القراٰن وعلمہٗ —
صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — (اوکما قال
علیہ الصلوٰۃ والسلام)

بزرگانِ محترم!

جلسہ کی مناسبت سے مَیں نے جو حدیث تلاوت کی اس کا مفہوم اور ترجمہ یہ ہے۔ — "تم میں سے وہ شخص بہترین ہے جو قرآن کریم حاصل کرتا، یا دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔ خود پڑھتا ہے یا دوسروں کو پڑھاتا ہے" —

خیر کی دو بُنیادیں

اس امت کے لئے سب سے پہلے جو چیز لازم کی گئی اور جس کو سراپا خیر قرار دیا گیا، وہ اللہ کی کتاب "قرآن مجید" ہے۔ جس کے متعلق احادیث میں "اصدق الحدیث کتاب اللہ او خیر الحدیث کتاب اللہ" فرمایا گیا ——— یعنی سراپا سچ سراپا خیر، اللہ کی کتاب ہے۔

اسی طرح نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بابرکت ذات کے لئے خیر الھدیِ ھدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اطلاق فرمایا گیا۔ یعنی بہترین سیرت، سیرتِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہے ——— یہ دو بنیادیں ارشاد فرمائی گئی ہیں اوّل کتابُ اللہ، دوم رسولُ اللہ ——— رسول تو اللہ نے اِس امت کو وہ عنایت فرمائے جو خیر البشر ہیں، جو تمام بنی آدم اور تمام ملائکہ بلکہ پوری کائنات میں افضل ترین ہیں۔ اور کتابُ اللہ قوانینِ خداوندی میں سب سے اعلیٰ ترین اور جامع و اکمل ترین قانون ہے۔ اس کی تعلیم و تعلّم کو بہترین مشغلہ قرار دیا گیا۔

بُنیادوں کی خیر

اور یہ انہی بنیادوں کی خیر ہے جو امتِ محمدیہ صلے اللہ علیہ وسلم میں جاری ہوئی، اسی سبب یہ اُمت "خیرِ امۃ" کے لقب سے سرفراز ہوئی ——— کنتم خیر امۃ اخرجت للناس! تم ہی وہ بہترین امت ہو جس کو انسانیت کی بھلائی کے لئے وجود بخشا گیا۔ گویا بنیادیں بھی خیر و برکت، اور بنیادوں کے ذریعے تربیت یافتہ امت بھی خیرِ امۃ۔ پھر یہ خیرِ مطلق چند طبقات پر حاوی

ہوئی۔ تو وہ طبقات بھی کامل و اکمل طریقہ پر باعثِ خیر بنے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ہے...

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم

—— زمانوں میں بہترین زمانہ میرا ہے، پھر اس سے ملا ہوا، پھر اس سے ملا ہوا——

ان زمانوں کے اعتبار سے اعلیٰ ترین فضیلت صحابہ کرامؓ کو نصیب ہوئی، اور قرآن کریم نے من حیث الطبقہ جس کو محترم اور مقدس قرار دیا۔ وہ یہی صحابہ کرامؓ کا طبقہ ہے، جس میں کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔ مطلق اس طبقہ کو ہی خیر فرمایا گیا۔ قرآن کریم میں مختلف عنوانات سے اس طبقہ کی خیریت اور تقدس کو بیان فرمایا گیا، ارشاد ہوا۔

والسّٰبقون الاوّلون من المهٰجرین والانصار والذین اتبعوهم باحسان رضی الله عنهم ورضوا عنه۔

—— جنہوں نے اسلام کی پہلی پکار پر لبیک کہا، وہ مہاجر ہوں یا انصار یا اُن کے سچے دل سے پیروی کرنے والے، اللہ ان سب سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے —— اس میں جانبین کی باہمی رضا و خوشی بتائی گئی۔ تو یہ طبقہ مطلقاً خیرِ مطلق قرار پایا۔ یہ اللہ سے راضی، اللہ ان سے خوش، اور رضا و خوشی کا یہ اعلان چونکہ قرآن کریم کے ذریعے فرمایا گیا، جو دوامی کتاب ہے جس کا وجود قیامت تک باقی رہے گا۔ بلکہ آگے جنت میں بھی جاری و ساری رہے گا اور ایک لحاظ سے یہ ابدی کتاب ہے لہذا اعلانِ رضا بھی ابدی ہے۔ اس کا اطلاق ہر دور اور ہر زمانہ میں ہوتا رہے گا، اور کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا جس میں صحابہ کرامؓ کی خیر میں فرق پڑے، ورنہ ان سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا اعلان عام نہیں رہے گا۔ اعلان کی عمومیت ہی اس کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ صحابہ کرامؓ سے ابد تک راضی ہے اور رہے گا۔ اس کی رضا میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اللہ سے راضی رہیں گے، اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی رہے گا۔

★

مشیّتِ الٰہی بندہ کے تابع

صوفیاءِ کرام کی اصطلاح میں اسی تعلقِ رضا کو نسبت کہتے ہیں کہ بندہ اللہ تعالےٰ کی مرضیات کے تابع ہو جائے، اور اللہ تعالےٰ بندہ کی جو مرضیات ہوں ان سے خوش ہو، جانبین کا یہی تعلقِ رضا "نسبت" کہلاتا ہے۔ جس بندہ کو یہ نسبت حاصل ہو جائے تو اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ تعالےٰ اسے عافیت میں رکھے تب راضی، بیماری و دُکھ میں رکھے تب خوش، جو بھی تقدیرِ خداوندی ہو، بندہ اس پر مطلقاً رضا کا اعلان بھی کر دے۔ اور دل سے بھی راضی ہو اور جب بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ حق تعالےٰ کی ہر تقدیر پر راضی ہو، تو پھر اللہ تعالےٰ بھی بندہ کی ہر منشار پر راضی ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ کی رضا یہ ہوتی ہے کہ بندہ کا جو منشا ہو وہ پورا فرماتے ہیں ——

یہی وہ مقام ہے جس کو حدیث شریف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! آپؐ کی شان بھی عجیب ہے۔ اللہ تعالےٰ آپؐ کی خواہش پورا کرنے میں اس قدر جلدی فرماتے ہیں کہ اِدھر آپؐ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی اُدھر اللہ تعالےٰ نے فوراً پورا فرما دیا ——

اسی کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ مشیتِ الٰہی بندہ کی مشیت کے تابع ہو گئی۔ جو بندہ چاہتا ہے وہی ہو جاتا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ آپؐ کی جو خواہش ہوتی، پوری ہو جاتی — وجہ اس کی یہ تھی کہ جس طرح نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سراپا خیر تھے، اسی طرح آپؐ کی خواہش بھی خیرِ مطلق ہوتی تھی۔ غیر خیر یا شر کی خواہش نبی کے ذہن کو چھو بھی نہیں سکتی۔ انبیاء کرامؑ کے قلوب اتنے پاکیزہ و مقدس اور صاف ہوتے ہیں کہ ان میں جو ارادہ بھی پیدا ہوتا ہے وہ خیر ہوتا ہے۔ جو خواہش بھی پیدا ہوتی ہے خیر مطلق ہوتی ہے، جب وہ خیرِ محض ہے تو اللہ تعالےٰ اس کو ضرور پورا فرمائیں گے۔

اللہ تعالےٰ کی طرف سے خیر ہی چلتی ہے اور خیر ہی کی پذیرائی ہوتی ہے ــــ یہی وہ انتہائی مقام ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بندہ اللہ تعالےٰ کی تقدیر پر راضی، اور اللہ بندہ کی ہر خواہش پر راضی ۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عمرؓ جدھر گھومتے ، حق بھی ادھر گھومتا ہے۔ بظاہر تو صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جدھر مشیتِ خداوندی اور حق ہوتا ہے، ہم ادھر ہی چلتے ہیں ۔ اور یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ جدھر عمر رضی اللہ عنہ گھومتے ہیں، حق بھی ادھر ہی گھومتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایک مقام تو مبتدی کا ہوتا ہے کہ وہ تابع مطلق ہوتا ہے۔ جدھر حق ہو اُدھر ہی گھوم جائے ۔ اور ایک مقام منتہی کا ہوتا ہے ۔ اس وقت یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ حق بندہ کی سمت گھومتا معلوم ہوتا ہے ۔ یہ مقام جانبین کی رضائے کامل سے حاصل ہوتا ہے کہ اللہ بندہ سے راضی اور بندہ اللہ سے راضی ــــ اور یہ مقام پوری اُمتِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم میں سے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کو حاصل ہوا۔

خیرِ عمل

اوّل پوری اُمت کو دیگر امم کے مقابلے میں خیر امت قرار دیا گیا ۔ پھر اس خیریت کو خیر القرون قرنی کے ذریعہ عہدِ صحابہ کرام رضؓ کے ساتھ مخصوص فرمایا گیا۔ اس کے بعد عہد صحابہ رضؓ میں موجود مسلمانوں میں سے خیریت میں اس فرد کی ترجیح فرمائی گئی جو خود قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دے ۔ اس کی رغبت دلائے !

خیرکم من تعلم القرآن وعلمہٗ ۔ اس کو عملِ خیر کہا گیا ہے۔ قرآنِ کریم خود بھی خیر، اس کو پڑھنے پڑھانے والے بھی خیر کے مستحق ۔

حفاظتِ قرآنِ کریم

ظاہر میں قرآن کریم دو چیزوں، الفاظ و معانی کا مجموعہ ہے۔ اور یہ دونوں منزّل من اللہ ہیں۔ دونوں ہی اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوئے۔ الفاظِ قرآن جب نازل ہوتے تھے ایسے جوں کا توں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ و حاضرین کو سُنا دیتے۔ کوئی لفظ کم کرتے نہ زیادہ، اس معاملہ میں جس طرح آپؐ امین تھے، اسی طرح معانی کے سلسلہ میں بھی آپؐ امین تھے۔ الفاظ کی طرح معانی بھی اللہ تعالےٰ کی طرف سے القار کئے جاتے تھے۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے آیت کا جو مقصد، مطلب، معنیٰ آپؐ کے قلب مبارک پر القار ہوتا، آپؐ اسی کو روایت فرما دیتے۔ اپنی طرف سے کوئی معنیٰ بیان نہیں فرماتے۔

آپؐ الفاظ میں بھی امین تھے، اور معانی میں بھی امین۔ الفاظ بھی اللہ تعالےٰ کے اور معانی بھی اللہ تعالےٰ ہی کے۔ اور دونوں کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ ان میں قیامت تک کوئی خلل نہیں پڑ سکتا۔ یہ الفاظ و معانی قیامت تک باقی رہیں گے۔ تحریف کرنے والے ہزار تحریف کریں مگر حق غالب ہی رہے گا۔ الفاظ بھی باقی رہیں گے اور معانی بھی ——— خود قرآنِ کریم نے ہی اس کی گارنٹی دی ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر و انا لہٗ لحٰفظون۔

ابتدا ءً نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت شریفہ تھی۔ جب وحی نازل ہوتی تو آپؐ جلد جلد اس کو پڑھنے لگتے تاکہ الفاظ زبان پر چڑھ کر محفوظ ہو جائیں۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا :-

لا تحرك به لسانك لتعجل بہٖ ان علینا جمعہ و قرانہٗ

بھُولنے کے خطرہ کے پیشِ نظر جلد جلد زبان کو حرکت نہ دیجئے۔ اس کے الفاظ آپؐ کے قلب میں جمانے اور زبان سے ادائیگی کا ہم ذمہ لیتے ہیں۔ گویا الفاظِ قرآن

کی حفاظت، اور یاد داشت کی حفاظت، اللہ تعالےٰ نے اپنے ذمہ لی، کہ آپ ﷺ کے قلب مبارک سے پڑھوا بھی دیں گے۔ نہ جمع میں کوئی غلطی ہوگی، اور نہ پڑھنے میں کوئی چوک ہوگی ـــــ یہ اللہ تعالیٰ کا ذمہ بھی تھا اور وعدہ بھی ـــــ

عربی میں "علیٰ" الزام کے لئے آتا ہے جس چیز کو کوئی اپنے اوپر لازم کرتا اور ذمہ لیتاہے، اس کی تعبیر علیٰ سے کی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی کہتا ہے "علیَّ الف درھم" تو مطلب یہ ہوتاہے کہ مجھ پر لازم ہے کہ تم کو ایک ہزار روپیہ دوں۔ یہ میری ذمہ داری ہے ـــــ یہاں بھی اللہ تعالےٰ نے فرمایا ان علینا جمعہ و قرانہ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ الفاظِ قرآن آپ ﷺ کے قلب میں جمع و محفوظ بھی کر دیں، اور آپ ﷺ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں۔ گویا قرأۃ بھی دوامی ہے، جس میں کبھی اور کسی قسم کا خلل نہیں پڑ سکتا۔ اور جمع قرآن بھی دوامی ہے کہ اس میں تحریف و ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ قرآن پاک الفاظ و معانی کا مجموعہ ہے۔ الفاظ پڑھے جاتے ہیں۔ معانی پڑھے نہیں جاتے، سمجھے جاتے ہیں۔ تو یہاں قُرانَہٗ فرما کر الفاظ پڑھانے اور زبان پر جاری کرانے کی ذمہ داری لی گئی۔ معانی سے متعلق یہاں کچھ نہیں فرمایا گیا۔ قرآن کے لفظی معنیٰ "پڑھانا" کے ہیں۔ معانی کی ذمہ داری ثم ان علینا بیانہ میں لی گئی ہے۔ یعنی الفاظ کے معنیٰ کھول کھول کر بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ پہلی آیت میں قُرانَہٗ فرما کر الفاظ کی ادائگی اور قرأت کی ذمہ داری لی۔ اور اس آیت میں بیانہٗ فرما کر معانی بیان کرنے اور سمجھانے کی ذمہ داری لی۔

خلاصۃً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم کے دونوں اجزاء الفاظ و معانی کی ذمہ داری لے لی ہے ـــ یعنی قرآن پڑھوانا بھی ہمارے ذمہ ہے اور اس کے معنیٰ و مفہوم کو، جو قرآن کے موضوعات ہیں، سمجھانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

قرآن اور بیانِ قرآن

اور یہ بیان ہی دراصل حدیث کہلاتا ہے، اور حدیث ہی کے ذریعہ سے حضور

صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآنی مقاصد کو واضح فرمایا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث بھی قرآن کی طرح قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔ کیونکہ قرآن کے ساتھ بیانِ قرآن' باقی نہ رہے' تو لوگ کچھ کا کچھ مطلب لیں گے۔ ایک معنیٰ کے ہزار معنی بنیں گے —— قرآن کی اوّلین تفسیر حدیثِ نبوی ہے۔ قرآن مجید میں اس کو بیان بھی کہا گیا ہے۔

وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس مانزل الیھم

ہم نے یہ ذکر (قرآن مجید) آپؐ پر اس لئے نازل کیا ہے تاکہ آپؐ واضح اور کھول کر لوگوں کے سامنے بیان کریں ——

الفاظ جب آچکتے ہیں، تو اس کے معانی بیان ہوتے ہیں۔ اس لئے بیان معانی پر صادق آتا ہے۔ الفاظ بیان نہیں کہلاتے۔ وہ تلاوت کئے جاتے ہیں، پڑھے جاتے ہیں۔ قرآن کے جو الفاظ آچکے ہیں، اور ان کے جو معانی اور مراداتِ ربانی ہیں ان کو بیان کر دینے کا نام تبیین ہے۔ یعنی واضح کر دینا۔ تبین للناس سے معلوم ہوا کہ حدیث' بیان قرآن ہے ——

اللہ تعالےٰ نے ایک متن اتارا، جس کا نام قرآن مجید ہے، اور اس متن کی ایک شرح اتاری' جس کا نام حدیث ہے۔ اس کی تاکید لفظ بیان سے کی اور اس سلسلے میں خود ذمہ داری لی۔ ثم ان علینا بیانہ' کہ بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی' تو وہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے کئی معنوں میں ڈھل سکتی ہو لی، مگر آپؐ نے کبھی اس طرح نہیں فرمایا کہ اس آیت کے ایک معنیٰ یہ ہو سکتے ہیں، ایک یہ ہو سکتے ہیں۔ اور زمانہ کے مطابق فلاں معنیٰ ہیں۔ لہذا یہ معنیٰ مراد ہیں —— بلکہ اس آیت کی مراد بھی اللہ تعالےٰ ہی آپؐ کے قلب پر القا فرماتے، خود آپؐ مراد پر غور نہ فرماتے کہ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے۔ یہ مراد بھی نکلتی ہے —— مرادِ ربانی روایت اور نقل سے حاصل ہو سکتی ہے، عقل سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مراد کے دائرے میں رہ کر آپ عقل لڑائیں گے تو حکمتیں کھلیں گی۔ اور وہ حکمت' قرآن کہلائے گی۔ لیکن خود مراد کو عقل سے متعین نہیں کیا

جا سکتا۔ مراد اللہ تعالےٰ ہی بیان فرمائے گا کہ اس آیت سے میرا یہ مطلب تھا۔ اگر مرادِ آیت عقل سے ہی متعین کی جاتی تو قرآن کئی اقسام کے ہوتے۔ جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ جب روزہ کے بارے میں آیت نازل ہوئی۔ ابتدار میں یہ حکم تھا کہ رات کو سو کر جب بھی آنکھ کھلے اس وقت سے اگلے افطار تک بیچ میں کھانا پینا منع ہے۔ پھر اللہ تعالےٰ نے اس میں تخفیف فرمائی اور ارشاد فرمایا.....

کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر ــــــ یعنی صبح کاذب کے بعد جب صبحِ صادق کا اجالا ظاہر ہو تو اب کھانے پینے سے رُک جاؤ، اور روزہ کی نیت کرو۔

اس آیت کے نزول کے بعد لوگوں نے دو قسم کے دھاگے کالے اور سفید تیار کرائے اور سرہانے رکھ لئے۔ جب سفید دھاگہ کالے دھاگہ سے تمیز ہو جاتا، تب کھانا پینا بند کرتے ــــــ حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح کے دھاگے تیار کرائے، اور تکیئے کے نیچے رکھ دیئے، ان کو دیکھتے رہے۔ جب کالا دھاگہ سفید دھاگہ سے بالکل ممتاز نظر آتا، تو روزہ کی نیت کرتے۔ حالانکہ اس وقت صبحِ صادق ہوئے خاصا وقت پندرہ ۱۵، بیس ۲۰ منٹ گزر چکے ہوتے ــــــ ان حضرات نے باعتبارِ لغت یہ صورت اختیار کی تھی جو لغوی اعتبار سے غلط بھی نہ تھی۔ مگر اللہ تعالےٰ کی چونکہ یہ مراد نہ تھی اس لئے سب کی دلجمعی نہ ہوئی۔ اور معاملہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا۔ آپؐ نے حضرت عدی رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا۔ اے عدی! تم کیا صورت کرتے ہو ــــــ؟ انہوں نے عرض کیا۔ میں نے اللہ تعالےٰ کے ارشاد کلوا واشربوا کے نازل ہونے کے بعد دو ڈورے اپنے تکیئے کے نیچے رکھ لئے ہیں۔ اور انہیں دیکھتا رہتا ہوں۔ جب تک کالا ڈورا سفید ڈورے سے ممتاز نہ ہو جائے کھاتا پیتا رہتا ہوں۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اے عدی ــــــ! تمہارا تکیہ بڑا وسیع ہے کہ اس میں دن رات چھپ گئے۔ کیونکہ کالے ڈورے سے رات

مراد ہے اور سفید ڈورے سے مراد دن ہے۔ دھاگوں کے ڈورے مراد نہیں۔
اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہاں لغوی معنیٰ مراد نہیں۔

مرادِ قرآنی اور لغت

یہیں سے معلوم ہوا کہ لفظ کے ایک لغوی معنی ہوتے ہیں اور ایک مرادی۔ قرآن مجید اترا تو لغتِ عربی میں ہے۔ لیکن ہر جگہ لغت مراد نہیں ــ بعض جگہ قرآن کریم نے لغت تو زبانِ عرب سے لیا، مگر معنیٰ اس کے اندر اپنے ڈالے اور وہی مرادی معنیٰ کہلاتے ہیں ــــــ

اب دیکھئے صلوٰۃ کا لفظ ہے۔ لغت عربی میں اس کے معنی دعا کے ہیں۔ ایک آدمی دعار مانگ لیتا ہے تو لغت کے لحاظ سے اس نے صلوٰۃ ادا کرلی۔ یہاں باعتبار لغت رحمت بھیجنا، اور دعار مانگنا تو صحیح ہے۔ مگر اسے نماز پڑھ لینا کہنا صحیح نہیں۔ کیونکہ صلوٰۃ کے لفظ کی مراد یہ نہیں ہے۔ اس سے مراد کچھ خاص اعمال و افعال ہیں کہ یوں نیت باندھو، اس طرح قیام کرو، رکوع وسجود کرو، یوں قعدہ میں بیٹھو وغیرہ۔ اس مجموعہ کو صلوٰۃ کہتے ہیں ــــــ یہاں قرآن نے لفظ لغت عربی کا لیا ہے مگر معنیٰ اپنے ڈالے، کہ یہاں صلوٰۃ سے ہماری مراد یہ ہے۔ اس مراد کی وضاحت کے بعد صرف دعار مانگنے کو نماز نہیں کہا جا سکتا، اور آدمی نماز کی ادائیگی سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا ــــــ

اسی طرح لغتِ عرب میں "زکوٰۃ" کے معنیٰ پاک کر دینے کے ہیں۔ آپ ہاتھوں پر پانی ڈال کر دھو کر پاک کرلیں، زکوٰۃ ادا ہوگئی۔ یہ ہزاروں روپیہ کی زکوٰۃ نکالنے کے معنیٰ کہاں سے نکال لئے۔ لغت میں تو اس کا کہیں پتہ نہیں۔ یہاں بھی قرآن کریم نے زکوٰۃ کا لفظ تو لغت عرب سے لیا مگر اس کے معنیٰ خود متعین کئے کہ اگر تمہارے پاس اتنا مال، روپیہ پیسہ ہو، اور اس پر ایک پورا سال بھی گزر جائے تو اس مال

سے خاص مقدار کی رقم اللہ کی راہ میں نکالنا زکوٰۃ کہلاتا ہے۔ تو زکوٰۃ کے لغوی معنے جتنے بھی ہوں، مراد وہی عرفی معنے ہی ہیں، جو قرآن کریم نے مراد لئے ہیں۔ اللہ جل شانہ نے بہت سے الفاظ لغت عرب کے لے کران میں اپنے معنے ڈالے، وہی مرادی معنے ہوتے ہیں۔ معلم ان ہی معانی کو سمجھاتا، بتاتا اور ان کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر مرادی معنے ضروری نہ ہوتے، لغوی معنے ہی کافی ہوتے، تو اتنا کافی ہوتا کہ حضرت جبریل علیہ السلام قرآن مجید کا نسخہ لاتے۔ بیتُ اللہ کے چھت پر رکھ دیتے اور اعلان کر دیتے ہے لوگو! تم روحانی مریض ہو۔ یہ تمہارے لئے نسخۂ شفا ہے۔ تم زبان داں ہو، عربی سمجھتے ہو، اس کتاب کو دیکھ دیکھ کر اپنا علاج کر لیا کرو۔ پھر پیغمبر مبعوث کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی، مگر مسائل کہیں بھی لغت سے حل نہیں ہوا کرتے۔ اسی لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، وہ لغت سے اللہ کی مراد متعین کر کے لوگوں کو بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے، اور اللہ کے نزدیک اس آیت کا کیا مطلب ہے ؟

مقاصدِ بعثت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

آپ صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، اور آپ کے چار وظیفے متعین و مقرر فرمائے پہلا وظیفہ یتلوا علیھم ایٰتہ ـــــ یعنی لوگوں کو اللہ تعالےٰ کی آیات پڑھ کر سنائیں۔ اور امت تک ان کو پہنچائیں۔ آپؐ نے یہ وظیفہ پوری امانت کے ساتھ انجام دیا اور پورا قرآن اُمت کو سنایا، ان تک پہنچایا۔

اس کے بعد دوسرا وظیفہ یعلمھم الکتٰب ـــــ کتاب کی تعلیم دو! تعلیم کا مطلب ہے کہ ان الفاظ سے اللہ تعالےٰ نے جو مطلب اور مراد متعین کی ہے، وہ انہیں سمجھائیں۔ آپؐ نے وہ معانی سمجھائے اور مرادات ربانی بیان فرمائیں۔ یہ تعلیم کا وظیفہ ہوا۔ جب نبیؐ خود کوئی مراد متعین فرمادے تو اس کے اندر کوئی کھچاؤ باقی نہیں رہتا ـــــ

پھر تیسرا وظیفہ تعلیم حکمت بیان فرمایا۔ یعلمھم الکتٰب والحکمۃ ——
چنانچہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کو حکمتیں بھی سکھلائیں — حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ حکمتِ نظری، حکمتِ عملی —— بقاعدہ بلاغت حکمتِ نظری تعلیم کے اندر ہی آگئی۔ اس کے بعد لفظ حکمت کے ساتھ حکمت کی تعلیم کا حکم دینے سے یہ متعین ہوگیا کہ اس سے حکمتِ عملی مراد ہے۔ اور وہ "اسوۂ حسنہ" ہے۔ آپ کی مقدس سیرت ہے —— آپؐ نے مرادات ربانی نہ صرف سنائیں، اور نہ ان کی تعلیم پر اکتفار فرمایا۔ بلکہ عملی طور پر بھی ان کا نمونہ پیش فرما دیا۔ اب کوئی خطرہ باقی ہے نہ خدشہ۔ اور نہ کوئی خامی باقی رہ جاتی ہے ——

اگر صرف لفظوں سے لوگوں کو عمل متعین کرنے کو کہا جاتا، تو ہر ایک اپنے ذوق کے مطابق الگ الگ متعین کر لیتا۔ مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ پر عمل بھی فرمایا۔ اور ان مراداتِ ربانی کی ہیئت بھی دکھلا دی۔ اب اس میں کوئی خلجان باقی نہیں رہ سکتا —— اسی واسطے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نماز کے متعلق جو عمل کر کے دکھلایا گیا۔ اسی کے مطابق عمل کرو۔ صلوا کما رایتمونی اصلی —— جس طرح مجھے نماز پڑھتے تم نے دیکھا ہے، اسی طرح نماز پڑھو۔ میرا اسوہ و عمل تمہارے لئے نمونہ ہے۔ تم اپنی مرضی کے مطابق اس کی ہیئت متعین نہ کرو۔ میرا عمل اللہ کی مراد کے مطابق ہے، اور اللہ تعالےٰ کو یہی ہیئت مطلوب ہے۔ اس کے بعد کوئی خدشہ کوئی خلجان اس ہیئت کے متعلق کیسے باقی رہ سکتا ہے؟

اس کے بعد چوتھا وظیفہ یہ بھی فرمادیا —— کہ لفظ بھی آپؐ سنادیں۔ معنیٰ بھی آپؐ سمجھادیں، اور عمل کر کے بھی دکھلادیں مگر ان کے دلوں میں صلاحیت بھی ہونی چاہیئے کہ ان معانی کو قبول کرلیں۔ اس ہیئت پر اعتقاد جمالیں، اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے قلب کی صلاحیت کی کہ ذہن بھی صحیح ہو، ذہن صحیح نہ ہو، اس میں ٹیڑھ اور کجی ہو تو اوندھے معنےٰ سمجھتا ہے، اس لئے بطور وظیفہ چہارم فرمایا ویزکیھم —— ان لوگوں کے دلوں کو بھی مانجھ دیجئے۔ ان کے دلوں میں استعداد اور صلاحیت

بھی پیدا کیجیے، کہ جب اللہ کا کلام ان کے کانوں میں پڑے تو اس کا مطلب ٹھیک ٹھیک وہی سمجھیں جو اللہ تعالٰی کی مراد ہے اور عمل کی ٹھیک وہی ہیئت اختیار کریں۔ جو اللہ تعالٰی کا منشاء اور اس کا مطلوب ہے —— محض لفظوں سے کوئی شخص عمل کا نمونہ اختیار نہیں کر سکتا۔ جب تک عملی نمونہ اس کے سامنے نہ ہو۔ اور عملی نمونہ کو اختیار کرنے کی رغبت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک دل کی کدورات صاف کر کے، اس کو مانجھ کر پاک و مصفّٰی نہ کر دیا گیا ہو۔

اسوۂ حسنہ کی ضرورت

میں کہتا ہوں کہ روٹی پکانا بظاہر معمولی بات ہے۔ ہم اور آپ روزانہ گھروں میں روٹی پکتے دیکھتے ہیں۔ مگر آپ محض دیکھتے رہنے سے روٹی پکانے کا عمل نہیں کر سکتے۔ جب تک اس عمل کی مشق نہ کریں۔ پہلے آپ دیکھیں گے کہ پیڑا کس طرح بنایا جاتا ہے، اس کو روٹی کی شکل کس طرح دی جاتی ہے، پھر اس کو توے پر کس طرح ڈالا جاتا ہے۔ جب آپ اپنے ہاتھ سے اس عمل کو دھرائیں گے، عملی طور پر اس کی مشق کریں گے۔ تب آپ کو روٹی پکانی آئے گی۔ محض بیٹھے دیکھتے رہنے سے آپ کبھی روٹی نہ پکا سکیں گے۔ روٹی پکانے کے عمل اور ہیئت کو دیکھنے کی طرح اول ہر عمل کی ہیئت دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ الفاظ سے ہیئت ذہن نشین نہیں ہوا کرتی، اور مشق کے بغیر عمل کی صورت ظہور پذیر نہیں ہوتی ——

خیاطی ایک فن ہے۔ اس فن کی آپ ہزار کتابیں پڑھ ڈالیں۔ سوئی چلانی نہیں آئے گی۔ جب تک درزی کو سوئی چلاتے دیکھ نہ لیں، آپ سوئی نہ چلا سکیں گے —— اسی طرح دنیا کی سب صنعتوں اور حرفتوں کا حال ہے کہ کوئی بھی صنعت بغیر سیکھے سکھائے نہیں آ سکتی، جب تک سکھانے والا عملی نمونہ نہ دکھائے، محض الفاظ اسے صنّاع نہیں بنا سکتے ——

یہی حال "ذہن کی صنعت" کا بھی ہے کہ محض الفاظ کے اتار دینے، ان کے معانی سمجھا دینے کے باوجود عمل کی ہیئت ان کے ذہن نشین نہیں ہو سکتی۔ عملی نمونہ ضروری ہے تاکہ وہ الفاظ و معانی کو صحیح عمل اور ہیئت پر منطبق کر سکیں ۔۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور رسولوں کو اسی لئے مبعوث فرمایا کہ وہ اپنی امتوں کو اللہ تعالیٰ کے فرامین و احکامات کے الفاظ بھی سکھائیں، ان کے مفاہیم و معانی بھی بتائیں، اور الفاظ و معانی سے جو عمل مطلوب ہے اس کا نمونہ بھی ان کے سامنے رکھیں، اور اسی کے ساتھ ان کے ذہن کو بھی مصفیٰ اور منور کریں۔ اور ذہن سازی فرمائیں، تاکہ وہ کلام الٰہی کے اُوندھے سیدھے معانی نہ سمجھیں۔ اور پیغمبر نے جو نمونہ عمل ان کے سامنے پیش کیا ہے اس سے گریز اور بے رغبتی نہ برتیں، بلکہ ذوق و شوق اور کشادہ دلی کے ساتھ اس نمونہ کو حرزِ جان بنالیں' اگر ذہن کی صفائی کے لئے الفاظ و معانی کافی ہو جایا کرتے' تو انبیاء علیہم السلام کے لئے "وظیفۂ تزکیہ" لازم نہ کیا جاتا ۔۔۔۔ ذہن کی صفائی کے لئے خاص طرح کی محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب کا تزکیہ فرمایا۔ ان کو مجلّٰی اور مزکّٰی کیا۔ اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ان کو اللہ کا کلام سنایا جاتا تو ان پر وہی اثرات ظاہر ہوتے جو کلام اللہ کے اثرات ہیں۔

اللہ کا یہی کلام آپ عام مسلمان کو سنائیں، تو وہ عملی طور پر معتقد ہوگا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، اس کی بے ادبی نہیں ہونی چاہیئے۔ مگر اس سے آگے کے اثرات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف اللہ کا یہی کلام کسی عارف باللہ کو آپ سنائیں، تو وہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا۔ اس لئے کہ اس کا دل منجھا ہوا ہے۔ مجاہدات و ریاضات سے اس کا قلب روشن ہے۔ اسی روشنی میں کلامِ الٰہی کے جو اثرات وہ مشاہدہ کرے گا، عام مسلمان ایسا نہیں کر سکے گا۔

اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ذکر اللہ کی کثرت، نماز کی ادائیگی جہاد اور دیگر مجاہدات کے ذریعہ اپنے صحابہؓ کی تربیت فرمائی، ان کے قلوب کو

مانجھا، مصفّٰی و مزکّٰی کیا۔ اور ان کا رُخ بدل دیا۔ پہلے ان کا رُخ دنیا کی طرف تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش کی طرف ان کا رُخ کر دیا۔ پہلے وہ فرشی تھے۔ آپؐ کی تربیت نے عرشی بنا دیا۔

تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے ایک تو الفاظ ہیں، ایک معانی ہیں، جو الفاظ میں پوشیدہ ہیں، پھر ان معانی کی تہہ میں حقائق ہیں، حقائق کے تحت معارف ہیں، اور معارف میں کیفیات ہیں۔ جو قلوب پر طاری ہوتی ہیں۔ ـــ کتابُ اللہ کے نزول کا مقصد محض الفاظ و معانی کی سمجھ بوجھ ہی نہیں، بلکہ اس کا مقصد ایسے قلوب و اذہان کی تربیت و تزکیہ بھی ہے، جو الفاظ و معانی کی تہہ میں چھپے ہوئے حقائق و معارف کے ادراک کے قابل ہوں، اور ان معارف کی کیفیت کا محل بھی بن سکیں۔

قرآن کے ساتھ ـــ اجتماعِ خیر

اس تربیت و تزکیہ کا مدار مربّی و مزکّی کی شخصیت پر ہوتا ہے۔ اس لئے کلام اللہ کے ساتھ ساتھ رسول اللہؐ کی بعثت بھی ضروری گردانی گئی۔ جہاں بھی کسی صحیفہ الٰہی یا کتابُ اللہ کے نزول کا ذکر ہوا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس صحیفہ یا کتاب کے نزول کے مورد پیغمبر و رسول کا ذکر بھی لازماً ہوا۔

اللہ تعالےٰ کی چار مشہور کتابیں چار پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔ تورات کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام، زبور کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام، انجیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اور قرآن مجید کے ساتھ ہمارے پیغمبر رسُولِ مقبول حضرت محمد مصطفٰی صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ غرض کوئی ایسا دور نہیں گزرا کہ قانون تو آیا ہو مگر شخصیت نہ آئی ہو۔ اس لئے کہ دارو مدار شخصیت پر ہوتا ہے، کاغذ اور تختیوں، یا ان پر کندہ حروف پر نہیں ہوتا۔

ان حروف والفاظ کی تلاوت شخصیت کرے گی اور ان کے معانی بھی شخصیت بتلائے گی۔ اور نمونۂ عمل بھی شخصیت بنے گی۔ کسی کتاب کے اوراق تو نمونۂ عمل نہیں بنیں گے۔ دلوں کو مانجھنے، ان کو مصفیٰ و مزکیٰ کرنے کا کام بھی شخصیت انجام دے گی۔ کتابوں پر لکھے ہوئے یا تختیوں پر کندہ الفاظ تو دلوں کو نہیں مانجھیں گے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ہر قانون کے ساتھ شخصیت لازم اور ضروری ہوتی ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جس کا نام اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول رکھا۔

یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ جب قرآن کریم خیر الکتب ہے تو اس کے ساتھ مبعوث ہونے والی شخصیت بھی لازماً خیر البشر ہوگی۔ اور اس خیر البشر شخصیت کے شاگرد بھی خیر الناس ہوں گے۔ اور وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کرام ہیں۔ اسی قاعدہ کے مطابق خیر البشر کا قرن خیر القرون ہوگا۔ ایسی خیر در خیر کے اندر قرآن مجید کا نزول ایسا خیر مطلق تھا کہ اس کے ساتھ کئی طرح کی خیر وابستہ تھی۔ زمانہ کی خیر، مکان کی خیر، ذاتِ اقدس کی خیر، شاگردوں کی خیر، اور جب گوناگوں خیر یکجا اور مجتمع ہو گئی تو خیر الکتب کا نزول ہوا، اور اس کے متعلق فرمایا گیا۔

خیرکم من تعلم القرآن وعلمہٗ — تم میں سے جو قرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، وہ بہترین لوگ ہیں —— جس کتاب کے اندر باہر، ارد گرد اوپر نیچے ہر سمت خیر ہی خیر ہو تو اس کے پڑھنے پڑھانے والے اس خیر سے کیسے محروم رہ سکتے ہیں، وہ بھی خیر بن جائیں گے۔

کلام اللہ کے ذریعے باطنِ خداوندی سے وابستگی

اسی لئے ایک حدیث اس مضمون کی مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا —— "قرآن سے برکت حاصل کرو، یہ اللہ کا کلام ہے، اور

اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے"۔ (او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام)
—— کلام آدمی کے اندر سے نکلتا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی کلام کو تخلیق کرتا ہے، بلکہ کلام آدمی سے سرزد ہوتا ہے۔ آدمی اس کی تخلیق نہیں کرتا۔ جب کسی بولنے والے کو آپ بولتا سنتے ہیں تو یہ کہتے ہیں، کلام اس سے صادر ہو رہا ہے۔ سرزد ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ یہ شخص کلام پیدا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام آسمان و زمین اور پوری کائنات تخلیق فرمائی — تمام خیرات و برکات مخلوقِ خداوندی ہیں۔ مگر قرآن مجید مخلوق نہیں ہے، وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے صادر ہوا ہے۔ اسی لئے اس کلام پاک کو پڑھ کر بندہ کا تعلق باطنِ خداوندی سے قائم ہوتا ہے۔ دیگر نعمتوں کے ذریعہ ظاہر سے وابستگی اور تعلق قائم ہوتا ہے۔ اور کلامِ خداوندی کے ذریعہ باطن سے وابستگی پیدا ہوتی ہے۔

اسی لئے قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: — واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا۔ اور حدیث شریف میں حبل اللہ کی تفسیر القرآن حبل اللہ کے الفاظ سے فرمائی گئی، کہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو زمین پر اتاری گئی ہے۔ اسے مجموعی طور پر مضبوطی سے تھامے رہو۔ کیونکہ یہ رسی قیامت کے دن کھینچی جائے گی۔ تو اُس کو تھامنے والے بھی اسی کے ساتھ کھنچے آئیں گے" اور جہاں قرآن پہنچے گا وہیں اس سے چمٹے رہنے والے باطن حق سے وابستہ ہو جائیں گے۔

باطنِ قرآن جنّت ہے

بعض احادیث کے مضمون میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں جتنی آیات ہیں، جنت میں اتنے ہی درجے ہیں۔ ایک قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا "رتّل وارتق" پڑھتا جا اور چڑھتا جا۔ اب جس کو جتنا قرآن یاد ہوگا، وہ اسی کے مطابق درجات تک پہنچ جائے گا۔ بعض احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ آیتیں خود

جنت کے درجات ہیں۔

یہاں آپ کو جو آیات الفاظ کی صُورت میں نظر آتی ہیں۔ جنت میں یہی آیات باغ و بہار کی شکل میں ڈھل جائیں گی۔ چیز ایک ہی ہے۔ یہاں شکل اور ہے، جنت میں یہ شکل بدل جائے گی۔

——— ہمارے زمانے میں یورپ کا ایک کھلونا آتا تھا۔ پیکیٹ میں غالباً ۱۲ گولیاں ہوتی تھیں۔ چار آنے میں ملتا تھا۔ بچے لاتے تھے۔ پانی کا پیالہ بھر کر گولی اس میں ڈالتے تھے تو پانی لگنے سے گولی چٹختی تھی اور وہ گولی پھیل کر کوئی انجن بن جاتی تھی، تو کوئی گھوڑا کسی کا پھول بن گیا تو کسی کا بگلا۔ کاریگر نے صناعی یہ کی تھی کہ کاغذ پر اس انداز میں مسالے لپیٹے تھے کہ جب وہ گولی پھٹتی تھی۔ تو مختلف شکلوں کا ظہور ہوتا تھا، شرط پانی کا لگنا تھا ———

شادی بیاہ میں آتشبازی چھوڑی جاتی ہے۔ ایک چکر سا ہوتا ہے۔ اس میں مسالہ اس انداز اور کاریگری سے لپیٹا جاتا ہے کہ جب آگ لگا کر اسے چھوڑا جاتا ہے تو اس کے شراروں سے ایسا سماں بندھتا ہے کہ دیکھنے والوں کو گھوڑا اور اس پر سوار نظر آتا ہے، یا باغ کا نظارہ پیشِ نظر ہو جاتا ہے۔ لوگ حیران ہوتے اور خوب داد دیتے ہیں کہ کیا صناعی اور کاریگری ہے، اور مسالہ کو کس انداز سے لپیٹا ہے کہ کبھی گھوڑا نظر آتا ہے، کبھی بگلا اور کبھی کوئی پھول۔ یہ ایک عجیب صناعی ہے۔

. اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی آیات میں یہ صناعی رکھی ہے کہ وہ جب تک عالمِ آب و گِل میں موجود ہیں خزانۂ علم و عرفان ہے، پڑھنے پڑھانے کی چیز ہے، اور جب ان کو آخرت کا پانی لگے گا تو یہی حروف والفاظ گل و گلزار میں تبدیل ہو جائیں گے۔ دنیا میں جو الفاظ اپنے تلاوت کرنے والوں کے لئے سرمایۂ سکون و راحت تھے، اور انہیں علم و عرفان کی دنیا کی سیر کراتے تھے۔ وہی الفاظ اب ان کے لیے جنت نگاہ باغ و بہار اور لعل و جواہر کی صُورت میں ظاہر ہو کر آخرت کی زندگی پر بہار اور گہوارۂ شادمانی و مسرت بنا دیں گے۔ انہیں میں سے نہریں پھوٹیں گی۔ یہی حروف

حور و قصور کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان حروف کے نقطے ہی وہاں لعل و جواہر، موتی وغیرہ کی شکل اختیار کر لیں۔ یہاں ان کی شکل آیات کی ہے، وہاں باغ و بہار میں تبدیل ہو جائیں اور نعمتوں کے روپ میں ڈھل جائیں ——

میں کہا کرتا ہوں کہ دوسری قومیں جو اپنی کتابوں اور رسالوں پر ایمان لا کر قیامت کے بعد جس جنت میں داخلہ کی امید رکھتی ہیں، وہ جنت تو مسلمان اپنے دلوں میں یہیں دنیا میں سمیٹے بیٹھے ہیں۔ وہ قیامت کا انتظار کرنے کے بجائے آج ایمان لا کر یہ جنت کیوں نہ حاصل کر لیں۔

—— جس مسلمان نے پورا قرآن حفظ کر لیا، اس نے گویا پوری جنت اپنے قلب میں سمیٹ لی۔ جب عالم آخرت میں حرفوں اور لفظوں میں سمٹی ہوئی یہ جنت کھلے گی اور پھیلے گی۔ تو وہ دیکھے گا کہ یہ تو قرآن حکیم تھا، جو اب جنت بن گیا۔ اس دنیا میں مومن اپنے اندر جنت لئے بیٹھا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی اصل شکل سامنے نہیں ہے، اس لئے اسے پتہ نہیں کہ کتنی عظیم چیز وہ اپنے اندر لئے بیٹھا ہے۔ جب آیتوں کی حقیقت کھلے گی، اور وہ اپنی اصل شکل بدل کر سامنے باغ و بہار بن کر نظر آئیں گی، تو اس نعمت کا اندازہ ہو سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مردِ مومن اپنی ذات میں جنت ہے۔ قیامت میں اس کو جو چیز جنت کے نام سے ملنے والی ہے، وہ یہیں قرآنی الفاظ کی شکل میں اس کو عنایت کر دی گئی ہے۔ اب جو بھی یہاں قرآن پڑھ رہا ہے، وہ گویا جنت سمیٹ کر اپنے اندر ذخیرہ کر رہا ہے، وہی جنت جب کھلے گی، تو اسے پتہ چلے گا کہ یہ تو مجھے دنیا ہی میں مرحمت فرما دی گئی تھی۔

بہر حال قرآن حکیم حق تعالےٰ کے باطن سے وابستہ ہونے کا ذریعہ بھی ہے۔ اجر و ثواب کے حصول کا باعث بھی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ کے بدلے دس دس نیکیاں نامۂ اعمال میں ذخیرہ ہو رہی ہیں۔ اور یہی قرآن جنت کے محلات و قصور، گل و گلستان بھی ہیں ——

غرض قرآن شریف کی عجیب شان ہے، اسے پڑھو تو اس سے بہتر وظیفہ

نہیں۔ اس کا علم سیکھو تو اس سے بڑھ کر کوئی علم نہیں۔ اسے دستورِ زندگی بناؤ تو اس سے بڑھ کر کوئی قانون نہیں۔ اگر اس کے حقائق کھولو تو اس سے بہتر حکمتیں نہیں، اگر اس کی کیفیات اپنے اوپر طاری کر لو تو اس سے بڑھ کر سکونِ قلب کوئی نہیں۔ نعمتوں کا جو تصور بھی کوئی قائم کرے وہ سب کی سب اس کے اندر جمع ہیں، جو یہاں علمی شکل میں ہیں۔ عالمِ آخرت میں باغ و بہار کی شکل میں آجائیں گی۔ اور یوں معلوم ہو گا کہ قرآن کریم ایک عظیم الشان اور حد نظر تک وسیع باغ ہے۔ جس میں ہزاروں لاکھوں پھول کھلے ہوئے ہیں۔ اور ہمہ اقسام خوشبوئیں موجود ہیں۔

تورات اور میدانِ حشر

چنانچہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا کہ میدانِ حشر میں جب اقوامِ عالم جمع ہو جائیں گی، تو اللہ تعالےٰ لوحِ محفوظ سے پوچھیں گے کہ وہ کتاب "تورات" کہاں ہے جو ہم نے تیرے اندر رکھی تھی؟ وہ عرض کرے گی کہ وہ تو جبریل علیہ السلام لے گئے تھے۔ جبریل علیہ السلام سے سوال ہو گا، لوحِ محفوظ سے تم تورات لائے تھے؟ وہ عرض کریں گے، جی ہاں لایا تھا۔

پھر سوال ہو گا، اسے کہاں لے گئے؟ وہ کہیں گے "تورات" کو میں نے موسیٰ علیہ السلام کے قلب پر نازل کیا۔ موسیٰ علیہ السلام سے سوال ہو گا کہ جبریلؑ سے تم نے تورات سنی ہے؟ وہ عرض کریں گے جی ہاں" تورات سنی۔ اس کے معنی سمجھے۔ اللہ تعالےٰ فرمائیں گے، پھر آپؑ نے کیا کیا؟ موسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے۔ میں نے وہ تورات اپنی امت کو پہنچا دی ــــــ حق تعالےٰ شانہٗ کا ارشاد ہو گا۔ وہ "تورات" اب اپنی امت کو سنا کر دکھاؤ۔ آپؑ پوری تورات وہاں تلاوت فرمائیں گے۔ دنیا میں تورات کے الفاظ پڑھے اور سنائے گئے، اس کے معنی سمجھائے گئے۔ اور آج کی تلاوت نے الفاظ و معانی میں پوشیدہ حقائق مجسم شکل میں سامنے کر دیئے، جس سے

معلوم ہوا وہ ایک عظیم الشان باغ ہے۔ اور اس سے قلب پر عجیب و غریب کیفیات طاری ہو رہی ہیں۔ حیرت انگیز انکشافات ہو رہے ہیں۔ تو امتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے لوگ کہیں گے یہ تورات تو ہم نے آج تک نہ دیکھی نہ سنی۔ ہم وہاں الفاظ و معانی کی افہام و تفہیم میں الجھے رہے۔ یہ حقیقت کہ تورات کیا ہے، آج ہم پر کھلی! پہلے یہ حقیقت ہمارے سامنے کبھی نہیں آئی۔

قرآنِ حکیم ـــــــ اور میدانِ حشر

اسی طرح نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوگا کہ قرآن آپ تک پہنچا؟ تو آپ نے اس کا کیا کیا؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم فرمائیں گے "جی ہاں" قرآن مجھ تک پہنچا اور اسے میں نے اپنی امت کو تلاوت و تعلیم کے ذریعہ پہنچایا۔ ارشادِ ربانی ہوگا۔ اب یہاں بھی اس کی تلاوت کیجئے۔ (تاکہ اقوام عالم کے سامنے قرآنی الفاظ و معانی کی حقیقتیں، اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہو جائیں اور سب دیکھ لیں کہ قرآن کریم نے کس طرح پورے عالم کا احاطہ کیا ہوا تھا)

حدیث شریف میں آتا ہے۔ تب حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے منبر بچھایا جائے گا۔ آپ اس پر تشریف فرما ہو کر قرآن کریم کی اول سے آخر تک تلاوت فرمائیں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم تک کے، جن لوگوں کو قرآن نہیں پہنچا! حسرت و یاس .... کہیں گے۔ کاش دنیا میں ہم کو یہ کتاب ملی ہوتی۔ یہ تو بہت ہی عجیب و غریب کتاب ہے۔ اس کے اندر عجیب خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ تو دنیا میں الفاظ قرآنی کی تلاوت کرنے، اس کے معانی کو سمجھنے سے دل پر جو روحانی کیفیات و اثرات طاری ہوتے تھے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی آج کی تلاوت سے سب مجسم شکل میں آجائیں گے، اور معلوم ہوگا کہ قرآن تو اتنا بڑا اور عظیم الشان باغ ہے، جس نے پورے عالم اور کائنات کا

احاطہ کر رکھا ہے ۔ اور اس میں سدا بہار پھولوں اور رنگ برنگ بوٹوں کی دنیا آباد ہے، جن کی مہک بے مثال ہے ۔

اس حقیقت کو عیاں دیکھ کر خود صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین حیران ہوں گے کہ قرآنِ حکیم کا یہ رُخ تو ہم نے بھی نہیں دیکھا تھا ۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے تلاوتِ قرآن کی کیفیات سے صحابہ کرام رضؓ کے قلوب پُر رہتے تھے، لیکن ان کیفیات کو آج جس شکل میں وہ مجسم دیکھ رہے ہیں، اس سے دنیا میں وہ واقف نہ ہو سکے تھے ۔

جلوہ حق کی موجودگی کے ساتھ، تمام انبیاء و ملائکہ علیہم السلام اور تمام امتوں کے اجتماع میں جب قرآنی حقائق مجسم ہو کر سامنے آئیں گے، تو حیرانگی کا عجیب عالم ہوگا ۔ سارے لوگ گنگ ہوں گے ۔ جن کو یہ نعمت نہیں ملی، ان کو حسرت ہوگی ۔ اور جن کو یہ نعمت ملی، ان کو افسوس ہوگا کہ ہم کتنی بڑی نعمت سے بے خبر رہے ۔ اور اسکو پس پشت ڈال کر کتنا بڑا خسارہ اور محرومیاں سمیٹتے رہے ۔

تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کو بطور وِرد پڑھو کہ اس سے بہتر کوئی وظیفہ نہیں ۔ اس کا علم سیکھو کہ اس سے بہتر کوئی علم نہیں ۔ حکمتوں کی تلاش ہو تو اس میں غور و فکر کرو، کہ حکمتوں سے بھرا ہوا اس جیسا کوئی اور کلام نہیں ۔ معارف کی جستجو ہو، تو قرآن سے بہتر معارف کا ذخیرہ کہیں نہیں ۔ انہی چیزوں کا یہ لفظی و معنوی مجموعہ جب اپنی حقیقی صورت میں مجسم ہوگا، تو وہی جنت کہلائے گا ۔ یہ وہی جنت ہوگی جسے قاریٔ قرآن نے اپنے دل میں سمیٹ کر محفوظ کیا ہوا ہے ۔ یہی جنت بالآخر اس کا مسکن و ماویٰ بنے گی ـــــ جب وہ اپنی جنت کو دیکھے گا، اور پہچانے گا، تو خود کہہ اٹھے گا کہ یہ جنت تو وہی جنت ہے، جو میرے نہاں خانۂ قلب میں پوشیدہ تھی ۔ البتہ دنیا میں وہ اس کے حقیقی ذائقوں اور لذتوں سے نا آشنا رہا تھا ۔ اب اس کے ذائقے بھی اس کی دسترس میں آگئے ہیں ۔ اس کے انوار بھی اس پر ضوفشاں ہیں، اور اس کی خوشبوئیں بھی اس کو سرشار بنائے ہوئے ہیں، غرض قرآن اور اس کے متعلقات

ہر حال و ہر آن خیر مطلق ہیں۔ دنیا میں بھی خیر مطلق، آخرت میں بھی خیرِ مطلق اس کا پڑھنا بھی خیرِ مطلق اور اس کا پڑھانا بھی خیرِ مطلق، یہی بات اس فرمانِ نبویؐ میں ارشاد فرمائی گئی ہے۔ خیرکم من تعلم القراٰن و علمہٗ۔ (قرآن حکیم کا پڑھنا پڑھانا جس کا وظیفہ ہو وہ تم میں بہترین آدمی ہے)

اہلِ قرآن کے احوال

اب چند بزرگوں کے حالات سناتا ہوں، جن کو ہم نے دیکھا تو نہیں۔ البتہ اپنے بزرگوں سے ان کے متعلق سنا ہے! ۔ ہمارے استاذ محترم مولٰنا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان "اویسیہ خاندان" کہلاتا تھا۔ آپؒ کے خاندان میں کوئی نہ کوئی مادر زاد ولی ضرور پیدا ہوتا تھا، بلا مجاہدے اور ریاضت من جانب اللہ وہبی طور پر ولایت عنایت ہوتی تھی۔ (خاندانِ اویسیہ میں ولایت عموماً وہبی طور پر مرحمت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ خاندانِ اُویسیہ کہلاتا تھا۔ ورنہ نسباً یہ خاندان سادات کا تھا)۔

میاں صاحبؒ کے نانا شاہ محمد حسین صاحبؒ ایک نہایت پارسا اور نیک صفت انسان تھے۔ ان کے متعلق حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ:۔

"یہ وہ شخصیت ہیں کہ ان کے ذہن میں گناہِ صغیرہ کا خیال تک کبھی نہیں آیا۔ یہ جانتے ہی نہیں کہ گناہ کیا ہوتا ہے"۔

——— تو انہی شاہ صاحب موصوف نے تعلیمِ قرآن کا مشغلہ اختیار کر لیا تھا۔ دن رات بچوں کو قرآن پاک پڑھاتے رہتے۔ آپ پر استغراقی کیفیت کا غلبہ تھا۔ اولاد کے نام بھی بھول جاتے۔ ان کے ایک داماد تھے، جن کا نام "اللہ بندہ" تھا۔ وہ آتے تو فوراً نام پوچھتے، وہ کہتے 'اللہ بندہ' فرماتے صحیح نام بتاؤ۔ وہ پھر کہتے حضرت میں اللہ بندہ ہوں۔ فرماتے بھئی! اللہ بندے تو ہم بھی ہیں۔ صحیح نام بتاؤ۔

آخر میں کہتے۔ حضرت میں آپ کا داماد ہوں۔ تب پہچانتے۔ فرماتے۔ اچھا بیٹھ جاؤ۔ بات چیت کر کے چلے جاتے۔ پھر تھوڑی دیر بعد آتے تو وہی سوال و جواب ہوتے۔ اللہ سے ایسی لو لگی ہوئی تھی، اور اس کا اتنا غلبہ تھا کہ "دنیا و ما فیھا" سے بے خبر رہتے۔ اولاد تک کے نام یاد نہ رہتے، اور یہ کیفیات پیدائشی عطیہ تھیں۔ (کسی مجاہدہ و ریاضت کے نتیجہ میں نہ تھیں)۔

اس زمانہ میں گھڑی گھنٹے تو موجود نہیں تھے۔ نشانیوں سے وقت پہچانا جاتا، اور پہروں میں تقسیم ہوتا تھا۔ ایک جگہ کوئی نشان لگا کر یا کوئی چیز رکھ کر کہہ دیتے کہ دھوپ یہاں تک پہنچ جائے، تو چھٹی کا وقت ہو جائے گا۔ بس دھوپ وہاں پہنچی، اور چھٹی ہو گئی ــــ بچے ہمیشہ کے شرارتی، یہاں کبھی شرارت کر کے نشان آگے گاڑ دیتے، تاکہ دھوپ وہاں جلد پہنچ جائے۔ وہاں دھوپ پہنچی، اور شور مچا، چھٹی کا وقت ہو گیا۔ آپ فرماتے، اچھا بھئی چھٹی کرو۔

لوگوں نے آپ کو بتایا، میاں جی! لڑکے شرارت کرتے، اور جھوٹ بول کر وقت سے پہلے چھٹی کرا لیتے ہیں۔ فرماتے بھائی! مسلمان بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ چھٹی کا وقت ہو گیا ہو گا۔ جاؤ بچو چھٹی کرو۔ یہ آپؒ کا پختہ عقیدہ و خیال تھا کہ مسلمان جھوٹ بول ہی نہیں سکتا ــــ عربی کا مقولہ ہے المرأ یقیس علیٰ نفسہٖ۔ ہر آدمی دوسرے کو بھی اپنے ہی پر قیاس کرتا ہے۔ ان کے دل میں جھوٹ کا کبھی وسوسہ بھی نہیں آتا۔ اس لئے دوسروں کے متعلق بھی ان کا یہ خیال تھا، کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس لئے جو لوگ ان سے واقف تھے، وہ خاموش رہتے تھے۔

ہمارے زمانے میں حافظ محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ تھے۔ کسی نے ان کی زمین کے متعلق جھوٹا دعوےٰ کر دیا کہ یہ میری زمین ہے۔ دعوےٰ کر کے میاں جی کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت جی! میں نے زمین کی بازیابی کا دعوےٰ کیا ہے، دعا کیجئے زمین مجھے مل جائے۔ فرمایا، اچھا بھائی دعا کرتا ہوں، زمین تمہیں مل جائے گی ــــ ادھر حافظ محمد احسن صاحبؒ کو اطلاع ہوئی کہ کسی نے میری زمین

پر جھوٹا دعوٰی کر دیا ہے۔ کیونکہ در اصل زمین ان کی تھی۔ چنانچہ وہ بھی میاں صاحبؒ کی خدمت میں آئے، اور کہا، حضرت! مَیں بھی تو مسلمان ہوں۔ زمین میری ہے۔ فرمایا اچھا تم اپیل کر دینا، زمین تمہیں واپس مل جائے گی ——

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پہلے مرحلہ میں اس شخص کے حق میں دعوٰے فیصل ہوا —— انھوں نے اپیل کی۔ اپیل میں یہ جیت گئے۔ ان کا دل یہ قبول ہی نہیں کرتا تھا کہ مسلمان جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

ایک مرتبہ میاں جیؒ کی آنکھیں دکھنے لگیں۔ دوا دارو کچھ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھوں میں زخم پڑ گئے۔ کسی نے کہہ دیا۔ میاں جی! اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ میاں جی کو یقین آگیا، مکان بند کر کے بیٹھ رہے۔ جو آیا کہہ دیا کہ مَیں نابینا ہو گیا ہوں۔ فلاں صاحب آئے تھے وہ کہہ گئے کہ اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ اب آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں، جو آ رہا ہے اس سے کہہ دیتے، کہ فلاں صاحب نے کہہ دیا تھا کہ بینائی جاتی رہتی ہے۔ میں نابینا ہو گیا ہوں — مولٰنا محمد یعقوب صاحبؒ کو اس کی اطلاع ہوئی تو مضطرب و پریشان ہوئے۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کا پختہ خیال ہے کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو نابینا کہہ رہے ہیں۔ مولاناؒ مزاج پرسی کو پہنچے۔ احوال دریافت کیا۔ میاں جیؒ نے فرمایا۔ اجی میری تو بینائی جاتی رہی۔ فلاں صاحب آئے تھے کہہ رہے تھے، اس مرض میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ اب وہ جھوٹ تھوڑا ہی بول رہے تھے۔

مولٰناؒ بہت زیرک و ذہین تھے۔ بات سمجھ گئے، کہنے لگے حضرت جی! مجھے ایسا پانی پڑھ کر دینا آتا ہے، جس کا چھینٹا آنکھ پر پڑتے ہی بینائی واپس آجاتی ہے۔ چنانچہ آپؒ نے پانی پر کچھ پڑھ کر دم کیا، اور چھینٹا مار کر کہا، حضرت جی! آنکھیں کھول لیے۔ بینائی واپس آگئی — بینائی گئی کہاں تھی، وہ تو موجود ہی تھی — آنکھیں کھول کر فرمایا۔ اللہ تمہیں جزائے خیر دے۔ میری بینائی واپس آگئی۔

ادھر لطیفہ یہ ہوا کہ دو کر دن مولانا کی مسجد کے سامنے نابیناؤں کا مجمع

اکٹھا ہوگیا کہ مولانا کو ایسا پانی دم کرنا آتا ہے جس سے بینائی واپس آجاتی ہے۔ لہٰذا وہ بھی علاج کے لئے آگئے۔ مولانا نے ان سے کہا، بھائی یہ ترکیب تو میں نے میاں جیؒ کو سمجھانے کے لئے کی تھی۔ میرے پاس کوئی پانی وانی نہیں۔

برکاتِ قرآنِ حکیم

قرآن حکیم کا شغل ایک مبارک شغل ہے۔ اللہ کی کتاب سے واسطہ رہے گا، تو اس کے ذریعہ اللہ سے بھی واسطہ رہے گا۔ قرآن نازل ہی اس لئے کیا گیا کہ اس کے ذریعہ لوگ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس راستہ سے کروڑوں بندگانِ خدا، خدا تک پہنچ بھی گئے۔ کسی کو نجات عطاء ہوئی، کوئی اس کے ذریعہ درجات پر فائز ہوا، جس کا قرآن مجید سے جتنا گہرا واسطہ اور ربط رہا۔ اسی قدر بلندئ درجات حاصل ہوتی رہیں۔

غرض کروڑوں انسان قرآن کریم کی بدولت فائز المرام ہو چکے ہیں، اور کروڑوں اور ہوں گے۔ (اور تا قیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اِن شاء اللہ)۔

حدیث شریف میں ہے کہ قرآن کریم، جب اللہ تعالیٰ کے سامنے مجسّم شکل میں حاضر ہوگا، تو اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے، آج میں تیری وجہ سے کتنوں کو بلند درجات پر فائز کرتا ہوں، اور کتنوں کو پستی و گہرائی میں ڈالتا ہوں۔ جو تجھ پر عمل کرتے تھے، تیرے علم میں مشغول تھے، ان کے لئے رفع مراتب اور بلندئ درجات اور بہترین اجرو جزا ہے۔ اور جو تجھ سے اعراض کرتے، اور بھاگتے بھاگتے پھرتے تھے۔ نہ انہوں نے تجھے پڑھا، نہ تیرے پیغامات پر عمل کیا، وہ آج پست و ذلیل ہوں گے۔ اس گریز کی سزا پائیں گے، اور ذلت و رسوائی میں مبتلا ہوں گے۔

یضع بها اقوام و یرفع بها اقوام — (اللہ تعالیٰ اس قرآن حکیم کے ذریعہ کچھ اقوام کو بلند اور کچھ کو پست کرتا ہے)۔

اس سارے بیان سے قرآن کے خیرِ مطلق ہونے کا بخوبی پتہ چل گیا —— اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ پڑھانے والا اور پڑھنے والا تو قرآن سے براہِ راست رابطہ رکھنے کی بنا پر خیر ہے ہی۔ اس کی اشاعت میں کسی درجہ کی مدد کرنے والا بھی اس خیر میں شامل اور برابر کا شریک ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر کلمۂ "خیر" کہنے والا بھی اس خیر میں داخل ہوگیا۔ غرض قرآن سے کسی بھی طور پر وابستگی خیر سے محروم نہیں رہنے دیتی۔ اس لئے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ خیر تو ساری قرآن پڑھنے، پڑھانے والا سمیٹ کرلے گیا۔ باقیوں کے حصہ میں کیا رہا۔ ایسا نہیں ہے۔ پڑھنے پڑھانے والے، جانی و مالی مدد کرنے والے، پڑھنے پڑھانے کے ذرائع قائم کرنے والے، ان کی خبر گیری کرنے والے سب اسی خیر میں شامل و شریک ہیں۔ کوئی خیر سے محروم نہیں۔

حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی مجلس میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔ علم کی گفتگو ہوتی ہے، تو اس مجلس کو لاکھوں کروڑوں فرشتے گھیر لیتے ہیں۔ مجلس کے اختتام پر جب فرشتے اللہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں، تو ارشادِ ربانی ہوتا ہے کہاں گئے تھے ؟ —— اللہ تعالےٰ کا یہ سوال ناواقفی کا نہیں، کیونکہ ان کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔ بلکہ بطور حکمت ہوتا ہے —— ملائکہ علیہم السلام کہتے ہیں آپ کے بندوں کی ایک مجلس میں گئے تھے —— اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ اس مجلس میں میرے بندے کیا کر رہے تھے —— ؟ ..... وہ کہتے ہیں، آپ کے عذاب سے ڈر رہے تھے۔ آپ کی نعمتوں کے طالب تھے۔ جنت کے طالب اور عذابِ جہنم سے پناہ کے طالب تھے ——

اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں، کیا انہوں نے جنت دیکھ لی ہے، جو اس کے طالب تھے۔ اور کیا جہنم کا عذاب چکھ لیا ہے، جو اس سے پناہ مانگ رہے تھے ؟۔ فرشتے عرض کرتے ہیں۔ انہوں نے دیکھا تو کچھ بھی نہیں۔ آپ کے پیغمبر نے جو ان کو بتایا، اس پر ایمان لاکر اور یقین کر کے یہ خواہشیں کر رہے تھے۔

اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ فرشتو! تم کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ اس مجلس میں

جتنے افراد بھی شریک تھے، میں نے سب کی مغفرت کر دی، جو مانگتے تھے وہ دے دیا جس سے پناہ چاہتے تھے، اس سے ان کو بچا لیا۔ اس سے نجات دی —— شرکار مجلس کے لئے کتنی بڑی عجیب بشارت ہے۔

فرشتے عرض کرتے ہیں، کہ اے اللہ اس مجلس میں سارے ہی تیرا ذکر کرنے والے، تجھ سے انعام کی خواہش کرنے والے، تیرے عذاب سے بچنے کی دعار کرنے والے نہیں تھے۔ کئی تو مجمع دیکھ کر بطور تماشائی کناروں پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ اللہ تعالےٰ فرمائیں گے، وہ بھی اس مجلسِ خیر میں شریک قرار دیئے گئے۔ وہ بھی اس مغفرت میں داخل ہیں۔ شریکِ مجلس ایسے لوگ ہیں کہ جن کے آس پاس کھڑے ہونے والا بھی محروم نہیں رہتا۔

تو قرآن کریم کا پڑھنا پڑھانا خود سراپا خیر ہے ہی۔ اس مجلس کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے والا بھی ان شار اللہ اس خیر سے محروم نہ رہے گا۔ چاہے وہاں وہ تعلیم و تعلّم کی غرض سے نہ بھی آیا ہو۔ یہ اتنی وسیع رحمت ہے کہ آس پاس والے بھی اس کے احاطہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کتنے مُبارک ہیں وہ لوگ، جو قرآن کی تعلیم دینے، اور اس کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے میں شب و روز منہمک و مشغول ہیں۔ اور کتنے خوش بخت ہیں وہ طالب علم جو کلام اللہ پڑھنے اور سیکھنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ دونوں ہی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

مسرت کا موقع

قرآن کی تعلیم کی آغاز و افتتاح امرِ واقع یہ ہے کہ نہایت ہی خوشی اور مسرت کی بات ہے۔ یہ اتنی بڑی خوشی ہے کہ ہم جتنا بھی اس پر خوش ہوں، کم ہے — اس لئے کہ انسان کی خوشی کے دو ہی موقعے ہیں۔ ایک جب وہ کسی کام کی ابتدار یا افتتاح کرتا ہے۔ دوسرا جب وہ اس ابتدار کی انتہار کو پہنچتا ہے، اور حصولِ مقصد

ہی کامیاب ہوتا ہے ــــ آپ جب کسی بچہ کو مکتب میں بٹھلاتے ہیں، تو خوشیاں مناتے اور مٹھائی بانٹتے ہیں، کہ زندگی کے ایک بڑے اور اچھے مقصد کی ابتدا ہو رہی ہے۔ اور جب وہ بچہ عالم فاضل بن کر مقصد کی انتہا پر پہنچتا ہے تب بھی خوشیاں منائی جاتی ہیں، جلسے کئے جاتے ہیں، مٹھائی بانٹی جاتی ہے ــــ کوئی باغ لگاتا ہے، تو خوشی مناتا ہے، اور جب اس باغ میں پھل آتا ہے تو بھی خوشی مناتا ہے۔

خوشی کا دوسرا موقع

تو خوشی کے دو ہی موقعے ہیں ــــ ابتدا ر و انتہا ر ــــ بچہ جب پیدا ہوتا ہے، تو بڑے جشن منائے جاتے ہیں، دعوتیں ہوتی ہیں۔ جلسے کئے جاتے ہیں، اور جب وہ مرتا ہے، تو میرے نزدیک وہ بھی خوشی کا دن ہے، کہ اس نے اللہ تعالےٰ کی عنایت کی ہوئی زندگی، اسی کے بتائے ہوئے طریقہ پر گزاری، اور وہ اس امتحان میں کامیاب گزرا۔

ع چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

یہ مردِ مؤمن کی خوشی ہے کہ وہ اپنا ایمان سلامت رکھ سکا۔ تو مرنا، غم کی بات نہیں، خوشی کا موقع ہے ــــ

آپ کہہ سکتے ہیں کہ لوگ تو مغموم ہوتے ہیں، روتے ہیں، خوش تو نہیں ہوتے۔ ــــ میں کہتا ہوں کہ لوگ اس کے مرنے پر نہیں روتے۔ بلکہ اس کی جدائی پر، یا اپنے مفادات سے محرومی پر روتے ہیں۔ موت پر تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ تب ہی تو یہ کہتے ہیں کہ۔ "اے اللہ! فلاں جیسی موت تو ہمیں بھی نصیب کر" موت پر رنجیدہ ہوتے، تو اس پر روتے، اس کی تمنا نہ کرتے۔ معبود و محبوب سے ملنے پر بھی کوئی روتا ہے۔ موت تو ہمیں اللہ سے واصل کرتی ہے۔ یہ غمی کی چیز کب ہو سکتی ہے ــــ غرض بچہ کی پیدائش بھی خوشی کا موقع ہے، اور اس کا دنیا کا

چھوڑ جانے کا مرحلہ بھی خوشی کا وقت ہے۔

حدیث شریف میں موت کو تحفۂ مؤمن فرمایا گیا ہے، الموت تحفۃ المؤمن۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے لئے سب سے بڑا تحفہ موت ہے۔ تو کوئی تحفہ ملنے پر بھی روتا ہے؟ ۔ تحفہ پر تو اظہارِ مسرت و خوشی کیا جاتا ہے۔

موت تحفہ کس طرح ہے؟ ۔ اس کے بارے میں دوسری حدیث شریف میں یوں ارشاد ہے:۔

ان الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب۔
(او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام)

موت درمیانی پُل ہے، جو محب کو حبیب سے ملاتا ہے۔ جو وصلِ حبیب کا ذریعہ ہو، وہ باعثِ گریہ و ملال کیسے ہو سکتا ہے؟ اپنے محبوب سے ملاقات بھی ماتم یا غمی کی بات ہے؟ ۔ محبوب سے ملانے والا یہ ذریعہ تو محبت کرنے کی چیز ہے، تحفہ کی چیز ہے۔ اس لئے حقیقت میں اس پر خوش ہوتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ بڑی اچھی زندگی گزاری۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہو گیا۔ اشکباری اور غم تو اس کی جدائی کا کرتے ہیں کہ عزیز ہم سے چھن گیا۔ اس سے ہم جو فائدہ اٹھا رہے تھے، جو آرام پا رہے تھے، وہ منقطع ہو گیا، اس سے محروم ہو گئے۔ اپنے نفع کے لئے رونا تو خود غرضی کا رونا ہے۔ موت پر رونا نہیں ہے۔

بہر حال ولادت بھی خوشی کا موقع ہے، اور موت بھی خوشی کا مقام ۔۔ اسی لئے قرآنِ کریم کا آغاز بھی خوشی کی چیز ہے، اور جب اس سے فارغ ہو جائے، اس کا حافظ و عالم ہو جائے، وہ بھی خوشی منانے کا موقع ہے، البتہ فرق اتنا ہے کہ آغاز پر جو خوشی ملتی ہے وہ توقعات پر ملتی ہے۔ کیونکہ آغاز کے وقت یہ توقع باندھتے ہیں کہ بچہ پڑھے گا، لکھے گا، حافظ و عالم بنے گا ۔۔ تو آغاز کی خوشی توقع کی خوشی ہے، اور فراغت و انتہا کی خوشی کمال پر ہوتی ہے کہ ابتداء میں جو امید باندھی گئی تھی، وہ پوری ہو گئی ۔۔۔ مراد حاصل ہو گئی۔ بچے کی پیدائش کی خوشی بھی توقعات کی خوشی ہے کہ پلے گا، پڑھے گا، جوان ہو گا، عالم فاضل

بنے گا، صناع و کارگیر بنے گا، یہ سب توقعات ہی ہوتی ہیں۔ اور جب وہ اپنی زندگی حسب توقعات کامیاب گزار کر سلامتیٔ ایمان کے ساتھ موت کی سرحد پار کر جاتا ہے، تو بھی خوشی ہوتی ہے۔ گو زندگی بھر کا ساتھ چھوٹ جانے اور بچھڑ جانے کے غم سے آدمی اشکبار بھی ہوتا ہے اور یہ اشکباری اور رونا دھونا موت کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ موت تو اللہ تعالےٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اس لیے یہ تو خوشی کی چیز ہوئی۔

علامت ولایت

بلکہ خوشی کی چیز سے بھی بڑھ کر ولایت کی علامت ہے۔ کیونکہ دل میں موت کی محبت ہونا ولی ہونے کی علامت ہے۔ اسی لئے جب یہود نے یہ دعوےٰ کیا تھا کہ ہم تو اللہ تعالےٰ کے چہیتے (اولیاء اللہ) ہیں۔ تو قرآن کریم نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، اور دیگر لوگوں کی نسبت اللہ کے زیادہ چہیتے ہو، تو پھر موت کی تمنا کر کے دکھاؤ۔

قل یا ایھا الذین ھادوا ان زعمتم انکم اولیاء للہ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صٰدقین ـــ (جمعہ پ ۲۸)

معلوم ہوا موت کی تمنا کرنا ولایت کی علامت ہے ـــ اور ظاہر بات ہے کہ ولایت موجود ہوگی، تو موت کی تمنا میں (بوقت آزمائش) کوئی جھجک نہ ہوگی۔ حدیث شریف میں تو ایک دعاء کے طور پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد بھی ملتا ہے کہ: ـــ

اللھم حبب الموت الذی یعلم انی رسول اللہ۔

اے اللہ! جو شخص میری رسالت کو مانتا اور اس کا اقرار کرتا ہے۔ اس کے لئے موت کو محبوب بنا دے۔ (آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم)

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی دعاء میں موت کی محبت اور تمنا کا ارشاد ہے۔ اس سے دل میں طالب علمانہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں تو موت کی تمنا کرنے کی ممانعت

آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے لا یتمنین احدکم الموت (تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے) ـــــ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے انا نکرہ الموت کہ ہم موت کو ناپسند کرتے تھے۔ تو یہ کیا بات ہوئی کہ تمنا بھی فرما رہے ہیں، دعا بھی کر رہے ہیں، اور تمنا سے منع بھی فرما رہے ہیں۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ ممانعت اس بات کی ہے کہ دنیوی شدائد و مصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرو! کہ ایسا کرنا ممنوع ہے۔ ـــــ اور جس کے دل میں اللہ کی محبت' اور اس سے ملاقات کا ولولہ اور اشتیاق ہے، اس کے لئے تمنائے موت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان الگ الگ چیزوں کی وجہ سے مضامین احادیث بھی مختلف ہیں، ان میں باہم کوئی تضاد یا خلاف نہیں۔ غرض جس طرح ولادت خوشی کی چیز ہے، موت بھی خوشی کی چیز ہے۔

تقریب مسرت

تو جو بھی قرآن کریم کا آغاز کر رہے ہیں۔ ان کے لئے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوگی اور اس سے بڑھ کر اور کوئی تقریب کیا ہو سکتی ہے جو ہمارے بزرگوں کی تقریبات کا جو انداز تھا، اور کونسی تقریب ان کی نظروں میں اہم تھی، اس کا پتہ اس سے چل سکتا ہے کہ میرے جد محترم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً اپنی صاحبزادی کے نکاح کی تقریب اس طرح کی، کہ چپ چپاتے مسجد میں خود نکاح پڑھایا، اور گھر آکر لڑکے سے کہا یہ تمہاری دلہن ہے، اسے لے جاؤ، گھر والوں کو پتہ بھی نہیں تھا۔ سب حیران تھے ـــــ لیکن میرے والد محترم رح فرماتے ہیں کہ جب میں نے قرآن مجید حفظ کر لیا، تو بڑی دھوم دھام کی شاہانہ دعوت کی۔ جب سب لوگ کھا پی کر فارغ ہوئے، اور رخصت ہو گئے، تو تنہائی میں مجھ سے فرمایا۔ میاں احمد! تم حافظ بھی ہو گئے ... تمہاری عزت افزائی بھی ہو گئی، دعوت بھی ایسی دوبارہ نہ ہو گی۔ یہ سب کچھ میں نے تمہارے لئے کیا۔ لیکن یہ قرآن میں نے تم کو اپنے لئے پڑھایا ہے (تاکہ آخرت میں میرے کام آئے)

اس لئے والد محترمؒ کا یہ معمول تھا کہ دو پارے روزانہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے تلاوت فرماتے تھے۔

بہر حال قرآن کریم کا آغاز بھی مبارک اور انجام بھی مبارک، آج افتتاح ہے۔ اس تقریب سے بڑھ کر کوئی تقریب نہیں۔ نہ اس خوشی سے بڑھ کر کوئی خوشی ہے۔ تقریبات تو شادیوں اور پیدائشوں کی بھی ہوتی ہیں، مگر اصل تقریب افتتاح قرآن ہی کی ہے۔ جس کا افتتاح بھی مبارک، انجام بھی مبارک۔ ایسے موقع و تقریب کی مبارکباد دینا بھی مبارک ——— تو ہماری حاضری آپ کو مبارکباد دینے کے لئے ہوئی ہے۔ آپ حضرات بہترین کام کا افتتاح فرما رہے ہیں، حق تعالیٰ اس کا انجام، اس کی انتہا بھی بہترین فرمائے۔ جس طرح اس کا آغاز بہترین فرمایا ہے ———

دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اس کی برکات کا حصہ مقرر فرمائے، اور آخرت میں بھی ——— !

اللھم آنس وحشتنا فی قبورنا۔ اللھم ارحمنا بالقرآن العظیم۔ واجعلہ لنا اماما و نورا و ھدی و رحمۃ۔ اللھم ذکرنا منہ ما نسینا و علمنا منہ ما جھلنا۔ وارزقنا تلاوتہ آناء اللیل و آناء النھار۔ واجعلہ لنا حجۃ یا رب العٰلمین۔

اللھم اجعل القرآن رضاء قلبی و جلاء حزنی۔ فاغفر لنا ذنوبنا و اسرافنا فی امرنا۔ وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکٰفرین۔ اللھم وتوفنا مسلمین والحقنا بالصالحین۔ غیر خزایا ولا مفتونین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔ برحمتک یا ارحم الراحمین

رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم

حدیث میں فرمایا گیا انا رحمۃ مہداۃ۔ میں اللہ کی ایک رحمت ہوں۔ جو بطور ہدیہ کے بندوں کے پاس بھیجی گئی ہے اللہ کا ایک ہدیہ جو بندوں کو ملا، وہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے — تو اتنی بڑی نعمت دی گئی کہ جتنی عالم کی نعمتیں ہیں سب اسی کی طفیل مل رہی ہیں ......

از، حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

ترتیب

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔ من یھدہ اللہُ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہ۔ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ۔ ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ۔ ارسلہ اللہ الیٰ کافۃ للناس بشیرًا ونذیرًا۔ وداعیا الیہ باذنہٖ وسراجًا منیرًا۔ امابعد: ـــــــ فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین

(پ۱۷۔ ع۷)

صدق اللہ العلی العظیم

اقسامِ نعمت

بزرگانِ محترم!

اس دنیا میں حق تعالےٰ شانہٗ کی نعمتیں اس درجہ ہیں کہ ان کا شمار کرنا ناممکن اور محالات میں سے ہے۔ رحمتوں کی ایک بارش ہے۔ جیسے بارش کے قطرات کو

آپ گننا چاہیں تو ساری دنیا کے انسان بھی مل کر سعی کریں، کہ آسمان سے کتنے قطرے ٹپکے ہیں۔ تو یہ آپ کے قبضے میں نہیں ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اللہ کی رحمتوں کی بارش دنیا پر ہے۔ اگر کوئی انسان گننا چاہے، تو قبضۂ قدرت میں نہیں ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو شمار کر سکے۔ اسی لئے قرآن کریم نے دعویٰ فرمایا کہ :۔

وان تعدوا نعمۃ اللّٰہ لاتحصوھا......... اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو، تم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ گن نہیں سکتے ——— آسمان کے ستاروں کا گننا ممکن ہے۔ بارش کے قطروں کا گن لینا ممکن ہے۔ لیکن اللہ کی رحمتوں کا گن لینا، یہ ناممکن اور محالات میں سے ہے ——— لیکن جہاں تک دیکھا جائے، تو اصولی طور پر دو قسم کی نعمتیں ہیں۔ ان دو قسموں میں پھر کروڑوں اور اربوں نعمتیں ہیں، مگر قسمیں دو ہیں۔ ایک ظاہری نعمتیں ہیں۔ ایک باطنی نعمتیں ہیں۔ ایک نعمتیں وہ ہیں، جن کو ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، ہمارے بدن کو لگ سکتی ہیں۔ ایک نعمتیں وہ ہیں، جو آنکھ سے نظر نہیں آتیں۔ بدن سے بظاہر ان کی ٹکر بھی نہیں لگتی۔ لیکن عجیب نعمتیں ہیں، جن کو انسان اپنے ضمیر میں محفوظ کرتا ہے۔ نعمتوں کے درجے میں سورج بھی اللہ کی ایک نعمت ہے۔ اس سے جو روشنی چھن رہی ہے وہ اللہ کی نعمت ہے۔ وہ نہ ہو تو ہم کام کاج نہیں کر سکتے۔ اس سے جو گرمی برس رہی ہے، وہ اللہ کی نعمت ہے۔ وہ نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا ——— غذائیں انسان کو اللہ نے لاکھوں دیں۔ ترکیبیں بتلا دیں کہ مختلف انداز سے جوڑ توڑ کر کے انسان نئی نئی غذائیں نکالتا ہے۔ یہ ایک مستقل نعمت ہے۔ لباس مستقل نعمت ہے۔ گھر دیا گیا یہ مستقل نعمت ہے۔ غرض کھیتی باڑی، باغ، زمین، کھانا پینا وغیرہ یہ سب نعمتیں ہیں، اور ان میں بھی اتنی قسمیں ہیں کہ انسان گننے لگے، تو ان کا گننا ناممکن ہے۔ ہر وقت آدمی ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ پھل فروٹ ہے۔ یہ ایک نعمت کا دائرہ ہے، ہزاروں پھلوں کی قسمیں ہیں۔ غلات ہیں، تو ہزاروں قسم کے غلے ہیں۔ کہیں چنا، کہیں چاول اور گیہوں۔ غرض کھانے، پینے، رہنے، سہنے، اور استعمال کی بے شمار نعمتیں ہیں۔ اور یہ وہ

نعمتیں ہیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاتھوں اور بدن کو لگتی ہیں ان کا ہم احساس کرتے ہیں۔ ان کو ظاہری نعمتیں کہا جائے گا۔

ایک باطنی نعمتوں کی قسم ہے، جو دل محسوس کرتا ہے آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ جیسے علم اور معرفتِ خداوندی ہے۔ علم دل کے اندر بھر جانا یہ ایسی چیز تو نہیں کہ آدمی اسے پکڑ کر جیب میں رکھ لے۔ علم ظاہری چیز نہیں ہے، وہ بدن سے نہیں ٹکراتی۔ وہ دل سے دل میں آتی ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ نعمت ہے لیکن آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ محبتِ خداوندی ہے، یہ عظیم نعمت ہے۔ اپنے پروردگار سے محبت نہ ہو تو ایمان بھی نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن محبت کوئی آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں، وہ دل میں رکھنے کی چیز ہے۔ ایمان ایک مستقل نعمت ہے، لیکن ایمان آنکھوں سے نظر آنے کی چیز نہیں ہے۔ اسلام تو آنکھوں سے نظر آسکتا ہے۔ اس لئے کہ اسلام کے معنیٰ ظاہری عمل کے ہیں۔ نماز پڑھی، روزہ رکھا، حج کیا، زکوٰۃ دی۔ نماز پڑھنے والے کو دیکھ کر ہر ایک کہے گا کہ یہ نماز پڑھ رہا ہے۔ حج کرنے والے کو دیکھ کر کہے گا کہ حج کر رہا ہے۔ تو اسلام یہ ظاہری نعمت ہے، جو بدن پر افعال کی صورت میں آتی ہے۔ لیکن ایمان دل میں چھپا ہوا رہتا ہے، اسے آدمی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ مگر ہر دل جانتا ہے کہ اس میں ایمان ہے۔ تو ایمان بھی ایک نعمت، محبتِ خداوندی بھی ایک نعمت ——— جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے محبت یہ عظیم نعمت ہے۔ ایمان کی بنیاد ہے۔ اگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات سے محبت نہ ہو، ایمان ہی نصیب نہیں ہو سکتا۔

امتحانِ محبت نعمت میں نہیں، مصیبت میں ہوتا ہے

اسی واسطے حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

لا یؤمن احدکم حتّٰی اکون   تم اس وقت تک مومن نہیں بن سکتے جب تک

احب الیہ من ولدہ و والدہ والناس اجمعین۔ میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ نہ اتنی محبت اپنی اولاد اور ماں باپ سے ہو، نہ دنیا کے کسی سامان سے ہو ——— جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہیں ہوگی۔ آدمی مومن نہیں بنے گا ——— اس محبت کا ظہور کب ہوتا ہے؟ جب خُدا اور رسولؐ کی محبت کا دوسری محبتوں سے مقابلہ پڑے۔ آدمی سو رہا ہے، اُسے محبت اِس سے ہے کہ میٹھی نیند آرہی ہے نہ اُٹھوں۔ مسجد میں اذان ہوتی ہے کہ آؤ مسجد میں ——— اس وقت امتحان ہوگا کہ نفس سے زیادہ محبت ہے یا خُدا سے زیادہ محبت ہے۔ اگر لحاف کو اتار پھینکا، گرم ٹھنڈے کی پرواہ نہ کی، وضو کیا، مسجد میں حاضر ہوا۔ تو اپنے نفس کو چھوڑ دیا۔ اپنے خُدا کو اختیار کیا۔ گویا یہ امتحان کا موقع ہوتا ہے ——— اللہ کے راستہ میں جانا ہے، اولاد کی محبت چاہتی ہے کہ نہ جاؤں چھوڑ کے۔ خُدا اور رسُولؐ کی محبت چاہتی ہے کہ چلا جاؤں۔ اگر چلا گیا تو محبت میں کامیاب ہے۔ اللہ و رسول کی محبت اولاد کی محبت پر غالب آگئی ———

جیسے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ (زادھا اللہ شرفاً و کرامۃً) کی طرف ہجرت فرمائی ہے۔ تو حضرات صحابہؓ کے گھر بار، بال بچے مکہ ہی میں تھے۔ جائیدادیں مکہ ہی میں تھیں۔ عزیز و اقربا، مکہ میں تھے۔ سب کو چھوڑ چھاڑ کر کے اللہ کے رسولؐ کے ساتھ چل دیئے۔ نہ جائیداد کی پرواہ کی نہ اولاد کی نہ بنیاد کی۔ تو یہ کہا جائے گا کہ محبت میں کامیاب ہو گئے۔ امتحان میں پاس ہو گئے۔ جب خُدا اور رسُولؐ کی محبت کا اولاد و بنیاد کی محبت سے مقابلہ پڑا، انہوں نے اولاد و بنیاد کو چھوڑ دیا۔ اللہ و رسولؐ کا راستہ اختیار کیا۔ یہ مطلب ہے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا۔ کہ جب میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ نہ اتنی اولاد سے ہو نہ ماں باپ سے ہو، نہ دنیا کی کسی چیز سے ہو، اس وقت تک مومن نہیں بن سکتا ——— تو وہ محبت ہے جو مقابلہ کے وقت غالب آجائے۔ یوں تو ہر شخص کہتا ہے کہ مجھے بھی اللہ سے محبت ہے۔ مجھے اللہ کے رسولؐ سے محبت ہے۔ لیکن جب دنیا کی محبت کا مقابلہ

اللہ کی محبت سے پڑ جائے ، اُس وقت کہے کہ ہاں مجھے محبت ہے۔ اس وقت کہا جائے گا کہ ہاں واقعی محبت والا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا - یا رسولَ اللہ! مجھے آپؐ سے محبت ہے۔ فرمایا۔ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو؟ عرض کیا یا رسول اللہ! آپؐ سے مجھے محبت ہے۔ فرمایا۔ دیکھو بہت بڑا دعوٰے کر رہے ہو، سمجھ کے کہو کیا بات ہے؟ عرض کیا۔ آپؐ سے محبت ہے۔ فرمایا اگر محبت ہے؟ تو تیار ہو جاؤ فقر و فاقہ کے لئے، تنگیاں اٹھانے اور مصیبتیں جھیلنے کے لئے - یعنی ان تمام مواقع میں بھی محبت باقی رہی تب یہ دعوٰے سچا ہو گا کہ واقعی اللہ و رسولؐ سے محبت ہے۔ عیش و آرام کے اندر ہر شخص کہتا ہے کہ یا اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے - آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ۔ لیکن سب کچھ چھن جائے پھر بھی کہے - آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ - تب کہا جائے گا سچا بندہ یہی ہے۔ نعمتوں میں رہ کر بندگی کا اعلان کرنا، یہ آسان ہے۔ مصیبت میں رہ کر محبت اور بندگی کا اعلان کرنا یہ مشکل ہے ، اور یہی آزمائش کا وقت بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی شاعر نے کہا تھا کہ ؎

ولا اندر جہاں یاراں سہ قسم اند زبانی اند و نانی اند و جانی

اے دل زمانے میں دوستوں کی تین قسم ہیں —— یعنی آدمی جب دوستی کا دعوٰے کرتا ہے تو اسے پرکھا بھی جاتا ہے کہ دوستی میں سچا بھی ہے یا نہیں - تو شاعر نے کہا دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک زبانی ، جو زبانی جمع خرچ کرتے ہیں، کہ ہم آپ کے دوست ہیں - ہم آپ کے خیر خواہ وہی خواہ ہیں —— ایک نانی ہیں، روٹی کے دوست ہیں - یعنی جب تک دستر خوان پر چکنا کھانا مِل رہا ہے۔ ہم آپ کے دوست ہیں - اور اگر دستر خوان اُٹھ گیا، تو کہاں کی دوستی - کہاں کے تم کہاں کے ہم؟ بس ختم ہو گئی ساری دوستی —— اور ایک دوست وہ ہیں جو جگری دوست ہیں۔ کہ دوست راحت میں ہو تب بھی ساتھ - مصیبت میں دوست ہو تو کہیں گے پہلے ہم مصیبت جھیلیں گے ، بعد میں تمہارے اوپر آئے گی یہ جانی دوست کہلاتا ہے۔

تو ایک زبانی جمع خرچ ، ایک روٹی کی دوستی ، ایک جگر کی دوستی —— اس شاعر نے کہا ہے کہ تینوں کے تین ہی طریقے ہیں ۔ جو زبانی دوست ہیں ، ان کے بارے میں کہتا ہے کہ ؎

بنانی ناں بدہ از در بدر کن   تلطف کن بیاران زبانی [۱]

یہ جو روٹی کے دوست ہیں ۔ انہیں کچھ کھلا پلا دو ۔ اس کے بعد رخصت کرو ۔ ان کو دوست مت سمجھو ۔ وہ آئے تھے ، ان کو ٹکڑا مل گیا ۔ بس ٹھیک ہے —— اور جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم جناب کے دوست ہیں ، تم بھی زبان سے کہدو جناب کا بہت بہت شکریہ ! ہم بھی تمہارے دوست ہیں ۔ نہ حقیقی معنٰے میں وہ دوست ، نہ حقیقی معنٰے میں تم دوست ۔ وہ زبان کی بات ہے ، زبان سے وہ خوش کرنا چاہتے ہیں ، تم بھی زبان سے خوش کر دو ، مگر اعتماد مت کرو ، وہ دوست نہیں ہے ۔

وہ جیسے کسی شاعر کا واقعہ ہے ، وہ کسی امیر کے ہاں گئے تھے ۔ اس نے قصیدہ لکھا اور امیر کی بڑی تعریف کی کہ آپ ایسے اور ایسے ۔ اور شاعری میں آدمی سچ کم بولتا ہے ، جھوٹ زیادہ بولتا ہے ۔ شعر اچھا ہوتا ہی وہ ہے جس میں غلط بیانی زیادہ ہو ۔ اور جو سیدھی سیدھی بات کہدے اس سے کوئی بھی خوش نہیں ہوتا ۔ تو مبالغہ اور بہت حد سے گزر کر بات کرنا ، یہی ہوتا ہے —— شاعر حضرات خفا نہ ہوں کبھی کبھی میں بھی شعر کہہ لیتا ہوں ، مجھے بھی جھوٹ بولنا پڑتا ہے —— تو شعر کہتے ہی اسے ہیں جس میں آدمی سچ کم بولے ، جھوٹ زیادہ بولے ۔ تو اس شاعر نے قصیدہ لکھا ۔ اور اس میں ایران توران کی ہانکی ۔ آپ کی سلطنت تو ایسی ہے کہ آپ کے تخت کا پایہ آسمان پہ رکھا ہوا ہے ، اور آپ کے حسن و جمال کے آگے چاند بھی شرما رہا ہے ، اور ستارے بھی شرمندہ ہیں کہ ہمیں وہ حسن و جمال نصیب نہ ہوا ، جو ان

---

[۱] اس کا تیسرا مصرعہ اس تقریر میں آگے ارشاد نہیں فرمایا ۔ لیکن ایک اور تقریر سے نقل کیا جاتا ہے ؎ ولیکن یار جانی را بدست آر
مدار آتش بگیری تا توانی   (از مرتب غفرلہٗ)

نواب صاحب کو نصیب ہے۔ جب وہ قصیدہ پڑھ چکے۔ امیر نے کہا کہ پرسوں کو آنا۔ دو ہزار روپیہ تمہیں (انعام) دیں گے۔ یہ بہت خوش ہو کر واپس ہوئے، چونکہ بڑے آدمی نے وعدہ کیا تھا تو یقین بھی پورا تھا، آکے پانچ سو روپے قرض بھی لے لیا۔ اور بڑا عمدہ اچکن بھی بنوایا۔ گھر میں مرغا اور بکرا بھی پک رہا ہے۔ اس نے کہا پرسوں تو دو ہزار روپے مل ہی جائیں گے۔ پانچ سو کا قرض ادا کر دیں گے۔ دو ہزار سے بھی بچ جائے گا۔ بہت بڑی رقم ہوگی۔ تو خوش خوش گھر میں چاندنا، کھانا اور پینا ——— پرسوں وہ پہنچے، وہ امیر بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے جا کر سلام کیا، انہوں نے جواب بھی نہیں دیا۔ سرے سے گردن ہی نہیں اٹھائی۔ بہت دیر کھڑے رہے۔ آخر انہوں نے کچھ کھنکار کے کہا کہ حضور میں حاضر ہوں ——— انہوں نے کہا آپ کون ہیں؟ میں وہی شاعر ہوں جو آپ کی تعریف میں قصیدہ لکھ کے لایا تھا۔ اور آپ نے وعدہ کیا تھا کہ پرسوں آنا، دو ہزار دوں گا ——— کہنے لگے، تم بڑے بے وقوف آدمی ہو۔ بھئی! تم نے ہمیں لفظوں سے خوش کیا ہے معنیٰ کچھ نہیں تھے۔ ہم نے بھی لفظوں سے خوش کر دیا، معنیٰ کچھ نہیں تھے۔ نہ ان اشعار کے معنیٰ تھے نہ اس وعدہ کے معنیٰ تھے۔

تو حقیقت یہ ہے کہ جو زبانی جمع خرچ کے دوست ہیں، آپ بھی ان کے ساتھ زبانی جمع خرچ کر دیں۔ مگر اصل دوست وہ ہے جو سچا دوست ہو اور مصیبت کے وقت کام آئے ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست ——— در پریشان حالی و درماندگی

شیخ سعدیؒ نے کہا ہے کہ دوست وہ ہے جو پریشان حالی میں آکر دوست کا ہاتھ پکڑے ——— مگر ہاتھ پکڑنے کے وہ معنیٰ نہیں جیسے ایک صاحب نے پکڑے تھے، ان کے بھی ایک دوست تھے۔ انہیں اتفاق سے دشمنوں نے گھیر کر مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ انہوں نے جلدی سے جا کر ان کے ہاتھ پکڑ لئے۔ اب وہ غریب حملوں کو روکتا، دو مارتا۔ اب رکا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا۔ کم بخت! کیا کر رہا ہے؟ میں پٹ رہا ہوں۔ میرے ہاتھ چھوڑ دے۔ میں بھی تو مقابلہ کروں ———

انہوں نے کہا نہیں ۔ شیخ سعدیؒ نے کہا ہے کہ دوست وہ ہے جو مصیبت میں دوست کا ہاتھ پکڑے ۔ مَیں نے بھی آ کے ہاتھ پکڑ لئے ـــــ اب وہ غریب اچھی طرح سے پٹ رہا ہے ـــــ تو یہ معنےٰ ہاتھ پکڑنے کے نہیں ہیں ۔ ہاتھ پکڑنے کے معنے مدد کرنے کے ہیں ، کہ جب دوست پریشانی میں مبتلا ہو ، مدد کرے ـــــ

توجب دنیا کی دوستی میں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ آڑے وقت میں آدمی دعوے کو سچا کر کے دکھلائے کہ مَیں دوست ہوں ۔ دین کے معاملہ میں تو اور بھی زیادہ امتحان کی ضرورت ہے ۔ جب اللہ سے یوں کہے کہ مَیں آپ کا دوست ہوں تو اگر حق تعالےٰ کوئی مصیبت ڈالیں ۔ جب بھی یوں کہے کہ مَیں آپ کا نیازمند ، غلام اور بندہ ہوں ۔ تب کہا جائے گا کہ یہ سچا بندہ ہے ۔ ورنہ نعمتیں برس رہی ہیں ۔ اس میں ہے کہ مَیں بندہ ہوں ۔ یہ نہیں ۔ نعمت چھن جائے اور پھر کہے کہ ویسا ہی بندہ ہوں جیسا پہلے تھا ۔ جس حال میں آپ رکھیں مَیں خوش ہوں ۔ تب کہا جائے گا کہ یہ سچا بندہ ہے ۔

تو محبتِ خداوندی ایک بڑی نعمت ہے ۔ ایمان بھی نعمت ، علم اور معرفت بھی نعمت ۔ مگر یہ سب نعمتیں باطنی نعمتیں کہلاتی ہیں ، جن کا قلب سے تعلق ہے ۔ علم ، ایمان اور محبت روٹی کی طرح سے نہیں ہیں کہ رکابی میں رکھ کر پیش کر دیئے جائیں ۔ یہ قلبی دولت ہے ـــــ تو نعمت کی دو قسمیں ہو گئیں ۔ ایک مادی نعمت جو آنکھوں سے نظر آتی ہے ۔ ایک روحانی نعمت ہے جس کو آنکھ نہیں دیکھ سکتی مگر دل پہچانتا ہے کہ یہ نعمت ہے ۔

اعلیٰ ترین نعمت اور حاصلِ کائنات

ان تمام معنوی نعمتوں میں اعلیٰ ترین نعمت درحقیقت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے ، جس کو اللہ نے بطور نعمت کے دنیا میں بھیجا ، کہ آپؐ ہی کی ذات بابرکات کے

طفیل سے علم نصیب ہوا، ایمان نصیب ہوا۔ اور آپ ؐ ہی کی ذات بابرکات کی جوتیوں کے صدقے بندے کو اللہ کی محبت نصیب ہوئی۔ جس سے انسانوں نے اپنے خدا کو پہچانا، اپنی زندگیوں کے مقاصد کو جانا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا طفیل ہے۔ اگر دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے، یہ عالم ظاہر نہ کیا جاتا، جیسے ایک حدیث میں ہے۔ گو وہ حدیث ضعیف ہے، مگر معنے کے لحاظ سے وہ مقبول ہے —— ابن کثیر مکی ؒ نے البدایۃ والنہایۃ میں یہ حدیث نکالی ہے کہ حق تعالےٰ شانہٗ نے آدم علیہ السلام کو فرمایا۔ جب ان کو پیدا کیا گیا۔ اور ان میں روح ڈالی گئی، تو سب سے پہلے ان کی نگاہ عرش کے اوپر پڑی۔ دیکھا کہ عرش کے پائے کے اوپر لکھا ہوا ہے —— لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ —— آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ یہ محمد رسول اللہ کون ہیں ؟ - فرمایا۔ تیری اولاد میں سے ہیں - میرے آخری اور سب سے بڑے پیغمبر یہی ہیں۔ اور اے آدم ! اگر مجھے ان کا پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا۔ میں تجھے بھی پیدا نہ کرتا۔ تجھے اس لیے پیدا کیا ہے کہ ان کو دنیا کے اندر لانا ہے۔ تو ساری کائنات کا پھل درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

—— یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ ایک درخت لگائیں۔ دس برس اس کے اوپر محنت کریں۔ پانی دے رہے ہیں۔ دھوپ اور پالے سے بچا رہے ہیں۔ پھر جا کے وہ تیار ہوا۔ کیوں آپ نے یہ درخت لگایا ہے، کیوں اس پر اتنی محنت کی ہے۔ اس لئے کہ اس پر پھل آجائے۔ اگر اس نے پھل دے دیا۔ آپ کہیں گے محنت وصول ہو گئی۔ پھل نہ دیا تو کہیں گے محنت اکارت گئی۔ ضائع ہو گئی۔ —— تو درخت سے مقصود پھل ہوتا ہے۔ پھل آگیا تو سمجھو کہ درخت کے لگانے کا مقصود حاصل ہو گیا۔

یہ پوری کائنات ایک درخت ہے۔ اس کے مالک نے اس کو چھ ہزار برس میں بنایا۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا :- ان ربکم اللہ الذی خلق السمٰوات والارض فی ستۃ ایام ——

تیرے پروردگار نے اس زمین و آسمان کی کائنات کو چھ دن میں بنایا۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ وان یوما عند ربک کالف سنۃ مما تعدون۔ — اللہ کے ہاں کا ایک دن تمہارے ہاں کے ایک ہزار برس کے برابر ہے۔ تو چھ دن میں بنانے کا یہ مطلب نکلا کہ چھ ہزار سال میں یہ کائنات تدریجی طور پر تیار ہوئی ہے۔ اور دہ چھ دن ہفتے کے ہیں۔ یک شنبہ سے گویا کائنات شروع ہوئی ہے۔ اور جمعہ پر ختم ہوئی۔ ہفتہ کا دن فارغ ہے — آپ کے نزدیک یہ دن چوبیس گھنٹے کا ہے۔ لیکن اللہ کے ہاں یہ ایک ہزار سال کے برابر ہے —— آخری دن جمعہ کا تھا، اس کی آخری ساعت میں جو غروب آفتاب کے ساتھ ہی گھنٹہ ہے اس میں آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے۔ گویا چھ ہزار سال میں کائنات بنی۔ اور آخری جو مخلوق ہے وہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اس لئے کہ آدم ہی کے لئے یہ ساری کائنات بنائی گئی — زمین، آسمان، چاند ستارے سب اس لئے ہیں کہ آدم اس میں گزر بسر کر سکے۔ آسمان کی چھت ڈال دی۔ زمین کا فرش بچھا دیا۔ ستاروں کے قمقمے لٹکا دیئے۔ دریاؤں میں پانی رکھا۔ زمین میں اگانے کی صلاحیت رکھی۔ چوپائے اور جانور پیدا کئے جو انسان کے کام آئیں —— جب مہمان کو بلاتے ہیں تو پہلے سامان سب مرتب کر دیتے ہیں۔ مکان، بستر، پلنگ، ملازم، کھانے کا سامان وغیرہ، تاکہ مہمان کو تکلیف نہ ہو۔ تو آدم کو لانا تھا۔ اس لئے پہلے گھر بنایا اور ساری چیزیں تیار کیں۔ جب دنیا مکمل ہو گئی تو اخیر ساعت میں آدم علیہ السلام کو لائے۔ گویا آدم ساری کائنات کا پھل ہیں۔ سارا درخت اس لئے لگایا تاکہ آدم آجائیں۔ اور پھر آدم کا ایک شجرہ ہے۔ جیسے آپ نسب نامے کا شجرہ بناتے ہیں کہ باپ کا نام لکھا، ان کے چار بیٹے تو چار شاخیں نکلیں۔ پھر آگے اور شاخیں نکلیں۔ اس کو نسب کا شجرہ کہتے ہیں —— کائنات کے شجرہ و درخت کا پھل حضرت آدم ہیں۔ اور آدم کا جو شجرہ ہے اس میں آخری پھل جو مقصودِ اصلی ہے، وہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو ساری کائنات کا مقصودِ اصلی جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی

ذات نکل آئی ہے - آپؐ کو لانا تھا۔ اس لئے یہ سارا قصہ کیا گیا۔

مقصدِ کائنات عبدیتِ محمدیؐ ہے

اور آپؐ کیوں لائے گئے؟ اس واسطے کہ کائنات کو بنانے کا مقصد انسان کو لانا ہے۔ اور انسان کا مقصد عبادت ہے کہ وہ اپنے پروردگار کو یاد کرے۔ تو عبادت کے لئے یہ قصہ کیا گیا تاکہ اللہ کے آگے نیازمندی، اس کے سامنے جھکنا اور گڑگڑانا ہو۔ اور آدم اور اس کی اولاد میں سب سے زیادہ مکمل عبادت، سب سے زیادہ اعلیٰ ترین عبادت جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ آپؐ سے بڑا کوئی عابد نہ پیدا ہوا اور نہ آئندہ پیدا ہوگا۔ آپؐ کی ذات کے اوپر مراتبِ عبادت ختم ہیں۔ بندگی اور عبودیت کی جتنی شاخیں آپؐ نے دکھائی، اتنی عالم میں کسی نے نہیں دکھائیں — یوں کہنا چاہیئے جیسے اللہ معبودیت میں وحدہٗ لاشریک ہے۔ معبودیت میں اس کی کوئی نظیر نہیں، یکتا معبود ہے — عبدیت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم وحدہٗ لاشریک ہیں۔ عبدیت میں کوئی آپؐ کی نظیر نہیں ہے — اللہ کے آگے جتنی مکمل عبدیت اور بندگی آپؐ نے پیش کی ہے، عالم میں کسی نے نہیں پیش کی — حدیث میں فرمایا گیا:۔ کان یذکر اللّٰہ علیٰ کل احیانہٖ۔ آپؐ کا کوئی لمحہ ذکر اللہ اور یادِ خداوندی سے خالی نہیں تھا — کان دائم الفکرۃ حزینا — کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا کہ آپؐ پر آخرت کا غم طاری نہ ہو — اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور فکر میں مبتلا ہے۔ یہ کیفیت تھی — صحابہؓ عرض کرتے۔ یا رسول اللہ! آپؐ تو وقت سے پہلے بوڑھے ہوگئے۔ قوتیں آپؐ کی بڑی عظیم تھیں — فرمایا — شیبتنی ہود و اذا الشمس کورت — مجھے سورۂ ہود اور تکویر نے بوڑھا کر دیا ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں سورتوں میں قیامت کے ہولناک مناظر

بیان کئے گئے ہیں۔ ان حالات کو سامنے رکھ کر مجھ پر بڑھاپا طاری ہو گیا۔ تو کوئی لمحہ آخرت کے فکر سے خالی نہیں تھا، کوئی لمحہ ذکر اللہ سے خالی نہیں تھا۔ قدم قدم کے اوپر طاعت، ذکر، عبادت ہے۔ تو عبادت کو جس مکمل طریق پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات نے پیش کیا ہے۔ گویا وہ عبادت مقصود تھی۔ وہ عبادت نمایاں ہوئی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں آنے سے۔ تو مقصدِ کائنات کا پورا ہو گیا۔

اب آپ کے تشریف لانے کے بعد پھر اس اُمت کی عبادتیں درکار ہیں کہ یہ نبی کے نمونے پر چل کر اس نمونے کا پیغام دنیا کی اقوام کو پہنچا دیں۔ ورنہ مقصد حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے آنے سے پورا ہو گیا —— اسی واسطے آپ فرماتے ہیں کہ بعثت انا والساعۃ کھاتین۔ میں اور قیامت اس طرح سے ہیں جیسے یہ دو انگلیاں ملی ہوئی ہیں، کہ میں ذرا آگے نکل آیا ہوں، قیامت پیچھے دوڑتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ اس لئے کہ جب کائنات کا مقصد پورا ہو گیا، تو اب اس کائنات کو باقی رکھنے کی ضرورت نہیں —— جب درخت پھل دے کر فارغ ہو جائے۔ اور آئندہ ایسا پھل بھی آنے والا نہیں۔ پھر اسے کاٹ کے جلا دیتے ہیں کہ مقصد پورا ہو گیا۔ وہ پھل تھا جو ہم نے کھا لیا، تو اصل پھل آگیا۔ مقصد پورا ہو گیا۔ اب کائنات کو باقی رکھنے کی ضرورت نہیں۔

اور فرمایا کہ قیامت کی ہزاروں علامتیں ہیں۔ سب سے پہلے دنیا میں میرا آنا ہے۔ سمجھو کہ دنیا کے خاتمے کا وقت قریب ہے۔ اس لیے کہ دنیا کے برپا کرنے کا مقصد میرے آنے سے پورا ہو گیا۔ اب جب مقصد آگیا تو اب دنیا کے باقی رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف دنیا اس لئے باقی رہے گی کہ میرا پیغام پوری دنیا تک پہنچ جائے۔ اور امت نمونہ بن کر دکھلائے کہ یہ ہے عبادت کا نمونہ، جس کے لئے دنیا قائم کی گئی —— تو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سب سے بڑی نعمت ہے اور نعمتوں کی جڑ بنیاد ہے کہ آپ عالم کے لئے رحمت ہیں۔ پوری

دنیا کو آپؐ نے عبادت کا سبق دیا۔

اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے

بعض غیر مسلموں نے یہاں مجھ سے سوال کیا کہ اسلام نے ہمیں نئی چیز کیا دی؟ جو ہم اسلام قبول کریں۔ ہم تو اپنے اپنے مذہب پر چل رہے ہیں۔ میں نے کہا اسلام کوئی نئی چیز لے کر نہیں آیا، جو کل انبیاء علیہم السلام کا دین ہے۔ وہی دین اسلام لے کر آیا ہے۔ یہی اسلام ہے جو سارے انبیاءؑ کا مذہب اور دین رہا ہے۔ یہی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی لے کر آئے ہیں — یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تمام انبیاءؑ کا دین اسلام بتلایا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ایک جگہ حق تعالےٰ نے فرمایا۔ اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العٰلمین — اے ابراہیم مسلم بن جاؤ، کہا میں بھی مسلم بن گیا۔ فرمایا۔ اگر مسلم بن گئے ہو تو اعلان کرو۔ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین۔ لا شریک لہ وبذٰلک امرت وانا اول المسلمین — اے ابراہیم کہہ دو! میری نماز اور میرا حج، میرا مرنا، اور جینا سب اللہ کے لئے ہے۔ مجھے اسی کا امر کیا گیا ہے، اور میں ہی آج کے دور میں اول مسلم ہوں — تو ابراہیم علیہ السلام کی طرف اسلام منسوب کیا گیا کہ وہ بھی مسلم تھے۔ اور اسلام ہی لے کر دنیا میں تشریف لائے — حضرت یوسف علیہ السلام کہتے ہیں۔ توفنی مسلما والحقنی بالصلحین۔ اے میرے پروردگار مجھے وفات بھی مسلم بنا کر دیجئے، کہ مرتے دم تک میں اسلام پہ قائم رہوں۔ یوسف علیہ السلام کا دین بھی اسلام ہی ثابت ہوا — ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی۔ فرمایا۔ ووصّٰی بھا ابراھیم بنیہ ویعقوب۔ یٰبنیّ ان اللہ اصطفےٰ لکم الدین فلا

تموتن الا و انتم مسلمون ـــ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی، کہ اے بیٹو! تمہارے لیے اللہ نے دین پسند اور منتخب کیا، تم مرنا بھی تو اسلام ہی کے اوپر مرنا۔ یہی تمہارا دین رہا ہے۔ تو ابراہیمؑ کی اولاد کا دین بھی اسلام ہے۔ یوسف علیہ السلام کا دین بھی اسلام ہے ـــ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرا دین بھی اسلام ہے، جو خود قرآن نے نقل کیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے کہا کہ واشھد بانا مسلمون۔ اے مسیح علیہ السلام آپ گواہ رہیں ہم سب مسلمان ہیں۔ تو دین عیسوی بھی اسلام ہے ـــ سلیمان علیہ السلام پر بلقیس جیسی ملکہ ایمان لائی۔ تو کہتی ہے۔ انی ظلمت نفسی واسلمت مع سلیمٰن للہ رب العٰلمین ـــ میں اس سے پہلے گناہگار تھی مگر اب میں اسلام لاتی ہوں سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر ـــ تو سلیمان علیہ السلام کا دین بھی اسلام ہے۔ غرض کوئی پیغمبر ایسا نہیں ہے جس کی طرف اسلام منسوب نہیں کیا گیا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی اسلام لے کر آئے۔ فرمایا۔ ان الدین عند اللہ الاسلام۔ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ تو میں نے کہا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے۔ جو سارے انبیاء علیہم السلام لے کر آئے، وہی دین ہے۔ نئی چیز کیا ہے؟

تکمیلِ دین ایک مستقل نعمت ہے

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا ـــ میں نے دین کو مکمل نقشے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تو دین نیا نہیں بلکہ تکمیلِ دین ہے، کہ دین کے ہر ہر جزء، ہر ہر اصول و فروع کو آپ نے اتنا مکمل کر دیا ہے کہ اب اس میں کمی زیادتی کی گنجائش باقی نہیں رہی ـــ گویا دین، اسلام چل رہا تھا، شریعتیں آ رہی تھیں۔ اس میں اضافے

ہو رہے تھے۔ کمی بھی ہو رہی تھی۔ احکام منسوخ بھی ہوتے تھے۔ نئی نبوت آکر نیا پروگرام دیتی تھی ــــ آپؐ نے جو پروگرام دیا وہ اتنا مکمل ہے کہ اب اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہے۔ تو تکمیلِ دین ہے۔ دین نیا لے کر نہیں آئے۔ دین وہی ہے جو سارے انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ شریعت مکمل لے کر آئے جو پروگرام کہلاتا ہے، وہ نیا اور مکمل لے کر آئے۔ اب اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جب کوئی بچہ پیدا ہو۔ آپ اُسے جو کُرتہ پہنائیں گے، وہ بالشت بھر کا ہوگا، لیکن اس کے بعد جب وہ چھ مہینے کا ہوگا، تو کُرتہ ڈیڑھ بالشت کا ہو گیا۔ اس کے بعد جب وہ آٹھ برس کا ہوا تو گز بھر کا کُرتہ پہننے لگا۔ بچہ تو وہی ہے بعینہٖ جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ آٹھ برس پہلے بھی وہی تھا چار برس پہلے بھی وہی تھا۔ کُرتے بدل رہے ہیں، اس کی پیمائش بڑھ رہی ہے۔ بچہ وہی ہے ــــ پھر چودہ برس کا ہوا تو سوا گز کا کُرتا ہو گیا۔ اور جب تینتیس ۳۳ برس کا جوان ہو گیا، جو نشوونما کا انتہائی وقت ہے۔ اس وقت کُرتے کی پیمائش بالکل آخری اور مکمل ہو گئی، اب گھٹنے بڑھنے کا کوئی سوال نہیں، کیونکہ اب گھٹنا بڑھنا ختم ہو گیا ــ جتنا قدوقامت ہونا تھا، وہ ہو گیا، اب جو کرتے کی پیمائش ہے، وہ مرتے دم تک ایک ہی رہے گی۔ اس میں اب کمی بیشی نہیں ہو گی ــــــ

تو دین کو ایک بچے کی مانند سمجھو۔ آدم علیہ السلام جو دین لے کر آئے، وہ یہی اسلام تھا، لیکن اس وقت یہ چھوٹا سا تھا۔ پیدا ہوا ہی تھا۔ اس کے لئے شریعت بھی چھوٹی رکھی گئی۔ بالشت بھر کا کُرتہ اس کے لئے کافی تھا ــــ عارضی طور پر وہ اس کے بدن کے اوپر چھپ گیا۔ جوں جوں اسلام کا قدوقامت بڑھتا رہا، شریعتیں یعنی کُرتے بھی بڑھتے رہے ــ تو آدم علیہ السلام کے زمانے کی شریعت بہت مختصر اور معمولی سی تھی ــــ حدیث میں ہے کہ ایک وقت کی نماز تھی، اور وہ بھی مکمل صُورت نہیں تھی جو اب اسلام میں ہے ــ بس اللہ کے آگے ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہو جاؤ، نیازمندی سے کھڑے ہو جاؤ، یا اوندھے منہ لیٹ جاؤ۔ یہ کافی ہے ــ

یہ قیام، رکوع، تشہد، قومہ، جلسہ اور یہ سجدہ، یہ چیزیں آدم علیہ السلام کی شریعت میں نہیں تھیں۔ جیسا اسلام، دین چھوٹا سا تھا، پیدائش ہی ابھی ہوئی تھی، ویسی ہی شریعت تھی۔ گویا لباس بھی اس کا چھوٹا تھا ـــــ جب اسلام کا قدو قامت بڑھا، اور ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ آیا۔ شریعت بھی ذرا پھیل گئی ـــــ موسیٰ علیہ السلام کا دور آیا۔ دین کا قدو قامت بڑھا۔ تو شریعت کا لباس بھی وسیع ہوا۔ اور فرمایا۔ وتفصیلاً لکلّ شیءٍ ـــ ہم نے دین کے اندر بہت تفصیل کر دی ـــ اور جب آخری زمانہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا آیا تو دین کا نشوونما ختم ہو کر جوان ہو گیا۔ اب جو شریعت کی پیمائش ہے اس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی۔ یہ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے جب کوئی تعلیم پائے۔ اور دوسری شریعتوں کا شریعت اسلام سے موازنہ کرے، بالکل زمین آسمان کا بیّن فرق معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک شریعت کے احکام معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے بچے دین اور شریعت محمدی کے احکام ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے جوان ہیں کہ ان کا قدو قامت مکمل ہے ـــ وہ تفصیلات ہیں۔

توحید کی تکمیل

بہر حال نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو شریعت پیش فرمائی، وہ دین کی تکمیل ہے۔ دین وہی ہے جو پہلے سے تھا۔ مگر اس میں کمال پیدا ہو گیا۔ یعنی مثلاً توحید ہے۔ ہر نبی نے توحید کا عقیدہ سکھلایا۔ کسی نبی نے شرک کی تعلیم نہیں دی۔ سب نے یہی کہا کہ اللہ کو ایک جانو ـــ لیکن توحید کی تکمیل حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کی، کہ اللہ کو ایک جانو۔ اُس کی ذات کو یکتا، اس کی شان یکتا، افعال یکتا، اُس کو صفات و افعال کے لحاظ سے بھی یکتا جانو۔ ہر ہر چیز میں اُسے یکتا سمجھنا چاہیئے ـــ جب اس کی ساری شانوں میں یکتائی ہے، تو اتنے ہی حقوق قائم ہوں گے، پھر عبادتیں بھی اتنی ہی ہوں گی۔ کہ قلب سے یوں عبادت کرو۔ زبان سے یوں عبادت کرو۔ قالب سے

یوں عبادت کرو۔ اس لئے کہ جب اس کے حقوق بہت ہیں، اس کی شانیں بے حد ہیں۔ اس کے سامنے نیاز مندی کے سارے طریقے بھی مکمل ہونے چاہئیں ——— اسی طرح سے اور انبیاء علیہم السلام نے شرک سے روکا اور منع کیا۔ لیکن اسلام نے فقط شرک سے نہیں روکا، بلکہ شرک کے اسباب سے بھی روک دیا کہ وہ بھی منع ہیں۔ جن اسباب سے شرک کے پیدا ہونے کا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ ان کو بھی رد کر دیا۔ جہاں شرک کا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ اس وہم کو بھی ختم کیا ———

اسبابِ شرک کو بھی شریعتِ محمدیؐ میں قطع کر دیا گیا

حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ طواف کر رہے تھے۔ حج کا زمانہ تھا۔ اور مطاف کے اندر ہزاروں آدمی طواف میں مشغول تھے۔ جو لوگ حج کر کے آئے ہیں انہیں معلوم ہے۔ بیت اللہ کے ارد گرد سات پھیرے کئے جاتے ہیں۔ اس کو طواف کہتے ہیں۔ حجرِ اسود ایک جنت کا پتھر ہے، اس کو چوم کر پھیرا شروع کیا جاتا ہے۔ اور اسی پر آکر ختم کیا جاتا ہے۔ ہر پھیرے پر اس کی تقبیل کرتے اور چومتے ہیں ——— تو لوگ دوڑ رہے تھے، حجر اسود کے اوپر جُھک رہے تھے۔ اور عوام الناس حجرِ اسود پر زیادہ جھکتے ہیں، چاہے طواف ملے نہ ملے، مگر اس کا چُومنا مل جائے۔ اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ لڑائی تک کی نوبت آتی ہے۔ تو لوگ ہجوم کر رہے تھے ———

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ بالکل ایسی شان ہوگئی۔ جیسے حجرِ اسود کی پوجا اور عبادت کر رہے ہوں۔ بس وہیں کھڑے ہو کر للکارا، ایک دم طواف رُک گیا، اور حجرِ اسود کو خطاب کیا۔ فرمایا۔

انی اعلم انک حجرٌ لا تنفع ولا تضر۔ ولولا انی رایت رسول اللہ صلی اللہ

——— میں جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے۔ نہ تجھ میں نفع پہنچانے کی طاقت ہے نہ نقصان پہنچانے کی۔ اگر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو

علیہ وسلم قبلك ما قبلتك۔ نہ دیکھتا کہ آپؐ نے تجھے چوما۔ تو مَیں کبھی نہ چومتا۔ ——— ہمارا نفع نقصان قطعاً تیرے قبضے میں نہیں ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے ——— مطلب یہ کہ اتباعِ سنت کے لئے چوم رہا ہوں۔ عبادت کے لئے نہیں۔ لوگوں کے خیالات درست ہو گئے۔ وہ جو لوگ یہ سمجھ رہے تھے، یا سمجھنے کا اندیشہ تھا کہ شاید اسی پتھر کی عبادت مقصود نہ ہو۔ پھر بت پرستی اور خدا پرستی میں فرق کیا رہتا ہے۔ اس کو رد کر دیا ——— تو اتنے اتنے احتمالات کے اوپر اسلام نے روک ٹوک کی ہے۔ شرک تو بجائے خود ہے۔ شرک کا وہم بھی پیدا ہو۔ اس کو بھی رد کرنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ میدان میں نماز پڑھی۔ تو مسئلہ آپ کو معلوم ہے کہ سترہ سامنے رکھ لیتے ہیں۔ کوئی لاٹھی کھڑی کر لی، کوئی پتھر کھڑا کر لیا۔ تاکہ آنے جانے والے نمازی کے سامنے نہ آئیں۔ بلکہ اس کی وجہ سے باہر باہر سے چلے جائیں۔ مقصد یہ کہ نمازی کے آگے سے جو گزرے گا، تو وہ جو بندے اور خدا کے درمیان رابطہ ہے، وہ قطع ہو جاتا ہے، تشویش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جب سترہ کھڑا کر لیا۔ اور جانے والا سترہ سے باہر چلا گیا۔ اب قلب پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے سنت طریق یہ ہے کہ کوئی سترہ رکھ لو۔ لاٹھی رکھ لو یا پتھر رکھ لو ——— تو عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے بھی سامنے سترہ رکھا۔ ایک پتھر کھڑا کر لیا۔ لیکن پتھر دائیں مونڈھے کے سامنے کھڑا کیا، اور لوگوں کو حکم دیا کہ دائیں مونڈھے کے سامنے یا بائیں مونڈھے کے سامنے پتھر رکھو۔ بالکل ناک کے سامنے مت رکھو۔ فرمایا ناک کی سیدھ میں رکھو گے تو کسی کو وہم ہو گا کہ کہیں پتھر کی تو عبادت نہیں کی جا رہی۔ اس وہم سے بھی بچو ——— تو یہاں پر اسبابِ شرک کو بھی رد کیا ہے۔ فقط شرک ہی کو رد نہیں کیا۔ ورنہ ظاہر ہے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ جو نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کے قلب میں تو شرک کا وہم بھی نہیں تھا۔ جلیل القدر صحابی ہیں، ان سے زیادہ متبعِ سنت کون ہے جب یہ احتمال بھی نہیں ہو سکتا کہ معاذ اللہ عبداللہ ابن عمرؓ

کے قلب میں کوئی شرک کا وہم تھا ——— لیکن صورت بھی ایسی نہیں بنانی چاہی۔ ناک کی سیدھ میں پتھر رکھنے سے شرک کی صورت بنتی تھی۔ اس صورت کو بھی ختم کر دیا، تو بعید سے بعید احتمالات کو بھی قطع کر دیا کہ کسی طرح شرک قلب کے اندر گنجائش نہ پانے پائے۔ قلب اس سے بری رہے۔

حدیث میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الشرک اخفیٰ من دبیب النمل ——— اتنا باریک باریک شرک ہے جیسے ایک چکنے پتھر کے اوپر چیونٹی ہے۔ تو اس کے چلنے کی آواز نہیں آتی۔ اتنی باریک آواز ہوتی ہے کہ آپ اس کا احساس نہیں کر سکتے ——— فرمایا جتنی وہ باریک چال ہے، شرک اس سے بھی زیادہ باریک چال ہے۔ بعض دفعہ آدمی شرک میں مبتلا ہوتا ہے اور اسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ میں شرک میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ مثلاً فرمایا، اگر کوئی شخص نماز پڑھنے لگے اور دل میں یہ جذبہ ہو کہ لوگ یوں سمجھیں کہ بڑا عبادت گزار ہے۔ تو فرمایا۔ الریاء شرک ——— ریار خود شرک ہے۔ یہ خدا کی نماز نہیں پڑھ رہا، بلکہ بندے کی نماز پڑھ رہا ہے۔ لوگوں کو دکھلانے کے لئے تاکہ یہ مجھے عبادت گزار سمجھیں۔ اب ریار اور دکھلاوا کرنے والا ذہن میں تصور نہیں کرتا کہ میں شرک کر رہا ہوں۔ اپنے نزدیک تو وہ خدا کی عبادت کر رہا ہے، مگر حقیقۃً وہ خدا کی عبادت نہیں۔ وہ تو دیکھنے والوں کی عبادت ہو رہی ہے، جن کو وہ دکھلا رہا ہے۔ تو ریار بھی ایک شرک ہے مگر یہ ظاہری اور کھلا ہوا شرک نہیں۔

اور ایک شرک اس سے بھی زیادہ باریک ہے۔ یعنی کوئی بھی دیکھنے والا نہ ہو، اور پھر بھی شرک پیدا ہو جائے۔ اس کو عُجب کہتے ہیں۔ یعنی آدمی تنہا عبادت کر رہا ہے دل میں غرور ہے کہ میں ایسی عبادت کر رہا ہوں کہ آج تک کسی نے نہیں کی۔ گویا میں ہی دنیا میں ایسی عبادت کرنے کو پیدا ہوا ہوں۔ فرمایا یہ شرک ہے۔ یہ اپنے نفس کے لئے عبادت کر رہا ہے، خدا کے لئے نہیں ——— اس کے نفس میں غرور اور پندار پیدا ہو رہی ہے۔ اور اپنے نفس میں بڑائیاں مار رہا ہے کہ میں بہت بڑا آدمی

ہوں۔ اتنی بڑی عبادت کی ؟ جب یہ خود خدا کے سامنے کھڑا ہو کے بڑا بننے لگا، اس کی بڑائی کا تو انکار کر دیا۔ اپنے نفس کو اس کی بڑائی میں جگہ دے دی۔ یہ بھی شرک پیدا ہوا۔ اس تک کو اسلام نے قطع کیا ہے کہ جب تنہا کھڑا ہو ، تو عُجب اور خود بینی نہ ہو کر اپنے کو دیکھ کر نماز پڑھو۔ لوگوں کے سامنے کھڑے ہو تو لوگوں کے دکھلاوے کے لیے مت پڑھو، کہ وہ بھی شرک ہے ۔ اگر ضرورت ہو تو سترا رکھو۔ اس کو بھی ایسے انداز سے مت رکھو، کہ وہاں شرک کی صُورت بھی بن جائے۔ تو شرک کی صُورت بھی درست نہیں ہے۔ حقیقی شرک تو کیا درست ہوتا ہے اور مذاہب نے بھی شرک کو رد کیا ہے۔ مگر دُور دُور کے اسباب کو رد نہیں کیا۔ اِسلام نے ان کو بھی رد کیا تاکہ توحید مکمل ہو کر دنیا کے سامنے آئے —— وحدانیت کی تکمیل اسلام (شریعت محمدی علےٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) نے پیش کی ہے۔ صرف توحید پیش نہیں کی، توحید تو پچھلے انبیاء علیہم السلام بھی پیش کر گئے۔ مگر اس توحید کو اتنا مکمل بنا دیا کہ ظاہر اور باطن میں شرک کی کچھ گنجائش باقی نہیں رہی۔

اسی مذہب میں تصویر حرام کی گئی کہ اس سے شرک کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تصویر ہی سے شرک کی ابتداء ہوئی ہے —— حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں پہلے شرک پیدا ہوا ہے۔ ان کی قوم میں پانچ بزرگ تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا، قوم نے ان کے بت بنا کے عبادت گاہوں میں رکھ دیئے تھے۔ کہ ان کی صورتیں دیکھ کے ہمیں خدا یاد آئے گا۔ جیسے ان کی مجلس میں بیٹھ کر خدا یاد آتا تھا —— پہلی نسل تو ان کو دیکھ کر خدا کو یاد کرتی رہی۔ ان کی عبادت انہوں نے نہیں کی۔ مگر جب دوسری نسل آئی ، ان کے دلوں میں وہ علم و معرفت نہیں تھا، جو ان کے بڑوں میں تھا۔ تو کچھ تعظیم انہوں نے مورتیوں کی شروع کی جو عبادت گاہوں میں رکھی ہوئی تھیں، کچھ خدا کی طرف جھکے۔ اب جب تیسری نسل آئی، تو خدا کو تو بھول گئے۔ اور ساری عبادت ان بتوں ہی کے لئے رہ گئی۔ یہیں سے شرک کا قصہ چلا۔ تو شرک کی ابتداء انہی چیزوں سے ہوئی ہے۔ ابتداءً تصویر رکھ

لی گئی ۔ پھر وہ شرک کا ذریعہ بن گئی ——

اور اسی طرح سے دنیا کی قومیں بھٹکتی ہیں، کہ کسی بزرگ نے غلبۂ حال میں کسی کام پر عمل کر لیا ۔ بعد والوں نے اُسے قانون بنا کر اسی پر عمل کرنا شروع کر دیا ۔ اور شرک میں مبتلا ہو گئے ، تو ان کے بزرگوں نے تصویر یاد دہانی کے لئے رکھی تھی ، عبادت کے لیے نہیں ۔ مگر بعد والوں نے ان کی صورت کو اختیار کر لیا کہ وہ بتوں کے آگے جھک رہے تھے ۔ لہٰذا ہم بھی جھکیں ۔

یہی صورتیں ہوئی ہیں کہ درختوں کی پوجا شروع ہوئی ۔ کسی بزرگ نے کسی درخت کے نیچے بیٹھ کے عبادت کی ہو گی ۔ اس کے ماننے والے معتقدین نے اس درخت کی عظمت شروع کی ۔ انہوں نے فقط تعظیم کی ۔ ان کے بعد والوں نے اس کو پوجنا شروع کر دیا ۔ آج ہندوؤں میں پیپل کا درخت واجب العبادت ہے ۔ اس کی عبادت کی جاتی ہے ، — ان کا کوئی بزرگ پیپل کے درخت کے نیچے عبادت کرنے بیٹھا ہو گا ۔ انہوں نے پیپل ہی کی عبادت شروع کر دی ، وہی معبود بن گیا ——

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس چیز کو سمجھا ۔ حدیبیہ کے مقام پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت جہاد لی ۔ آپؐ کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے ۔ اور اس کے نیچے بیٹھ کر بیعت لی ۔ وہ وقت ختم ہو گیا ۔ یہ ایک واقعی اثری بات ہے کہ بزرگ اور اہل اللہ جہاں بیٹھ جاتے ہیں ، وہاں بھی برکت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں ۔ تو سید الاولین والآخرینؐ کسی جگہ بیٹھیں اور وہاں برکت نہ ہو ؟ یہ ناممکن تھا ۔ اس درخت کے اندر برکت کے آثار پیدا ہوئے ، صحابہؓ نے یہ شروع کیا کہ جب ادھر سے گزرتے تو تبرّکاً درخت کے نیچے دو نفل پڑھ کے جاتے ۔ اگر نماز کا وقت نہ ہوا یا وقت مکروہ تھا ۔ تو کم سے کم وہاں بیٹھ کے کچھ تسبیح و تہلیل ہی کر لیتے کہ برکت حاصل ہو گی —— حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ آج تو یہ صحابہؓ ہیں ، یہ تو عارفین ہیں ۔ اللہ اور رسول کی پہچان ہے ۔ یہ محض تبرکاً یہاں بیٹھتے ہیں ، درخت کی پوجا کرنے نہیں بیٹھتے ۔ لیکن آئندہ نسلیں جو آنے والی ہیں

کیا خبر ہے ان کے دل میں یہ علم و معرفت نہ ہو، اور وہ اس درخت کی عظمت کر کے اسی کی پوجا کریں ۔ حکم دیا کہ اس درخت کو کاٹ دو۔ درخت کٹوا دیا ۔۔۔۔۔ صحابہ کرامؓ کو ناگوار ہوا کہ ایک بابرکت درخت کٹوا دیا ۔۔۔ فرمایا ۔۔۔ یہ تمہارے نزدیک بابرکت ہے ۔ اگلوں کے نزدیک یہی عبادت کا ذریعہ بنے گا ۔ اور کیکر کا درخت معبود بن جائے گا ۔ پوجا شروع ہو جائے گی ۔۔۔ دنیا کی اقوام اسی طرح سے بھکی ہیں ۔۔۔ کہیں درخت معبود بنا ۔ کہیں پانی معبود بنا ۔ وہ اسی طرح سے کہ کسی بزرگ نے وہاں برکت حاصل کرنے کے لئے قیام کیا ۔ معتقدین و متوسلین نے نیک نیتی سے اس چیز کی عظمت سے فائدہ اٹھایا ۔ بعد والوں میں نہ وہ نیکی رہی، نہ وہ نیت رہی ۔ انہوں نے اس چیز کو معبود بنا لیا ۔ یہیں سے شرک کی ابتداء ہو گئی ۔

ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولٰنا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے ۔ جو عارفِ کامل، صاحبِ کشف و کرامت بزرگ اور اولیائے کاملین میں سے تھے ۔ تو مولانا کے مزاج میں کچھ مجذوبیت سی تھی ۔ جیسے مجذوب ہوتے ہیں کہ آدھے باؤلے سے آدھے عقلمند سے ۔ اس طرح سے ایک جذب کا مادہ تھا ۔ آنکھیں سُرخ رہتی تھیں ۔ اور ایک کیفیت طاری ۔۔۔۔ جس چیز کی ہٹک گئی وہ لگ جاتی تھی ۔۔۔ ایک دن بیٹھے تھے یہ چیز ذہن میں آ گئی کہ اس کی تحقیق کرنی چاہیئے کہ یہ گنگا کہاں سے نکلی ہے ۔ ہندوستان میں یہ بڑا دریا ہے، ہندو گنگا کی پوجا کرتے ہیں ۔ اس کے پانی کو بڑا باعظمت جانتے ہیں ۔ اس کو سامنے رکھ کر پوجا کرتے ہیں ۔ اور اس میں کھڑے ہو کر عبادتیں کرتے ہیں ۔ اس کی بڑی عظمت ان کے دلوں میں ہے ۔ اس کو گنگا مائی کہتے ہیں کہ یہ ہماری ماں اور اصل ہے ۔۔۔۔ جب وہ پانی لے کر گنگا سے چلتے ہیں، جب تک پانی کندھے پر رہتا ہے تو جوتا نہیں پہنتے ۔ زمین پر بیٹھتے نہیں ۔ کھڑے کھڑے اس کو لاتے ہیں ۔۔۔ اتنی عظمت کرتے ہیں ۔۔۔ تو مولٰنا مرحوم کے دل میں یہ ایک جذبہ پیدا ہوا کہ یہ گنگا کہاں سے نکلی ہے ۔ اور اس کے نکلنے کا کیا سبب

ہوا ہے ـــــ ؟ حالانکہ اس کی تحقیق ایک غیر ضروری بات تھی۔ مگر ایک لگ لگ گئی، تو رات کے بارہ بجے چارپائی سے اٹھ کے گنگا کی تحقیق کے لئے روانہ ہو گئے۔

دیوبند سے گنگا چالیس میل کے فاصلے پر بہتی ہے۔ چالیس میل کے سفر کے ارادہ سے رات کو بارہ بجے چارپائی سے اُٹھ کر روانہ ہو گئے۔ صبح کو جب مولٰنا درس میں نہ آئے تو سارے دار العلوم میں ڈھونڈ پڑی کہ مولٰنا کہاں ہیں، مولٰنا کا کہیں پتہ نہیں، طلبہ پریشان، مدرسین پریشان کہ ہمارا صدر مدرس کہاں گیا۔ آدمی بھیجے گئے کسی کو نانوتے، کسی کو گنگوہ، مولٰنا کا کہیں پتہ نہیں۔ لوگ سخت حیران۔ بعضے تو رو پڑے کہ خدا جانے کیا گزری۔ اور مولٰنا گنگا کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ پورا ایک دن اور ایک رات لگا۔ پورے چوبیس گھنٹے کا پیدل سفر کر کے وہاں پہنچے۔ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں نیچے کو ہے، گنگوتری اس کو کہتے ہیں۔ وہاں سے چشمہ گنگا کا پھوٹتا ہے اور چونکہ گاؤں کا نام گنگوتری ہے۔ اسی مناسبت سے گنگا اس کو کہتے ہیں ـــ تو گاؤں میں پہنچے، جہاں سے یہ دریا نکل رہا ہے۔ اور چشمہ ہے' ـــ وہاں مولٰنا نے سات دن قیام کیا۔ نمازیں اور تلاوت میں سات دن لگے رہے۔ رات دن کامل عبادت کی، اور چونکہ خود بھی بزرگ تھے، تو حال منکشف ہوا کہ گنگا کیوں نکلی ہے کیا بات ہوئی ہے ـــــ

فرمایا کہ مجھ پر منکشف ہوا کہ جہاں سے گنگا نکلی ہے یہاں یا تو کسی نبی کی قبر ہے۔ یا کسی نبی کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ اس برکت کے آثار ہیں۔ اس لئے چشمہ نکلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کی قوم مبتلا ہے ـــــ تو گنگا کا چشمہ کسی پیغمبر کی دعا سے نکلا ہو گا۔ اس میں کچھ برکت کے آثار آئے۔ لیکن قوم نے جہالت سے اس پانی کو معبود سمجھ لیا' ابتدا میں اس کی تعظیم و وقعت کی ہو گی۔ اور جب علم و معرفت دل میں باقی نہ رہا' وہی معبود بن گیا، قابلِ پوجا بن گیا۔ اسی کے سامنے سجدے شروع ہو گئے ـــــ یہ اُمتِ مسلمہ پر اللہ کا رحم ہے کہ وہی نوعیت مکہ مکرمہ میں آبِ زمزم کی ہے، جو ہندو گنگا کو سمجھتے ہیں ـــ لیکن اللہ کا فضل ہے آج تک آبِ زمزم کی پرستش کسی نے

نہیں کی، یا پوجا کی ہو، یا زمزم سامنے رکھ کر کسی نے سجدے کئے ہوں۔ عظمت و توقیر کرتے ہیں۔ شرعاً حکم ہے کہ اور پانی بیٹھ کر پیو، مگر یہ پانی تبرکاً کھڑے ہو کر پیو۔ یہ سب کچھ ہے۔ لیکن یہ کہ اس سے مسلمان مرادیں مانگتے ہوں۔ اے زمزم! ہمیں بیٹا دے دے۔ یا اے زمزم! ہمیں روٹی دے دے۔ یہ کوئی نہیں کرتا۔ معبود نہیں جانتے۔ یہ محض اللہ کا اس امت کے اوپر فضل ہے، اس امت میں بھی برکت کی چیزیں آئی ہیں مگر پوجا اور عبادت کے لائق صرف اللہ کی ذات کو سمجھتے ہیں۔ غیر اللہ کے آگے نہیں جھکتے ——

وہ کیوں —— ؟ اس لئے اسلام نے نہ صرف شرک سے روک دیا، بلکہ شرک کے دُور دُور کے اسباب کو بھی قطع کر دیا ہے کہ شرک پیدا نہ ہونے پائے۔ اس لئے یہ امت کامل توحید پر قائم ہے۔ اگر اسلام اسباب شرک کو نہ روکتا تو ہم بھی انہی چیزوں میں مبتلا ہوتے، جس میں دوسری اقوام مبتلا ہوئیں۔ ہر درخت کو پوجتے۔ ہر پانی کو پوجتے، ہر پتھر کے آگے جھکتے، اور جہاں کچھ طبقات میں جہالت ہے۔ وہ اب بھی ایسا کرنے سے باز نہیں رہتے لیکن مجموعی طور پر امت الحمد للہ کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی —— لوگ نادانی اور جہل کی وجہ سے غلطیاں کرتے ہیں۔ مگر اصل دین جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم چھوڑ کر گئے ہیں۔ وہ موجود ہے۔ وہ قیامت تک رہے گا۔ اصل دین میں فرق نہیں آئے گا۔ یہ اس کی برکت ہے کہ اسلام نے توحید کو لیا۔ شرک کو رد کیا۔ اور شرک کے دُور دُور کے اسباب تک کو رد کر دیا۔ صحابہ رضؓ کے زمانے سے ہی یہ روک تھام شروع ہو گئی تھی۔ حدیث میں ایک واقعہ ارشاد فرمایا گیا، کہ دمشق میں ایک پیغمبر کی قبر تھی۔ وہ اتفاق سے کھلی، پانی برسنے سے یا کسی اور وجہ سے۔ اس میں سے ایک کتاب نکل آئی۔ اس کتاب میں کچھ قواعد ایسے لکھے ہوئے تھے کہ آئندہ کی کچھ خبریں اس سے معلوم ہو سکتی تھیں۔ کسی آدمی نے اس کو پڑھ کر بتلایا کہ کل کو یوں ہوگا، پرسوں یوں ہوگا۔ اس سے لوگوں کے اندر فتنہ پھیلنا شروع ہوا۔ اور اس شخص نے دعوٰے کر دیا کہ میں خود پیغمبر ہوں ——

دیکھو میں تین دن بعد کی بات بتا رہا ہوں، کہ یہ ہو گا۔ ہفتہ بعد یوں ہو گا۔ اس کتاب میں سے دیکھ دیکھ کے اس قسم کی باتیں شروع ہوئیں۔ لوگوں میں فتنہ پھیلا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی گئی ——— تو مدینہ طیبہ سے مستقل شام کا سفر فرمایا۔ اور بیت المقدس پہنچے۔ اس شخص کو بلوایا گیا۔ کتاب اس سے لی گئی۔ اس کتاب میں کچھ قواعد ایسے لکھے ہوئے تھے کہ جن کے ذریعے سے آئندہ کی کچھ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ مگر ظاہر ہے کہ قواعد کے ذریعے سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ وہ قطعی اور یقینی نہیں ہوتی، وہ تو قیاسی ہوتی ہیں۔ جیسے ایک طبیب طب کے لحاظ سے پیشین گوئی کر دے کہ فلاں مریض تین دن میں مر جائے گا۔ یہ کوئی غیبی الہام نہیں ہوتا، کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہو۔ قیاسی چیز ہے۔ ہو بھی سکتی ہے، ممکن ہے نہ بھی ہو۔ بہت سے لوگ سیاسی پیشین گوئیاں کیا کرتے ہیں کہ دو برس کے بعد فلاں حکومت کا یہ حشر ہونے والا ہے۔ وہ اپنے تجربات اور سیاسی قواعد سے پیشین گوئی کرتے ہیں۔ وہ غیبی الہام نہیں ہوتا کہ اس کا یقین کرنا اور اس کا عقیدہ بنانا ضروری ہو۔ ہر صاحب فن اپنے فن کے لحاظ سے کچھ پیشین گوئیاں کر دیتا ہے۔ اسی طرح سے علماء نے کچھ قواعد لکھے ہیں کہ ان کے ذریعے سے بعد کی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ کچھ مستقبل کی چیزوں کا پتہ چل سکتا ہے۔

اسلام نے ان چیزوں سے اس لئے روک دیا کہ یہ قیاسی چیزیں ہیں۔ قطعی نہیں۔ ان پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا ہو جائے، ہو سکتا ہے اس کے خلاف ہو۔ مومن کا کام یہ ہے کہ اللہ پر بھروسہ رکھے۔ جو خبر اس نے اپنے پیغمبر کے ذریعے بھیجی ہے یقینی ہے۔ باقی اور کوئی چیز قطعی اور یقینی نہیں ہے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے سامنے وہ کتاب پیش کی گئی۔ فرمایا۔ جہاں یہ قبر کھلی ہے وہاں گیارہ قبریں کھدوائی جائیں۔ گیارہ قبریں کھدوا دی گئیں۔ اور اعلان کیا، کہ جن پیغمبر کی نعش مبارک ظاہر ہوئی ہے اور وہ اوپر آ گئی ہے۔ ان کو دفن کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ قبر جو تھی، اس میں سے وہ نعش نکالی گئی اور رات کو جب تمام سو گئے، تو

کسی ایک قبر میں دفن کر دیا، اور کتاب بھی ان کے ساتھ دفن کر دی۔ اوپر سے ساری زمین برابر کر دی گئی۔ لوگوں کو اب یہ پتہ نہیں چلا کہ کون سی قبر میں وہ کتاب دفن کی گئی ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔ یہ اس لئے پیش بندی کر دی کہ اگر وہ کتاب رہ جاتی، لوگ اس سے فتنہ پھیلاتے۔ اس سے پیشین گوئیاں کرتے کہ ہم نبی ہیں۔ ہم پر الہام ہوا ہے، اس سے ختم نبوت کا انکار ہوتا۔ تو دور سے پیش بندی کر کے اس سلسلہ ہی کو قطع کر دیا کہ لوگ پہنچنے ہی نہ پائیں ——

بہر حال اس قسم کے اسباب کو رد کرنا، یہ اسلام نے توحید کی تکمیل کے لئے کیا۔ تاکہ مکمل ہو کے توحید دلوں کے اندر آئے ——

اسبابِ معاصی بھی حرام ہیں

یہی وجہ ہے کہ ایسی تعظیم سے بھی روکا جس سے شرک کا واہمہ بھی پیدا ہو۔ جیسے فقہائ لکھتے ہیں کہ جب سلام کرو تو جھک کے مت کرو۔ مسلمانوں کا سلام السلام علیکم و رحمت اللہ تعالٰے و برکاتہ، ہے۔ یہ جھکنا جھکانا نہیں ہے، تھوڑا سا کوئی جھک جائے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر اتنا جھک گیا کہ رکوع کی شکل پیدا ہو گئی، اس شخص کو سزا دی جائے گی کہ اس نے عبادت کی شکل پیدا کر دی۔ حالانکہ انسان کے لئے عبادت نہیں رکھی گئی۔ تو سلام میں رکوع کی شکل پیدا ہو جانا، یہ مکروہ تحریمی گیا ہے۔ اس سے شرک کے پیدا ہو جانے کا احتمال ہے —— یہاں تک پیش بندی کی۔ اور دور تک اسباب کو قطع کیا۔

اسی طرح سے معاصی اور زنا میں بھی کیا گیا ہے کہ زنا سے روکنا مقصود ہے لیکن اس کے روکنے کے لئے جو اسباب زنا تھے، ان کو بھی حرام قرار دیا۔ اجنبی عورت پر ارادے سے نگاہ ڈالنا، یہ بھی ممنوع ہے۔ اس کو ہاتھ لگانا، یہ بھی ممنوع۔ اس کی آہٹ پر چلنا، یہ بھی ممنوع۔ حالانکہ اصل میں عورت کو دیکھنا کوئی ممنوع چیز نہیں ہے، یہ

بُری بات نہیں ہے۔ وہ بُرا فعل ہے جس کو زنا کہتے ہیں۔ مگر چونکہ بسا اوقات یہ اصل فعل کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس لئے اس سے بھی روک دیا۔ فرمایا گیا۔ عورت خوشبو لگا کے سڑک کے اوپر نہ نکلے۔ اس لیے کہ خوشبو ایک دعوت ہے کہ مجھے دیکھیں، خوشبو جب ناک میں پہنچے گی، لوگوں کی توجہات منعطف ہوں گی۔ تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ خوشبو لگا کر باہر جانے والی عورت کی مثال حکم زانیہ کی ہے۔ گویا زنا کر رہی ہے کہ زنا کی دعوت لوگوں کو دے رہی ہے، اس حد تک روک دیا گیا —— تو باہر نکلنا، یا خوشبو لگا کے نکلنا، یا ایسے زیورات پہن کے نکلنا جس کی آواز دوسروں کے کانوں تک پہنچے، ان سب چیزوں سے روکا۔ تاکہ اصل فعل سے آدمی رُک جائے۔ روکنا زنا کا مقصود ہے۔ یہ چیزیں اپنی ذات سے ناجائز نہیں تھیں۔ اس لئے روک دی گئیں، کہیں ذریعہ نہ بن جائیں۔ اس کو شریعت کی اصطلاح میں سدِّ ذرائع کہتے ہیں۔ یعنی وسائل کو روک دو تاکہ آدمی مقاصد تک نہ پہنچنے پائے —— روکنا تو چوری کا مقصود ہے کہ دوسرے کا مال نہ لے۔ لیکن تاک لگانا، کسی مکان میں ٹوہ لینا، نقب لگانا، دیواریں دیکھنا کہ اینٹ کہاں سے ٹوٹ سکتی ہے، مال اسباب کہاں کو رکھا ہوا ہے۔ اس دیکھنے کو بھی ممنوع و حرام قرار دے دیا۔ اس لئے کہ جو آج دیکھ رہا ہے، وہ کل کو چوری بھی کرے گا یہی چیزیں ذریعہ بنیں گی۔ تو چوری کو روکنے کے لئے جتنے اسباب اور دواعی تھے، ان سب کو ممنوع اور ناجائز قرار دے دیا گیا۔

حدیث میں ہے کہ من اتیٰ عرافاً فقد کفر بما انزل علیٰ محمدٍ صلی اللہ علیہ وسلم۔ جو جادوگر کے پاس گیا، اس نے شریعتِ محمدی کے ساتھ کفر کیا۔ حالانکہ جادوگر کے پاس جانا اپنی ذات سے کفر نہیں۔ اس لئے کہ جب وہ اس کے پاس گیا تو اس نے توحید کا انکار نہیں کیا، نبوت، قیامت اور فرشتوں کا انکار نہیں کیا۔ ایمان کا تعلق تو ان چیزوں سے ہے۔ جب یہ ساری چیزیں موجود ہیں پھر کیسے کفر کیا —— فرمایا گیا اس لئے کہ جو آج کسی جادوگر کے پاس جائے گا، تو سب سے پہلے تو جادو کی بُرائی دل سے نکلے گی، وہ جو دل میں بیٹھا

ہوا تھا کہ جادو کرنا حرام ہے۔ وہ حُرمت دل سے نکلے گی۔ دوسرے دن جا کے وہ اسے لیں کہے گا کہ ایک منتر مجھے بھی سکھلا دو، تو ایک منتر سیکھ لیا۔ تیسرے دن جائے گا تو خود منتر کرے گا۔ اور چوتھے دن اچھا خاصا جادوگر بن جائے گا۔ اور کفر میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس سے بچانے کے لئے یہیں سے روکا کہ جادوگر کے پاس جانا ہی کفر کی چیز ہے ——— اس کو کہتے ہیں کسی عمل کی تکمیل۔ کہ اس کے دور دور کے اسباب کو بھی روک دو، تاکہ اصل برائی کے اندر مبتلا نہ ہونے پائے۔

روکنا شراب سے مقصود تھا۔ فرمایا گیا۔ ما اسکر کثیرہٗ فقلیلہ حرام ——— جس چیز کے زیادہ حصے میں نشہ ہے، اس کا کم حصہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔ یعنی شراب کا گلاس پینا حرام ہے۔ ایک قطرہ چکھنا بھی حرام ہے۔ اس کو نجس العین کہا گیا ہے۔ جیسے خنزیر نجس العین ہے، کہ اس کی ذات ہی ناپاک ہے اسی طرح شراب کو بھی فرمایا گیا کہ اس کی ذات اور جوہر بھی ناپاک ہے۔ اس لئے فرمایا ایک قطرہ بھی اسی طرح سے حرام ہے جس طرح سے ایک گھونٹ اور ایک جام پینا حرام ہے۔ ———

——— لیکن اگر کوئی یہ سوال کرے کہ شراب اس لئے حرام کی کہ نشہ لاتی ہے۔ اور نشے میں آدمی کی عقل جاتی رہتی ہے۔ مگر ایک قطرہ چکھنے سے تو نشہ نہیں پیدا ہوتا۔ پھر یہ کیوں حرام ہے؟ ——— وہ یہی وجہ ہے کہ جس نے آج ایک قطرہ پیا۔ وہ کل کو ایک گھونٹ پیئے گا۔ جو کل کو ایک گھونٹ پیئے گا، پرسوں کو ایک گلاس بھی پیئے گا۔ اور جو پرسوں کو ایک گلاس پیئے گا، وہ چوتھے دن جا کر شراب خور بن جائے گا۔ تو شراب خور بننے سے روکنے کے لئے ایک قطرے کو بھی ممنوع قرار دے دیا، تاکہ ابتداء سے آدمی رُک جائے۔

پھر یہی نہیں کہ شراب کا ایک قطرہ یا ایک گھونٹ ہی پینا حرام ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں چار قسم کے برتن تھے، جن میں شراب پی جاتی تھی۔ جیسے اس زمانے میں بھی شراب پینے کے کچھ مخصوص برتن ہوتے ہیں، جام اور صراحی اس کا

الگ ہوتا ہے۔ ایسے ہی زمانۂ جاہلیت میں چار قسم کے برتن تھے۔ حنتم۔ دُبہ۔ نقیر اور مزفت ـــــــــ

دُبہ ایک خاص قسم کا کدو ہوتا تھا۔ جس کو اندر سے کھرچ کر کھوکھلا کرتے تھے۔ اس میں شراب رکھتے تھے، تو اس میں نشہ زیادہ پیدا ہوتا تھا ـــــ اسی طرح سے نقیر ایک خاص قسم کے درخت کی جڑ ہوتی تھی۔ اس کو کھود کر پیالہ بناتے تھے۔ اس پر روغن اور بہت عمدہ رنگ کر کے اس کو بیچتے تھے، اس میں شراب پی جاتی تھی، تو وہ اچھی معلوم ہوتی تھی ـــــــ

اسی طرح دوسرے برتن تھے ـــــــ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جس طرح سے شراب حرام ہے اسی طرح سے یہ چار برتن بھی حرام قرار دیئے گئے کہ ان میں پانی بھی مت پیو۔ اس لئے اگر پانی پینے بیٹھے، ممکن ہے شراب یاد آجائے، اور شراب کی طرف توجہ ہو جائے ـــــــ میرا مقصد یہ ہے کہ روکنا اصل حرام فعل سے مقصود ہے۔ اس کے جتنے اسباب تھے، دُور دُور سے انہیں روکا ہے تاکہ آدمی وہاں تک نہ پہنچنے پائے۔ تو شرک ایک قبیح فعل تھا۔ اس کو روکنے کے لئے اس کے جتنے اسباب تھے، ان سے بھی روک دیا، تاکہ انسان میں کمالِ توحید اور کمالِ تقویٰ پیدا ہو۔

یہ جو آپ نے سُنا ہو گا کہ صغیرہ گناہ اور کبیرہ گناہ ـــــــ تو صغیرہ اور کبیرہ گناہ کی تعریف یہی ہے کہ ہر گناہ کے سلسلہ میں جو فعلِ اصل مقصود ہوتا ہے وہ تو کبیرہ ہے۔ اور جو اس کے اسباب ہوتے ہیں، وہ صغیرہ ہے ـــــ زنا تو کبیرہ گناہ ہے عورت کو دیکھنا، ہاتھ لگانا، بُری نیت سے اس کی طرف چل کے جانا، یہ سارے گناہِ صغیرہ ہیں ـــــ اگر خدانخواستہ وہ اصل فعل واقع ہو گیا۔ تو یہ سارے گناہ لادے جائیں گے۔ اور سب کا وبال چکھنا پڑے گا۔ لیکن اگر یہ سارے افعال سرانجام دیئے اور اصل فعل سے بچ رہا، تو یہ بھی سب معاف کر دیئے جائیں گے۔ نیکیاں کرنے سے صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ تو شریعت اسلام نے فقط گناہ سے نہیں روکا، بلکہ

ان کے اسباب یعنی صغیرہ گناہ سے بھی روکا ہے۔ تاکہ اس گناہ سے آدمی دور دور رہے۔ یہ اصل میں دین کی تکمیل ہے۔ کہ اصل مقاصد کو روکنے کے لیئے اس کے دواعی اور اسباب تک کو روکا۔ اور مکمل قانون بنا دیا ——

اسبابِ فرائض پر اجر و ثواب ہے

اسی طرح سے جو فرائض ہیں۔ ان میں اصل مقصود تو فرض ہے۔ لیکن فرض کو انجام دینے کے لئے اسباب کا سلسلہ بچھا دیا۔ مثلاً اصل مقصود نماز ہے۔ یہ تو فرض ہے لیکن اس کے لئے شریعتِ اسلام نے کہاں سے سلسلہ چلایا —— فرمایا گیا —— اگر ایک شخص لحاف میں پڑا ہوا سو رہا ہے۔ اور اذان ہوئی۔ تو جب مؤذن حیّ علی الصلوٰۃ کہے، جبھی بستر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس لیئے اگر یہ خیال ہوا کہ ابھی یہ اذان دے رہا ہے —— ابھی تو پانچ منٹ اذان ہی میں لگیں گے۔ اس کے بعد پندرہ منٹ نماز میں۔ ذرا اور سو جاؤں —— تو سوتے سوتے وہ آدھ گھنٹے سوئے گا۔ جماعت بھی قضا ہو جائے گی۔ مسجد میں جانا ہی نصیب نہیں ہوگا۔ تو وہاں سے پکڑا ہے کہ جب حیّ علی الصلوٰۃ کی آواز آئے، جبھی اٹھ کھڑے ہو جاؤ۔ آسانی اسی میں ہے —— اس کے بعد آدمی نے وضو کیا۔ فرمایا گیا جب آدمی وضو کرنے بیٹھتا ہے، تو جس عضو کو آدمی دھوتا ہے، جو گناہ اس عضو سے کیئے ہیں۔ وہ جھڑنے شروع ہوتے ہیں۔ ہاتھ سے گناہ کیا۔ جب ہاتھ دھوئے گا تو ناخنوں سے وہ گناہ جھڑیں گے۔ پیر دھوئے گا، تو پیروں کے گناہ جھڑیں گے۔ کلی کرے گا تو منہ سے جو گناہ کیئے تھے وہ جھڑیں گے۔ ناک میں جب پانی دے گا، تو ناجائز سونگھنے کے جو گناہ کیئے ہیں، وہ جھڑیں گے۔

حتیٰ یخرج نقیئا من الذنوب۔ جب وضو کر کے اٹھے گا، تو ایسا پاک ہوگا گویا اس نے وہ گناہ کیئے ہی نہیں تھے۔ یہ سب پاکی نماز کے لئے کی جا رہی ہے۔

پھر فرمایا گیا۔ جب وضو کر کے آدمی چلا، تو مسجد تک جانے میں ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک بدی مٹادی جاتی ہے۔ اب نیکیوں کا ایک ذخیرہ یہاں سے جمع ہوا۔
—— پھر فرمایا گیا۔ اگر مسجد میں بیٹھا ہے اور ابھی نماز نہیں ہوئی، دیر ہے۔ یہ انتظار کر رہا ہے۔ تو نماز کا انتظار کرنے والا نماز پڑھنے والے کے حکم میں ہے۔ انتظار کے وقت میں اتنا ہی اجر دیا جائے گا جتنا کہ نماز پڑھنے میں دیا جاتا ہے۔ یہاں سے ایک اجر کا ذخیرہ مہیا ہوا۔ تو وہاں سے ثواب کے وعدے دینے شروع کئے۔ کہ لحاف سے اٹھے تو اجر و ثواب۔ وضو کی تو ایک ایک عضو دھونے پر ثواب، مسجد گئے تو ایک ایک قدم پر ثواب، مسجد میں انتظار کیا تو ایک ایک منٹ پر ثواب —— تاکہ نماز کا وقت آجائے۔ تو مقصود نماز کا ثواب دینا ہے —— اس کے لئے ایک سلسلہ بچھادیا کہ وہاں سے آدمی چلے۔ تاکہ نماز کے قضا ہونے کا کوئی احتمال باقی نہ رہے ——

تو جیسے ناجائز چیزوں میں روکنے کے لئے اسباب تک کو روک دیا۔ یہاں فرائض کے ادا کرانے کے لئے کچھ اسباب بھی کر دئے تاکہ آدمی مکمل طریق پر اپنے دین کو انجام دے۔

یہ بات مجھے اس پر یاد آگئی، کہ سوال اس نے یہ کیا تھا کہ اسلام نے کوئی نئی چیز نہیں کیا لاکر دی، جو ہم اس کی طرف متوجہ ہوں ؟ - میں نے کہا کہ دین نیا نہیں لاکے دیا۔ دین تو وہی ہے جو سارے انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ اس دین کی تکمیل لاکر دی ہے۔ ہر ہر حکم کو اتنا مکمل کیا کہ وہ مستقل ایک قاعدہ اور ضابطہ بن گیا۔ توحید کی تکمیل، نماز کی تکمیل، صدقات کی تکمیل، حج کی تکمیل، سونے اور جاگنے کے اوقات کو عبادت سے مکمل بنانا۔ یہ چیز اسلام نے لاکر دی ہے۔ اسی کی ہم دعوت دیتے ہیں۔ دوسرے مذاہب میں یہ چیز نہیں ملتی۔ اصل دین ملتا ہے۔ نیکی ملتی ہے۔ ہر مذہب کہے گا کہ زنا مت کرو، بہت بری بات ہے۔ کوئی بھی اجازت نہیں دے گا۔ لیکن بچنے کے طریقے کیا ہیں؟ قانون کا ایک لامبہ سلسلہ

یہ نہیں ملے گا۔ ہر مذہب کہے گا کہ شراب مت پیو، لیکن شراب کے لئے اسباب کیا ہیں جن سے شراب بنتی ہے اور جن سے پیتا ہے۔ ان سے اسلام نے روکا ایسی صحبت مت اختیار کرو جس میں شراب کی رغبت پیدا ہو سیلے اوباش لوگوں کے پاس بیٹھو بھی مت، جو تمہیں شراب پینے پر ڈال دیں، اور تمہارے اندر رغبت پیدا کر دیں ـــــــــ

ایک ایک شق اور سبب کو روک دینا ہر حکم میں یہی دیکھتے ہیں۔ ہر حکم ایک مستقل قانون بنا ہوا ہے۔ یہ ہے تکمیلِ دین۔ یہ تکمیل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے آئی۔ تو کامل دین ایک مستقل نعمت ہے، اور اس نعمت کے لانے والے حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس واسطے آپ کا دنیا میں آنا سب سے بڑی نعمت ہے۔

اللہ کی طرف سے ہدیہ

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا: انا رحمۃ مھداۃ۔ میں اللہ کی ایک رحمت ہوں، جو بطور ہدیہ کے بندوں کے پاس بھیجی گئی ہے۔ اللہ کا ایک ہدیہ جو بندہ کو ملا وہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے ـــ تو اتنی بڑی نعمت دی گئی کہ جتنی عالم کی نعمتیں ہیں ـــ سب اسی کے طفیل میں مل رہی ہیں۔ زندگی کی نعمت ملی، تب اسی کے طفیل ملی۔ جب آدم علیہ السلام کو فرمایا کہ اگر انہیں پیدا نہ کرنا ہوتا، تمہیں بھی پیدا نہ کرتے۔ اگر آدمؑ کو پیدا نہ کرتے۔ ہم اور آپ کہاں سے آجاتے ؟ ـــ ہمارا وجود اور زندگی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے ہے۔ زندگی کے بعد جتنی کائنات میں نعمتیں ہیں۔ اگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نہ آتے کائنات نہ بنتی۔ تو وہ نعمتیں پھر آپ کے طفیل ہوئیں ـــ ہمیں کھانا پینا جو بھی نعمتیں مل رہی ہیں وہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے مل رہی ہیں ـــــ اگر آخرت میں نعمتیں ملیں گی، وہ ایمان کی وجہ سے ملیں گی۔ ایمان حضورؐ نے لا کے دیا۔ پھر یہ ایک

مستقل نعمت ہے۔ غرض دنیا سے لے کر قبر تک ، اور قبر سے لے کر حشر تک نعمتوں کا ایک سلسلہ ہے وہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں ہے۔ اس لئے اس نعمت کا جتنا بھی ناز کیا جائے ، وہ کم ہے ، اور جتنا بھی حضورؐ کے حقوق کو پہچانا جائے اتنا ہی کم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق بنیادی طور پر تین ہیں ، جن کا ادا کرنا ضروری ہے۔ ایک عظمت ، ایک محبت ، ایک متابعت ۔ عظمت یہ کہ آپ کو اتنا بڑا جانا جائے کہ کائنات میں کوئی اتنی بڑی ہستی نہیں ہے جتنی آپ کی ہے ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

دوسری چیز محبت ہے ۔ اگر محبت نہیں ہوگی تو ایمان نصیب نہیں ہوگا۔ آپؐ کا یہ حق ہے کہ ہم آپؐ سے محبت کریں ۔ محبت کا یہ خاصہ ہے کہ فقط محبوب ہی محبوب نہیں ہوتا ۔ محبوب کی ادائیں بھی محبوب ہو جاتی ہیں ۔ جس سے محبت ہوتی ہے ، تو آدمی یہ چاہتا ہے کہ میں صورت بھی ایسی بنالوں جیسی محبوب کی ہے ۔ میں چال ڈھال بھی ایسی بنالوں جیسی محبوب کی ہے ۔ میں رہن سہن کا ڈھنگ بھی وہ بنالوں جو میرے محبوب کا ہے ۔ محبوب سے جب محبت ہوتی ہے تو فقط محبوب سے نہیں ہوتی ، اس کی ہر اِک اِک ادا سے محبت ہو جاتی ہے ۔ اس کا گھر در بھی محبوب بن جاتا ہے ۔ جیسے مجنوں لیلےٰ کا عاشق بن گیا تھا ۔ لوگوں نے دیکھا کہ مجنوں لیلےٰ کے مکان کی ایک ایک اینٹ چومتا ہوا پھر رہا ہے ۔ لوگوں نے کہا کہ بھئی! اینٹ میں کیا رکھا ہے ؟ اس نے ایک شعر پڑھا ؎

امر علے الدیار دیار لیلیٰ اقبل ذاالجدار وذاالجدارا

میں لیلےٰ کے مکان سے گزرتا ہوں تو کبھی اس اینٹ کو چومتا ہوں کبھی اس کو ، کبھی دہلیز کو ، کبھی اس کے کواڑوں کو ۔

وماحب الدیار شغفن قلبی ولکن حب من سکن الدیارا

مجھے ان اینٹوں سے محبت نہیں ۔ مجھے اس سے محبت ہے جو ان اینٹوں کے اندر بیٹھی ہوئی ہے ۔ اس کی وجہ سے مجھے اینٹیں بھی عزیز ہو گئیں ۔ وہ محبوب ہے

تو اُس کا مکان اور کتا بھی محبوب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہمیں محبوب ہیں، تو مدینہ منوّرہ بھی محبوب ہے، اس لئے کہ حُضور صلے اللہ علیہ وسلم کا شہر ہے۔ مسجدِ نبوی ؐ بھی ہمیں محبوب ہے کہ وہ حُضورؐ کی مسجد ہے۔ مدینہ کے رہنے والے بھی ہمیں محبوب ہیں، اور ہم انہیں اپنا مخدوم جانتے ہیں۔ اس لئے کہ حُضورؐ کے پڑوسی ہیں۔ جب محبوب محبوب ہے۔ تو ادائیں بھی محبوب، ان سے جن کو نام لگ گئے ہیں یا ان کی نسبت لگ گئی ہے، وہ بھی سب محبوب بن گئے۔ تو وہ وطن بھی، مکان بھی، اور وہاں کے باشندے بھی محبوب۔

سب سے بڑی نعمت کی عظمت پہچاننے والے

اور عظمت تو عظمت کرنے والوں نے کی۔ ہم تو دعوے ہی دعوے کرتے ہیں حقیقی عظمت کرنے والے تو گزر گئے۔ عظمت کرنے والے وہ تھے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جب حج کرنے گئے ہیں، تو تین دن ٹھہر کر مدینہ طیبہ سے واپس ہونے لگے، تمام اہلِ مدینہ نے آکے راستہ روکا کہ ہم تو آپ کو نہیں جانے دیں گے۔ امام ابو حنیفہؒ کی عظمت اور محبت تھی۔ سارے اہلِ مدینہ آکے کھڑے ہو گئے کہ ابھی آپ اور رہیں۔ ہم نہیں جانے دیں گے۔ ان کے کہنے سننے سے پھر رُک گئے، پانچ دن کے بعد پھر ارادہ کیا، پھر اہلِ مدینہ نے آکے روک دیا کہ ہم ابھی نہیں جانے دیں گے۔ بہت کہا، بہت معذرت کی مگر اہلِ مدینہ نے نہیں مانا۔ پھر رُک گئے۔ یہاں تک کہ کئی دفعہ ہوتے ہوتے گیارہواں دن آگیا۔ اب جانے کا ارادہ کیا، پھر اہلِ مدینہ نے روکا۔ کہا اب میرے بس میں نہیں ہے رکنا۔ لوگوں نے عرض کیا۔ حضرت! بس کی کیا بات ہے؟ فرمایا۔ گیاراں دن گزر گئے ہیں۔ آج تک میں نے استنجا نہیں کیا۔ ایک ہی وضو سے اتنے دن گزارے۔ اس لئے کہ میرے دل نے گوارہ نہیں کیا کہ مدینۃ الرسول صلے اللہ علیہ وسلم میں آکر میں یہاں بول و براز کروں۔ اس زمین کو

گندہ کروں۔ معلوم نہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا قدم کہاں پڑا ہو گا۔ اور میں وہاں گندگی ڈالوں ——— ؟ یہ بھی حقیقی عظمت۔ ہم اور آپ اس عظمت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ امام ہی کا رتبہ اور حق تھا کہ گیارہ دن تک ایک وضو سے رہے۔ تب اہل مدینہ نے کہا کہ اب تو ہم جلدی رخصت کریں گے ——— جلدی رخصت کیا۔ تب جا کے استنجا، وغیرہ سے فارغ ہوئے ——— خیر یہ تو ایک کرامت کا درجہ ہے۔ ہر ایک اس کو انجام نہیں دے سکتا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام دار الہجرت کہلاتے ہیں۔ مدینہ سے بے حد محبت تھی اور یہ چاہتے تھے کہ مدینہ ہی میں میری وفات ہو جائے۔ اور مدینہ ہی کی زمین مجھے قبول کرے۔ تو اخیر عمر ساری مدینہ ہی میں گزاری۔ اور اس ڈر کے مارے حج نفل ادا کرنے نہیں جاتے تھے کہ کہیں مدینہ سے باہر موت نہ آجائے۔

کیفیت یہ تھی، جب تک مدینہ میں رہے ہیں۔ مدینہ کی گلیوں اور بازاروں میں ننگے پاؤں پھرتے تھے کہ معلوم نہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک کہاں پڑا ہو گا۔ میں جوتے لے کر وہاں سے گزروں ؟ ——— مجھے چاہیئے تھا کہ میں سر کے بل چلتا۔ مگر یہ میرے بس میں نہیں۔ کم سے کم جوتا تو پہن کے نہ چلوں۔ عظمت حقیقی یہ بھی جو ان اکابر نے کی ہے کہ سارے عمر مدینہ میں جوتے پہن کر نہیں چلے۔

حضرت مولنا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دار العلوم دیوبند، جب حج کے لئے گئے ہیں تو مدینہ منورہ کے قریب ایک منزل آتی ہے، جس کو بیر علی کہتے ہیں۔ ذرا سی پہاڑی ہے، اس پر جب اونٹ یا کاریں چڑھتی ہیں تو ایک دم حرم شریف کے مینارے نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے مدینہ منورہ تین چار میل کے فاصلے پر ہے ——— یہ حضرات جب مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ حضرت مولنا محمد قاسم صاحبؒ اور مولنا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور سارے بزرگ ——— جب بیر علی پر پہنچے اور حرم کے مینارے نظر پڑے۔ تو حضرت مولنا قاسم صاحبؒ بے تاب ہو کر ایک دم اونٹ سے کود ے، اور ننگے پیر چل پڑے تھے۔ اور کچھ عاشقانہ اشعار زبان پر

تھے، جیسے معلوم ہو کہ اپنے ہوش میں نہیں۔ حالانکہ وہاں کی کنکریاں ایسی ہیں کہ جب وہ چُبھتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے چھُریاں چُبھ رہی ہوں —— اور لوگ حضرت کو دیکھ کر کود پڑے۔ مولٰنا گنگوہی رحؒ نے فرمایا کہ یہ دوسرے لوگ جو کود ے ہیں، یہ نقالی کر رہے ہیں، ان پر تو حال طاری ہے، وہ تو اپنے آپے میں نہیں۔ ان کی یہ نقل نہیں اتار سکیں گے۔ چار پانچ میل اسی طرح ننگے پاؤں چلے۔ پیر لہولہان ہو گئے مگر انہیں کچھ ہوش نہیں تھا۔ حقیقی عظمت تو اہل اللہ کی ہوتی ہے۔ جن پر عظمت کا حال طاری ہوتا ہے —— لیکن میں کہتا ہوں۔ ہم اگر تھوڑی بہت نقل بھی اتار لیں۔ یہ بھی ہماری سعادت ہے۔ وہ حال تو حال والوں کا ہوتا ہے۔ ہم میں وہ حال کہاں ؟

غرض مدینہ منورہ سے محبت کیوں ہیں۔ اس لئے کہ صاحبِ مدینہ سے محبت ہے، وہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا وطن بنا تھا۔ جب وطن والا ہمارا محبوب ہے، تو وہ وطن بھی محبوب، اس وطن کے رہنے والے بھی ہمیں محبوب، اس کا پانی اور اینٹ اینٹ بھی محبوب —— یہی وجہ ہے کہ خاکِ شفاءٔ مدینہ کی مٹی، تھوڑی تھوڑی تبرک کے طور پر لے کر آتے ہیں۔ اس کو گھر میں تبرکاً رکھتے ہیں۔ اس واسطے کہ جس ذاتِ اقدس سے ہمیں محبت ہے۔ وہیں کی تو یہ مٹی ہے۔ یہ مٹی بھی ہمیں عزیز ہے، اس کا ایک ذرہ بھی ہمیں عزیز ہے۔

امام مالک رحؒ کا تو یہ حال تھا کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مجھے موت مدینہ میں آئے۔ نفلی حج کرنا اس ڈر کے مارے چھوڑ دیا تھا کہ کہیں باہر نہ وفات ہو —— ان کے واقعات میں لکھا ہے۔ کہ ایک دفعہ خواب میں دیکھا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا دربار ہے۔ صحابہ کرام رضؓ حاضر ہیں۔ امام مالک رحؒ آگے بڑھے، اور عرض کیا۔ یارسول اللہؐ! مجھے یہ بتلا دیا جائے میری عمر کتنی باقی ہے ہے، تاکہ میری عمر زیادہ باقی ہو تو میں حج نفل کر لوں۔ اور توقع رکھوں کہ لوٹ کے آجاؤں گا، اور مدینہ میں میرا انتقال ہو جائے گا۔ میں مدینہ کی زمین کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ پتہ چل جائے

کہ میری عمر کے کتنے سال باقی ہیں۔ اگر دو تین سال باقی ہوں تو میں نفلی حج ہی کر آؤں ——— ؟

یہ پوچھا۔ تو آپؐ نے اس طرح سے ہاتھ سامنے کر دیا کہ پانچ انگلیاں سامنے ہیں۔ امام مالکؒ کی آنکھ کھل گئی۔ اور حیران ہوئے کہ پانچ انگلیوں کا کیا مطلب ہے؟ آیا میری عمر کے پانچ برس، یا پانچ ماہ، یا پانچ ہفتے یا پانچ دن باقی ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

تو تعبیر خواب کے بڑے ماہر محمد ابن سیرینؒ جو تابعی بھی ہیں۔ اور امام مالکؒ کے ہمعصر ہیں ـــ خواب کی تعبیر ایسی دیتے تھے، کہ ادھر تعبیر دی، اور ادھر ہاتھ کے ہاتھ واقعہ ظاہر ہو گیا۔ اس فن کے بڑے امام تھے۔ انہوں نے کتاب لکھی ہے "تاثیر الانام فی تعبیر المنام" ——— وہ جلدوں میں ہے اس میں بہت بڑے تعبیر خواب کے اصول بتلائے ہیں۔

ان کی بات پر یاد آیا۔ ان کے پاس ایک شخص آیا اور آکر عرض کیا۔ حضرت! میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ میری چارپائی کے نیچے انگارے دھک رہے ہیں۔ فرمایا جلدی جا۔ تیرا مکان گرنے والا ہے۔ بیوی بچوں اور سامان کو نکال آیا ——— بے چارے نے جلدی جلدی سامان اور بیوی بچوں کو نکالا۔ دو تین گھنٹے کے بعد ساری بلڈنگ آپڑی ـــ خواب کی تعبیر بالکل ہاتھ کے ہاتھ ظاہر ہو گئی ——— کوئی پانچ چھ مہینے کے بعد ایک اور شخص آیا۔ اور عرض کی میں نے خواب دیکھا ہے کہ میری چارپائی کے نیچے انگارے دھک رہے ہیں۔ فرمایا جا کر چارپائی کے نیچے کھدائی کر، تجھے سونا ملے گا، کھودنا جو شروع کیا تو لاکھوں روپے کا سونا نکلا۔ ایک خزانہ دبا ہوا نکلا ———

لوگوں نے امام ابن سیرینؒ سے عرض کیا کہ حضرت! خواب تو دونوں نے ایک ہی دیکھا ایک کا تو آپ نے گھر گروا دیا۔ اور ایک کو سونا دلوا دیا ——— فرمایا کہ پہلے نے جو خواب دیکھا، وہ گرمی کے زمانے میں دیکھا۔ اور گرمی میں چارپائی کے نیچے آگ کا ہونا، یہ گویا بنیاد کے منہدم ہونے کی علامت ہے۔ میں نے تعبیر دی کہ تیرا گھر گر پڑے گا ——— اور دوسرے نے یہی خواب سردی کے زمانے میں دیکھا، اور سردی میں چارپائی کے

نیچے آگ کا ہونا یہ بڑی خوشگوار نعمت ہے۔ اس سے بڑھ کر نعمت نہیں۔ اور آگ کی رنگت سونے کے مشابہ ہے۔ میں نے کہا چارپائی کے نیچے سے سونا نکلے گا۔ دونوں باتیں پوری ہوئیں۔ تو ابن سیرینؒ اس درجے کے امام تھے، کہ ان کی تعبیر ہاتھ کے ہاتھ پوری ہوتی تھی ـــــ امام مالکؒ نے اپنا یہ خواب کہ میں نے عمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی۔ آپؐ نے پانچ انگلیاں سامنے کر دیں۔ ایک شخص سے کہا کہ تو اس کی تعبیر ابن سیرینؒ سے پوچھ کے آ۔ مگر یہ مت کہنا کہ مالکؒ نے یہ خواب دیکھا ہے۔ بس کہنا کہ ایک مسلمان نے یہ خواب دیکھا ہے میرا نام مت بتلانا ـــــ وہ شخص ابن سیرینؒ کے پاس گیا اور کہا کہ ایک مسلمان نے یہ خواب دیکھا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ہے اور وہ یہ عرض کر رہا ہے کہ حضرت! یہ فرما دیجئے۔ میری عمر کتنی باقی ہے۔ آپؐ نے پانچ انگلی اٹھا دی ــ اس کی کیا تعبیر ہے؟

فرمایا۔ سچ بتلا یہ خواب کس نے دیکھا ہے؟ اس نے کہا جس نے دیکھا ہے اس نے نام بتلانے کی ممانعت کر دی ہے۔ بس یہ سمجھ لیجئے ایک مسلمان نے دیکھا ہے۔

فرمایا یہ خواب کوئی بہت بڑا عالم دیکھ سکتا ہے۔ عوام الناس میں سے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اور فرمایا۔ مدینہ میں امام مالکؒ سے بڑا کوئی عالم نہیں۔ تو امام مالکؒ نے تو یہ خواب نہیں دیکھا؟ ۔ اب وہ بے چارہ چپ ہو گیا۔ اسے ممانعت تھی۔ فرمایا۔ اچھا جاؤ پوچھ کے آؤ۔ نام بتلانے کی اجازت لے کے آؤ۔

اس نے آکر عرض کیا۔ حضرت! وہ تو پہچان گئے کہ آپ ہی نے خواب دیکھا ہے مگر چونکہ اجازت نہیں تھی اس لئے میں نے کوئی حامی نہیں بھری۔ بس چپ ہو گیا۔ فرمایا۔ اچھا جاؤ میرا نام بتلا دینا۔ یہ آیا اور آکر ابن سیرینؒ سے عرض کیا کہ وہ واقعی امام مالکؒ نے ہی خواب دیکھا تھا۔ آپ نے ٹھیک سمجھا تھا۔ فرمایا۔ امام مالکؒ ہی یہ خواب دیکھ سکتے تھے دوسرے کسی عالم کی مجال نہیں تھی۔ کہہ دینا۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ حضورؐ نے جو پانچ انگلیاں اٹھا کے دکھلائیں۔ اس سے نہ پانچ برس، نہ پانچ گھنٹے نہ پانچ دن اور ماہ مراد ہیں بلکہ اشارہ اس طرف ہے کہ ھی من خمس لا یعلمھن الا اللہ ــ موت اور زندگی کا علم ان پانچ

چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں - ان اللہ عندہ علم الساعۃ۔ وینزل الغیث - ویعلم ما فی الارحام- وما تدری نفس ماذا تکسب غدًا- وما تدری نفس بای ارضٍ تموت ـــــ پانچ چیزیں اللہ نے ارشاد فرمائیں کہ قیامت کا علم اللہ ہی کو ہے کہ کب آئے گی ؟ کس سن میں آئے گی ؟ کسی کو اس کا علم نہیں دیا گیا حتیٰ کہ حضورؐ کو بھی نہیں دیا گیا- اور یہ بارش کہاں سے آتی ہے ؟ کیوں آتی ہے ؟ کیا اسباب باطنی بنتے ہیں کسی کو پتہ نہیں- ظاہری طور پہ ہم آلات سے پتہ چلالیں کہ بادل اٹھے گا، مون سون اٹھے گا لیکن خود مون سون آج کے دن کیوں اٹھے گا- مون سون کو بنانے والی کیا چیز ہے ؟ وہ کیا ہے ؟ اور وہ کیوں بناتی ہے- یہ سب علل اور بنیادی چیزیں اللہ ہی جانتا ہے- اللہ کے سوا کسی کے علم میں نہیں ہے- ہم ظاہری اسباب کا کچھ پتہ چلا سکتے ہیں- مگر باطنی اسباب کا کچھ پتہ نہیں- وہی جانتا ہے ـــــ ویعلم ما فی الارحام- ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ لڑکا یا لڑکی ؟ اللہ ہی جانتا ہے- بعض دفعہ بزرگوں نے بتلا دیا ہے کہ لڑکی ہے یا لڑکا ہے- وہ شخصی طور پہ ایک جزوی چیز بتلائی- کلی طور پہ یہ علم کہ لڑکا کیوں بنتا ہے؟ لڑکی کیوں بنتی ہے؟ کیا اندرونی اسباب ہیں کہ اس دفعہ لڑکا بن گیا- اس دفعہ لڑکی بن گئی - یہ اللہ ہی کے علم میں ہے ـــــ وما تدری نفس ماذا تکسب غدًا - اور کسی نفس کو یہ پتہ نہیں وہ کل کو کیا عمل کرنے والا ہے- کل جب آئے گی تبھی پتہ چلے گا ـــــ اور وما تدری نفس بای ارض تموت - کسی نفس کو یہ پتہ نہیں کہ کونسی زمین میں اور کب اس کا انتقال ہوگا؟- ـــــ تو فرمایا- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پانچ انگلیاں دکھائیں - اس کا یہ مطلب ہے کہ کونسی زمین میں آپؐ کا انتقال ہوگا- یہ ان پانچ چیزوں میں سے ہے کہ اللہ کے سوا کسی کے علم میں نہیں ہے-

سب سے بڑی نعمت کے حقوق

تو بات مجھے اس پر یاد آئی تھی کہ چونکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پورے عالم کے لیے محسنِ اعظم ہیں اور ساری نعمتیں آپ کے طفیل سے ہیں- تو آپؐ کے حقوق کو پہچاننا یہ سب سے بڑی نعمت ہے-

اور آپ ؐ کے حقوق تین ہیں۔ آپ ؐ سے ہم محبت کریں۔ آپ کی عظمت کریں۔ آپ ؐ کی اطاعت اور متابعت کریں ۔۔۔ تو عظمت کے بارے میں میں کہہ رہا تھا کہ عظمتِ حقیقی کرنے والے تو گزر گئے ہیں۔ لیکن ان کو دیکھ کر کچھ بھی کر لیں وہ بھی ہماری سعادت ہے۔ چلو جتنی ہی کر سکیں ۔۔۔۔ ورنہ اصل عظمت تو یہ تھی کہ امام مالکؒ نے عمر بھر جوتا پہننا چھوڑ دیا۔ امام ابو حنیفہؒ نے گیارہ دن استنجا تک نہیں کیا کہ مدینۃ الرسول میں رہ کر میں گندگی پھیلاؤں۔

دوسری چیز محبت ہے کہ اولاد بنیاد کی محبت اس درجہ کی نہ ہو۔ یعنی جب اولاد بنیاد سے مقابلہ پڑے، تو ہم اللہ و رسول کی محبت کو ترجیح دیں۔ اولاد کی محبت کو ترجیح نہ دیں۔ جب کسی حکم شرعی سے اولاد کی محبت سے مقابلہ پڑ جائے تو ہم حکم شرعی کو ترجیح دیں۔ مثلاً خدانخواستہ کسی کا بچہ بیمار ہو جائے۔ تو مرد تو نہیں، مگر عورتیں، ٹوٹکے، ٹونے اور شرکیہ رسموں میں مبتلا ہو جاتی ہیں، کہ شاید یہ اچھا ہو جائے۔ جو خلافِ شرع ہوتا ہے۔ تو محبت کا تقاضا یہ ہے کہ شریعت سے محبت ہونی چاہیئے۔ بچے سے اتنی نہ ہو کہ ماں باپ شرکیہ امور سرانجام دینے لگیں، کہ کسی طرح اس کی جان بچ جائے۔ جان بچانے والا اللہ ہے۔ جب اس کے قانون کی پابندی کر دگے، ممکن ہے اسی کی برکت سے جان بچ جائے ۔۔۔ بچے کی جان بچانے کے لئے شرکیہ امور انجام دینا یہ اس کی دلیل ہے کہ خدا کی محبت گویا اتنی نہیں ہے، جتنی بچے کی ہے۔ بچے کی محبت سامنے آئی تو خدا کے قانون کو چھوڑ دیا۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ بچے کی جان کی شریعت کے مقابلے میں پرواہ نہ کی جائے۔ تو دوسرا حق یہ ہے۔

۔۔۔۔ اور تیسرا حق متابعت ہے، جو قانون آپ ؐ نے لا کے دیا ہے اس کی پیروی اور اطاعت کریں۔ جو سنتیں آپ ؐ سے ثابت ہیں۔ ان کی اتباع کریں۔ ایک ایک سنت کی پیروی میں جو نورانیت اور برکت ہے، ہم اپنی عقل سے ہزار قانون بنا لیں اس میں وہ خیر و برکت نہیں آسکتی۔ جو آپ ؐ کی ایک سنت کی ادائیگی میں برکت ہو سکتی ہے۔ تو ایک ایک سنت کی پابندی کرنا مثلاً پہننے میں، کھانے میں پینے میں

چلنے پھرنے میں، اٹھنے بیٹھنے میں، اس انداز کو اختیار کرنے کی کوشش جو آپ کا انداز تھا۔ یہ ایک مستقل نعمت اور برکت ہے۔ اسی کا نام متابعت ہے۔

ایک فرائض میں اتباع ہے جیسے نماز پڑھ لی، وہ بھی آپ ہی کی سنت کے مطابق پڑھیں گے۔ روزہ رکھیں گے، وہ بھی حضورؐ ہی کے طریق کے مطابق ہے۔ یہ وہ فرائض ہیں جو ہمارے ذمے ہیں ہی۔ اصل تو یہ ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی کو آپؐ کی زندگی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ اسی کے لئے تعلیم پائی جاتی ہے۔ علم سیکھا جاتا ہے، تو قدم بقدم چلنے کی کوشش کریں۔

مَیں نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بزرگوں میں سے کسی نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے آنے کی خبر ہے، اور آپؐ تشریف لے جارہے ہیں۔ صحابہؓ کا ہزاروں کا مجمع پیچھے ہے اور بھی ہزاروں لوگ ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو بھی دیکھا گیا، وہ بھی مجمع کے ساتھ ساتھ ہیں۔ لیکن مجمع تیزی سے جارہا ہے، کہ جلدی سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت کریں، اور مولانا آہستہ آہستہ دھیمی چال، سوچ سوچ کے قدم رکھ رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے مجمع سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں — لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! لوگ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے شوق میں دوڑے جارہے ہیں کہ حضورؐ آگے آگے ہیں۔ جلدی پہنچیں، اور کسی طرح زیارت نصیب ہو — جا تو آپ بھی رہے ہیں، مگر قدم ٹٹول ٹٹول کے۔ فرمایا کہ ہاں۔ میں چاہتا ہوں کہ جہاں حضورؐ کا قدم پڑا ہے۔ مَیں بھی وہاں قدم بہ قدم، قدم رکھوں۔ اس کے دیکھنے میں دیر لگتی ہے۔ اس لئے مَیں آہستہ چل رہا ہوں۔ الحمدُ للہ میرا ایک قدم بھی حضورؐ کے نشان سے الگ نہیں پڑا۔ ٹھیک اسی نشان پہ قدم رکھتا ہوا جارہا ہوں۔ اگرچہ دیر میں پہنچوں گا۔ گویا وہ ان کی اتباعِ سنت کی چیز تھی جو خواب میں دکھلائی گئی — مسلمان میں یہ جذبہ ہونا چاہیئے کہ اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو اس انداز میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہو بہو نقشہ تو ہم نہیں اتار سکتے۔ ہماری ایسی قسمت کہاں ہے

مگر اپنا کام سعی اور جد وجہد کرنا ہے۔ دل میں تڑپ پیدا ہو جائے۔ اگر تڑپ پیدا ہو گئی تو ممکن ہے اللہ پوری پیروی نصیب کر دے۔ ورنہ جتنی بھی نصیب ہو جائے۔ اس جذبہ کی وجہ سے ہمیں نجات ہونے کی توقع ہے — تو تین حقوق ہیں۔ ایک عظمت، ایک محبت، ایک متابعت۔

محبت میں فنائیت ہوتی ہے کہ آدمی محبوب میں فنا ہو جائے۔ متابعت میں قدم بہ قدم چلنے کا جذبہ ہوتا ہے، کہ ایک ایک چیز میں پیروی نصیب ہو۔ عظمت سے اعتقاد پیدا ہوتا ہے۔ اگر بڑائی دل میں نہ ہو تو عقیدت نہیں ہو سکتی۔ اور عقیدت و اعتقاد نہیں ہو گا۔ تو ایمان نہیں بنے گا۔ اس واسطے ان تینوں حقوق کی ضرورت ہے۔

تو میں نے آیت وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین۔ پڑھی تھی، کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے بارے میں حق تعالٰے فرماتے ہیں ہم نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔ تو عالموں کا وجود، ان کی نعمتیں اور ان کی ہستی آپ کے طفیل ہی ہے۔ جو ہستی ایسی بابرکت ہو، جس امت کو دی گئی ہو۔ وہ امت کتنی قسمت والی اور بانصیب ہے کہ حضورؐ جیسا نبی عطا کیا گیا۔ تو امت پر نبی کے حقوق کا حق عائد ہوتا ہے۔ تو محبت بھی ہو، عظمت بھی ہو، اور متابعت بھی ہو۔ محض محبت ہو کہ آدمی دعوٰے کرے کہ میں عاشقِ رسولؐ ہوں مگر اطاعت نہ کرے۔ وہ محبت ناتمام ہے۔ محبت کی علامت ہی یہ ہے کہ اطاعت کرے۔ اطاعت دلیل ہے اور محبت دعوٰے ہے۔ جب کہے گا کہ مجھے محبت ہے۔ تو دلیل پوچھیں گے۔ تو کہے گا کہ میں پیروی کر رہا ہوں۔ کہا جائے گا بے شک یہ محبت ہے —

ایک شخص اپنے باپ سے کہے کہ مجھے آپ سے بڑی محبت ہے۔ باپ کہے مجھے حقہ پینے کی عادت ہے۔ ذرا حقہ بھر کے لاؤ۔ تو کہے صاحب! میں نے تو یہ کہا تھا کہ مجھے محبت ہے۔ یہ کب کہا تھا کہ میں حقہ بھی بھر کے لاؤں گا، یا پانی بھی پلاؤں گا باپ کہے گا تو پھر محبت کیسی؟ محبت تقاضا کرتی ہے کہ جو میں کہوں وہ کر۔ — تو ہم نے دعوٰے کیا کہ ہمیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔ محبت کا خاصہ ہے

کہ اطاعت ہو۔ اطاعت نہیں ہوگی تو دعویٰ محبت غلط ہوگا۔

اسی کو حدیث میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ من احبنی فقد اطاعنی، ومن اطاعنی کان معی فی الجنۃ۔ جسے میرے ساتھ محبت ہوگی، وہ میری اطاعت بھی کرے گا۔ اور جو اطاعت کرے گا وہ جنت میں بھی میرے ساتھ ہوگا۔ تو اصل بنیاد محبت ہے۔ اور محبت کی علامت اطاعت ہے اور دل میں عظمت ہو۔

تو آیت میں نے پڑھی تھی، اس کی روشنی میں یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں تاکہ حقوقِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے آجائیں۔ سارا دین اور اسلام اس لئے ہے کہ انسان آپ ؐ کے حقوق پہچان لے ـــــ دعا کیجیے اللہ تعالےٰ ہمیں اطاعت، محبت و عظمت اور عقیدت و اعتقاد کی توفیق عطا فرمادے اور سنت کی پیروی نصیب فرمادے، اور ہم کو اپنی مرضیات پر چلائے۔

اللّٰھم ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا
وھب لنا من لدنک رحمۃ۔ انک انت الوھاب
واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

بیتُ اللہِ الکریم

(بیتُ اللہ، محض کوئی کوٹھا نہیں ہے، کوئی عمارت نہیں ہے، بلکہ وہ تجلّی گاہِ ربانی ہے اس میں حق تعالیٰ کی وہ تجلی جو اقرب الی الذات ہے، وہ موجود ہے۔ اسی تجلّی کو ہم سجدہ کرتے ہیں۔ اسی تجلّی کو سجدہ کرنا، عینِ ذات کو سجدہ کرنا ہے —— تجلّی کے معنیٰ فی الحقیقت عکس کے ہیں۔ تو بیتُ اللہ "آئینۂ جمالِ خداوندی" ہے۔ جس میں حق تعالےٰ نے اپنا عکس ڈالا ہے۔ اور عکس اور اصل میں عینیت ہوتی ہے ......)

از:۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

ترتیب

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ و نتوکل علیہ، ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔ من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ۔ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ۔ ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولٰنا محمدًا عبدہ ورسولہ۔ ارسلہ اللہ الی کافۃ للناس بشیرًا ونذیرًا۔ وداعیا الیہ باذنہٖ وسراجًا منیرًا۔

امابعد: ــــ فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ــــ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبٰرکا وھدی للعٰلمین۔ فیہ اٰیٰت بینٰت مقام ابراھیم ومن دخلہ کان اٰمنًا ــــ صدق اللہ العلی العظیم۔

(آل عمران پ۴ ع۱)

اوّلِ عالَم

بزرگانِ محترم!

اس وقت ہم سب خدامِ دین بحمد اللہ کہ اوّلِ عالَم میں موجود ہیں ــ جو مرکزِ عالَم بھی ہے، وسطِ عالَم بھی ہے اور اصلِ عالَم بھی ہے۔

میں نے یہ چار الفاظ مکہ کے بارے میں استعمال کئے ہیں۔
اوّلِ عالم، اصلِ عالم، مرکزِ عالم اور وسطِ عالم۔ یعنی سب سے پہلا مقام دنیا میں یہی ہے اور ہم سب کی اصل یہی ہے۔ اور اس عالمِ شاہد کے بیچوں بیچ بھی یہی ہے، اور مرکزِ عالم بھی یہی ہے —— یہ چار چیزیں ہیں۔ اس میں بعض امور تو نصِ قطعی سے ثابت ہیں۔ یعنی قرآن کریم نے خود تصریح فرمائی ہے، اور بعض آثارِ صحابہؓ سے ثابت ہیں۔ یعنی اس بارے میں یا تو حدیث مرفوع ہے نہیں یا ہمارے علم میں نہیں۔ لیکن آثارِ صحابہؓ بکثرت ملتے ہیں۔ جن سے یہ چاروں دعوے ثابت ہوتے ہیں۔
قرآن حکیم نے تو ارشاد فرمایا ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ خدا کا سب سے پہلا گھر جس کو اللہ نے لوگوں کے لئے وضع کیا وہ بکہ میں ہے —— خواہ بکہ کے معنی مکہ کے ہوں۔ یا بکہ کے معنی اس موضع کے ہوں جس میں بیتُ اللہ الکریم واقع ہے۔ اور اس کے اردگرد کو مکہ کہتے ہوں — یہ اختلافِ اقوال ہے۔ مگر بہر حال حاصل یہ نکلا کہ خدا کا سب سے پہلا گھر جو عبادت کے لئے بنایا گیا، وہ مکہ میں ہے جس کا نام بیت اللہ الکریم ہے —— یعنی قدرت نے جب ارادہ کیا کہ اس عالم کو پیدا کیا جائے اور بنایا جائے تو اس میں سب سے پہلی وضع بیت اللہ کی واقع ہوئی۔ جیسا کہ آثارِ صحابہؓ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس پورے عالم میں پانی ہی پانی تھا۔ یعنی عناصرِ اربعہ میں سے سب سے پہلے اللہ نے پانی کو پیدا فرمایا۔ جب حق تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ اس پانی سے دوسرے عنصر تیار کئے جائیں۔ اور دوسری کائنات بنائی جائے۔ تو اس پانی میں ایک وضع واقع ہوئی۔ پانی میں اتنی جگہ، جہاں بیت اللہ واقع ہے، کا کچھ حصہ ابھرا ہوا تھا۔ جیسے پہاڑی کا ایک چھوٹا سا مقام ہوتا ہے۔ وہ ابھر گیا۔ وہ بیت اللہ تھا۔ اس کے بعد کچھ گہرائی واقع ہوئی۔ اس کے بعد پانی نے ٹکرانا شروع کیا —— تو پانی اور بالخصوص سمندر کا پانی جب ٹکراتا ہے تو اس میں غلظت اور گاڑھا پن پیدا ہوتا ہے

جیساکہ اب بھی آپ دیکھتے ہیں۔ سمندر کے کناروں پر جب پانی ٹکریں کھاتا ہے تو جھاگ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ سمندر جھاگ مثل پتھر کے ہوتی ہے۔ اسی طرح سے پانی نے لہرانا شروع کیا۔ اور ٹکریں کھاکر اس میں غلظت اور گاڑھا پن پیدا ہوا۔ گاڑھے پن نے سختی اختیار کی۔ اور وہ ایک اینٹ کے برابر سختی پیدا ہوئی —— اس کا مطلب یہ ہے کہ اوّل زمین ایک اینٹ کے برابر بنی۔ تو زمین کی اصل یہی بیتُ اللہ ہے۔ اس کے بعد میں حق تعالیٰ نے اس کو بڑھایا اور پھیلانا شروع کیا۔ وہ پھیلتے پھیلتے زمین بنتی گئی اور اس حد پر آکر رُک گئی۔ جس حد تک آج زمین ہے —— کتنے دِنوں میں ؟ ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ قرآنِ کریم میں بعض جگہ تصریحات بھی ہیں۔ لیکن اس وقت مدّت سے بحث نہیں۔ کہ کتنی مدّت تک زمین پھیلی۔ بہر حال زمین پھیلی —— اس کا حاصل یہ نکلا کہ بیت اللہ ساری زمین کی اصل ہے۔ یہیں سے ایک اینٹ کے برابر زمین پیدا ہوئی۔ وہیں سے پھیلی اور پھیلتے پھیلتے اس حد پر آکر رُک گئی۔ جس کو آج ہم زمین کہتے ہیں۔

ہم سب کی اصل بیتُ اللہ ہے

گویا زمین کا اوّل حصہ وہ ہے جو بیتُ اللہ ہے۔ نیچے سے زمین شروع ہوئی، اور آپ سب جانتے ہیں کہ ہم سب زمینی مخلوق ہیں۔ ہمیں اللہ نے اسی مٹی سے پیدا کیا۔ جیساکہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا:۔ کلکم بنو آدم ۔ وآدم من تراب —— تم سب کے سب آدمؑ کی اولاد ہو، اور آدمؑ کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا۔ آدم کی اصل مٹی ہے۔ ہم سب کی اصل بھی مٹی ہے۔ اسی لیے انسان کو مشتِ خاک اور مشتِ غبار کہا جاتا ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے نا کہ :۔

؎ قدرت خدا کی دیکھیں تو انسان کو دیکھئے
کیا کیا تکلفات میں مشت غبار میں

ایک مٹھی بھر مٹی ہے اور کیا کیا تکلفات دکھائے۔ کتنا دنیا کو سجایا۔ اور کہاں تک پہنچایا ــــــ تو حق تعالیٰ شانہٗ نے ہم سب کو مٹی سے بنایا۔ اور مٹی کی اصل بیت اللہ ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ ہم سب کی اصل بیت اللہ ہے۔ ایک عام اصول ہے ــــ کل شیءٍ یرجع الی اصلہٖ۔ ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اگر شاخیں ہیں تو وہ جڑ کی طرف رجوع کریں گی۔ پانی ہے تو وہ اپنے مرکز کی طرف رجوع کرے گا۔ زمین ہے تو وہ مرکزِ ثقل کی طرف رجوع کرے گی۔ ہر چیز اپنے مرکز کی طرف فطرۃً دوڑتی ہے۔ اسے کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اگر بیٹے کو باپ کی طرف کشش ہے تو آپ بیٹوں کو تلقین نہیں کرتے کہ بھئی باپ کی طرف رجوع کرو۔ کہیں نہ کہیں وہ تو رجوع ہو گا۔ اس لئے خِلقۃً و طبعاً تمام انسانوں کو بیت اللہ کی طرف رجوع ہے۔

بیت اللہ کو مرکزِ عبادت بنانے کی حکمت

بعض کے علم میں ہے کہ ہماری اصل ہے اور بعض کے علم میں نہیں ہے۔ علم میں آجائے تو پھر ان میں کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے مثلاً کسی شخص کے اولاد ہوئی، ۔۔ ہوتے ہی باپ چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ بچہ جوان ہوا، بڑی عمر کا ہوا۔ اب اگر باپ کہیں سامنے آئے گا تو طبعی کشش تو ہو گی ــ مگر یہ نہیں جانے گا کہ یہ باپ ہے جب تک کہ پہچنوایا نہ جائے۔ جب پہچان جائے گا کہ یہی ہے وہ باپ جس کی طرف طبعی کشش ہے۔ تو طبعی چھوڑ کر وہ کشش عقلی بھی بن جائے گی۔ قدرۃً آدمی متوجہ ہو گا۔ تو فطرۃً ہر انسان جانتا ہے کہ میری اصل ہے اس کی طرف کشش ہے ــــــ

انبیاء علیہم السلام نے آکر تعارف کرا دیا کہ جس اصل کی طرف کشش ہے وہ یہی اصل ہے۔ علم میں نہیں مگر کشش موجود ہے۔ اور وہ تشخص کے ساتھ موجود ہے۔ جن کے علم میں آگیا۔ وہ ایمان لے آئے۔ انہیں کشش بھی ہے اور تشخص یعنی معرفت اور پہچان بھی ہے۔ غرض انسان کا بیتُ اللہ کی طرف خلقۃً رجوع ہے۔

چونکہ طبعی کشش تھی۔ حق تعالیٰ نے عقلی کشش بھی پیدا فرما دی کہ پھر عبادت میں بھی اسی کو مرکز سمجھو۔ اگر عبادت کا مرکز کوئی ایسا ہوتا کہ طبعاً اُس کی طرف رجوع نہ ہوتا، تو لوگ زبردستی رجوع کرتے۔ فطری کشش نہ ہوتی مگر حق تعالیٰ نے اسی چیز کو مرکزِ عبادت بنایا، جس کی طرف کشش بھی تھی۔ وہ طبعی کشش انسانوں کو اس کی طرف کھینچ کر لاتی ہے۔

اب یہ لاکھوں انسان، اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر اربوں کھربوں انسان جو "من کل فج عمیق" ہر گھاٹی سے نکل نکل کر آرہے ہیں۔ سفر کی سختیاں اٹھاتے ہیں، محنتیں اٹھاتے ہیں۔ خلافِ طبع باتیں برداشت کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی آتے ہیں۔ تو کوئی تو کشش ہے۔ وہ فطری کشش بھی ہے اور شرعی کشش بھی ہے۔ عقلی کشش بھی ہے۔ کئی کششیں جمع ہو گئیں۔ ——

فطری تو یوں ہے کہ وہ ہماری اصل ہے۔ اور عقلی یوں ہے کہ اصل کی طرف رجوع ہوتا ہی ہے۔ معقول بات ہے۔ اور شرعی یوں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعارف کرا دیا کہ یہی ہے وہ بیتُ اللہ جو تمہاری اصل ہے ——

یہی وجہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نبی ایسے نہیں گزرے جنھوں نے آکر بیتُ اللہ کا طواف نہ کیا ہو۔ اور جب انبیاء علیہم السلام نے طواف کیا تو یقیناً ان کی اقوام کے دلوں میں بھی یہ چیز ہو گی کہ یہ ہماری اصل ہے ——

یہ اصل صرف آپ ہی کی نہیں، جو مسلمان کہلاتے ہیں۔ بلکہ آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کی اصل ہے ——

بیت اللہ کی حدود

حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی ہے۔ ملائکہ علیہم السلام نے اس کی بنیادیں بھری ہیں۔ اور بنیادیں بھی دس بیس سو پچاس گز نہیں بلکہ حدیث میں ہے کہ تحت الثریٰ تک بیت اللہ کی بنیادیں بھری گئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ فقط اس حصہ میں نہیں ہے جو چار دیواری آپ کے سامنے ہے، بلکہ تحت الثریٰ تک جتنا حصہ چلا گیا۔ وہ سب بیت اللہ ہے۔ اسی طرح سے اوپر کی طرف چلیئے تو یہ عرش تک سب بیت اللہ ہی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر آسمان میں ایک قبلہ ہے۔ وہ قبلہ ٹھیک اسی سیدھ میں ہے جہاں یہ بیت اللہ ہے، اور ساتویں آسمان پر بیت المعمور ہے۔ وہ ساتویں آسمان کا قبلہ ہے۔ تو ہر آسمان میں قبلہ ہے ——— یہ ایسا ہے جیسے ایک تار میں لٹو باندھ دیئے جائیں۔ اور تھوڑے تھوڑے فاصلے سے پرو دیئے جائیں، تو ہر لٹو دوسرے لٹو کا محاذی ہو گا۔ گویا بالکل سیدھ میں بیت اللہ ہے۔ جیسے حدیث میں ہے کہ اگر بیت المعمور سے کوئی پتھر گرایا جائے تو وہ سیدھا بیت اللہ کی چھت پر آ کر گرے گا۔ تو بیت اللہ فقط اس چار دیواری کا نام نہیں ہے جو کعبہ مکرمہ کی شکل میں موجود ہے۔ وہ ایک علامتی نشان ہے ورنہ بیت اللہ عرش سے لے کر تحت الثریٰ تک ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر آپ آسمانوں میں پہنچ جائیں اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھیں، تو آپ کو الٹا نہیں لٹکنا پڑے گا کہ بیت اللہ تو نیچے ہے ــ اسی طرح نماز پڑھیں گے جیسے زمین پر پڑھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں بھی بیت اللہ سامنے ہے، اور اگر آپ کشتیوں کے ذریعے سے زمین کی بڑی تہہ میں پہنچ جائیں تو وہاں آپ کو الٹے کے سجدہ نہیں کرنا پڑے گا کہ بیت اللہ تو اوپر ہے۔ آپ اسی طرح سجدہ

کریں گے جیسے زمین پر۔ تو بیت اللہ نیچے سے لے کر اوپر تک ایک کیل کی مانند ہے ایک نورانی لاٹ ہے جس کے اردگرد یہ سارے جہان چکی کے پاٹ کی طرح سے چکّر کھا رہے ہیں۔ یہ بیچ میں ایک مرکز ہے۔

بیت اللہ میں اقرب الی الذات تجلی کا عکس

حق تعالیٰ نے اس کو مرکز بنا کر تاکا، تاکہ اس کو وجود دیا جا سکے، اور مرکز سے جو چیز چلتی ہے، وہ چہار طرف برابر چلتی ہے۔ اگر آپ پانی کے بیچ میں ڈھیلا ماریں تو دائرے بنتے بنتے کنارے تک پہنچیں گے، مگر مرکز سب کا ایک ہی رہے گا۔ اور برابر دائرے بنتے چلے جائیں گے۔ تو مرکز میں جو حرکت ہوتی ہے وہ پورے محیط میں ہوتی ہے۔ وجود کو جب حرکت دی گئی کہ زمین کو پیدا کیا جائے، تو اسی مرکز کو قدرتِ حق نے تاکا۔ اور وجودی تجلی یہیں نازل ہوئی۔ اس لئے بیت اللہ محض کوئی کوٹھا نہیں ہے، کوئی عمارت نہیں ہے، بلکہ وہ تجلی گاہِ ربانی ہے۔ اس میں حق تعالیٰ کی وہ تجلی جو اقرب اِلی الذات ہے وہ موجود ہے۔ اسی تجلی کو ہم سجدہ کرتے ہیں۔ اسی تجلی کو سجدہ کرنا، عینِ ذات کو سجدہ کرنا ہے۔ تجلّی کے معنیٰ فی الحقیقت عکس کے ہیں، تو بیت اللہ آئینۂ جمالِ خداوندی ہے جس میں حق تعالیٰ نے اپنا عکس ڈالا ہے۔ اور عکس اور اصل میں عینیت ہوتی ہے۔ جو حرکت ذات کرتی ہے وہ عکس کرتا ہے، سایہ بھی کرتا ہے۔ اگر ذات ہنس رہی ہے تو سایہ بھی ہنسے گا۔ اگر ذات چل رہی ہے تو وہ بھی چلے گا۔ وہ ٹھہر جائے گی تو سایہ بھی ٹھہر جائے گا۔ کلیتہً عکس سائے کے تابع ہوتا ہے۔ البتہ شدت اور ضعف کا فرق ہوتا ہے۔ ورنہ حرکت اور سکون وہ بھی وہی کرتا ہے جو اصل ذات کرتی ہے۔ تو وہ تجلّیِ ربانی بیت اللہ میں اتری ہوئی ہے جسے ہم سجدہ کرتے ہیں اسے سجدہ کرنا عینِ ذات کو سجدہ کرنا ہے۔ اس لئے کہ عینِ ذات اتنی لطافت میں ہے کہ کوئی سیدھ اور محاذات

بن نہیں سکتی۔ اگر محض ذات کو سجدہ کرایا جاتا تو تصور محض ہوتا، ظاہر میں اصلیت کچھ نہ ہوتی ——

لیکن ذات کا عکس جب اتار دیا گیا تو عکس کا قاعدہ ہے کہ بڑی سے بڑی چیز کا عکس بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز میں آجاتا ہے —— آفتاب کو آپ آئینے میں دیکھتے ہیں، تو آئینہ زمین کا ایک حصہ ہے۔ اس حصہ کی سورج (جیسے کرّہ) کے سامنے کوئی حیثیت نہیں لیکن پورا آفتاب مع اپنی پوری شکل وصورت کے اس میں موجود ہو جاتا ہے۔ اور پھر جو کام اصل آفتاب کرتا ہے، وہی آئینہ کا آفتاب بھی کرتا ہے۔ آپ آئینے کو دوسرے آئینے کے سامنے کریں اس میں بھی عکس پہنچ جائے گا۔ تیسرے کے مقابل رکھیں اس میں عکس پہنچ جائے گا —— آفتاب کا کام تنویر یعنی روشن کرنا ہے تو جہاں جہاں تک آئینے لگاتے رہیں گے، آفتاب کی روشنی پہنچتی رہے گی۔ چاہے آپ اندھیرے کوٹھے میں روشنی پہنچا دیں —— اسی طرح آفتاب کا کام حرارت پہنچانا ہے۔ آئینوں کے ذریعے سے بھی وہی حرارت پہنچتی ہے۔ شدت اور ضعف کا فرق ہوتا ہے —— تو جو کام آفتاب کا ہے، وہی اس کا عکس بھی کرتا ہے۔

اس لئے عکس کو دیکھ کر کہا کرتے ہیں کہ ہم نے آفتاب کو دیکھا۔ آفتاب کی ذات کو ٹکٹکی باندھ کر کوئی نہیں دیکھ سکتا، ورنہ تو نگاہیں کھو دینی پڑیں گی۔ آئینے میں جب آفتاب کا عکس آتا ہے تو دیکھ بھی سکتے ہیں۔ اس کی ہر جانب اور سمت کو آپ دیکھ سکتے ہیں، معائنہ کر سکتے ہیں —— تو عکس میں اور ذات میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ عین ذات کو سجدہ کرنا، یہ ناممکن تھا۔ اس لئے کہ وہ غایت لطافت میں اور غیب در غیب میں ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم کھایا کہ اپنا عکس آئینۂ بیت میں اتار دیا تاکہ ایک حد تک محدود ہو جائے، اور بندوں کی نگاہ اس حد تک جا سکے، اور اس کی طرف جھک سکیں، ورنہ جھکنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ یہ حق تعالیٰ کا

فضل اور عنایت ہے کہ ذات اور تجلّی کی نسبت سے اپنی وہ تجلّی جو اقرب الی الذات تھی، اتار کر بندوں کو سجدہ کا موقع دیا۔ ورنہ کہاں ذاتِ باری تعالےٰ اور کہاں یہ بندے۔ وہ نورِ مطلق اور ہم ظلمت محض۔ بیچ میں ایک چیز تجلّی کی اتار دی تاکہ سجدہ بھی کر سکیں، طواف بھی کر سکیں۔ عبادت بھی کر سکیں۔ اور اس کی عبادت کو ذات کی عبادت قرار دیا۔

مادیت، روحانیت اور نورانیت سب کی اصل بیت اللہ ہے

بیت اللہ فی الحقیقت ہماری مادی اصل بھی ہے، روحانی اصل بھی ہے۔ مادی اصل تو یوں ہے کہ زمین اسی سے بنی، اور ہم سب زمینی مخلوق ہیں تو وہ ہماری مادی اصل ہوئی۔ اور روحانی یوں ہے کہ جب عبادت کریں گے تو انوارِ ربانی اسی کے ذریعہ سے ہمارے قلب میں آئیں گے۔ تو روحانی اصل بھی ہوئی۔

اور جب یہ بیت اللہ تحت الثریٰ تک ہے اور اوپر عرش تک ہے۔ تو مَیں کہتا ہوں کہ جہاں جہاں بیت اللہ ہے۔ اس کے ارد گرد جو جو مخلوق ہے۔ اس کی اصل یہی بیت اللہ ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ہر وطن کے مناسب اس کی صورت بن جاتی ہے۔ زمین میں بیت اللہ ہے تو اس کی صورت اینٹ پتھر کی ہے۔ آگے آسمانوں میں جائے گا لطافت بڑھتی جائے گی۔ نورانیت بڑھتی جائے گی۔ عرش کے قریب پہنچ جائے گا تو نورانیتِ محضہ رہ جائے گی۔ اس لئے وہاں نوری مخلوق پیدا ہوئی۔ یہاں کثیف اور خاکی مخلوق پیدا ہوئی، مگر ہے سب کی اصل بیت اللہ —— اس لئے سب کا رجوع اس کی طرف ہے۔ ملائکہ علیہم السلام بھی اس کا طواف کرتے ہیں۔ انسان بھی طواف کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض جانور بھی اس کا طواف کرتے ہیں۔ اس لئے کہ سب پہچانتے ہیں کہ یہ ہماری اصل ہے۔

تو مَیں نے ایک تو عرض کیا تھا کہ وہ اوّلِ عالم ہے۔ تو واقعی وہ اوّلِ عالم ہے

ان اول بیت وضع للناس —— سب سے پہلے قدرت نے اسی کو تاکا۔ اور حدیث میں فرمایا گیا جب زمین پھیلنی شروع ہوئی، تو سب سے پہلے وہ پہاڑیاں پیدا ہوئیں جو مکہ کے اردگرد ہیں۔ پھیلتے پھیلتے اور پہاڑیاں بن گئیں —— ظاہر بات ہے کہ جب چاروں طرف زمین پھیلنا شروع ہوئی، تو جس جس چیز میں جو جو خصوصیت بھی وہ چمک اٹھی —— تو مدینہ منورہ بھی تو اسی میں آتا ہے —— وہ بھی اوّلِ عالم ہے اپنے ماسوا کے لحاظ سے۔ اس لئے کہ مدینہ کے دائرہ کے باہر جو ہے وہ مدینہ مقدم ہے اور وہ اس سے مؤخر ہے۔ تقدیم تاخیر ہوتی چلی جائے گی، تو اصل جا کے سب کی بیت اللہ نکلتی ہے اس لئے میں نے کہا وہ اوّلِ عالم بھی ہے۔

بیت اللہ کے وسطِ عالم ہونے کی حکمت

اصلِ عالم بھی ہے اور وسطِ عالم بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی مرکزی جگہ ہے۔ جس میں قدرت نے تجلی ڈالی تاکہ چہار طرف انوار و برکات برابر پھیلیں —— اسی واسطے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے۔ یا اھل مکۃ انتم فی وسط من الارض —— اے اہلِ مکہ! تم زمین کے بیچوں بیچ واقع ہوئے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ وسطِ عالم بھی ہے۔ اور مرکز ہوتا بھی وسط میں ہی ہے، دائرہ جبھی بنے گا، جب بیچ میں مرکز ہو —— پرکار کی ایک ٹانگ کو آپ مرکز پر رکھیں گے۔ اور ایک ٹانگ گھمائیں گے، تبھی تو دائرہ بنے گا۔ اگر مرکز سے ٹانگ ہٹ جائے دائرہ بن ہی نہیں سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ اوّل بھی ہے، اصل بھی ہے، مرکز بھی ہے اور وسط و درمیان بھی ہے۔

بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حق تعالٰے نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت مکہ میں فرمائی۔ اور اللہ کی طرف سے اسلام اور جامع دین کی

سے بڑے بڑے اجلّہ علماء اور فضلاء تیار ہوئے۔ کبھی اسپین کی طرف علم منتقل ہو گیا۔ فلسطین مرکز بنا۔ بڑے اکابر علماء اسپین میں پیدا ہوئے ــــــــ

تو مطلب یہ ہے کہ حق تعالےٰ نے کسی ایک خطۂ زمین کو خاص نہیں کیا کہ اسی میں اس کی برکت آئے ۔ وہ مبدارِ فیاض ہے ۔ اس کے لیے سب برابر ہیں حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کبھی یہاں کبھی وہاں .... کبھی وہاں

اسی طرح سے خاندان بدلتے رہتے ہیں ۔ کتنے عرصے بنی اسرائیل میں نبوت رہی، جب انہوں نے ناشکری و ناقدری کی ۔ خاندان کو محروم کر کے بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیلؑ میں نبوت آگئی ــ اور ایک ہی نبوت ایسی آئی کہ ساری نبوتوں سے فائق تر ہو گئی ــــ خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم پیدا فرمائے گئے۔ بنی اسماعیل کو نوازا گیا ــــــــ

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے برکات و کمالات بھی کسی ایک خاندان کے ساتھ خاص نہیں ہیں ۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفۂ اوّل ہیں ، تو صدیقیت کے ساتھ خلافت آئی۔ پھر فاروقیت کے ساتھ آئی ۔ عثمانیت کے ساتھ آئی ، اور پھر علویت کے ساتھ آئی ــ ہر خاندان کو حصّہ ملتا رہا ۔ اور ہر خطۂ زمین مستفیض ہوتا رہا۔ کبھی مکّہ مرکز ہے ، کبھی مدینہ مرکز ہے ، کبھی خراساں مرکز ہے ، کبھی اسپین ہے اور کبھی ماوراء النہر مرکز ہے ، اور کبھی ہندوستان مرکز ہے کہ مرکزیت منتقل ہوئی تو دہلی پہنچ گئی ۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا خاندان اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح ، انہوں نے علمِ حدیث پھیلایا ــ پھر وہ دہلی سے ضلع سہارنپور کی طرف منتقل ہو گئی ۔ بڑے بڑے اجلّے علماء اس میں پیدا ہوئے ــــــــ

ــــ تو کسی ایک خطّے کے ساتھ خاص نہیں ۔ مگر مرکز سب کا بہر حال ایک ہی رہے گا ۔ مرکزیتِ حقیقی وہ صرف بیت اللہ کو حاصل ہے ۔ وہیں سے علم اور کمالات کے چشمے پھوٹ رہے ہیں ۔

گویا پہلی دعوت مکہ سے چلی۔ تاکہ مرکز سے دعوت چلے اور یکسانی کے ساتھ تمام عالم میں اس کی آواز پھیل سکے ـــــــ اگر مثلاً بیت اللہ کو روس میں اور کاکیشیا کے پہاڑوں پر بنا دیتے تو ساری دنیا کو مصیبت اٹھا کے وہاں جانا پڑتا۔ اور اگر کہیں مغرب میں امریکہ کی طرف بنا دیتے تو روس سے جو لوگ چلتے وہ لاکھوں مصیبتیں اٹھا کے پہنچتے۔ بہت سے پہنچ بھی نہ سکتے۔ اللہ نے اسے بیچ میں رکھ دیا تاکہ نرم اور گرم ملک کا ہر انسان وہاں پہنچ سکے۔ مشقت سب پہ برابر پڑے۔ اور اپنے مرکز کو پہنچ جائیں۔ جیسا کہ وسط ہونے کی وجہ سے آسانی ہے۔ اسی طرح مرکز سے جو چیز چلے گی اُسے پھیلنے میں بھی آسانی ہو گی۔ حق تعالیٰ نے دعوۃ الی اللہ اور جامع دین کا کارخانہ مکہ سے شروع کیا۔ اور اسلام کی پہلی دعوت مکہ سے شروع ہوئی۔

مرکزیت کی منتقلی

وہیں سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی ـــــــ اس کے بعد مدینہ مرکز بنا ـــــــ یہ حق تعالیٰ کی مشیت اور شان ہے کہ اس نے کمالاتِ ظاہر ہوں یا باطن۔ کسی کی تخصیص نہیں رکھی۔ مثلاً یہ کہ علم ہوگا تو فلاں ہی خاندان میں ہو گا۔ اور کسی میں نہیں ہو گا۔ روحانیت ہو گی تو فلاں ہی خاندان والے اس کے وارث ہوں گے، دوسرے محروم رہیں گے۔ علم ہو گا تو فلاں ہی خطے میں ہو گا۔ بنی آدم کے ہر طبقہ کو علم اور روحانیت سے نوازا۔ اور تمام زمین کے خطوں کو اس میں سے حصہ دیا۔ تو اول مرکز مکہ بنا۔ اس کے بعد وہ مرکزیت مدینہ کی طرف منتقل ہوئی۔ خلفائے راشدین کی حکومت وہاں قائم ہوئی۔ اور علم کے دریا اور نہریں وہاں سے جاری ہوئیں۔ اس کے بعد مرکزیت عراق کی طرف منتقل ہوئی۔ بغداد دارالخلافۃ بن گیا۔ تو وہاں ہزاروں، لاکھوں علماء تیار ہوئے۔ اس کے بعد خراسان کی طرف منتقل ہوئی۔ تو خراسان اور ماوراء النہر

برکت و ہدایت کا گھر

اس لیے فرمایا کہ :- ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبٰرکًا وھدی للعٰلمین —— تو یہ برکت والا بھی ہے، اور ہدایت والا گھر بھی ہے۔

برکت کا لفظ عام طور سے مادیات میں استعمال ہوتا ہے۔ چاہے روحانیات میں بھی استعمال کریں۔ مگر عام استعمال مادیات میں ہے۔ جیسے مثلاً کہ بھائی کھانے میں برکت ہوگئی۔ فلاں کی عمر میں برکت ہوگئی۔ فلاں کے کاموں میں برکت ہوگئی۔ تو برکت کا لفظ مادیات میں استعمال ہوتا ہے۔ اور ہدایت کا لفظ معنویات میں استعمال ہوتا ہے۔ علم ہے، معرفت ہے، اور کمالاتِ معنویہ ہیں —— حاصل یہ نکلا کہ برکت کا گھر بھی ہے اور ہدایت کا گھر بھی ہے۔ یعنی مادی برکتیں بھی اس میں موجود ہیں۔ روحانی برکتیں بھی اس میں موجود ہیں۔

آیاتِ بیّنات

فیہ اٰیٰت بیّنٰت مقام ابراھیم —— آج یہاں لاکھوں انسان آئے ہوئے ہیں۔ تو یہ کھلی کھلی نشانیاں ہیں کہ لاکھوں کو روٹی بھی مل رہی ہے، پھل بھی مل رہے ہیں —— اس وادی غیر ذی زرع میں —— جہاں نہ سبزہ، نہ پانی، نہ نہریں، نہ باغات۔ لیکن ہر تازہ پھل میسّر۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے کہ وارزق اھلہ من الثمرات من اٰمن منھم باللہ والیوم الاٰخر —— ، اے اللہ! اس گھر والوں کو رزق دے۔ اور رزق بھی کیا۔ ؟ فروٹ جو اعلیٰ ترین رزق ہے۔

یعنی تازہ پھل ۔ اگر کہیں ملکِ شام میں دعا مانگتے تو اسبابِ طبعیہ کے مطابق ہوتی۔ کہ وہاں پر تو پیدا ہوتے ہیں ۔ یہاں دُعا مانگی ، جہاں نہ سبزہ نہ پانی۔ لیکن دنیا بھر کے تازہ پھل موجود ، اور ہر ملک کے موجود ۔ اور ہر شخص مستفید ۔ دس بیس ہزار کا مجمع ہو گرانی الگ ہو جاتی ہے ۔ جھگڑے اور نزاعات الگ ہوتے ہیں ۔ فیہ اٰیٰت بینٰت ـــــ کھُلی کھُلی نشانیاں ہیں ـــ رزق بھی مل رہا ہے ۔ جھگڑے بھی نہیں ہوتے ۔ اور لاکھوں آدمی جمع ہیں ۔ عرفات میں تو ایک جگہ جمع ہوتے ہیں جو چودہ پندرہ لاکھ آدمی ہوتے ہیں (اور یہ تعداد روز افزوں بھی ہے) ۔ لیکن سانس کی آواز نہیں ہوتی ۔ ہر شخص اپنے کام میں لگا ہوتا ہے ۔ ہر شخص اپنے مرکز کی طرف متوجہ ہے ۔ کوئی آواز ہو ، کوئی گفتگو ہو ، کوئی جھگڑا ہو ، بالکل بھی نہیں ـــ ایک ایسا سکونِ محض ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کی مسجدوں میں بھی دیکھنے میں نہیں آتا جتنا میدانِ عرفات کے لاکھوں آدمیوں میں سکون ہوتا ہے ـــ تو کیا یہ آیات بینات میں شامل نہیں ہے ـــــــ ؟

قالبی امن کے ساتھ قلبی امن بھی

انسان میں دو ہی قوتیں ہیں ۔ ان سے ساری معصیتیں پھیلتی ہیں ـــ ایک قوتِ شہوانی ، اور دوسری قوتِ غضبیہ ـــ ایک سے فواحش و منکرات پھیلتے ہیں ، اور دوسری سے مار دھاڑ جھگڑے اور ٹنٹے پھیلتے ہیں ۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ مطاف کے اندر عورت مرد مخلوط ہو کر طواف کرتے ہیں ۔ کندھے سے کندھا لگ رہا ہے صرف یہی نہیں کہ مرد کو ادھر توجہ نہیں بلکہ بعض اوقات کراہت پیدا ہوتی ہے کہ عورت کیوں سامنے آ گئی ـــــ تو میں کہتا ہوں کہ ایک جذبے کو سرد کر دینا ، کیا یہ آیات بینات میں داخل نہیں ہے ؟ ۔ یہ اللہ کی کھُلی نشانی ہے ورنہ مرد کو عورت

وسطِ عالم میں ولادتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حکمت

اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں پیدا فرمایا گیا کہ یہ دین عالمی ہے، مقامی نہیں ہے کہ کسی ایک خطہ اور قوم کے لیے ہو۔ پوری دنیا کے لئے ہے۔ تو پھر ایسی جگہ سے آواز اٹھائی جائے کہ چاروں طرف اس کی آواز برابری کے ساتھ پھیلے۔ وہ مکہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس لئے ولادت باسعادت مکہ میں ہوئی۔ اور آپ نے جو دعوت الی اللہ شروع کی، وہ مکہ سے شروع کی۔ ہر طرف اس کی آواز پھیلی۔ اگر کسی ایک جانب ہوتے تو وہاں دین کا غلبہ ہوتا، اور دوسری طرف اندھیرا ہوتا۔ لیکن جتنا بھی دین پھیلا ہے۔ بہر حال چہار طرف پھیلا ہے۔ کوئی ملک خالی نہیں جس میں اللہ کے نام لیوا موجود نہ ہوں ——

پھر اس کا وعدہ دیا گیا کہ ایک وقت آرہا ہے کہ پورے عالم میں یہی ایک دین ہو جائے گا —— حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا۔ لایبقیٰ علیٰ ظھر الارض بیت مدرٍ ولا وبرٍ الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام بعز عزیزٍ وبذل ذلیل —— روئے زمین پر کوئی کچا پکا گھر نہ کوئی اینٹ پتھر کا گھرانہ اور کوئی کپڑے اور چمڑے کا خیمہ باقی نہیں رہے گا، جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہیں ہو جائے گا۔ رغبت سے ماننے یا مجبور ہو کر ماننے —— جبر کے معنیٰ یہ نہیں کہ مسلمان گلے پر تلوار رکھیں گے کہ کلمہ قبول کرو۔ اس کی تو ممانعت ہے۔ —— لا اکراہ فی الدین دین میں کوئی اکراہ (جبر) نہیں —— افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین ۔ اے پیغمبر! کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ وہ دین قبول کریں —— ؟ تو دین جبری چیز نہیں۔ اس لئے اسلام میں اکراہ جائز نہیں۔ پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ بذل ذلیل ۔ یعنی دنیا میں چہار طرف ڈھکے کھلے

کی طرف طبعی کشش ہوتی ہے لیکن سینکڑوں عورتیں موجود، کندھے سے کندھا، کمر سے کمر لگتی ہے نہ صرف یہ کہ رغبت نہیں بلکہ بعض اوقات کراہت بھی ہوتی ہے کہ یہ کہاں بیچ میں آگئی؟ اور ہماری طاعت و عبادت کے درمیان میں خلل انداز ہوگئی۔ تو دِلوں کا بدل ڈالنا بلاشبہ آیاتِ بیّنات میں داخل ہے۔

یہی قوتِ غضبیہ کا حال ہے ورنہ اتنے جھگڑے جھمیلے ہوتے کہ حکومت کو فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا۔ جگہ جگہ لڑائیاں ہوتیں۔ لیکن کہیں لڑائی نہیں۔ حتیٰ کہ کندھے سے کندھا ٹکراتا ہے۔ خلافِ طبع اُمور پیش آ رہے ہیں۔ اور یہ لاکھوں آدمیوں میں متفقہ فی الدین علماء تو نام کو ہیں زیادہ تو جہلاء ہیں۔ لیکن جھگڑے کا نشان نہیں —— اور یوں کبھی اتفاق سے ہو جائے تو بندہ بشر ہے۔ انسان ہے۔ کہیں ہو جائے، لیکن جتنا طبعاً ہونا چاہیے تھا، قطعاً اس کا نشان نہیں —— تو قوتِ غضبی بھی ساکن ہے، اور قوتِ شہوانی بھی ساکن ہے۔ کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ باطنی طور پر بھی امن کا گھر ہے۔ تو اندر بھی امن ہے اور باہر بھی امن ہے۔ اور قلوب کے اندر بھی امن ہے —— قلبی اور نفسانی قوتوں کو وہاں اتنا پامال کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے کام میں نہیں لگتیں۔ اپنی ذات بابرکات کی اطاعت و عبادت اور روحانیت کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے۔ تو "فیہ اٰیٰت بیّنٰت" میں رزق کا ملنا جھگڑوں کا نہ ہونا بھی داخل ہے۔ شہوانی اُمور کا مٹنا اور نہ ہونا، یہ بھی سب داخل ہے۔ خالص قلبی اور قالبی امن ہے، باطنی بھی اور ظاہری بھی ہے۔ وَمَن دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔ جو اس میں داخل ہو گیا وہ امن میں آ گیا۔ تو امن فقط اسی کو نہیں کہتے کہ جان بچ جائے۔ امن اسے بھی کہتے ہیں کہ آدمی نفس سے بچ جائے۔ شیطان کے رذیلوں سے بچ جائے۔ نفس و شیطان کی مکاریوں سے بچ جائے —— اور یہاں سبھی چیزوں سے بچاؤ ہو رہا ہے۔ تو "آیاتِ بیّنات" ظاہر میں بھی نمایاں، باطن میں بھی نمایاں ——

تو مکّہ مکرمہ اور بیتُ اللہ اولِ عالم بھی ہے۔ مرکزِ عالم بھی ہے اور وسطِ عالم بھی ہے اور ہم سب کی اصل بھی ہے۔

اسلامی اصول مجبور کر دیں گے کہ انہیں میں پناہ لی جائے۔ اس کے سوا پناہ گاہ کوئی نہیں ہو گی۔ مجبور ہو کر اس کی طرف آئیں گے۔

اسلامی اصول کی عالمگیر صداقت

بادشاہوں میں عموماً گدی نشینی ہوتی۔ خاندانوں میں اس کی وراثت چلتی تھی۔ کئی کئی صدیوں تک ایک ہی خاندان حکومت کرتا تھا۔ آج بین الاقوامیت غالب آئی تو بادشاہیں اور اس کی حکومتیں ختم ہونا شروع ہو گئیں۔ "انتخاب اصلح" کا اصول آیا کہ جو تم میں بہتر ہو اس کو امیر بناؤ۔ یہ الگ چیز ہے کہ بہتری کا معیار کیا تجویز کیا گیا۔

اسلام میں بہتری کا اصول یہ ہے کہ جو فاضل ہو، متقی ہو، متوجہ الی اللہ ہو۔ وہ اصلح ہے۔ جس کو خلیفہ کہتے ہیں ـــــ لوگوں نے کہا جو مالدار زیادہ ہو، یا کہا کہ جس کے ساتھ ووٹ زیادہ ہوں۔ یہ تو الگ چیز ہے، مگر انتخاب اصلح کا اصول رائج کرنا پڑا ـــــ جیسے کہ عرفِ عام میں مشہور ہے کہ سب بادشاہتیں ختم ہو جائیں گی۔ بس دو بادشاہتیں باقی رہیں گی۔ ایک انگلستان کی اور ایک جو تاش میں بادشاہ ہوتا ہے۔

ـــــ تو انتخاب اصلح اسلامی اصول نہیں تو اور کیا ہے؟ انتخاب اصلح یعنی صالح ترین امیر مقرر کرو۔ اسلام نے یہ اصول دیا ہے۔ وہاں نہ خاندانیت تھی، نہ قبائلیت تھی۔ باقی چاہے وہ اتفاق سے خاندانی بھی ہو جائے تو اس کا مضائقہ نہیں، خاندان کی بالکل نفی نہیں، کہ اچھے خاندان کی طرف جانا ہی نہیں۔ اگر خاندان میں ہی کوئی اصلح پیدا ہو جائے کوئی صالح ترین فرد ہو تو سبحان اللہ۔ دونوں باتیں حاصل ہو جائیں گی۔ مگر مقصود اصلی یہ ہے کہ امیر صالح اور مصلح ہو۔ بہر حال انتخاب ہوا۔ تو انتخاب اصلح کا اصول آیا۔ آج لوگ انتخاب کرنے پہ مجبور ہیں۔ انہیں اس کے علاوہ کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ ایک سلسلہ چل پڑا۔

اسی طرح وراثت کا قصہ ہے۔ بہت سی اقوام میں بیٹیوں کو وراثت نہیں ملتی تھی اسلام نے بیٹے اور بیٹیوں کا حق رکھا۔ البتہ فرقِ مراتب ضرور قائم رکھے۔ مگر جس طرح بیٹا باپ کا وارث ہے، بیٹی بھی وارث ہوگی ـــــ بعض اقوام میں بیٹیوں کی بالکل وراثت نہیں تھی۔ ہندوستان میں بعض قوموں کی عورتوں نے ایجی ٹیشن برپا کیا۔ اور اسمبلی کے اردگرد انہوں نے دھاوا بولا کہ جس باپ کی اولاد لڑکے ہیں اسی کی ہم ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہمیں میراث نہ ملے۔ بالکل مجبور ہو کر گورنمنٹ کو قانون بنانا پڑا، اور وراثت میں ان کو حصہ دار بنایا۔ اس قانون کے بنانے میں آخر اقوام نے کدھر رجوع کیا۔ ان کے ہاں تو کچھ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ انہوں نے اسلامی فقہ کو لے کر اپنے الفاظ میں ادا کر دیا اور کیا کیا جائے گا ـــــ ؟ تو لوگ اسلام کا نام نہیں لیتے مگر اس کے اصول اختیار کرتے جا رہے ہیں کے۔ ایم منشی جو یو۔ پی کا گورنر تھا۔ اس نے ایک جلسہ میں اپنا پیغام بھجوایا۔ میں بھی اس جلسہ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ اس کو جلسہ میں شرکت کی دعوت دی گئی تو اس نے معذرت کی کہ حکومت کے کام بہت پڑے ہوئے ہیں۔ میں نہیں آسکتا۔ میں اپنے بجائے اپنا پیغام بھیجتا ہوں ـــــ سیرت کا جلسہ تھا۔ وہ پیغام پڑھ کر سنایا گیا اس کے دو جز تھے ـــــ

پہلا جز یہ تھا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مناقب اور فضائل اس نے بیان کئے اور ایسے بیان کئے کہ شاید کوئی مسلمان بھی اتنا نہ بیان کرے۔ اس نے کہا دنیا میں اگر کوئی ہستی ایسی ہے جس کی زندگی پراگندگی رکھنے کی گنجائش نہیں وہ سوائے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے دوسری نہیں۔ کامل اور مکمل ہستی ایک ہی پیدا ہوئی۔ یہ تو ابتدائی جز تھا ـــــ

دوسرا جز یہ تھا کہ ہم نے ہندوستان کا قانون اسلامی اصولوں پر بنایا ہے۔ ہم نے عدل قائم رکھا۔ مساوات قائم رکھی۔ اقوام کے حقوق برابر رکھے ـــــ یہ الگ بات ہے کہ ان حقوق کو چور اور ڈاکو مارنے لگیں، اور نہ پہچانیں۔ مگر قانون میں

حقوق برابر رکھے گئے ہیں ۔ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ ان کے ہاں اس قسم کے اُصول نہیں تھے، مجبور ہو کر اسلام کی طرف رجوع ہوئے اور وہاں سے اُصول لئے ۔

صحابہ کرامؓ ـــــــ اور غیر مسلم اقوام

ہندوستان میں جب کانگریس کی عارضی حکومت قائم ہوئی تھی، تو گاندھی نے کہا تھا کہ :-

"ہمارے وزراء اگر عالمی وقار چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ چھوت چھات کو ختم کریں، نسلی امتیازات کو ختم کریں، اونچ نیچ ختم کریں، اور صدیقؓ و فاروقؓ کا نمونہ اختیار کریں"۔

گاندھی کی قوم نے برا مانا اور کہا کہ آپ کو صدیقؓ و فاروقؓ ہی کا نمونہ ملتا ہے۔ اس نے کہا :-

"بھئی! کسی قوم میں تم نمونہ بتا دو۔ جب نہیں ملا تو اب میں کس کا نام لوں یہ ساری مثالیں انہوں نے ہی قائم کی ہیں کہ حکومت بھی قائم اور درویشی بھی قائم۔ دبدبہ بھی قائم اور ساتھ میں پیوندوں کی چادریں بھی قائم، اور زہد و قناعت بھی قائم۔ تم کوئی حکومتیں مثال میں بتلا دو کہ نظام عالم بھی قائم ہے اور سارے درویش کے درویش ہیں"۔

خلفائے راشدین نے کوئی سونے چاندی کے محل نہیں قائم کرائے۔ یہی سادہ زندگی جو عوام الناس کی تھی۔ وہی زندگی ان کی تھی۔ مگر پورے عالم میں دینِ حق کا ایک دبدبہ پھیلا دیا۔ تو قوم نے بُرا مانا کہ تمہیں یہی نمونہ ملتا ہے۔ اس نے کہا جب نمونہ نہیں ہے تو میں کسے پیش کروں۔ تم بُرا مانو یا بھلا۔ بہر حال مطلب یہ ہے کہ لوگ اسلام کی طرف جھکیں گے۔ مسلمان ان کے گلے پر کوئی تلوار نہیں رکھیں گے کہ اسلام قبول کرو۔ اُصول مجبور کریں گے کہ اسلام کی طرف آؤ۔ زمانہ مجبور کرے گا۔ دوسری طرف پناہ نہیں ملے گی۔

انہیں اصُول میں پناہ ملے گی۔ اس لئے کہ یہ فطری اصُول ہیں، تولامحالہ مجبور ہوں گے۔

فیضانِ نبوت کا پورے عالم میں پھیل جانا

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ دیا۔ فرمایا:۔ لا یبقی علٰی ظهر الارض بیت مدرٍ ولا وبر الخ... روئے زمین پر کوئی کچا پکا گھرانہ نہیں رہے گا مگر اس میں اسلام کا کلمہ داخل ہو جائے گا۔ فیکون الدین کلہ للہ ——— ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر پورے عالم میں ایک دین ہو جائے گا۔ ——— بعض حضرات شراح فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ (فیکون الدین کلہ للہ) حدیث کا جزء ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے مگر بہر حال مقولہ حق ہے کہ جب روئے زمین کے ہر گھر میں اسلام کا کلمہ داخل ہو جائے گا تو پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا۔

یہ مکہ کی آواز تھی۔ سارے عالم میں پھیلنی چاہیئے تھی۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے ——— حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی وہ آواز مرکز سے چہار طرف پھیلی۔ اور اس کی تکمیل ہوئی تھی۔ مگر وہ تکمیل کیفیت کے لحاظ سے تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لاکھ چوبیس ہزار وہ افراد تیار فرما دیئے، جو نبی تو نہیں تھے، مگر آثارِ نبوت سب کے اندر موجود تھے۔ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل ——— وہ انبیاء علیہم السلام تو نہیں تھے، مگر حضرات خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ نے کام وہ کئے جو انبیاء علیہم السلام کرتے ہیں۔ جو جس خطے میں پہنچ گیا اس خطے کو ایمان و علم اور نور سے رنگ دیا ——— صحابہؓ کی شان تو بڑی ہے۔ آئمہ مجتہدین میں سے جو جہاں بیٹھ گیا۔ اس نے اس خطے کو علم و معرفت اور ایمان سے رنگ دیا ——— امام ابو حنیفہؒ خراسان میں تھے۔ ان کا مذہب پھیلا تو خراسان، ہندوستان،

افغانستان میں حنفیت ہے، اس راستے سے کروڑوں آدمی جنت میں پہنچ گئے۔ امام شافعیؒ کا ابتدائی قیام حجاز میں تھا، اور وفات کے وقت مصر میں قیام تھا۔ تو مصر و حجاز میں اکثریت شوافع کی ہے۔ غرض جو امام جہاں بیٹھ گیا اس نے علم و تفقہ اور کمالاتِ دینی سے اس خطہ کو رنگ دیا۔ تو یہ حضرات انبیاء نہیں تھے، لیکن کام وہ کیا جو نبیوں کا کام تھا۔ ایک نبی آیا تو علاقہ کو ایمان سے بھر دیا۔ اس امت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے خدام میں ایسے افراد پیدا ہوئے کہ کارہائے نبوت انجام دیئے۔ طاقت ایک ہی نبوت کی تھی اور وہ ہے ختمِ نبوت۔ اس کے نیچے آ کر علماء نے کام کیا۔ فیضان ایک نبوت کا ہے۔ اس کے تحت میں علوم و کمالات دنیا میں پھیلے اور پھیلتے رہیں گے۔ تو عہد نبوت میں دین مکمل ہوا اور چہار طرف پھیلا۔ مگر کیفیت کے لحاظ سے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار وہ نمونے تیار ہو گئے کہ شاید ہر صحابی کسی ایک نبی کی نسبت کے اوپر ہے۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات جامع النسب تھے، اور آپ کی تربیت سے وہ آگے پھیلیں۔ تو کیفیت کے لحاظ سے دین مکمل ہو گیا۔ مگر آواز مرکز اور مکہ کی تھی، اسے سارے عالم میں پھیلنا تھا۔ تو دور عیسوی میں اور دور مہدوی میں جو کہ آخری مجدد ہوں گے۔ اس وقت فرمایا گیا کہ فیکون الدین کلہ للہ۔ پورے عالم میں دینِ واحد ہو جائے گا۔ اسلام واحد کے سوا کوئی دین باقی نہیں رہے گا اور اسلام سارے عالم میں پھیل جائے گا۔ تو کمیت کے لحاظ سے اخیر میں تکمیل ہوگی۔ کیفیت کے لحاظ سے پہلے تکمیل ہو چکی ہے۔ تو مکہ کی آواز جو مرکز سے اٹھی تھی بے اثر نہیں جا سکتی تھی۔ کیفاً بھی پہنچ گئی، کماً بھی پہنچ گئی۔ اور جب کمیت کے لحاظ سے پورے عالم میں دینِ واحد ہو گیا۔ تو مقصدِ دنیا پورا ہو گیا کہ عبادت کا کارخانہ مکمل ہو چکا، اس کے بعد پھر قیامت کا دور ہے۔ تو یہ عالم ختم کر دیا جائے گا۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز مکہ سے اٹھی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ خیر و برکت کے بعد پوری امت آپؐ کی قائم مقام

ہے۔ تو اس امت کا فرض بھی یہ ہے کہ اس آواز کو آگے بڑھائے، اور مرکز سے چلائے۔

بین الاقوامی تبلیغ گاہ مرکزِ عالم میں ہونی چاہیے

تقریباً انچاس برس کا عرصہ ہوا ہے جب پہلی دفعہ یہاں (کعبۂ مکرم میں) میری حاضری ہوئی ہے۔ اس وقت ملک عبدالعزیز ابن سعود مرحوم زندہ تھے۔ اور ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا، کہ مطاف میں ان پر کسی نے حملہ کیا، اللہ نے ان کو بچا لیا، تو ہندوستانی زعماء کی طرف سے مبارک بادی کا جلسہ منعقد کیا گیا، کہ ملک کو مبارک باد دیں کہ اللہ نے آپ کی حفاظت کی، اور آپ کو محفوظ رکھا۔ فندقِ مکہ میں یہ جلسہ ہوا۔ اور تقریباً تین چار سو کے قریب حضرات، جن میں علماء، زعماء، تُجّار اور امراء سب جمع تھے۔ اس حج کو لوگ حج العظماء کہا کرتے تھے۔ یعنی ہر ملک کے بڑے بڑے لوگ اس حج میں شریک ہوئے —— خیر وہاں جلسہ ہوا، تقریریں ہوئیں، تجویز پاس ہوئی، اور ایک وفد گیارہ آدمی کا تیار کیا گیا، جس میں مفتی نعیم صاحب مرحوم لدھیانوی، حافظ ہدایت حسین صاحب کانپوری، مولانا آزاد سبحانی مرحوم گیارہ آدمی تھے اور مجھے رئیس الوفد بنا دیا۔ کہ یہ لے جا کر ملک کی خدمت میں تجاویز پیش کریں کہ کل جلسہ ہوا تھا، یہ اس کی کارروائی ہے۔ ملک نے اجازت مرحمت فرمائی، اور بہت ہی توقیر کی —— انہوں نے یہ فرمایا کہ وہ جو گیسٹ ہاؤس، مہمانوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ وہاں علماء کو نہ بٹھایا جائے، اس لئے کہ وہاں میں آؤں گا۔ تو علماء میری تعظیم کو کھڑے ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ خود ان کی تعظیم کروں وہ میری تعظیم کو کھڑے نہ ہوں۔ محل میں جو اُن کا اپنا کمرہ تھا، اس میں بلوایا، تاکہ جب علماء آئیں تو میں تخت سے اتر کر ان کی تعظیم کروں۔ چنانچہ ہم اندر پہنچے اور ملک اپنے شہ نشین سے اترے اور انہوں نے ہر ایک سے مصافحہ کیا، اپنا تعارف کرایا۔ خیر یہ کارروائی ہوتی رہی۔ اس کے بعد اخیر میں میں نے تجویز پیش کی کہ ——

"اس وقت کوئی عیسائی حکومت ایسی نہیں، جس کے ہاں تبلیغی مشن نہ ہو۔ امریکہ، انگلستان اور فرانس کی حکومتیں کروڑوں روپے اس پر خرچ کر رہی ہیں۔ اور جگہ جگہ ملکوں میں تبلیغی مشن کے افراد پہنچے ہوئے ہیں۔ اگر حکومتِ حجاز اس قسم کا اقدام کرے۔ اور اسلامی تبلیغ کے لئے یہاں سے وفود روانہ کرے، تو سارے مسلمانوں کے لیے ایک عزت افزائی کا سامان ہوگا، حکومت کی محبت بھی دلوں میں قائم ہوگی —— اور اس آواز میں بھی اثر ہوگا —— اور ہندوستان۔ جب وفد آئے گا —— میں نے عرض کیا —— سارے علماء اس کی حمایت اور اس کے تعاون کے لئے کھڑے ہو جائیں گے، جہاں جہاں آپ وفد بھیجیں گے"——

یہ ہم نے تجویز پیش کی۔ ملک نے اس کو بہت پسند فرمایا، اور فرمایا کہ بالکل مناسب تجویز ہے۔ مگر یہ کہا کہ ابھی اس کا وقت نہیں۔ اس لئے کہ مثلاً برطانوی حکومت ہے، ہم اسلامی تبلیغ کے لئے وفد بھیجیں گے۔ وہ کہیں گے اس میں کوئی سیاسی چال ہے، تو تبلیغ تو ایک طرف رہ جائے گی، اور سیاسی قصے آجائیں گے۔ پھر اس میں کہیں شکوک و شبہات اور فتنے نہ کھڑے ہو جائیں۔ مگر تجویز معقول ہے، وقت آرہا ہے اس کے اوپر عمل درآمد ہوگا۔ وقت کا انتظار کیا جائے گا۔

ممکن ہے یہ چیز عمل میں بھی آجائے۔ کچھ سننے میں آ بھی رہا ہے کہ یہ تجویز عمل میں آرہی ہے۔ بہر حال وہ حکومت کا قصہ ہے، جس طرح حکومت نے حج کے سلسلے میں احسانات کئے ہیں۔ حرم شریف کی توسیع کی۔ حج کے انتظامات کئے۔ اس میں یہ بھی ایک چیز ہے کہ دین کی تبلیغ اور اشاعت کی طرف متوجہ ہو۔ مگر بہر حال جب تک حکومت متوجہ نہ ہو۔ اس وقت تک علماء کا کام ہے کہ وہ اپنے طور پر اس کو چلائیں، تو اگر اس کو مرکز بنایا جائے —— اور الحمد للہ ہماری تبلیغی جماعتوں نے اس کو مرکز بنالیا ہے —— بہت سے افراد ہیں، جو ہجرت کر کے یہاں آگئے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو یہاں ٹھہرے

ہوئے ہیں۔ اور کام جاری ہے۔ دیہات تک میں کام پھیلا دیا ہے۔ باقی وہ احق تھے اس کے کہ یہ کام پھیلاتے۔ یہ کام اس کا مستحق تھا کہ یہ کام یہیں سے جاری ہو۔ برکت اور وسعت کا اس میں اثر ہے۔ مکہ کے لوگ جب باہر ملکوں میں پہنچیں گے تو کہا جائے گا کہ یہ تبلیغ کے لئے آئے ہیں۔ تو قلوب پر کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ جو جماعتیں پہنچتی ہیں اس میں عرب ہوتے ہیں۔ تو ہندوستان والے اس سے اثر قبول کرتے ہیں۔ اور ان کے دلوں میں ایک نیت پیدا ہوتی ہے کہ بھئی! جب عرب تک تبلیغ کرنے آگئے تو ہم ہی بیٹھے ہیں، ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم بھی تبلیغ کریں۔ اس کا اثر پڑتا ہے۔

بہر حال تبلیغی جماعت نے یہاں بھی اور دنیا کے ہر ملک میں بحمد اللہ مرکز قائم کئے۔ حجاز میں بھی مرکز قائم ہے، مدینہ و مکہ میں بھی ہیں، اور یہاں سے مضافات میں بھی جماعتیں جاتی ہیں۔ اور بہت سے لوگوں کے اندر یہ سلسلہ پھیل گیا۔ تو واقعی مکہ ہی اس کا احق تھا کہ یہیں سے آواز اٹھتی۔

شام مرکزِ سیاست ہے

آج مکہ مکرمہ جیسے بین الاقوامی عبادت گاہ ہے، اور بین الاقوامی تجارت گاہ بھی بن گیا۔ دنیا کے ہر ملک کی چیز یہاں ملتی ہے اور کہیں ملے نہ ملے۔ تو بین الاقوامی تبلیغ گاہ بھی یہاں ہونی چاہیئے۔ یہیں سے اللہ کے دین کا کلمہ بلند ہو اور چلے۔ اور آثار و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر دور میں عرب ہی کھڑے ہوں گے۔ انہی کے ہاتھوں پر قوت و شوکت کے ساتھ یہ چیز آگے بڑھے گی۔ اور باطل قوتیں بھی انہی کے ہاتھوں ٹوٹیں گی۔ بہر حال مہدی ہیں وہ بھی عربی ہیں، اور حسنی ہوں گے۔ ان کے زمانے میں مغرب کی قوتیں ٹوٹیں گی۔ بیعت بھی انہی کے ہاتھ پر مکہ ہی میں ہوگی۔ اور شام کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنائیں گے۔ اس لئے کہ وہ مرکزِ سیاستِ اسلام ہے۔ حجاز مرکزِ عبادت

بنایا گیا ـــــ عبادت کے لئے امن کی ضرورت ہے۔ فتنہ ہوتا ہے تو آدمی نہ تلاوت کر سکے نہ ذکر کر سکے۔ عبادت کے لئے سکون ضروری ہے۔ جب اللہ نے اس کو مرکزِ عبادت بنایا تو امن کا بھی مرکز بنایا۔

واذ جعلنا البیت مثابة للناس وامنًا ـــــ

اور.... اولم یروا انا جعلنا حرمًا اٰمنًا ویتخطف الناس من حولھم ـــــ پھر اس کو امن گاہ بھی عالمی بنایا۔ اس لئے کہ یہ عبادت گاہ بھی اور عبادت فتنوں کے اندر نہیں ہو سکتی۔ یہاں جانور ں اور درختوں تک کو پناہ ہے، بلکہ یہاں تک کہ گھاس بھی نہیں کاٹی جا سکتی ـــــ یہاں کے پتھر وغیرہ ہیں، ان کے بارے میں یہ پسندیدہ نہیں سمجھا گیا کہ آدمی لے جائے۔ کیونکہ یہاں امن ہے ـــ محرم کے لئے شکار تک ممنوع ہے۔ تو جانو ں کو بھی پناہ، مال کو بھی پناہ۔ یعنی امنِ کامل۔ جب اتنا امن ہے، جبھی عبادت کا کارخانہ یہاں چل بھی سکتا ہے۔

اور سیاست کے لئے تعلقات، روابط، جوڑ توڑ اور اونچ نیچ کی ضرورت ہے اگر وہ یہاں ہوتی تو عبادت کی خیر سلّا ہو جاتی ـــــ اسلام نے شام کو مرکزِ سیاست قرار دیا ہے۔ حجاز مرکزِ عبادت ہے، اصل اُصول وہی ہے۔ لیکن جب جنگ کرنی ہو، فوجیں بھیجنی ہوں تو وہ شام سے ہو ـــ تو شام کو مرکزِ سیاست قرار دیا ـــــ

مصر مرکزِ عسکریت ہے

اور مصر کو مرکزِ عسکریت قرار دیا، کہ وہاں فوجی قوت جمع رکھو۔ شام اور حجاز کو مہاجر نایا۔ کوئی ہجرت کرے تو شام میں اور حجاز میں کرے۔ مصر کو ہجرت گاہ نہیں بنایا وہ فوجی چھاؤنی ہے۔ اس لئے کہ فوج میں جو لوگ بھرتی ہوتے ہیں وہ ہجرت کر کے وطن چھوڑ کے تھوڑا ہی جاتے ہیں۔ وہ تو طاقت کے فراہم کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ ں کا

حاصل یہ کہ مصر کو فوجی طاقت بناؤ اور لوگ مدد پہنچائیں، مگر ہجرتیں کر کے وہاں نہ جائیں۔ طاقت ان کے وہاں پہنچتی رہے۔

اس لئے کہ مصر در حقیقت ایشیا کا دہانہ ہے یورپ کے لئے۔ اور ایشیا کے لئے یورپ کا دھانہ مصر ہے، تو اُدھر کے لئے اِدھر دھانہ اور اِدھر کے لئے اُدھر دہانہ۔ اس دھانے پر جو غالب ہو گا، اسی کے اثرات غالب ہوں گے۔ اگر ایشیا مصر پر غالب ہے تو یورپ تک اثرات پہنچیں گے۔ اور اگر یورپ نہر سویز اور مصر پر غالب ہو گیا، تو پورے ایشیا پر یورپ کے اثرات پہنچیں گے۔ اس لئے احادیث سے اشارے ملتے ہیں کہ مصر کو قوت گاہ بناؤ، مرکزِ عسکریت قرار دو۔ شام کو مرکزِ سیاست قرار دو۔ یہاں امن رہنا چاہیئے۔ وہاں جنگیں ہوں، تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیت المقدس جنگوں کے بیچ میں رہا ہے۔ کبھی ہم غالب، کبھی یہودی غالب، کبھی نصرانی غالب۔ کما نصبت حرب نصبت اخری۔ ایک جنگ ختم ہوئی ہے، دوسری چھڑ جاتی ہے۔ وہ مرکزِ عبادت بنتا، تو عبادت کا کارخانہ کبھی نہ جم سکتا۔ رات دن جنگیں، جوڑ توڑ رہتا۔ تو عبادت کا مرکز حجاز کو قرار دیا۔ اسے امن بخشا۔ سیاست کا مرکز شام کو کو قرار دیا۔ کہ یہاں لڑتے مرتے رہو، جو بھی غالب آجائے۔

اسلام کی بقاء تبلیغ میں ہے

بہر حال دین کی تبلیغ یہ بھی امن کی چیز ہے۔ بدامنی میں تبلیغ بھی مشکل ہوتی ہے جیسے نماز پڑھنی مشکل ــــ تو یہ ملک (حجاز) زیادہ احق ہے کہ یہ مرکزِ تبلیغ بنے۔ یہیں سے اللہ کے دین کا آوازہ اٹھے، جیسا کہ یہاں سے اٹھا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ تبلیغی حضرات نے اس کو سمجھا ہے، اور کام چل رہا ہے۔ دیہات تک ان کے تعلقات اور روابط ہیں۔ یہیں سے جماعتیں ہندوستان اور دوسری جگہ

بھی جانے لگی ہیں۔ تو ہم سب کا فرض ہے کہ اس کام میں شرکت کر کے قوت پہنچائیں۔ اس لئے کہ اس کی قوت سے ہماری قوت ہے۔ اسلام کی قوت جو ہے وہ پھیلنے میں ہے، سکڑنے میں نہیں ہے۔ اگر اسلام کو آپ کسی کوزے میں بند کر کے رکھ دیں، وہ پھیل نہ سکے۔ اسلام کی اصلیت ختم ہو جائے گی — اسلام میں جامعیت اور پھیلاؤ ہی ہے۔ وہ جبھی اپنی اصلی صورت میں رہے گا جب کہ وہ دنیا کے اندر پھیلتا رہے۔

لا اسلام الا بجماعۃ — اس کے اندر جماعتی رنگ رہنا چاہیئے۔

———— اگر یہ تبلیغی دین نہ ہوتا، تو حجاز سے باہر نہ نکلتا لیکن ساری دنیا میں پھیلا ہے، یہ تبلیغ ہی کی برکت ہے۔ اس لیے کہ جب یہ دین کا مرکز ہے تو تبلیغ کا مرکز بھی ہے۔ اس کے لئے یہاں کے لوگوں کو زیادہ آمادہ کیا جائے۔ کہ یہ دینی تعلیم و تبلیغ کے لئے اور دعوت الی اللہ کے لئے اٹھیں۔

اس واسطے میں نے یہ چند باتیں عرض کیں کہ مکہ کا اول عالم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ دین کے کاموں کی یہیں سے اولیت ہو۔ اس کا مرکزِ عالم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ یہاں دین کی مرکزیت ہو۔ اس کا اصل عالم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ یہیں سے چہار طرف آواز پھیلے گی۔

اس واسطے میں نے یہ چند چیزیں عرض کیں، اور محض تعمیل حکم کے لئے عرض کیں، ورنہ میں کچھ بیمار بھی ہوں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ مدینہ اور مکہ میں ہماری جرأت تو بولنے کی ہوتی نہیں، اب زبردستی بڑے بلوائیں، تو الگ چیز ہے ———— مثل مشہور ہے کہ بڑا مارے بھی اور مار کر رونے بھی نہیں دیتا ———— حکم دیا کہ کرو تقریر، عذر بھی نہیں سنا جائے گا ———— اس لئے تعمیلِ حکم کے طور پر یہ چند باتیں عرض کیں۔ ورنہ کچھ علالت اور مقام کی ہیبت و عظمت کی وجہ سے نہ جرأت پڑتی ہے نہ ہمت ہوتی ہے — یہ چند الفاظ بھی خود اپنی ہمت سے نہیں کہے کہ میری

ہمت کام کر رہی ہو۔ ممکن ہے آپ حضرات کی ہمت کام کر رہی ہو۔ ورنہ میں نے عرض کر دیا تھا۔ میرے میں جرأت نہیں۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ حرم شریف میں تقریر ہو جائے۔ میں نے کہا کہ تقریر کے بہت سے مواقع ہیں۔ حرم شریف ہماری تقریر کے لئے نہیں ہے ——— جو باعزم لوگ ہیں۔ تقریر کریں ——— ہم جیسے طالب علموں کے لئے مناسب نہیں۔ بہر حال تعمیل حکم کے طور پر یہ چند چیزیں عرض کیں تاکہ ایک تو مقامات کی برکت معلوم ہو جائے اور جو مقصد ہے کہ تبلیغ کا کام پھیلے اس کی طرف بھی کچھ اشارہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو بڑھائیں۔ اور ہم سب کو اس کام میں لگنے کی توفیق عطا فرماویں۔ ———

اللھم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

وارنا مناسکنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم

(محرم الحرام ۹۵ھ مدینہ منورہ مدرسہ علوم شرعیہ کی چھت پر حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہٗ مہاجر مدنی (سہارن پوری) کی زیر صدارت حجاج کرام کی بڑی تعداد سے یہ خطاب عام فرمایا گیا) ———

عبادت و خلافت

صحیح معنوں میں انسان وہ ہے جو اپنی ذات کو اپنے پروردگار کے سامنے جھکا دے اور عبادت میں آگے بڑھے، اس کی ناک، پیشانی، ہاتھ، پیر، اس کی روح اور اس کا خیال بھی اللہ کے سامنے ذلیل بن کر جھک جائے یہ کام اپنی ذات کے لئے ہوگا یہ عبادت ہے، دوسرا فریضہ یہ ہے کہ وہ تختِ خلافت پر بیٹھ کر دنیا سے برائیوں کا خاتمہ کرے۔ اس لئے نہ فقط عبادت اور نہ فقط خلافت مقصدِ زندگی ہے بلکہ دونوں مقصود ہیں۔

از: حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

ترتیب

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن
بہ ونتوکل علیہ - ونعوذ باللہ من شرور انفسنا
ومن سیئات اعمالنا - من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ
ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ - ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ
وحدہ لا شریک لہٗ - ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولانا
محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ - ارسلہ اللہ الیٰ کافۃ للناس
بشیرًا ونذیرًا - وداعیًا الیہ باذنہٖ وسراجًا منیرًا
امّا بعد : —— فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰبنیّ اقم الصلوٰۃ وأمر بالمعروف وانہ عن المنکر
واصبر علیٰ ما اصابک - ان ذٰلک من عزم الامور -
(لقمٰن پ۲۱ ع۲)

صدق اللہ العلی العظیم ؎

بزرگانِ محترم!

یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے، جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی۔ یہ نصیحت ہے جو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو کی۔ اور حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کو نقل فرمایا۔ یہ پورا رکوع ہے جس میں حضرت

؎ (۲۴ جولائی ۱۹۶۳ء، افریقہ)

لقمان علیہ السلام کی نصیحتوں ہی کا ذکر ہے، ان کی نصائح میں ایک نصیحت یہ ہے جو اس وقت میں نے تلاوت کی ــــــ اس آیت کے سلسلہ میں کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کرنی، اور نہ ہی آیت کی تفسیر کرنی ہے کہ وہ بہت لمبی چیز ہے، وقت اتنا نہیں ہے، اسی آیت سے ایک مضمون اخذ و استنباط کر کے میں عرض کرنا چاہتا ہوں، اور وہ دو مقاصد پر مشتمل ہوگا، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ انسان کو اللہ نے دنیا میں کیوں بھیجا؟ کیوں پیدا کیا؟ اس کی زندگی کے کیا مقاصد متعین ہیں؟ اور ہم ان مقاصد کو کس حد تک انجام دے رہے ہیں۔

تمہید

ان دو مقاصد کی تفصیل سے پہلے ایک مختصر سی تمہید سمجھ لیجئے، تاکہ اس مقصد کا سمجھنا آسان ہو جائے۔ وہ یہ کہ یہ جو لمبی چوڑی کائنات آپ کے سامنے پھیلی پڑی ہے، جس میں بے انتہا طویل و عریض آسمان کا خیمہ تنا ہوا ہے، زمین کا فرش بچھا ہوا ہے، زمین و آسمان کے بیچ میں ہزاروں قسم کی مخلوقات پھیلی پڑی ہیں، جمادات اور ان کی ہزاروں قسمیں، نباتات اور ان کی ہزاروں قسمیں، جانوروں کی ہزاروں قسمیں ہیں، دریا اور خشکی کے جانور، غرض جمادات، نباتات اور حیوانات یہ بہت سی انواع و اقسام ہیں، جو زمین و آسمان کے درمیان پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر آسمانوں کے اوپر ایک عظیم مخلوق ہے، جس کو ملائکہ کہتے ہیں، وہ اتنے پھیلے ہوتے ہیں، جیسے حدیث میں ہے کہ آسمان میں چار انگلی جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروفِ عبادت نہ ہو۔ تو ان گنت ملائکہ اوپر پھیلے ہوئے ہیں، اس ساری کائنات اور مخلوقات کی انتہاء عرش پر جا کر ہوتی ہے۔ عرشِ عظیم کے اوپر شریعت کسی مخلوق کا پتہ نہیں دیتی، وہاں خالق کی تجلیات اور کمالات ہیں۔ صرف ایک مخلوق

کا پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے ایک تختی اور لوح رکھی ہوئی ہے، اور وہ تختی زمین و آسمان سے بھی زیادہ بڑی ہے، اس پر لکھا ہوا ہے کہ :-

ان رحمتی سبقت غضبی۔ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔

رحمت آگے آگے چلتی ہے، غضب اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہے۔ اصل رحمت ہے، غضب اس کے تابع ہے، یہ ایک دستاویز لکھی ہوئی ہے، اس مخلوق کا تو نشان ملتا ہے۔ باقی خالق کی تجلیات و کمالات اور اس کی صفات عرش کے اوپر پھیلی ہوئی ہیں۔ تو زمینیں، آسمان و زمین کے درمیان فضا، آسمان، جنت، عرش اور کرسی پھر تجلیات ربانی کا یہ سلسلہ ہے، تو بڑی لمبی چوڑی کائنات ہے۔

انسان میں مخلوقات کے نمونے

لیکن اللہ کی قدرت دیکھئے کہ اس ساری لمبی چوڑی کائنات کو جو کروڑوں میلوں پر پھیلی ہوئی ہے، ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں بند کر دیا۔ آجکل کے سائنس دانوں کے قول کے مطابق چاند زمین سے سترہ لاکھ میل دور ہے، جس میں جانے کا ارادہ کیا جا رہا ہے، (اب تو ان کا دعوٰی ہے کہ وہ پہنچ بھی چکے ہیں)، پھر اس سے کتنا اوپر آسمان ہے، پھر کتنے آسمان اور کتنی جنتیں ہیں، تو لاکھوں کروڑوں میل پر مشتمل ہے، لیکن جب اس کو سمیٹا تو ایک ڈیڑھ گز کی جگہ میں آگئی، اور وہ ڈیڑھ گز کی جگہ کیا ہے ؟ وہ آپ ہیں۔ ساری کائنات کو اللہ نے انسان میں جمع کر دیا، جس میں زمین بھی ہے، آسمان بھی ہیں، پہاڑ بھی ہیں، جمادات، نباتات اور حیوانات بھی اس کے اندر جمع ہیں۔

انسان کو دیکھا جائے تو اس میں مٹی بھی ہے، پیدا ہی زمین سے ہوا، اسے مشتِ خاک ہی کہتے ہیں، کہ ایک مٹھی خاک سے ہمارا بدن پیدا کیا گیا۔ تو یہ ہمارا بدن زمین کا ایک تودہ ہے، روح نے اس مٹی کو سنبھال رکھا ہے، رُوح نکلنے کے بعد پھر مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے، تو اصل میں مٹی ہے ——— اور اس زندگی کی حالت میں بھی اس سے

مٹی نکلتی رہتی ہے۔ اگر آپ روزانہ غسل نہ کریں، تو جب بدن پہ ہاتھ پھیریں گے، بدن سے سیاہ سیاہ بتیاں اتریں گی، وہ مٹی اور کوڑا کباڑ نہیں تو کیا ہے؟ تو بدن خاک کا ہے اور خاک ہی اس سے چھنتی ہے۔ اگر خارش ہو جائے، تو سارے بدن سے بھوسی سی جھڑتی ہے، جیسے مٹی جھڑ رہی ہو، تو آج بھی انسان مٹی کا تودہ ہے۔ مرنے کے بعد یہ مٹی بکھر جاتی ہے، گویا انسان کے اندر زمین موجود ہے، اور وہی خاصیت اس زمین کی ہے، جو عام زمین کی ہے۔ اگر آپ اس میں غور کریں، آپ کی اس زمین میں پہاڑوں کا سلسلہ بھی ہے۔ ہزاروں چھوٹے بڑے پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں، یہ جو انسان میں ہڈیوں کا سلسلہ ہے، یہ پہاڑوں کی مانند ہے، کوئی بڑی ہڈی، کوئی چھوٹی، کوئی لانبی، کوئی چوڑی، جیسے پہاڑ مختلف ہوتے ہیں، تو یہ ایک سلسلہ ہے جو اس میں پھیلا ہوا ہے۔ اسی طرح اگر آپ غور کریں، جیسے دنیا کی زمین میں درخت، گھاس اور نباتات اُگتے ہیں، ہماری زمین میں بھی نباتات اُگے ہوئے ہیں، بدن کے اوپر رو داں اور بال یہ نباتات ہیں۔ پھر کسی زمین پر گھنے جنگل ہوتے ہیں کہ بہت ہی قریب قریب درخت ہیں، تو سر ایسا ہے جیسے گھنا جنگل، کہ سینکڑوں درخت اس میں قریب قریب اُگے ہوئے ہیں، کوئی زمین ایسی ہوتی ہے کہ اس میں درخت دُور دُور ہوتے ہیں، جیسے عام بدن کے اوپر رو داں، یہاں بال دُور دُور ہیں، کوئی زمین کا حصّہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں کوئی درخت پیدا ہی نہیں ہوتا، ہتھیلیوں پر کچھ بھی نہیں اُگتا، ناک کے اوپر کوئی بال نہیں اُگتا۔ تو اس ہماری زمین میں کوئی حصّہ وہ ہے جس میں کثرت سے اور کچھ حصّہ میں تھوڑے، اور کچھ حصّہ وہ ہے کہ اس میں سرے سے بال اُگے ہی نہیں —— غرض ہمارے بدن کی زمین میں مٹی، پہاڑ، اور نباتات کا سلسلہ بھی ہے۔

اور اس میں حیوانات بھی ہیں۔ آجکل کے ڈاکٹروں کی تحقیقات تو یہ ہیں کہ خون میں جراثیم (چھوٹے چھوٹے حیوانات) ملے ہوئے ہیں، جو خورد بین سے دکھلائی دیتے ہیں، ویسے نہیں۔ بدن کے ہر حصّے میں نئے نئے رنگ کے جانور ہیں۔ ان کے مجموعے سے خون بنا ہے، وہ مر جائیں تو انسان مر جاتا ہے، تو پورے بدن میں جراثیم پھیلے ہوئے ہیں۔

جیسے آپ کی زمین میں مختلف صوبے ہیں، کسی صوبے میں خاص قسم کے جانور، کہیں اور قسم کے جانور، کہیں کچھ ہوتا ہے کہیں کچھ۔ تو یہ ہاتھ اور پیر اس زمین کے صوبے ہیں، اس میں مختلف قسم کے جانور ہیں۔ وہ حیوانات مختلف شکلوں کے ہیں، ان سے امراض بھی پیدا ہوتی ہیں، اگر ان جراثیم کو مار ڈالا جائے تو ان سے بیماری ختم ہو جاتی ہے۔ انہی جراثیم سے زندگی بھی ہے۔ انسان کے مادے (خون) میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور سر میں بھی تو کبھی جوئیں پڑ جاتی ہیں، آدمی ان کو پکڑتا ہے اور ناخن پر رکھ کر مارتا ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے جنگل میں مختلف جانور پھرا کرتے ہیں، تو جیسے اسی زمین سے جانور پیدا ہوتے ہیں اور اسی میں کھپ جاتے ہیں۔ ایسے ہی انسان کی زمین میں جانور پیدا بھی ہوتے ہیں اور مر کر اسی میں کھپ بھی جاتے ہیں — بعض دفعہ معدے میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں، ڈاکٹر علاج کرتے ہیں، وہ کیڑے ساری غذا کھاتے رہتے ہیں، انسان کمزور ہوتا رہتا ہے، بدن کو نہیں لگتی، تو سر میں جوئیں اور معدے میں کیچوے پیدا ہو جاتے ہیں، زخموں میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ بہر حال انسان کی زمین میں مختلف حیوانات ہیں، جو چل رہے ہیں۔ تو جیسی کائنات باہر کی ہے ویسی ہی ہمارے اندر کی کائنات بھی ہے، کہ زمین، پہاڑ، نباتات اور مختلف قسم کے حیوانات بھی، شکل و صورت سے بھی مختلف، پیدا بھی ہوتے اور مرتے بھی ہیں۔

پھر جیسے آپ کی اس دنیا میں وقت آنے پر بارشیں ہوتی ہیں۔ اس بدن میں بھی بارش ہوتی ہے، جب گرمی آتی ہے تو پسینہ نکل رہا ہے، ایسے ٹپک رہا ہے، جیسے بارش ہو رہی ہو۔ پھر جتنے قسم کے پانی زمین میں ہیں، اتنے ہی قسم کے انسان کے اندر ہیں، دنیا میں بعض جگہ پانی کے گرم چشمے نکلتے ہیں۔ ہندوستان میں منڈیل کے ضلع میں بعض جگہ کھولتے ہوئے پانی کے چشمے ہیں، لوگ اس پانی کو ٹھنڈا کر کے غسل کرتے ہیں، ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے منوں آگ میں اسے پکایا گیا ہو — بعضے چشمے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے ہیں۔ سمندر کا پانی کڑوا ہے۔ بعض جگہ پانی میں ترشی ہوتی ہے — انسان کے بدن کے اندر بھی ایسے ہی ہے۔ منہ کے اندر اللہ نے میٹھا چشمہ جاری

کر رکھا ہے، اگر منہ میں کڑوا پانی ہوتا، آدمی کی زندگی تلخ ہو جاتی۔ تو نہایت شیریں قسم کے پانی کا چشمہ زبان سے بہہ رہا ہے۔ اسی پانی کی مدد سے غذا اندر پہنچتی اور اسی کی مدد سے ہضم بھی ہوتی ہے ـــ آنکھوں سے جو آنسو ٹپکتے ہیں، وہ نمکین پانی ہے۔ کبھی زبان پر آنسو کا پانی لگ جائے، تو نمک کا سا مزا آتا ہے۔ تو آنکھوں کے اندر نمکین چشمہ جاری کر دیا۔ پتے میں دیکھو تو کڑوا پانی بھرا ہوا ہے، اس میں کڑوا چشمہ جاری ہے۔ معدے کے اندر ترش پانی بھرا ہوا ہے، جس سے غذا ہضم ہو رہی ہے ـــ پھر کہیں پاک پانی اور کہیں ناپاک۔ مثانے میں ناپاک پانی بھرا ہوا ہے، جسے پیشاب کہتے ہیں، اور منہ میں پاک پانی بھرا ہوا ہے جسے لعاب کہتے ہیں، یہ نکلے کہ آدمی تھوکے، اس سے وضو نہیں ٹوٹتی۔ پیشاب کا ایک قطرہ نکل آئے، وضو ٹوٹ جاتی ہے۔ تو بدن میں پاک، ناپاک، ٹھنڈا، گرم، ترش، اور میٹھا و کڑوا ہمہ قسم پانی موجود ہے۔ برسات اس میں کہ پسینہ ٹپ ٹپ ٹپک رہا ہے، تو جو اس کائنات میں ہے وہی انسان کے اندر ہے۔ ساری کائنات انسان میں جاری ہے۔

یہاں اگر ہوائیں چلتی ہیں تو انسان میں بھی ہوائیں چلتی ہیں جیسے یہاں ٹھنڈی اور گرم ہیں، آپ جب سانس اندر کو لیتے ہیں، تو ٹھنڈی اور جب باہر کو لیتے ہیں تو گرم ہوا نکلتی ہے۔ جیسے دنیا میں بعض اوقات ہوا بند ہو جاتی ہے، آدمی دوڑا دوڑا پھرتا ہے کہ بھئی پنکھے چلاؤ، طبیعت گھبرا گئی۔ انسان کے بدن میں بھی بوجھ ہو جاتا ہے معدے میں ہوا پھنس جاتی ہے، ڈاکٹروں کے پاس دوڑے دوڑے پھرتے ہیں کہ صاحب! کسی طرح سے ہوا کو نکال دو۔ اگر ہوائیں بند ہو جائیں تو اندر بھی گھٹن ہوتی ہے ـــ تو انسان کے بدن میں پانی بھی ہے، اور ہوا بھی، اور چلنے کا ڈھنگ بھی وہی جو باہر کی زمین میں ہے ـــ

اسی طرح انسان کے بدن میں آگ بھی ہے۔ کبھی آپ بدن پر ہاتھ رکھیں گے تو گرمی محسوس ہوتی ہے۔ اگر بدن میں آگ نہیں تو یہ گرمی کاہے کی ہے؟ اور اگر آدمی زور سے ہاتھ کو ملے، تو چنگاریاں سی نکلنے لگتی ہیں۔ اور میل بھر دوڑ لیں، تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سارے بدن میں آگ بھر گئی۔ اگر اندر حرارت نہیں ہے،

تو اندر کیا چیز الگ ہے۔ تو آگ، پانی، ہوا اندر موجود ہیں، اور ان کا عمل بھی جاری ہے۔

غرض یہ آپ کا بدن اس پوری کائنات کی طرح ایک دنیا ہے، جیسے اس میں اوپر آسمان ہے، اور نیچے زمین ہے۔ آپ کے اندر سر آسمان کی مانند ہے، اور نیچے پیر زمین کی مانند ہیں۔

جیسے آسمان میں چاند سورج ہیں، جن کی روشنی سے آپ اس کائنات کو دیکھتے ہیں انسان کی پیشانی پر چاند اور سورج کی طرح سے دو آنکھیں ہیں، ان میں روشنی نہ ہو، کائنات نظر نہیں آتی ——— تو چاند، سورج اور روشنی بھی ہے۔

پھر حکومت کا ایک نظام بھی قائم ہے۔ ہاتھ اور پیر یہ قلب کے خادم ہیں، قلب کا ذرا اشارہ ہوا، ہاتھ پیر چلنے لگتے ہیں۔ تو پوری کائنات جیسے باہر منظم ہے، اسی طرح اندر بھی ہے، قلب حاکم و بادشاہ اور ہاتھ پیر اس کے خدام ہیں ——— غرض تفصیل کہاں تک عرض کی جائے۔ انسان کے اندر ہوا، برسات، آگ، مٹی، پہاڑ، سبزہ، جانور، اور موت و حیات بھی ہے، سارا قصہ وہی ہے جو کائنات کے اندر ہو رہا ہے ——— انسان کی ایک صورت یہ ہے جس کا آپ نے مشاہدہ کیا اور مثال دیکھی کہ آسمان سے زمین تک جتنے درجے کائنات کے ہیں، وہ سب اس کے اندر موجود ہیں۔ یہ اللہ کی صناعی ہے کہ جس کائنات کو لاکھوں، کروڑوں میل میں پھیلایا ہے، جب اس کو سمیٹا تو ایک ڈیڑھ گز کے انسان میں ساری کائنات کو جمع کر دیا۔

اسی واسطے علماء لکھتے ہیں کہ انسان حقیقتِ جامعہ ہے، یعنی اتنی جامع حقیقت ہے کہ وہ سارے کمالات اس کے اندر جمع ہیں جو پوری کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں ———

انسان میں خالقِ کائنات کے نمونے

پھر یہی نہیں ہے کہ اس میں فقط کائنات ہی کے نمونے ہوں۔ غور کیا جائے،

تو خالقِ کائنات کے نمونے بھی انسان ہی میں جمع ہیں۔ ایسے نمونے جمع ہیں کہ اگر ہم انہیں سامنے رکھیں تو ان نمونوں سے خدا تعالےٰ کی ذات، صفات اور کمالات سب عیاں ہو جائیں۔ ہمیں کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر ہم اپنے اندر غور کریں، تو خدائی کمالات بھی ہمارے اندر سے ابھریں گے

آپ غور کیجئے کہ آپ کے بدن کی یہ ساری کائنات کس چیز سے سنبھلی ہوئی ہے یہ روح ہی سے سنبھلی ہوئی ہے، اگر روح نکل جائے، تو ساری کائنات بکھر جائے۔ مٹی بکھر کر مٹی میں جا ملے گی، پانی پانی میں، آگ آگ میں، اور ہوا، ہوا میں مل جائے گی، ساری کائنات ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ روح ایک مدبرِ اعظم ہے، جس نے قیومیت کر رکھی ہے۔ ساری کائنات کو سنبھال رکھا ہے —— ہم اس کو سامنے رکھ کر دلیل پکڑ سکتے ہیں کہ جب ہماری کائناتِ بدن کو سنبھالے رکھنے کے لئے ایک قیوم کی ضرورت ہے، اسی طرح اس پوری کائنات کا ایک مُدبرِ اعظم ہے، جس نے پوری کائنات کو سنبھال رکھا ہے۔ تو خدا کے وجود پر دلیل ہمیں اپنے اندر سے مل جاتی ہے۔

آپ غور کیجئے آپ کا بدن سُرخی مائل ہے۔ چہرے پر سرخی اور بالوں پر سیاھی ہے۔ تو بدن پر کہیں سفیدی، کہیں سُرخی، کہیں سیاہی، غرض بدن پر مختلف رنگ ہیں۔ یہ سارے رنگ روح کی وجہ سے قائم ہیں، لیکن روح کا کوئی رنگ نہیں، وہ ہر رنگ سے بری و بالا ہے —— اسی طرح سے ہم کہیں گے کہ اس کائنات میں ہزاروں رنگ ہیں۔ انسان کے مختلف رنگ ہیں۔ درخت سبز، پھول سُرخ ہیں۔ ان سارے رنگوں کو اس روحِ اعظم نے سنبھال رکھا ہے جس کو ذاتِ خداوندی کہتے ہیں، اور وہ خود ہر رنگ سے بری و بالا ہے، لیکن ہر رنگ کو جلوہ دے رکھا ہے۔ تو خدا کے وجود کی دلیل اپنے اندر سے ملتی ہے۔

نیز اس پر غور کریں کہ آپ کے اس بدن کے اندر کسی کو جانے کا موقع دیا جائے۔ اور آپ کے اندر گھس کے وہ خوب سیر کرے۔ آپ اس سے پوچھیں کہ بھئی! رُوح

کہاں کو بیٹھی ہوئی ہے۔ ہاتھ، پیر، دماغ یا دل میں ؟ وہ یوں کہے گا کہ مجھے تو ہر ذرّے میں رُوح کا جلوہ نظر آتا ہے۔ میں (کسی خاص عضو کی طرف) اشارہ نہیں کر سکتا۔ کہ رُوح وہاں بیٹھی ہے۔ جب رُوح، ایک مخلوق کا، یہ عالم ہے کہ بدن کے ذرّے ذرّے میں اس کا جلوہ پھیلا ہوا ہے۔ تو اس پوری کائنات میں رُوحِ اعظم اور جلوۂ خداوندی ہر جگہ پھیلا ہوا ہو۔ اور اشارہ نہ کیا جا سکے کہ وہ وہاں ہے، یا یہاں ہے، اس میں کون سے تعجب کی بات ہے ؟ یہ اللہ کی شان ہے کہ وہ سمت اور جہت میں نہیں۔ انگلی سے اس کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے۔ وہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی جہت اور سمت میں مقید ہے۔ وہ لامحدود ذات ہے، مگر اس نے اپنا نمونہ رُوح کو بنا دیا..... کہ رُوح کو آپ کسی خاص عضو میں مقید نہیں بتا سکتے۔ ہاں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کو بدن کے بعض حصّوں سے خاص تعلق ہے۔ جلوہ تو ہر جگہ ہے، مگر تعلقات الگ الگ ہیں۔ رُوح کو جو تعلق قلب سے ہے، وہ دماغ سے نہیں۔ جو دماغ سے ہے، وہ پیٹ سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر قلب میں سوئی بھی چبھو دی جائے، تو آدمی مرنے کو ہو جاتا ہے۔ رُوح دوڑنے لگتی ہے کہ میں نہیں ٹھہرتی۔ دماغ کو توڑ دیا جائے، رُوح باقی نہیں رہے گی۔ ہاتھ پیر کو کاٹ لیا جائے، رُوح باقی رہے گی۔ اگرچہ آدمی ناقص ہو جائے گا۔ ناخن اور بال کاٹ دو تو کوئی اذیت نہیں ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے رُوح کو جو تعلق قلب سے ہے، دوسرے اعضاء سے وہ تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اس کائنات میں اللہ کا جلوہ ہر جگہ موجود ہے۔ مگر جو تعلق بیت اللہ سے ہے، وہ آپ کی مسجدوں سے نہیں ہے جو آپ کی مسجدوں سے ہے، وہ آپ کے گھرانوں سے نہیں ہے۔ جو آپ کے گھرانوں سے ہے وہ ویران جنگلوں سے نہیں ہے۔ تو جلوہ ہر جگہ ہے، مگر تعلقات الگ الگ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بیت اللہ کے بارے میں اگر کوئی گستاخی کا کلمہ بھی کہہ دے تو پورے عالم میں شور مچ جاتا ہے، جیسے عالم تباہ ہونے کے قریب آ گیا۔ مسجد پر اگر کوئی حملہ کر دے، تو اس مقام کے مسلمانوں میں بے چینی پھیل جاتی ہے، اگر آپ کے گھر پر

کوئی حملہ کر دے تو آپ اور آپ کے خاندان والے تو پریشان ہوں گے۔ یہ نہیں کہ سارا شہر بے چین ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ سے اللہ کو جو تعلق ہے وہ اتنا بڑا ہے کہ پوری کائنات پر پھیلا ہوا ہے۔ سارے انسان بے چین ہو جائیں گے۔ مسجد اور عام گھروں سے وہ تعلق نہیں ___ تو تعلق درجہ بدرجہ ہے مگر جلوہ ہر جگہ موجود ہے۔

اس لئے اللہ کے جلوے اور اس کی تجلیات کا ہر جگہ موجود ہونا، اور اس کے تعلقات میں فرقِ مراتب ہونا، آپ کو اپنے اندر سے اس کی دلیل مل جاتی ہے۔ کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

نیز آپ غور کریں کہ آپ رُوح سے زندہ ہیں۔ تو ایک رُوح سے زندہ ہیں، یا دو روحیں کام کر رہی ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ ایک ہی رُوح ہے۔ اگر دو روحیں ہو جائیں، بدن پھٹ کر خراب ہو جائے، ایک رُوح کہے گی میں بدن کو بھوک لگانا چاہتی ہوں۔ دوسری کہے گی میں ہرگز نہیں چاہتی۔ ایک رُوح کہے گی سردی لگنی چاہیئے، دوسری روح کہے گی گرمی لگنی چاہیئے۔ تو روحوں کو لڑائی سے فرصت نہیں ہوگی۔ بدن کی تربیت کون کرے گا؟ بدن خراب خستہ ہو کر تباہ ہو جائے گا۔ ایک ہی رُوح کام کر سکتی ہے۔ دو روحیں ہوں تو بدن کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔

یہی صُورت اس کائنات کی ہے کہ لو کان فیھما اٰلھۃ الا اللہ لفسدتا۔ اگر کائنات میں دو خدا ہوں تو کائنات چل نہیں سکتی۔ ایک خدا کہے گا میں فلاں کو بیٹا دینا چاہتا ہوں، دوسرا خدا کہے گا میں اس کو بانجھ رکھنا چاہتا ہوں ___ ایک کہے گا میں فلاں قوم کو عزت، اور دوسرا کہے گا کہ میں اس کو غلام بنانا چاہتا ہوں۔ دونوں خداؤں کو لڑائی سے فرصت نہیں ہوگی۔ کائنات کون چلائے گا؟ یہ بات الگ رہی کہ دو خدا ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر معاذ اللہ مان لیا جائے تو کائنات برقرار نہیں رہ سکتی۔ جیسے بدن میں دو رُوح ہوں، کائنات بدن باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ تو ایسا ہو گا جیسے ایک میان میں دو تلواریں ڈال دیں، اور ایک شیروانی میں دو آدمی گھس جائیں، شیروانی پھٹے گی نہیں تو اور کیا ہو گا؟ تو ایک

کائنات یا پچاس مخلوقات ایک ہی خالق سے چلتی ہیں۔

اور اگر یوں مان لیا جائے کہ دونوں خدا آپس میں صُلح کر لیں۔ معلوم ہوا ایک دوسرے سے دب گیا، تو جو ذلیل ہو، وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ خُدا وہ ہے جو سب چیزوں پر غالب اور قوی ہو۔ جو لڑائی سے بچنے کے لئے دوسرے سے کہے کہ صُلح کر لو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں دوسرے سے خوف موجود ہو، جس میں خوف ہو، وہ خدا تھوڑا ہی ہے۔ خدا وہ ہے کہ سارے اس سے ڈریں، وہ خود ڈر اور خوف سے بالاتر ہو ــــ نہ صلح کے اصول کو سامنے رکھ کر، اور نہ ہی فساد کو سامنے رکھ کر دو خدا نہیں مانے جا سکتے، تو اللہ کی توحید اور یکتائی کی دلیل آپ کے اندر سے آپ کو مل رہی ہے۔ آپ کو باھر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ خود آپ کے اندر اللہ کی ذات، توحید، اس کی یکتائی، اس کی صفات کے سب نمونے آپ کے اندر سے نکل آتے ہیں، اور ثابت ہو جاتا ہے کہ بے شک کائنات میں کوئی مُدبّرِ اعظم ہے ــــ اور یہ تخیل کہ معاذاللہ خدا نہیں ہے۔ اور کائنات خود ہی چل رہی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص یوں کہے کہ میرے اندر رُوح نہیں ہے۔ یہ بدن ایسا ہی چل رہا ہے۔ اگر کوئی دہریہ اس کائنات کے اندر خدا کا منکر ہے، اسے اپنے اندر رُوح کا بھی انکار کرنا چاہیئے۔

اور جس طرح سے آپ کی روح' بدن کے خِطّے خِطّے سے واقف ہے۔ آپ کے اندر شعور ہے کہ وہ جانتی ہے کہ یہ میرا ناخن، بال، پیٹ ہے۔ نیز یہ کہ اس وقت پیٹ میں گڑبڑ ہو رہی ہے، ویسے علم ہوتا ہے۔ اس وقت پیٹ اچھا ہے، تو کائنات بدن کے ذرّے ذرّے سے روح واقف ہے، اگر واقف نہ ہو، تو نظم کیسے چلائے، اگر رُوح کو پتہ ہی نہ چلے کہ بخار چڑھ رہا ہے، تو دُور کرنے کی اسے فرصت کہاں ہو گی؟ ۔ اسی طرح اس کائنات کے ذرّے ذرّے کا علم اللہ کی ذات کو ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ حق تعالیٰ نہ جانیں کہ کائنات میں کیا ہو رہا ہے۔ الا یعلم من خلق۔ جو پیدا کر رہا ہے، کیا وہ معاذاللہ لاعلم ہو گا ــــ؟ پیدا کرنے والا ہی مخلوق کے ذہن، صفات اور احوال کو جانتا ہے، تو اللہ کے لامحدود علم کی نظیر ہمارے اندر موجود ہے۔

تو اللہ نے انسان کو ایسا جامع بنایا کہ اگر وہ اپنے اندر خدائی کمالات دیکھنا چاہے تو اپنے آئینے کے اندر دیکھ لے۔ اس کو سارے خدائی نمونے نظر آجائیں گے۔

قرآن کریم نے فرمایا:-

سنریهم اٰیٰتنا فی الاٰفاق وفی انفسهم حتّٰی یتبین لهم انه الحق —— ہم عنقریب حق کی نشانیاں انسانوں کو باہر اور ان کی جانوں کے اندر بھی دکھلائیں گے، تاکہ واضح ہو جائے کہ اللہ ہی حق و ثابت ہے، اور وہی کائنات کا چلانے والا ہے —— تو منطقی دلیلیں الگ رہیں، یہ مشاہدے کی دلیلیں ہیں کہ آدمی اپنے اندر غور و فکر کر کے خدائی کمالات کو پہچان لے۔

میرے عرض کرنے کا حاصل یہ نکلا کہ خالق اور مخلوق کے نمونے سارے ہمارے اندر موجود ہیں۔ تو انسان ایک عجیب چیز نکلی، کہ اس میں دونوں نمونے جمع ہیں۔

نمونۂ کائنات ہونے کی نسبت سے انسان کا فریضہ

اس واسطے انسان پر دو ہی فرائض عائد ہوں گے، ایک ایسا فریضہ جو مخلوق ہونے کے مناسب، اور ایک فریضہ ایسا جو خالق کے نمونوں کے مناسب ہے۔

نمونۂ مخلوق ہونے کا فریضہ کیا ہے؟ —— جس مخلوق کو خدا وجود دے، وہ اپنی پیدائش میں خالق کی محتاج ہے اور بقاء میں بھی۔ تو ہر قدم پر ہم خدا کے محتاج ہیں۔ محتاج کا کام غنی کے سامنے کیا ہوتا ہے؟ محتاج کا کام یہ ہے کہ وہ غنی کے سامنے جھکے، اور اس کے آگے سجدہ کرے۔ اس لیے کہ اگر ہمارے پاس سب کچھ ہو، تو ہمیں اس سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تبھی حاجت مندی اس کے سامنے لے جاتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ موجود نہیں۔

ایک فقیر آپ سے تبھی سوال کرے گا کہ اس کے پاس دولت نہ ہو، اگر اس کے پاس دولت ہو، اسے سوال کرنے کی کیا ضرورت پڑی؟ تو محتاج ہاتھ پھیلاتا ہے،

غنی نہیں ـــــ زندگی ہمارے قبضے میں نہیں تھی۔ ہم نے ہاتھ پھیلایا کہ اے اللہ! ہمیں زندگی عطا کر اس نے دے دی۔

زندگی آنے کے بعد اس کا باقی رکھنا ہمارے قبضے میں نہیں، اگر ہمارے قبضے میں ہوتا، تو ہم کبھی نہ مرتے۔ مگر مرنا پڑتا ہے۔ معلوم ہوا ہمارے ہاتھ میں زندگی نہیں ـــــ ہم دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ ہماری زندگی طویل کر دے۔ عملی دعار مانگتے ہیں۔ یعنی ان اسباب کو اختیار کرتے ہیں جن سے زندگی باقی رہے، کھاتے، پیتے، دوائیں استعمال کرتے ہیں۔ یہ عملی دعار ہے۔ اور زبان سے بھی کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں زندہ رکھ۔ یہ کیوں مانگتے ہیں؟ محتاجگی ظاہر کرنے کو، کہ وہ غنی ہے، ہم محتاج ہیں۔ محتاج کا کام جھکنا ہے۔ تو مخلوق خالق کی محتاج ہوتی ہے۔ اس کا فریضہ ہے کہ وہ جھکے۔

اور جھکنا بھی معمولی درجے کا نہیں، بلکہ انتہار درجے کا جھکنا ہے، یعنی ایسی ذلت ظاہر کرے، کہ ایسی ذلت کسی کے آگے ظاہر نہ کر سکے۔ اس لئے کہ خالق وہ ہے کہ اس کی عزت کی کوئی انتہار نہیں۔ تو اس کے سامنے ذلت بھی ایسی پیش کرنی چاہیئے کہ اس ذلت کی بھی کوئی انتہار نہ ہو۔ اس انتہائی ذلت کو پیش کرنے کا نام اسلام کی زبان میں عبادت ہے۔ عبادت غایت تذلل کو کہتے ہیں ـــــ اور اگر آپ غور کریں تو یہ انتہائی ذلت آدمی نماز میں ہی ظاہر کر سکتا ہے۔ کسی اور عبادت سے ظاہر نہیں کر سکتا ـــــ اس لیے کہ انتہائی تذلل کی جتنی شانیں ہیں، وہ ساری نماز کے اندر موجود ہیں۔ نوکروں کی طرح ہاتھ باندھ کر گردن جھکا کر کھڑے ہونا۔ پھر اتنی ذلت پر قناعت نہیں، رکوع کر کے گردن جھکا دی، اور زیادہ ذلت کا اظہار کیا۔ پھر اسی پر قناعت نہیں، سب سے زیادہ عزت کی چیز انسان میں ناک اور پیشانی ہے، اسے سجدے میں جا کر زمین پر رگڑتا ہے۔ کہ اے اللہ! تیری عزت کے سامنے میں اپنی انتہائی ذلت پیش کرتا ہوں ـــ پھر اسی پر بس نہیں، اخیر میں بھیک مانگتا ہے کہ اے اللہ! مجھے نیکی دے، رزق دے، وغیرہ وغیرہ ـــــ بھیک مانگنے سے زیادہ کسی چیز میں ذلت نہیں ہوتی۔ تو سجدے کے بعد اخیر میں دعائیں مانگی جاتی ہیں ـــــ

تو مقصود یہ نکلا کہ مخلوق اپنے خالق کے آگے جھکے ۔ انتہائی ذلت کا اظہار کرے ، اور وہ نماز کے اندر ہوتی ہے ۔ تو نماز کا فریضہ عائد ہوا ، جس سے آدمی عبادت کر سکتا ہے ۔ نماز کے سوا حقیقۃً عبادت کی کوئی چیز نہیں ہے جس سے عبادت کی جا سکے ۔ اس لیے کہ عبادت کے معنیٰ انتہائی ذلت پیش کرنے کے ہیں ، یہ نماز ہی میں ہے ، اور کسی عبادت میں نہیں ہے ۔ مثلاً آپ زکوٰۃ ، یا صدقہ دیں ، یہ حقیقی طور پر عبادت نہیں اس میں ذلت کا اظہار تھوڑا ہی ہے ۔ اس میں تو اللہ کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا ہے کہ جیسے اللہ مخلوق کو دیتا ہے ، آپ بھی غریب کو دیتے ہیں ۔ تو دینا اور احسان کرنا ذلت نہیں ، بلکہ انتہائی عزت کی بات ہے ، یہ خدائی کام ہے ، تو زکوٰۃ وصدقہ دینا اپنی ذات سے عبادت نہیں ۔ چونکہ اللہ نے حکم دیا ، ایسا کرو ، تعمیلِ حکم کی وجہ سے اس میں عبادت کی شان پیدا ہو گئی ۔ ورنہ اپنی ذات سے عبادت نہیں ۔

اسی طرح آپ روزہ رکھیں ۔ روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں ۔ اس لئے کہ روزے کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ کھانے ، پینے اور بیوی سے بے نیاز ۔ سب سے مستغنی ۔ تو یہ شان اللہ کی ہے کہ کھانے ، پینے اور بیوی سے بری و بالا ہے ، اللہ سے مشابہت پیدا کرنا ، یہ ذلت کی بات تھوڑا ہی ہے ۔ تو روزہ عین عزت ہے ، پھر بھی روزہ عبادت بنا ۔ اس لیے کہ حکم ہے کہ روزہ رکھو ، تعمیلِ حکم کی وجہ سے عبادت بن گیا —— ہم سچ بولنے کو عبادت کہتے ہیں ، لیکن سچ بولنا اپنی ذات سے عبادت نہیں ، کیونکہ سچ بولنا اللہ کا کام ہے ۔ ومن اصدق من اللہ قیلاً ۔ اللہ سے زیادہ کس کا قول سچا ہے — ومن اصدق من اللہ حدیثاً ۔ اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ۔ جو سچ بولے ، وہ ذلت کا کام تھوڑا ہی کر رہا ہے ۔ وہ تو انتہائی عزت کے مقام پر ہے ۔ عبادت اس لئے بنا کہ حکمِ خداوندی ہے کہ سچ بولو ، جھوٹ مت بولو ۔ تعمیلِ حکم کی وجہ سے اس میں شانِ عبادت پیدا ہو گئی ۔ ان تمام چیزوں میں کوئی چیز اپنی ذات سے عبادت نہیں ۔ یہ نیت اور مقاصد کی وجہ سے عبادت بن گئی ہیں ۔ لیکن نماز میں جتنے افعال ہیں ، ان میں اپنی ذات کی وجہ سے اظہارِ ذلت ہے ۔

کھڑے ہونا، جھک جانا، سجدہ کرنا، دعائیں کرنا، بھیک مانگنا سب ذلّت کا اظہار ہے، اس لئے اپنی ذات سے جو چیز عبادت ہے، وہ صرف نماز ہے ——

یہی وجہ ہے کہ نماز اللہ نے فقط انسان پر نہیں، کائنات کے ذرّے ذرّے پر فرض کی ہے — قرآن کریم میں فرمایا گیا —— کل قد علم صلاتہ وتسبیحہ، —— ہر چیز نے اپنی نماز اور تسبیح پہچان لی —— معلوم ہوا درخت، پہاڑ، جانور سبھی نماز پڑھتے ہیں۔ سب پر نماز واجب ہے —— فرق اتنا ہے کہ انسان کو خطاب کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں عقل ہے، اور مخلوقات کو خطاب نہیں کیا گیا۔ مگر بنایا ایسے، گویا وہ نماز پڑھ رہے ہیں — جیسے علماء لکھتے ہیں کہ جتنے درخت ہیں، ان کی نماز میں قیام ہے، رکوع و سجدہ نہیں۔ گویا ایک پیر پر کھڑے ہوئے نماز میں مصروف ہیں۔ رکوع سجدے کی اجازت نہیں ہے — چوپائے، جو چار پیروں سے چلتے ہیں، ان کی نماز میں رکوع ہے۔ ان کو ایسی ہیئت سے اللہ نے بنایا، کہ وہ ہر وقت رکوع میں ہیں، سجدہ و قیام ان کی نماز میں نہیں ہے۔ پہاڑوں کو اس طرح بنایا جیسے آدمی تشہد میں بیٹھتا ہے۔ گویا پہاڑ زمین پر گھٹنے ٹیکے ہوئے التحیات میں مصروف ہیں، ان کی نماز میں قعدہ ہے۔ قیام، رکوع اور سجدہ نہیں ہے۔ حشرات الارض جیسے سانپ بچھو، ان کی نماز میں سجدہ ہے نہ رکوع ہے نہ قیام۔ یہ گویا ہر وقت اوندھے پڑے ہوئے اللہ کے سامنے سجدے میں مصروف ہیں۔ چاند، سورج یا آجکل کے قول کے مطابق زمین گردش میں ہے۔ یہ گردش سے اللہ کی عبادت کر رہے ہیں۔ حرکت دوری ان کی نماز ہے۔ اسی طرح سے جنّت و دوزخ کی نماز دعا مانگنا ہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت یہ سوال کر رہا ہے اے اللہ! قیامت کے دن مجھے بھر دیجئے۔ میرے محلات خالی نہ رہیں — جہنم بھی کہہ رہا ہے کہ مجھے بھر دیجئے۔ اور اللہ کا وعدہ ہے قیامت کے دن دونوں کو بھر دیا جائے گا۔ وعدہ پورا کیا جائے گا۔ جب تک نہیں بھریں گے، جہنم پکارتا رہے گا۔ ھل من مزید، ھل من مزید —— چاند، سورج، پہاڑ، دریا، مٹی سب جھونک دیئے جائیں گے۔ پھر بھی وہ کہے گا ھل من مزید ——

جب ان سب چیزوں سے نہیں بھرے گا، تو حدیث میں ہے، حق تعالےٰ جہنم کے منہ پر پیر رکھ دیں گے۔ جیسا پیر ان کی شان کے مناسب ہے۔ اس وقت کہے گا کہ بس! بس! اب میں بھر گیا، اور وعدہ پورا ہو گیا۔

جنت میں سارے جنتی داخل ہو جائیں گے۔ پھر بھی اس کے شہر اور بستیاں خالی رہ جائیں گی، تو ایک مستقل مخلوق پیدا کی جائے گی۔ جس سے جنت آباد کی جائے گی۔ تو جنت و جہنم کی نماز دعا ر مانگنا ہے —— فرشتوں کی نماز صف بندی ہے، کہ صفیں باندھ کر کھڑے رہیں —— انسان اور بالخصوص مسلمان کی نماز میں ساری کائنات کی نمازیں اللہ نے جمع کر دیں۔ درختوں کا سا قیام، چوپایوں جیسا رکوع، حشرات الارض جیسا سجدہ، جنت و جہنم جیسی دعار، پہاڑوں جیسا تشہد، فرشتوں کی سی صف بندی، اور چاند و سورج یا زمین کی گردش بھی نماز میں ہے —— اس واسطے کہ کوئی نماز دو رکعت سے کم کی نہیں۔ دو، تین، یا چار رکعت کی ہے۔ آپ ایک رکعت پڑھ کے کیا کام کرتے ہیں؟ جو کام پہلی رکعت میں کیا تھا۔ وہی کام دوسری، تیسری اور چوتھی میں کرتے ہیں —— وہی الحمد، سورت، اور تسبیحات وغیرہ۔ اس لیے گردش اور دوران نماز کے اندر ہے ——

جیسے انسان کو اللہ نے ایک جامع حقیقت بنایا، عبادت بھی جامع دی۔ آپ کی عبادت میں ساری کائنات کی عبادتیں جمع ہو گئیں۔ اس سے دین کا کمال بھی واضح ہوتا ہے۔

پچھلے ادیان میں ایسی نمازیں نہیں تھیں۔ کسی قوم کو فقط سجدے، کسی کو فقط قیام، کسی کو فقط رکوع کی نماز دی گئی۔ لیکن اسلام کی نماز میں ساری قوموں کی نمازیں جمع ہیں۔ ساری اقوام اور ساری مخلوقات کی نمازیں جمع ہو گئیں، تو نماز ایک جامع ترین عبادت ہے، بلکہ نماز ہی عبادت ہے، اور چیزیں تعمیل حکم کی وجہ سے عبادت بن جاتی ہیں۔ تو انسان پر ایک فریضہ جو عائد ہوتا ہے، وہ نماز کا ہے۔ اس لئے کہ جب

وہ مخلوقات کے سارے نمونے اپنے اندر رکھتا ہے، تو سارے نمونوں کی ذلت و عبادت اللہ کے سامنے پیش کر دینا اس کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے انسان کی زندگی کا ایک مقصد تو عبادت ہے۔

نمونۂ کمالاتِ خداوندی ہونے کی نسبت سے انسان کا فریضہ

اب یہی انسان جیسے مخلوق کے نمونے رکھتا ہے، خالق کے نمونے بھی رکھتا ہے۔ اس پر یہ فریضہ بھی عائد ہوا کہ جو کام خالق کرتا ہے، یہ بھی وہ کرے۔ خالق کا کام کیا ہے؟ اپنی مخلوق کو پالنا، اس کی تربیت کرنا، اس کو ہدایت کرنا، اس نے رزق پیدا کیا، تاکہ مخلوق پلے، اس نے مخلوق کو تعلیم دی، تاکہ اپنے بھائیوں پر رحم کرے، جیسے مَیں رحم کرتا ہوں۔ جیسے میں تمہیں راستہ دکھاتا ہوں تم اپنے بھائیوں کو دکھاؤ۔ جیسے مَیں تمہاری تربیت کر رہا ہوں تم بھی اپنے بچوں اور عیال کی تربیت کرو۔ یعنی میری طرف سے نائب بن کر وہ کام کرو، جو میرے کام ہیں۔ مَیں مُدبّر ہوں، تم بھی تدبیر کرو۔ مَیں موجد ہوں، تم بھی دنیا میں ایجادیں کرو، میرا کام ہدایت دینا ہے، تم بھی دُنیا کے لیے ہادی بنو۔ میرا کام احکام جاری کرنا ہے، تم بھی میرے نائب بن کر احکام جاری کرو ——— حاصل یہ نکلا کہ ایک فریضہ انسان پر عبادت کا، اور ایک فریضہ خلافت کا عائد ہوتا ہے۔ ایک طرف جھک کر عبادت کرے گا، اور ایک طرف تختِ خلافت پر بیٹھ کر اللہ کا نائب بن کر اس کی کائنات میں تصرفات کرے گا۔ ملکوں کو فتح کرے گا، دنیا میں ہدایت پھیلائے گا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے گا۔ یہ اللہ کا کام ہے، لیکن نائب بن کر یہ بھی کرے گا۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں اللہ کے نائب بن کر آتے ہیں، اور ہدایت کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ کائنات کے مربی ہیں۔ تو انبیاءؑ بھی مخلوق کی روحوں کی تربیت کرتے ہیں۔ اللہ معلّم ہے جو انبیاءؑ کو تعلیم دیتا ہے، اس لئے انبیاءؑ بھی تعلیم دیتے ہیں، تاکہ دنیا میں علم پھیل جائے۔ اللہ کے احکام

جاری کرتے ہیں۔ قصاص لیتے ہیں، شراب خوری پر دُرّے لگاتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام اللہ کے اوّلین نائب ہیں۔ پھر انبیاءؑ کے نائب ان کے صحابہؓ ہوتے ہیں، پھر صحابہؓ کے نائب تابعین ہوتے ہیں۔ تابعین کے نائب تبع تابعین ہوتے ہیں۔ اخیر تک سلسلہ پہنچ جاتا ہے۔ علماء ربانی، مشائخ حقانی، اور سچے درویش و صوفی، جو مخلوق کو سیدھا راستہ دکھلاتے ہیں۔ یہ خلافت کا کام ہے۔ حضرات خلفائے راشدینؓ نے سلطنت بھی کر کے دکھائی، خلافت کی گدی پر بیٹھ کر ملکوں کو بھی فتح کیا، مگر ملکوں پر اس لئے قبضے نہیں کئے کہ ان میں سے کچھ کھانا پینا مقصود تھا، اس لئے فتح کیا تاکہ مخلوق کو سیدھے راستے پر چلائیں۔ ان کو خدا کے قانون پر چلائیں۔ انہوں نے اللہ و رسول کے نائب بن کر وہ کام کئے جو اللہ کا منشاء تھے۔ دن بھر خلافت کے کام سرانجام دیتے، جب وقت آتا تو مسجد میں جا کے سجدے کرتے، اور عبادت کا کام سرانجام دیتے، تو ایک طرف عبادت اور ایک طرف خلافت کر رہے ہیں۔

اس لئے صحیح معنوں میں انسان وہ ہے جو اپنی ذات کو اپنے پروردگار کے سامنے جھکا دے اور عبادت میں آگے بڑھے، کہ اس کی ناک، پیشانی، ہاتھ، پیر، اس کی روح اور خیال بھی اللہ کے سامنے ذلیل بن کر جھک جائے۔ یہ کام اپنی ذات کے لئے ہوگا، یہ عبادت ہے۔ دوسرا فریضہ یہ ہے کہ تختِ خلافت پر بیٹھ کر دنیا سے برائیوں کا خاتمہ کرے۔ اس لئے نہ فقط عبادت اور نہ فقط خلافت مقصدِ زندگی ہے بلکہ دونوں مقصود ہیں۔

ہمارے سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے پیدا کیا، تو سب سے پہلے ملائکہ سے یہی بات فرمائی انی جاعل فی الارض خلیفۃ۔ میں زمین میں اپنا ایک نائب اتارنے والا ہوں۔ آدم علیہ السلام نائب کس چیز میں تھے؟ عبادت میں تو نائب نہ تھے، عبادت اللہ کا کام تھوڑا ہی ہے، وہ تو معبود ہے۔ عبادت سے بری ہے، عابد نہیں ہے۔ لیکن عالم کو درست رکھنے، اس کی تربیت اور اصلاح کے لئے خلافت دی، مگر یہ خلافت وہ انجام دے گا، جو پہلے عبادت

کر کے اپنے آپ کو درست کرے ۔ پہلے اللہ کے سامنے جھک کر اپنے اخلاق درست کرے اپنے اندر نیاز مندی اور بندگی کی شان پیدا کرلے ۔ اس میں تواضع و خاکساری و للّٰہیت بھی ہو، نہ غرور و تکبر رہے ، نہ حرص و لالچ رہے، بلکہ اس میں غنا اور ایثار ہو۔ مخلوق کی خدمت کا جذبہ اس میں ہو ۔ یہ جذبات عبادت کرنے سے پیدا ہوتے ہیں ۔ عبادت کر کے جب جذبات پیدا ہو گئے ، اب وہ نائب خدا بن گیا ۔ اب وہ دوسروں کی اصلاح کرے گا ــــ تو مقصدِ زندگی دو چیزیں نکل آئیں ــــ ایک عبادت دوسرے خلافت ـــــــ

تکمیلِ ایمان کے لئے عبادت و خلافت دونوں ضروری ہیں

اسی واسطے ایمان کے دو رکن فرمائے گئے ۔ التعظیم لامر اللہ ــــ والشفقۃ علی خلق اللہ ــــ اللہ کے امر کی تعظیم کرنا، اس کے سامنے جھک جانا ۔ دوسرے اس کی مخلوق پر شفقت اور اس کی خدمت کرنا ۔ دونوں باتوں سے مل کر ایمان بنتا ہے ۔ ایک شخص چوبیس گھنٹے مسجد میں رہے ، مخلوق چاہے جیئے یا مرے ، اسے کوئی پرواہ نہیں ۔ اس کا آدھا ایمان ہے ۔ اور ایک شخص رات دن مخلوق کی خدمت میں انجمنوں کے ذریعے لگا ہوا ہے ، مگر مسجد میں جانے کا نام نہیں لیتا، اس کا آدھے سے بھی کم ایمان ہے ۔ اس لئے کہ خلافت کا کام تو انجام دیا مگر عبادت چھوڑ دی ۔ انسان مکمل تب ہو گا ۔ جب ایک طرف عابد و زاہد ہو ، اور ایک طرف خلیفۂ خداوندی ہو ۔ ایک طرف وہ کام کرے جو مخلوق کے کرنے کا ہے ، وہ عبادت ہے ۔ ایک طرف وہ کام کرے جو خالق کا ہے ، وہ تربیت ہے ــــ انبیاء علیہم السلام کی یہی زندگی ہے ، راتوں کو دیکھو تو تہجد پڑھتے پڑھتے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر ورم آجاتا تھا ۔ دنوں میں دیکھو تو مخلوق کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں ۔ ہدایت و تبلیغ فرما رہے ہیں ۔ دُنیا کے بادشاہوں کے نام خطوط جاری فرما رہے ہیں ، جن میں اسلام

کی دعوت دی جا رہی ہے۔ سفر فرما رہے ہیں، کبھی طائف میں ہیں، کبھی مدینہ میں ہیں، تاکہ خلقِ خدا نیک راستے پر آجائے، یہ خلافت کا کام ہے ——— مسجدِ نبوی میں جس طرح سے آپ نماز پڑھتے، اسی طرح سے آپ مقدمات کے فیصلے بھی فرماتے۔ مسجد میں جیسے عبادت ہوتی، ویسے ہی درس و تدریس کے ذریعے تعلیم بھی ہوتی، یہ خلافت کا کام تھا۔ نماز پڑھنا، تلاوت کرنا، سجدے کرنا، یہ عبادت کا کام تھا۔

یہی شان صحابہ کرامؓ کی ہے کہ ایک طرف تختِ خلافت پر بیٹھ کر مخلوقِ خدا کی اصلاح، اور ایک طرف بوریا اور چٹائی پر بیٹھ کر اللہ کے سامنے عجز و نیاز سے سر جھکا دینا ———

فارس میں جب جنگ ہوئی ہے تو صحابہ کرامؓ کی تعداد کل تیس یا تینتیس ہزار تھی۔ فارسیوں کا تین لاکھ کا لشکر تھا، پھر فارس کی فوجیں کیل کانٹے سے مسلح، وردیاں، غذائیں اور رسد ان کی باقاعدہ۔ یہ تو اہلِ فارس کی شان ــــ اور ادھر صحابہ کرامؓ محض درویشوں کا ایک لشکر۔ وردی تو یہ ہے کہ کسی کے پاس کرتہ ندارد ہے، تو کوئی لنگی باندھے ہوئے ہے، کسی کے پاس لمبا کرتہ، کسی کے سر پر پگڑی نہیں تو رسّی باندھ رکھی ہے، کسی کے ہاتھ میں نیزہ، کسی کے ہاتھ میں تلوار، کسی کے ہاتھ میں خنجر۔ ہتھیار، لباس نہ غذائیں کچھ بھی باقاعدہ نہیں۔ درویشوں کا لشکر ہے، مگر کیفیت یہ تھی۔ لاکھوں فارسی آتے تھے، جب صحابہؓ بھوکے شیروں کی طرح پڑتے تھے، وہ بلیوں کی طرح سے بھاگتے تھے، اور یہ غالب تھے۔ پورے فارس میں ایک تہلکہ مچ گیا ——— فارس کا سب سے بڑا سپہ سالار رستم تھا۔ آپ نے رستم پہلوان کا نام سُنا ہوگا، وہ کمانڈر انچیف تھا، اس نے تمام سرداروں اور لفٹیننٹوں کو جمع کیا، اور کہا کہ یہ غضب کی بات ہے کہ ہمارا لشکر تین لاکھ، اور عرب کے بدو کُل تیس ہزار، پھر ان کے پاس سامان باقاعدہ نہیں، ہمارے پاس سامان باقاعدہ، انہیں مدد نہیں پہنچ رہی، ہمارے پیچھے پورا ملک ہے۔ یہ ہمارے ملک میں حملہ کرنے آئے ہیں، ان کا ملک دُور رہ گیا، یہ ہمارے ملک میں گھرے ہوئے ہیں، مگر اس کے باوجود وہ حملہ کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے

جیسے ببھو کے شیر ہیں، اور تم فارسی اس طرح سے بھاگتے ہو جیسے لومڑیاں بھاگتی ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے ——— سرداروں نے کہا اے رستم! اگر آپ سچی بات پوچھیں، ہم بتلادیں، مگر ہماری جان کی بخشش کردی جائے۔ امان دیا جائے کہ ہمیں قتل تو نہیں کیا جائے گا ——— اس نے کہا تمہاری جان کو امان دی جاتی ہے ———

اب سرداروں نے مل کر کہا۔ اے رستم! یہ مٹھی بھر عرب تیرے ملک پر غالب آکر رہیں گے، انہی کا قبضہ ہوگا، انہی کی حکومت ہوگی۔ پورا ایران ان کے تحت میں آئے گا۔ یہ نہیں ہاریں گے، تم ہاروگے ——— رستم نے کہا کیوں؟

انہوں نے کہا۔ اس وجہ سے کہ ان کی شان یہ ہے۔ "ھم باللیل رھبان و بالنھار فرسان"۔ دن بھر یہ گھوڑے کی پشت پر سوار جہاد میں مصروف ہیں، اور رات میں مصلے کی پشت پر سوار ہیں۔ اللہ کے آگے گڑگڑاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اے مالک! ہم میں کوئی طاقت نہیں، طاقت والا تو ہے، ہم تیرے سپاہی ہیں، تو اگر ہمیں فتح دے گا، تو ہم فتح یاب ہو جائیں گے۔ تو ہمیں شکست دے گا، شکست کھا جائیں گے۔ ہمارے اندر کوئی طاقت اور قوت نہیں۔ قوت و سلطنت تیری ہی ہے۔ تو رات بھر اللہ کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ عجز و نیاز سے سر زمین پر رگڑتے ہیں۔ اور دن کو گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتے ہیں۔

اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ایسے بزرگ لوگ ہیں، جس گاؤں میں جاتے ہیں، اگر کھیتیاں جلی ہوئی ہوتی ہیں تو سرسبز ہو جاتی ہیں۔ یہ دوسروں کی بیٹیوں کی ایسے ہی حفاظت کرتے ہیں جیسے اپنی بہو بیٹیوں کی کرتے ہیں۔ اور اے رستم! تیرا یہ لشکر ——— شرابیں یہ پیتے ہیں، جس گاؤں میں جا پڑتے ہیں، بہو بیٹیوں کی عزتیں برباد ہو جاتی ہیں۔ جس کھیتی اور باغ میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھل اُجڑ جاتے ہیں۔ کھیتیاں سب برباد ہو جاتی ہیں، یہ اثرات تیری فوج کے ہیں۔ اور یہ افعال ان کی فوج کے ہیں۔ تو غلبہ تجھے ہوگا یا انہیں ہوگا۔؟

راتوں کو مُصلّے کی پشت پر یہ عبادت میں مصروف ، اور دنوں کو گھوڑے کی پشت پر سوار اللہ کے نائب بن کر یہ دنیا کی اصلاح کے درپے۔ تو درحقیقت رستم اور اس کے سرداروں نے پہچانا کہ ان بزرگوں میں یہی دو چیزیں تھیں۔ ایک طرف یہ عبادت میں کامل اور ایک طرف خلافت میں کامل ۔ ایک طرف سرِ نیاز اللہ کے سامنے جھکا ہوا ہے ایک طرف اس کی مخلوق کی اصلاح کے لئے دنیا میں سفر کر رہے ہیں ، جو مُفسِد سامنے آتا ہے اُسے راستے سے ہٹاتے ہیں ، تاکہ دین پہنچ سکے ، اور لوگ دین کے اوپر غور کر سکیں ——

بہرحال جب مقصدِ زندگی عبادت اور خلافت نکلا ، سب سے بڑے عابد دنیا میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تھے اور سب سے بڑے اللہ کے نائب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تھے ، تو ان کی اُمت کو بھی سب سے بڑا عابد اور سب سے بڑا نائبِ خداوندی بننا چاہیئے۔ یہ امت اس لیے آئی ہے کہ رات دن عبادت میں مصروف رہے ، اور رات دن اللہ کی نائب بن کر اللہ کی مخلوق کی اصلاح کرے۔ یہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اٹھے۔ اپنی زندگی اور موت کا یہ مقصد قرار دے کہ مَیں چاہے جیوں یا مروں ، مگر خدا کا نام اونچا ہو ، تو اللہ اس قوم کو کبھی ذلیل نہیں کرے گا۔ ذلت و رسوائی جب ہوتی ہے جب کوئی خدا کے نام کو چھوڑ کر اپنی برتری چاہے ، اپنے عیش کو آگے رکھے۔ خدا کی طرف سے اس کی مدد نہیں ہوتی۔ اس پر دشمن اور اقوام مسلط کی جاتی ہیں ، جو اس کو غلامی میں بھی جکڑ بند کرتی ہیں۔ لیکن جو کہے مجھے ملک و دولت مقصود نہیں ، مجھے اللہ کا نام اونچا کرنا ہے۔ میری دولت ، میری جان اور خاندان اس کے لئے وقف ہے ، اس نصب العین کے تحت زندگی ہوگی ، وہ بھی باعزت ہوگی ، موت ہوگی ، وہ بھی باعزت ہوگی۔ انسان کو اصل میں عزت کی زندگی کے لئے اللہ کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ دُنیا میں ذلیل ہونے کے لئے نہیں بھیجا گیا —— تو سب سے بڑے خلیفہ خداوندی اور عابدِ خداوندی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں ، جیسے وہ سردارِ انبیاءؑ ہیں ، یہ اُمت امتوں کی سردار بنائی گئی۔ اس کو خیرِ امت اور افضل الامم کہا گیا ، مگر افضلیت کیوں ہے؟ کھانے پینے اور دولت کی وجہ سے نہیں۔ اس وجہ سے کہ اس کا نام یہ ہے کہ یہ دُنیا کی

کی قوموں کی اصلاح کرے۔ دنیا کی قوموں میں جو کھوٹ ہے اس کو رفع کرے، اور اگر یہ دنیا کی قوموں کی نقالی کرنے لگے کہ جو کھوٹ ان کے اندر ہے، وہ اپنے اندر لے لے، تو پھر یہ اصلاح کیا کرے گی؟ اس کا حاصل تو یہ نکلا کہ دوسری قومیں اس پر غالب آئیں گی۔ یہ غالب نہیں آسکتی۔ یہ ایک چیز سے غالب آسکتی ہے، وہ یہ کہ یہ کلمۂ خداوندی کو اونچا کرنے کا نصب العین لے کر چلے ــــــ

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

تم دنیا کی قوموں پر دولت سے غالب نہیں آسکتے، دولت دوسروں کے پاس زیادہ ہے، تعداد میں تم دنیا پر غالب نہیں آسکتے۔ اہلِ باطل کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے، اور رہے گی۔ تم اگر دنیا کی قوموں پر غالب آؤ گے تو اخلاقِ محمدی (صلے اللہ علیہ وسلم) سے غالب آؤ گے۔ کردار سے غالب آؤ گے، دین کو لے کر اٹھو گے تو غالب آؤ گے۔ اس لیے سب سے بڑھ کر تمہارے پاس حجت دین ہے، اس سے بڑھ کر کوئی حجت نہیں۔

اگر آپ کسی سے بحث کریں، اور یوں کہیں کہ میری عقل یوں کہتی ہے۔ دوسرا کہے گا میری عقل تم سے زیادہ ہے، میری عقل یوں کہتی ہے۔ لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے، ہم خادم ہیں، ہمیں یہ حکم پورا کرنا ہے، دنیا کی ہر قوم چپ ہو جائے گی، اس سے آگے اب حجت نہیں ہے۔ آگے پھر زور اور طاقت ہے، تو جس قوم کے ہاتھ میں خدا کا نام ہو، اور خدا کی نائب بن کر آئے، وہ حجت میں بھی اور انجام میں بھی غالب ہوتی ہے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کے بعد خلافتِ ربانی کا کام شروع کیا، اور اسلام کی دعوت دی، تو پورا مکہ، حجاز اور ساری قوم آپ کی دشمن تھی۔ عزیز و اقربا دشمن۔ صرف تین آدمی مسلمان ہوئے۔ بوڑھوں میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، عورتوں میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، اور لڑکوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، باقی سارا خاندان دشمن ــــــ لیکن آپ نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ پورے استقلال کے ساتھ اس کلمہ کو لے کر چلے۔ تو قوت مکہ والوں کے ہاتھ میں تھی۔ تعداد ان کی زیادہ

تھی۔ تیرہ آدمی جب مسلمان ہوئے، تو دار ارقمؓ میں اندر سے زنجیر لگا کر نماز پڑھی جاتی تھی۔ خطرے کی وجہ سے مسلمان باہر نہیں نکل سکتے تھے ——— ناداری اور مفلسی کا یہ عالم تھا، کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، ہم دارِ ارقم میں بند تھے۔ رات کو بارہ بجے میں پیشاب کرنے کے لئے باہر نکلا، صفا کی پہاڑی پر بیٹھا، پیشاب کیا، دھار جو پڑی تو ایسی کھنکھناہٹ کی آواز آئی جیسے کاغذ کے اوپر دھار گرتی ہے۔ میں نے پیشاب کرنے کے بعد ٹٹولا۔ معلوم ہوا چمڑے کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا، اس کے اوپر پیشاب گر رہا تھا۔ اس چمڑے کے ٹکڑے کو لائے، اور پانی سے پاک کیا، کئی وقتوں کے بھوکے تھے۔ اس چمڑے کو منہ میں ڈالا جس سے تسلی ہوئی کہ میں بھی کچھ کھا رہا ہوں۔ یہ مفلسی اور ناداری کی کیفیت تھی ——— تو تعداد مسلمانوں کی تیرہ، اور مشرکینِ مکہ کی تعداد کہیں زیادہ ——— افلاس کا یہ عالم کہ کھانے کو نہ ملے، خزانے سارے ان کے ہاتھ میں ہیں۔ مگر اس کے باوجود زندگی کا مقصد یہ تھا کہ اس کلمہ کو اونچا کرنا ہے۔ ہم خواہ مٹیں یا رہیں ——— تیرہ برس کے بعد پورا مکہ اور پورا حجاز اسلام میں داخل ہوا۔ یہی قوم جو اقلیت میں تھی، اکثریت میں آ گئی، وہ قوم جو بے شوکت تھی، ساری شوکتیں اس کے ہاتھ میں آ گئیں، اور جو قومیں شیر بنی ہوئی تھیں، وہ اس کے سامنے جھک گئیں۔ اللہ کا نام لے کر کھڑے ہونے میں جب استقلال و ثبات دکھلائے، تو دنیا کی قومیں جھک جاتی ہیں۔ ہمیں دوسری قوموں کی دولت و عزت نہیں چھیننی۔ ہمیں تو خدا کا نام پہنچانا ہے۔ چاہے ہم مر جائیں، مگر یہ کلمہ قبول کرو۔ اگر اس شان سے چلیں گے، دنیا کی قومیں ممنون ہوں گی۔

حدیث میں فرمایا گیا ——— جب کوئی قوم میرے قانون کی خلاف ورزی کرتی اور گناہوں میں ملوث ہوتی ہے، میں دنیا کی اقوام کے دلوں میں ان کے لئے دشمنی اور عداوت ڈال دیتا ہوں۔ وہ سزائیں دیتی ہیں ——— یہ درحقیقت میری طرف سے وہ قومیں جلاد بن کے کھڑی ہوتی ہیں، تاکہ معصیت چھڑا دیں ——— حق تعالیٰ فرماتے ہیں، اگر یہ چیز تمہیں ناگوار ہو کہ دنیا کی قومیں تم پر غالب آئیں، اور تمہیں سزائیں دیں، ان

بادشاہوں کو برا مت کہو، میرے سے معاملہ درست کر لو۔ میں عداوت کی بجائے ان کے دلوں میں محبت ڈال دوں گا۔ آج جو قومیں نفرت کرتی ہیں۔ کل کو وہ تمہاری طرف مائل ہو جائیں گی۔ دشمنی کرنے کی بجائے تمہاری خادم بن جائیں گی، قلوب تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ جب آدمی اللہ کا نائب بن کے اس کے کام کے لیے کھڑا ہو۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اس کی عداوت پر ہی کمر بستہ رہے؟ ایک نہ ایک دن عداوت ختم کر دینی پڑے گی۔ مگر شرط یہی ہے کہ نہ ہمیں دوسروں کا اقتدار چھیننا ہے نہ دولت چھیننی ہے۔ نہ کسی قوم سے حسد ہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ بس نیک اور صالح بن جاؤ، پروگرام پیش کرتے ہیں، اور پروگرام جبھی پیش کریں گے جب خود عامل ہوں۔ ہم نمونہ بن کے سامنے آئیں۔ اگر ہم کہیں کچھ، اور نمونہ دوسرا پیش کریں، دنیا ہماری بات کو کبھی نہیں مانے گی۔ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کر کے دکھلانے کی ضرورت ہے۔ دنیا جھک جائے گی۔

اخلاقی قوت سے ہی انسان اونچا ہو سکتا ہے

حضرات صحابہ رضؓ جب ہندوستان میں آئے ہیں، تو سب سے پہلے سندھ میں داخل ہوئے۔ مؤرخین لکھتے ہیں سندھ کے بازاروں سے جب صحابہ رضؓ گذرے، تو ہزاروں لوگوں نے ان کے چہرے دیکھ کر اسلام قبول کیا، اور کہا کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہو سکتے۔ ان کے چہروں پر سچائی برستی ہے۔ ان کا کردار اور چہرہ مہرہ سب اسلام کا مبلغ تھا۔ ہم اپنے کردار سے دنیا کی اقوام کو اسلام سے نفرت دلا رہے ہیں۔ دنیا کی اقوام ہمارے عمل کو دیکھ کر اسلام کو سمجھتی ہیں۔ جب وہ ہمارے اعمال کو دیکھتی ہیں، کہتی ہیں کہ ایسے اسلام کو سلام ہے، اسے قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم اسلام کے مبلغ کیا ہوئے، ہم خود اسلام کی تبلیغ میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔ تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی عملی زندگی درست کریں، ہمیں علم و تعلیم اور اسلامی اعمال سے واقفیت ہو۔ جہالت کے ساتھ دنیا کی کوئی قوم اونچی نہیں ہو سکتی۔ انسان کے لئے

ترقی کا پہلا زینہ علم ہے۔ تو تعلیم بھی ہو، اور اخلاق درست ہوں۔ ہم میں صبر و تحمل، بردباری، حیا، غیرت، حمیت، جذبۂ خدمت ایسے اخلاق ہوں۔ جب یہ اخلاق اور علم ہو گا تو ایسی قوم کبھی نیچے نہیں رہ سکتی۔ یہ علم اور اخلاق ایک قوت ہے جو انسان کو گرنے نہیں دیتی۔ یہ انسان کو اونچا بنا دیتی ہے۔ یہ جب نکل جاتی ہے تو کوئی چیز آدمی کو اونچا نہیں کر سکتی۔ جیسے ربڑ کی گیند میں ہوا بھری ہوئی ہے۔ اگر اسے آپ زمین پر زور سے پٹخ دیں تو وہ اتنا ہی اوپر جائے گی۔ اس لیے کہ اس میں ہوا کی قوت بھری ہوئی ہے۔ وہ نیچا نہیں دیکھ سکتی۔ اگر ہوا نکال دیں، وہ پھس سے ہو کے وہیں رہ جائے گی — ایک مسلمان کو مثل گیند کے سمجھو۔ اس میں جب تک دین اور علم و اخلاق کی ہوا بھری ہوئی ہے۔ اگر اس کو کوئی زمین پر پٹخے گا بھی، یہ اوپر ہی جائے گا۔ اور اگر یہ روح اس کے اندر سے نکل گئی پھر جس قوم کا جی چاہے، اسے ٹھپڑ مارے اور نیچے گرا دے — ہوا کی طاقت تو اس میں ہے نہیں۔ اس لئے ہوا اندر روح بھرنی چاہیے جس سے اندر طاقت آئے۔ اور طاقت روح سے آتی ہے، پھر روح کی طاقت علم و اخلاق سے، اسی سے آدمی کو خلافت کا مقام ملتا ہے، اسی سے انسان کے اندر عبادت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے — جب تک کسی چیز کا مقصد پورا نہ ہو۔ اس کی زندگی بے کار ہوتی ہے۔ مثلاً مدرسہ ہے، اس کا مقصد تعلیم ہے۔ اگر تعلیم نہ ہو، مدرسہ بے کار ہے۔ گھر کا مقصد رہن سہن ہے، اگر اس میں رہن سہن نہ ہو گھر بنانے کا فائدہ کیا — ؟ بازار کا مقصد یہ ہے کہ سامان ملے، اگر سامان نہ ملے تو بے کار ہے۔ اگر انسان کا مقصد عبادت و خلافت ہے۔ جب یہ مقصد نہ ہو، یہ انسان گولی مار دینے کے قابل ہے۔ اگر مقصد پورا کر رہا ہے تو وہ زندگی کا ثبوت دے رہا ہے۔

مسلمان کا دنیا میں مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے

دنیا کی اقوام کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں۔ کسی کا مقصد دولت، کسی کا روٹی، کسی کا اقتدار — اسلام اور مسلمان کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے، کہ میں رسول

یا نہ رہوں خُدا کا نام اونچا ہونا چاہیئے ۔ مَیں اللہ کا نائب بن کے آیا ہوں ۔ مَیں تو اسی کے نام کا ڈھنڈورچی ہوں ۔ جب تک آپ اللہ کے نام کا ڈھنڈورا پیٹیں گے ۔ اللہ کی حکومت کی قوت آپ کی پشت پر رہے گی ۔ جب اسے چھوڑیں گے ، قوت ختم ہو جائے گی ـــــ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بادشاہ جب کوئی قانون نافذ کرتا ہے ، تو قانون کو گورنروں کے پاس بھیجتا ہے ۔ گورنر کمشنر کے پاس ، اور کمشنر کلکٹر کے پاس ، اور کلکٹر تحصیل دار کے پاس بھیجتا ہے ۔ اور تحصیل دار کیا کرتا ہے ؟ وہ بھنگی بلاتا ہے ، ڈھول اس کے گلے میں ہوتا ہے ۔ اسے کہتا ہے کہ اس قانون کی منادی کرے ۔ تو بھنگی کی کیا قدر و قیمت ہے ۔ معمولی اس کی تنخواہ ہوگی ۔ لیکن جب سرکاری قانون کی منادی کرتا ہے ، گورنمنٹ کی پوری قوت اس کی پشت پر ہوتی ہے ۔ اگر اس وقت آپ اس کے گلے میں سے ڈھول نکال کر تھپڑ ماریں ، پوری گورنمنٹ مدعی بن جائے گی ۔ کیونکہ تم نے گورنمنٹ کے قانون کی منادی کرنے والے کی توہین کی ، گویا گورنمنٹ کی توہین کی ـــ مقدمہ قائم ہو جائے گا ۔ تو بھنگی کی کوئی قوت نہیں ۔ اصل قوت گورنمنٹ کی ہے ـــ جب ایک مسلمان منادی بنے گا ۔ اور اللہ کا بھنگی بن کر اس کے قانون کو دُنیا میں پکارتا پھرے گا ۔ اس حالت میں اگر اس کی کوئی توہین و تذلیل کرے ، وہ گویا خُدا کی گورنمنٹ کی توہین کر رہا ہے ۔ اللہ کی مدد شاملِ حال ہوگی ، وہ کبھی نیچا نہیں دیکھ سکتا ۔ ہاں آپ اپنے کو اونچا بنائیں گے ، تو ہماری قدر و قیمت نہیں ۔ ہمیں جس کا جی چاہے نیچا دکھا دے ۔ مگر جب خدا کی روح بھری ہوئی ہو ، اسے لے کر چلیں تو اسے کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا ۔ تو بات وہ کرنی چاہیئے جس سے ہم میں طاقت پیدا ہو ۔ ہماری طاقت دین ، اسلام ، ایمان اور خلافت اور روحانیت سے ہے ۔ ہتھیار و دولت اور بلڈنگوں میں ہماری طاقت نہیں ہے ۔ ہماری طاقت تو اللہ کے نام اور کام میں ہے ۔ جو آیت کریمہ میں نے پڑھی ، اس میں زندگی کے دو مقصد بتلائے ۔ ایک عبادت ، اور دوسرے خلافت ـــ عبادت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ۔ یبنی اقم الصلوٰۃ ۔ حضرت لقمان علیہ السلام فرماتے ہیں ۔ اے میرے بیٹے ! نماز قائم کر ، نماز ہی چونکہ

اصل میں عبادت ہے ۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ خدا کا عبادت گذار بندہ بن ۔ اللہ کے آگے اپنی ذلّت پیش کر، اسی میں تیری عزت اور رفعت و سربلندی ہے ۔ تو یہ فریضہ عبادت کا ہے جو زیادہ سے زیادہ نماز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ۔

دوسری بات فرمائی ۔ وأمر بالمعروف وانه عن المنكر ۔ معروف کا امر کر، اور منکر سے ممانعت کر ۔ یعنی دنیا میں نیکی پھیلاؤ، اور برائیاں مٹاؤ ۔ دنیا کی قوموں کو اچھے کاموں کی عادت ڈالو، بُرے کاموں سے روکو ۔ فحش و بے حیائی کو مٹاؤ، بے غیرتی و بے حمیتی کا دُنیا سے خاتمہ کرو ۔ حیاء، ایثار، سخاوت، مروّت اور شجاعت، ان اخلاق کو دنیا میں پھیلاؤ، تاکہ اللہ کی طاعت و عبادت دنیا میں پھیلے اور بغاوت ختم ہو ۔ اِس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا گیا ۔ امر بالمعروف یعنی نیکی کا آرڈر دینا ۔ نہی عن المنکر، برائی سے روک دینا ۔ اصل میں یہ کام اللہ کا ہے، وہ ہے سب سے بڑا امر فرمانے والا، اور برائیوں کو روکنے والا ہے ۔ مگر اُس نے انسان کو اپنا نائب بنایا، کہ تم میری طرف سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو ۔ ـــــ تو اس سے خلافت و نیابت ثابت ہوئی ہے ۔ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا :-

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر ؕ وللہ عاقبۃ الامور ـــــ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ۔ اگر ہم ان مسلمانوں کو طاقت و اقتدار اور بادشاہت دے دیں ۔ تو ان کا مقصد کیک پیسٹری کھانا نہیں ہوگا ۔ ان کا مقصد اللہ کی ترجمانی ہوگا ۔ یہ نمازوں کا نظام قائم کریں گے، صدقات پر دُنیا کو مائل کریں گے ۔ اچھی باتوں کا آرڈر جاری کریں گے ۔ برائیوں کو دنیا سے روکیں گے، یہ ان کا کام ہوگا ـــــ

معلوم ہوا سلطنت دینے کا بڑا مقصد امر بالمعروف کا نظام قائم کرنا، اور منکرات کو دُنیا سے مٹانا ہے، اسی کا نام خلافت ہے ۔

☆

قربانی سے نصب العین دنیا میں پھیلتا ہے

ظاہر بات ہے جب مسلمان امر بالمعروف اور نصیحت لے کر کھڑا ہو گا۔ ساری دنیا نہیں مانا کرتی، کچھ دوست بن جاتے ہیں، کچھ دشمن۔ مبلّغ کے سامنے مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ برا بھلا بھی کہتے ہیں۔ خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں کتنی گستاخیاں کی گئیں، اس میں صبر و تحمل، عالی ظرفی اور بڑے اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے آگے فرمایا گیا:۔ واصبر علی ما اصابک۔ اور اس راستے میں جتنی مصیبتیں آئیں، انکو جھیلنے کی عادت ڈالو، اور اپنے اندر صبر و تحمل پیدا کرو۔ جس قوم میں صبر و تحمل اور برداشت آگئی، وہ قوم کامیاب ہے۔ چاہے وہ ابتداء میں تکلیف اٹھائے گی، مگر چند دن کے بعد غلبہ اسی کا ہو گا۔ تو تین چیزیں فرمائی گئیں۔ عبادت و خلافت کا نظام اور اخلاق کا نظام، کہ صبر و تحمل اور اولوالعزمی ہو۔ جو آدمی ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جائے، کسی نے گالی دے دی، بس لڑنے مرنے کو تیار، کسی نے اشارہ ہی کیا تو منہ دکھلانے کو تیار، وہ کبھی کام نہیں کر سکتا۔ کام وہ کرے گا کہ قتل کی بھی دھمکیاں ہوں، دولت بھی چھین لی جائے، غلامی کی بھی دھمکی دی جائے۔ مگر وہ پرواہ نہ کرے، کہ یہ چیزیں مجھے مقصود نہیں، مجھے تو اللہ کا نام بلند کرنا ہے۔ فاقہ کروں یا کچھ کروں مگر مجھے تو آگے بڑھنا ہے، وہ کبھی نیچا نہیں ہو سکتا۔

اس واسطے اس آیت کی روشنی میں میں نے یہ تین باتیں عرض کیں۔ ایک عبادت درست ہونی چاہیئے۔ ایک خلافت کا جذبہ ہونا چاہیئے، اور ایک اخلاق اور کردار درست ہونا چاہیئے۔ تب جاکے قوم کی زندگی بن سکتی ہے، اگر عبادت اور خلافت کا جذبہ نہ ہو، اخلاقی قدریں بھی نہ ہوں تو آخر جینے اور زندہ رہنے کی صورت کیا ہے؟

روٹی زندگی نہیں ہے، زندگی انسان کا کردار اور نصب العین ہے۔ وہ ہو گا تو قوم زندہ ہے۔ آج دنیا میں جتنی قومیں بڑھ رہی ہیں، وہ کھانے پینے سے نہیں، یہ تو آثار میں سے ہے، خود ہی آجاتا ہے۔ اصل نصب العین ہے، جو قوم کوئی مقصد لے کر کھڑی ہوئی، اور وہ اس

مقصد کی خاطر قربانیاں دے رہی ہے، وہ بڑھے گی اور اقتدار پائے گی ـــــ ہم کوئی بھی مقصد نہ رکھیں۔ بس کھا پی لیا، اور سو گئے۔ یہ کوئی زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ اگر یہ مقصد ہے تو ہر جانور بھی یہ مقصد لیے ہوئے ہے، تو پھر انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انسان تو کوئی کمال لے کر آیا ہے ـــــ جامع تو اتنا کہ ساری مخلوقات اور خالق کے کمالات کے نمونے موجود، اور مقصد صرف روٹی۔ اتنا اعلیٰ کردار لے کر آئے، اور مقصد اتنا پھسپھسا، جو ہر جانور کو بھی میسر ہے ـ جیسا جامع ہے ویسا ہی مقصد بھی ہونا چاہیئے ـ وہ مقصد یہی ہے کہ ایک طرف عبادت ہو، یعنی اللہ کا سچا بندہ، اس کے نام پر مر مٹنے والا۔ اور ایک طرف اس کا نائب کہ اس کا خلیفہ بن کر پوری دُنیا میں اصلاح کا پیغام پہنچانے والا۔ اور اس میں مضبوط اتنا کہ جو مصیبت آئے، اُسے خوشدلی سے جھیلنے کو تیار، ایسے افراد اور ایسی قومیں ہمیشہ بلند و بالا ہوتی ہیں ـــــ غور کیا جائے جو تین چیزیں میں نے پیش کی ہیں یہ قوم کی برتری اور سربلندی کا پیغام ہیں۔ تفصیلات اس کی بہت ہیں۔ وہ تعلیم اور غور و فکر سے معلوم ہونگی، مگر اصولاً یہی تین چیزیں ہیں جس سے قومیں بڑھتی ہیں۔ ایک صحیح نصب العین کہ سچا عابد اور ایک دوسرا نصب العین کہ سچا خلیفہ ربانی، اور تیسرا نصب العین کہ سچا اخلاقی نمونہ رکھنے والا، اس سے ان شاء اللہ برتری پیدا ہو گی۔

یہ آیت ہے تو دو تین لفظوں کی، مگر اس نے بڑا عظیم پروگرام پیش کر دیا ہے، اور یہی اللہ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ میرا آپ کا کلام نہیں، خدا کا کلام ہے، کہ دو لفظ فرمائے جاتے ہیں۔ اور علوم کے دریا اس کے اندر بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ جتنا کھودتے جاؤ، نکالے جاؤ۔ جتنا غرق ہوتے جاؤ، موتی نکالتے جاؤ۔ اسی لئے قرآن کریم کو معجزہ کہا گیا ـــــ جیسے سمندر میں موتی اور ہزاروں جواہرات بھرے ہوئے ہیں مگر کوئی غوطہ لگانے والا اور نکالنے والا ہونا چاہیئے، جس میں دم اور سانس ہو کہ نیچے پہنچے، موتی نکال کے لائے، اور جو دم توڑ دے گا، وہ تو اپنی بھی جان کھو کے آئے گا، موتی تو کیا نکال کے لائے گا۔ جو تیراکی کے فن سے واقف نہ ہو، وہ جائے گا تو جان کھو کر ہی آئے گا۔ تیراکی کا فن سیکھ کر پھر سمندر میں گھسا جائے، تو موتی نکالتا ہے۔ قرآن حکیم ایک سمندر ہے، اور اس میں تیرنے کا فن

تعلیم ہے۔ علم سیکھ کر جب آدمی اس میں گھسے گا تو ہزاروں موتی اور علم کے جواہرات نکلیں گے، قرآن کے معجزہ ہونے کا یہی حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک لفظ ہوتا ہے، اور کوزے کے اندر ہزاروں دریا بھرے ہوئے ہوتے ہیں ___ اگر میں اس کی تفسیر کروں تو کتنے ہی دن چاہئیں، تفسیر پھر بھی پوری نہیں ہوگی۔ اس لئے بالاجمال یہ تین مقاصد نکال کر پیش کئے ___ ان کی تفصیلات کے لئے لمبی مدت کی ضرورت ہے۔ بالاجمال ان مقاصد کو یاد رکھ کے اپنی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہیئے کہ کس حد تک ہم ان مقاصد کو پورا کر رہے ہیں۔ اور اگر پورا نہیں کر رہے، تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ معلوم کر کے انہیں زائل کیا جائے۔ اس واسطے میں نے یہ تین چیزیں پیش کیں۔ امید ہے کہ آپ حضرات ان تینوں پر وقتاً فوقتاً غور کریں گے، اور اپنی زندگی کو بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کامیابی دے گا ___ ہزاروں مسائل کا اس میں علاج ہے۔ ہزاروں مصائب دنیوی و اُخری کا حل اسی کے اندر ہے۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمادے کہ ہم اپنے پروردگار کے کلام پر چلنے کی کوشش کریں، اور اپنی زندگی کو قرآن و حدیث میں ڈھالیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے، اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نصیب فرمادے۔ آمین

اللّٰھم ربنا تقبل منا انک السمیع العلیم
وارنا مناسکنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم
صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیرِ خلقہٖ محمد واٰلہ واصحابہ اجمعین
برحمتک یا ارحم الراحمین

اخلاص فی الدین

دین و دنیا کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر اخلاصِ کامل اور (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا) اتباعِ کامل پیدا کرے یہی دو چیزیں کلیدِ نجات ہیں اور کامیابی کی ضمانت ہیں۔ جو بھی کامیاب ہوا، وہ اسی طریق پر چل کر ہوا، اور جو راستہ سے ہٹ گیا، وہ منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکا، اور زندگی کا مایہ یوں ہی گم کر بیٹھا۔

از:۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

ترتیب

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولٰنا محمدًا عبدہ ورسولہ - ارسلہ اللہ الی کافۃ للناس بشیرًا ونذیرًا - وداعیًا الیہ باذنہٖ وسراجًا منیرًا۔
امابعد: فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔
بسم اللہ الرحمن الرحیم

" قل اننی ھدٰنی ربی الی صراط مستقیم دینا قیما ملۃ ابرٰھیم حنیفا وما کان من المشرکین - قل ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین لاشریک لہ وبذلک امرت وانا اول المسلمین "

(انعام پ)

صدق اللہ العلی العظیم

طریقِ سنت پر عمل سے عادت بھی عبادت بن جاتی ہے

بزرگانِ محترم!

.... حق تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور اس پر ہم کو فخر ہے لیکن ہم کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ اسلام کا کیا معنیٰ ہے؟
اس لیے میں مختصر سے وقت میں اس کا معنیٰ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے دو لفظ "عادت اور عبادت" سنے ہوں گے۔

عادت تو ان کاموں کو کہا جاتا ہے جو ہم روزمرہ (کی زندگی میں) کرتے ہیں۔ مثلاً کھانا، پینا، دوستوں سے ملنا، گھریلو زندگی، اجتماعی زندگی اور ایسے ہی جتنے طبعی افعال ہیں ان کو عادت کہا جاتا ہے۔

اور عبادت یہ ہے کہ انہی (مذکورہ بالا) افعال کو طریقِ سنت کے مطابق کیا جائے، اور یہ جو ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ مسجد میں جانا تو عبادت ہے لیکن گھر میں رہنا عبادت نہیں۔ یہ خیال غلط ہے کیونکہ اگر ہم گھریلو معاملات میں بھی سنت طریقہ پر عمل کریں گے تو وہ بھی عبادت ہو جائیں گے۔ صرف نیت کی ضرورت ہے۔ یہی روزہ ہے اگر ایک آدمی بلانیت سارا دن بھوکا رہے تو کوئی ثواب نہیں ہوتا لیکن اگر روزے کی نیت کرے، تو تھوڑی نیت کی تبدیلی سے یہی عبادت بن جاتی ہے ——— تو اگر ہم ساری دنیا کو دین بنالیں تو کتنا اچھا سودا ہے، اور اگر ہم نیت کے ذرا سے فرق سے دین کو دنیا بنالیں تو کتنا مہنگا سودا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ اگر ایک آدمی بِسْمِ اللّٰہ سے کھانا شروع کرے اور الحمد للہ کثیراً پر ختم کرے تو اس کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ صرف نیت کرنے سے اتنا بڑا اجر ملا کہ دنیا تو بنی ہی لیکن دین بھی ساتھ ہی بنا۔

اسلام یہی چاہتا ہے کہ تمام دنیاوی کاموں کو دین بنادیا جائے ــــــ حدیث شریف میں ہے السواک مطھرۃ للفم و مرضاۃ للرب (مسواک کرنا منہ کی صفائی کا ذریعہ اور خوشنودئ الٰہی کا باعث ہے ــــــ تو مسواک کرنا دنیا بھی ہے (جب کہ محض یہی نیت ہو کہ دانت اچھے ہوں گے) اور اللہ تعالےٰ کی رضا کا بھی سبب ہے اس لیے دین بھی ہے۔ احادیث میں ہے کہ آپ بہت مسواک فرماتے تھے۔ نمازوں کے اوقات، تہجد کے وقت اور اکثر اپنے دوستوں سے فارغ ہو کر مسواک فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ مرضِ وفات میں بھی آپؐ نے مسواک کی طرف دیکھا۔ تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سمجھ گئیں کہ آپؐ مسواک کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے آپؐ کو مسواک دیا تو آپؐ نے مسواک فرمایا، پھر وہی مسواک حضرت عائشہؓ نے بھی کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا باقی ازواجِ مطہرات پر اس بنا پر فخر کیا کرتی تھیں کہ آپؐ کا لعاب مبارک میرے حلق میں گیا، اور آپؐ کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ آپؐ کا سر مبارک میری گود میں تھا۔

اسلام کا ہر عمل دو حیثیت کا حامل ہے

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپؐ اس قدر کثرت سے مسواک کیوں فرماتے ہیں؟ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

"ملائکہ علیہم السلام سے میری گفتگو ہوتی ہے اور ان کو بُو سے نفرت ہے" تو ایسے ہی اسلام کے ہر عمل میں ایک راستہ دنیا کی طرف اور ایک راستہ دین کی طرف جاتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے ایک نوجوان حاضر ہوئے۔ جب واپس جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ان کو بلاؤ۔ جب ان کو بلایا گیا تو آپ نے

فرمایا۔ یا اخی ارفع ثوبک فانہ انقٰی لثوبک و ارضیٰ لربک اے بھائی! (ٹخنوں سے نیچے جو آپ کا کپڑا ہے اس) اپنے کپڑے کو اوپر اٹھاؤ، کیونکہ اس سے کپڑا بھی صاف رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی راضی ہوتے ہیں۔

(تو کپڑے کی صفائی بھی ہے اور رضائے خداوندی بھی ہے، عمل ایک ہے لیکن دونوں حیثیتیں اس میں بھی ہیں)

مسلم شریف میں ایک حدیث ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کی طرف نظرِ رحمت نہیں فرمائیں گے۔ ان میں سے ایک "المسبل" ازار کو نیچے کرنے والا بھی ہے (ٹخنوں سے ازار کا نیچا ہونا علامتِ تکبر ہونے کے باعث غضبِ خداوندی کو دعوت دیتا ہے۔ اس لیے ازار کا اوپر ہونا اگرچہ اس سے صفائی بھی رہتی ہے لیکن اللہ کی رضا کا ذریعہ بھی ہے)۔ تو ہر عمل میں حیثیتیں دو ہی ہیں، آپ کو جو ثواب ملتا ہے وہ آپ کے تعیین حیثیت ہی پر تو ملتا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ وفی بضع احدکم صدقۃ تمہاری شرمگاہوں میں بھی صدقہ ہے۔ تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ ایأتی احدنا شھوتہ ولہ فیھا اجر یعنی ہم میں سے کوئی اپنی شہوت کو پورا کرے تو اس میں بھی اس کے لئے اجر ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ یہی پانی اگر حرام موقع میں ڈالتا تو گناہ نہ ہوتا؟ جب اس نے حرام سے اجتناب کیا تو یہی عبادت ہو گی۔ تو شہوت کے پورا کرنے میں بھی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک محض شہوت رانی اور ایک یہ ہے کہ اجتناب عن الحرام کی نیت سے شہوت کو پورا کیا جائے۔ تو اس حیثیت کے متعین کرنے کی وجہ سے وہ عبادت بن گئی۔

اتباعِ حکم ہی عبادت ہے

حاصل یہ کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائے وہ عبادت بن جاتی ہے۔

حتیٰ کہ بعض گناہوں کی بھی اگر شریعت کی طرف سے اجازت مل جائے تو وہ عبادت بن جاتے ہیں۔ مثلاً جھوٹ بولنا اگرچہ بہت بڑا گناہ ہے لیکن صلح اور دفع فتنہ کے لیے واجب ہے۔ تو یہ عبادت میں شامل ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ عبادت کسی کام کے کرنے کا نام نہیں بلکہ حکم ماننے کا نام ہے —— (اسی لیے باوجود اس کے کہ ایک چیز اپنی ذات کے لحاظ سے درست ہوتی ہے مگر شریعت حقہ خلافِ حکم ہونے کے باعث اس کے نتائج کو غلط قرار دیتی ہے مثلاً) جب نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے تو پڑھنا عبادت ہے اور جب روکا جائے تو عبادت نہیں۔ جیسا کہ تین اوقات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ تو ان اوقات میں نماز پڑھنا حرام ہے۔ ایسے ہی روزہ ایک عبادت ہے لیکن جب اس سے روکا جائے تو عبادت نہیں۔ مثلاً عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے، کیونکہ اس سے روکا گیا ہے —— اسی طرح سچ کہنا عبادت ہے لیکن اگر سچ کہنے سے فتنہ و فساد بڑھے تو ناجائز ہے۔ جیسے غیبت کرنا جو کہ واقع میں تو سچ ہوتا ہے۔ (کیونکہ خلافِ واقعہ بموجب حدیث بہتان ہے) لیکن شریعت نے اس سچ سے منع فرمایا ہے —— معلوم ہوا کہ عبادت حکم ماننے کا نام ہے (کسی خاص فعل یا قول کا نام نہیں)، اور حکم دینے والے اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں، وہی جانتے ہیں کہ کس جگہ حکم دینا مناسب ہے —

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔ کیونکہ اکڑ کر نہ ہی تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ ہی پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بندہ ہے، بندگی کے لیے آیا ہے۔ اس کی مشیت (اس کا چلنا پھرنا) بھی بندگی ہی ہونی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔ وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارضِ ھونا —— یعنی اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔ غرض اِترا کر چلنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ جہالت کی علامت ہے۔ اور اکڑ کر وہی چلتا ہے جو اپنی اصلیت کو بھول جاتا ہے ——

ایک متکبر آدمی بہت اکڑ کر چل رہا تھا۔ ادھر سے ایک بزرگ بھی آ رہے تھے، جن کی

چال سے تواضع اور عاجزی ٹپک رہی تھی۔ تو اس بزرگ نے کہا کہ بھائی اکڑ کر نہ چلو تو اس کو غصہ آیا، اور کہنے لگا کہ تم جانتے نہیں میں کون ہوں؟ تو یہ شخص اگر اپنے مال میں مست تھا تو وہ بزرگ اپنی کمال میں مست تھے۔ انہوں نے فرمایا "جانتا ہوں تم کون ہو، اور تمہارا تعارف یہ ہے کہ" ـــــــ اولك قطرة و اخرك جيفة وانت تحمل بينهما قذرة۔ یعنی تیری ابتدا، تو اس پانی سے ہوئی جو بدن کو لگ جائے تو پلید ہو جائے، کپڑے کو لگ جائے تو ناپاک ہو جائے، اور بدن سے نکلے تو غسل واجب ہو ـــ اور انتہا میں تو ایک مردار ہے، اور ان دونوں حالتوں کے درمیان گندگی اٹھائے پھرتا ہے۔ تو اس شخص کو اپنی حقیقت نظر آئی، توبہ کی اور کہا ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

اِنسان کی ذات میں کوئی کمال نہیں

کمال درحقیقت جو بھی ہو وہ اللہ تعالٰے کا ہے۔ انسان کی اپنی ذات تو گندگی ہی ہے۔ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس میں عقل بھی نہیں ہوتی۔ فخر تو انسان اس وقت کرے جب اس کی ذات میں کوئی کمال ہو۔ ورنہ فخر کرنا جہالت ہے۔

انسان کا سب سے بڑا کمال ایمان ہے۔ لیکن اس پر بھی غرور کرنا ٹھیک نہیں، شکر کرنا واجب ہے کہ اللہ تعالٰے نے ہم کو ایمان کی توفیق دی۔ ورنہ جیسے دنیا میں سینکڑوں کفار پھرتے ہیں۔ اگر ہمیں بھی انہیں میں سے کر دیتے تو ہماری کیا مجال تھی؟ اللہ تعالٰے فرماتے ہیں:۔ يمنون عليك ان اسلموا قل لا تمنوا علىّ اسلامكم۔ بل الله يمن عليكم ان هدٰكم للايمان ان كنتم صٰدقين ـــ یعنی اپنے اسلام کا احسان اللہ پر نہیں کرنا چاہیے؛

بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان ماننا چاہیئے کہ اس نے ایمان کی توفیق بخشی ہے

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

بادشاہ کے خادم کو بادشاہ پر احسان نہیں رکھنا چاہیئے کہ وہ اس کی خدمت کر رہا ہے، بلکہ اس کو بادشاہ کا احسان ماننا چاہیئے کہ اس نے اسی کو خدمت کے لئے چن لیا ہے (ورنہ بادشاہ کے ہزاروں لوگ خدام بننے کی خواہش رکھتے ہیں)

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انسان کو اکڑ کر نہیں چلنا چاہیئے لیکن اگر اکڑ کر چلنے کا خود حکم دیں تو یہ عبادت بن جاتی ہے۔ جیسا کہ حج کرتے وقت طواف کے پہلے تین چکروں میں رمل (اکڑ کر چلنا) کرنا واجب ہے۔ لہٰذا یہ عبادت بن گئی۔

گر طمع خواہد زما سلطانِ دیں
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

معلوم ہوا جو چیز اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائے وہ عبادت ہو جاتی ہے۔ پس یہی عبادت عادت ہے اور یہی عادت نیت کے ساتھ عبادت ہے۔

اسلام کا سہل راستہ

اگر انسان نماز پڑھتا ہے تو زیادہ سے زیادہ سوا گھنٹہ لگتا ہے تو گویا سوا گھنٹہ عبادت ہوئی۔ لیکن اسلام ایک ایسا (سہل اور آسان) راستہ بتاتا ہے کہ ہر ایک کام عبادت بن جائے۔ چنانچہ کھانا، پینا، سونا تمام عبادت ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اس نیت سے انسان سوئے کہ میں اٹھ کر تہجد پڑھ سکوں یا بیت الخلاء میں اس لئے جائے کہ گندگی نکل جائے اور طبیعت میں نشاط پیدا ہو تو فراغت سے عبادت کر سکوں۔ روٹی اس نیت سے کھائے کہ اس سے قوت پیدا ہو تو اللہ کی عبادت کروں۔ تو یہ ساری چیزیں عبادت

بن جاتی ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ من قاد اعمیٰ غفرلہ ما تقدم من ذنبہٖ۔ یعنی جس نے اندھے کو لاٹھی پکڑ کر چلایا تو اس کے اگلے پچھلے تمام صغائر (چھوٹے گناہ) معاف ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی جنازہ اٹھانا ایک طبعی امر ہے۔ ثواب نہ بھی ہو تو بھی انسان اٹھاتا ہے۔ لیکن حدیث میں ہے کہ جو شخص جنازے کے چاروں پاؤں کو کندھا دے تو اس کو چالیس نیکیاں ملتی ہیں۔ مردہ کو دفن کرنا ایک امرِ طبعی ہے۔ لیکن اتباعِ سنت کی نیت سے کیا جائے تو عبادت ہے۔ یتیم پر شفقت تو ہر ایک کو ہوتی ہے لیکن لوجہ اللہ کی جائے تو عبادت ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص یتیم کے سر پر ہاتھ رکھے تو جتنے بال اس کے ہاتھ کے نیچے آئیں تو اس کو اتنی نیکیاں ملتی ہیں۔

عمل کے لوجہ اللہ ہونے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں

اور عمل کے لوجہ اللہ ہونے کے لیے دو چیزوں کی رعایت ضروری ہے۔ ایک اخلاص یعنی خالص اللہ کے لئے ہو۔ ریا یا شہرت کے لیے نہ ہو۔ اور حظِ نفس کے لئے بھی نہ ہو۔ عبادت میں اگر اخلاص نہ ہو تو وہ قبول نہیں ہوتی۔ پس ہر عبادت میں توحید کا رنگ ہونا چاہیئے۔ اگر نماز پڑھی جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے۔ روزہ رکھا جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے۔ نذر مانی جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اور دوسرے کو شریک نہیں کرنا چاہیئے۔ مشرکین کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں:۔

وجعلوا للہ مما ذرأ من الحرث والانعام نصیبا فقالوا ھٰذا للہ بزعمھم وھٰذا لشرکائنا۔ فما کان لشرکائھم فلا یصل الی اللہ وما کان للہ فھو یصل الیٰ شرکائھم

یعنی کفار نے کھیتوں اور جانوروں میں تقسیم کی ہوئی تھی کہ یہ حصہ اللہ تعالیٰ کا ہے، اور یہ حصہ ان کے دوسرے معبودوں کا ہے۔ پس یہ عبادت مشترک ہوئی اور مشترک عبادت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :- انا اغنی الشرکاء من الشرک ـــــ کسی دوسرے کو عبادت میں شریک کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دوسرے حصے کو بھی تو ہی رکھ لے مجھے تیری عبادت کی ضرورت نہیں۔

ایسے ہی اگر خیرات دی جائے تو چھپا کر دینی چاہیئے۔ ہاں اگر کسی دینی مصلحت کے لئے اظہار ہو تو یہ بھی اچھا ہے۔ مثلاً اس نیت سے مشہور کر کے دے تاکہ دوسرے بھی دینے لگیں تو یہ بہتر ہے۔ ورنہ اصل میں صدقہ کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ اس طرح دیا جائے کہ بائیں ہاتھ کو بھی علم نہ ہو۔ اور جو کچھ مانگا جائے وہ بھی اللہ تعالیٰ سے ہی مانگا جائے ـــ حدیث میں ہے کہ اگر انسان کا تسمہ ٹوٹ جائے اور اس کو ٹھیک کرانے کے لئے پیسے بھی موجود ہوں تو جیب میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے مانگنا چاہیئے۔ اس پر بھی ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ نافع حقیقت میں صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ یہ چیزیں اسباب نفع ہیں اور اسباب نفع پر خاصیت کا مرتب ہونا عقلاً ضروری نہیں۔ مثلاً آگ پر جلانے کا مرتب ہونا ضروری نہیں ـ اگر اللہ تعالیٰ اس کی خاصیت بدل دے تو یہی پانی کا کام دے سکتی ہے ـــ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس آگ میں پھینکا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے جلانے کی خاصیت چھین لی، تو آپ صحیح سالم رہے ـــ ایسے ہی روپیہ سبب نفع تو ہے لیکن نافع نہیں ـــ اگر اللہ تعالیٰ اس سے اس کی خاصیت چھین لیں تو بے کار ہے۔ ایسے ہی تلوار گلا کاٹنے کا سبب تو ہے لیکن خود نہیں کاٹتی۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری کو پھیرا، لیکن اس نے کاٹا ہی نہیں ـــــــ یہی پانی آبِ حیات ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :- وجعلنا من الماء کل شیء حی ـــــــ لیکن یہی پانی قبطیوں کے لیے سبب موت بن گیا۔ ای

پانی سے بنی اسرائیل کے لئے بارہ راستے بن گئے اور ایک ایک قبیلہ ایک ایک راستے سے گزرنے لگا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے ڈبونے کی خاصیت اس سے سلب کر لی اور قبطیوں کو اسی پانی میں ڈبو دیا۔ ماں باپ انسان کے لئے خالق نہیں۔ سبب تخلیق ہیں، اور اللہ تعالےٰ چاہے تو بدوں اس سبب کے پیدا کر دے۔ جیساکہ حضرت آدم علیہ السلام کو بدوں ماں باپ کے پیدا کیا۔ البتہ "عادت اللہ" یوں ہی جاری ہے کہ اولاد میاں بیوی دونوں سے ہوتی ہے۔ سینکڑوں کیڑے مکوڑے بدوں ماں باپ کے صرف گندگی جمع ہونے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں: ءانتم تخلقونه ام نحن الخالقون۔ اور کاشتکار سے فرماتے ہیں:۔ ءانتم تزرعونه ام نحن الزارعون۔ اور اگر ظاہری طور پر کاشت کار ہی بوتا ہو تو بونے کے لیے اعضاء، اسباب، بیج اور پھر بیج کا اگنا سب ہی تو اللہ تعالےٰ کا دیا ہوا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حقیقت میں نافع اور ضار اللہ تعالےٰ ہی ہیں۔

اللہ کی عبادت کیوں کی جائے؟

اور عبادت نافع اور ضار ہی کی ہوتی ہے۔ اسباب نفع و ضرر کی نہیں ہوتی۔ یہی دھوکہ دوسری قوموں کو لگا تو کوئی سورج کو سجدہ کرنے لگا تو کوئی درخت کو۔ کیونکہ کچھ نہ کچھ نفع تو ہر چیز میں موجود ہے۔ پس تمام عبادتیں (جانی و مالی ہمہ قسم) اللہ تعالےٰ کے لیے ہی ہونی چاہیئے۔ نہ غیر اللہ کی نذر ماننی چاہیئے نہ غیر اللہ کو سجدہ کیا جائے، اور نہ رکوع کیا جائے۔ البتہ جو چیزیں جائز ہیں ان کی تعظیم جائز ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام نے بھی یہی تعلیم دی ہے فرمایا گیا:۔ ان اعبدوا اللّٰه واتقوه واطیعون ـــــ یعنی اللہ تعالےٰ ہی کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو۔ اور میری اتباع کرو اور حضرات انبیاء علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان تو یہ تھی، کہ اگر

تکلیف ہوتی تو شکوہ بھی اللہ تعالیٰ سے کرتے تھے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام گم ہو گئے تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا :۔ انما اشکوا بثی و حزنی الی اللہ ۔۔۔۔۔

یعنی میں اپنے غم کی شکایت اللہ تعالیٰ سے کرتا ہوں۔ کیونکہ ان کو علم تھا کہ یوسف علیہ السلام انہی کی مرضی سے گم ہوئے ہیں اور انہی کی مرضی سے ملیں گے۔

حدیث شریف میں ہے :۔ اذا استعذت فاستعذ باللہ واذا استعنت فاستعن باللہ ۔۔۔۔۔ یعنی جب تو پناہ پکڑے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ۔ اور جب تو مدد چاہے تو بھی اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ ۔۔۔۔۔

مثلاً حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹے کی دعا کی۔ تو پہلے ولادت کے تمام اسباب کے نہ ہونے کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ فرمایا کہ اے اللہ! میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں اور جب ہڈیوں تک کمزوری پہنچ گئی ہو تو گوشت اس سے اوپر ہوتا ہے، وہ بطریق اولیٰ کمزور ہو گا۔ یہ تو اندرونی حالت تھی۔ اور باہر کے متعلق فرماتے ہیں کہ میرا سر بڑھاپے سے سفید ہو گیا۔ لیکن اے اللہ! میں تجھ سے مانگ کر کبھی نامراد نہیں گیا۔ اور اولاد طلب کرنے کی وجہ بیان فرمائی کہ یہ میرے رشتہ دار ہیں۔ ان سے مجھے ڈر ہے کہ یہ میرے مشن کو چلا نہیں سکیں گے۔ اور تربیت و ہدایت نہیں کریں گے۔ پھر فرمایا کہ میری بیوی بانجھ ہے۔ اس میں اولاد کی صلاحیت ہی نہیں۔ گویا اولاد کی صلاحیت نہ خاوند میں نہ بیوی میں، اور نہ رشتہ داروں سے تعلیم و تربیت کی کوئی امید، جو میرے مشن کو آگے بڑھا سکیں۔

بعد ازاں فرماتے ہیں اے اللہ! ایسا بیٹا دے جو میرا وارث ہو، اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی وراثت مال نہیں ہوتا بلکہ علمِ الٰہی ہوتا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہے کہ ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما ولکن ورثوا العلم۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان جب دعا

کرے تو تردد نہ کرے بلکہ عزم کے ساتھ کرے ــــ جیسا کہ ایک بدوی حج کو آیا تو بیت اللہ کے پاس کھڑے ہو کر کہنے لگا :۔ یارب البیت یارب البیت جئتك واھلی فی البیت الا تغفرلی۔

ــــ پھر دعار کے بعد بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ بعینہٖ وہی چیز مل جاتی ہے۔ اور بعض دفعہ اس سے اچھی چیز مل جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی دیر سے بھی ملتی ہے جیسا کہ بیٹا باپ سے کچھ پیسے مانگے تو باپ نہ دے اور کچھ دن گزرنے کے بعد دے، بیٹا کہے کہ جب میں نے مانگے تھے اس وقت تو آپ نے دیئے نہیں تھے تو باپ کہتا ہے کہ بیٹا تو اس وقت بیمار تھا اگر میں تمہیں پیسے دے دیتا تو تو ایسی چیزیں کھاتا جن سے تمہاری صحت بگڑتی. ــــ (بلاتشبیہ) ایسے ہی اللہ تعالےٰ سے اگر کوئی مال مانگے تو بعض اوقات مال نہیں ملتا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضول خرچ ہے۔ اگر اس کو مال دیا گیا تو یہ اور زیادہ معاصی میں مبتلا ہو جائے گا۔ لیکن جب مفلس ہو جاتا ہے اور معاصی سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ دے دیتے ہیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیٹا ساری زندگی مانگتا رہتا ہے، باپ کچھ بھی نہیں دیتا۔ لیکن جب بیٹا بوڑھا ہو جائے تو باپ اس کو خزانہ دے دیتا ہے ــــ بیٹا کہتا ہے کہ آپ نے ساری زندگی تو مجھے کچھ دیا نہیں ــــ باپ کہتا ہے کہ میں دیتا رہتا تو تو سارا مال ضائع کر دیتا۔ تُو جتنا مجھ سے مانگتا رہا میں جمع کرتا رہا۔ اور آج اتنا خزانہ ہو گیا ہے۔ ایسے ہی انسان کی دعار بعض اوقات ساری زندگی قبول نہیں ہوتی۔ لیکن قیامت میں نیکیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہوگا تو یہ انسان کہے گا کہ اے اللہ! میں نے تو اتنی نیکیاں نہیں کی تھیں۔ اللہ تعالےٰ فرمائیں گے کہ تو دنیا میں دعائیں کرتا رہا ــ میں ان کو تیری آخرت کے لیے جمع کرتا رہا۔ چنانچہ یہ تیری دعائیں ہیں۔ اس لیے انسان کو دعار سے کبھی تنگ نہیں ہونا چاہیئے ــ اور میں تو کہتا ہوں کہ کچھ بھی نہ ملے تو بھی دعار کو چھوڑنا نہیں چاہیئے ــ اس لیے کہ

حدیث میں ہے الدعاء مخ العبادة۔ دعاء عبادت کا مغز ہے۔ مغز کو چھوڑ کر محض چھلکے پر اکتفا کرنا کون سی دانش مندی ہے ؟

غیر اللہ میں سے کس کی تعظیم ضروری ہے ؟

اور دعاء وطلب صرف اللہ تعالیٰ سے ہونی چاہیئے۔ لیکن جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائیں ان کی تعظیم بھی ضروری ہے۔ مثلاً حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعظیم ضروری ہے کہ ان کی اتباع کی جائے۔ اور قرآن مجید کی تعظیم بھی ضروری ہے کہ اس کو بے وضو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ بیت اللہ المکرم کی تعظیم کرنی چاہیئے کہ قضاء حاجت کے وقت اس کی طرف منہ یا پیٹھ نہ کی جائے، کیونکہ وہ جہت صلوٰۃ ہے لیکن معبود نہیں۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ حج کو تشریف لے گئے تو حجر اسود کو بوسہ دینے کا موقع نہ ملا۔ اور اس وقت ایسی حکومت تو نہ تھی کہ بذریعہ پولیس آپؓ کے سامنے سب کو ہٹا دیا جاتا۔ تو آپؓ نے لاٹھی کو حجر اسود کے ساتھ لگا کر اس کو بوسہ دے لیا۔ اور حجر اسود سے خطاب کر کے فرمانے لگے:۔ انی اعلم انک حجرٌ لا تنفع و لا تضر لو لا انی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبلک ما اقبلک ......

یعنی میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ کسی کو ضرر دے سکتا ہے۔ اگر میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا ہوتا کہ وہ تجھے بوسہ دے رہے ہیں تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔

حدیث میں ہے۔ ایک صحابی رضؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کو سجدہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا، تم نے ایسا کیوں کیا؟ کہنے لگے میں نے قیصر وکسریٰ

کو دیکھا کہ لوگ ان کو سجدہ کر رہے ہیں۔ مَیں نے خیال کیا کہ اللہ کا رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کو سجدہ کیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کو بھی سجدہ کرنا جائز ہوتا تو مَیں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ ——— اس لیے کہ عبادت و سجدہ صرف اور صرف اللہ تعالےٰ کی ذاتِ عالی کے لیے مخصوص ہے۔ کسی اور کی نہ عبادت ہے نہ کسی کو سجدہ ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام نے خود بھی تعلیم دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں: ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتٰب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ——— یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالےٰ کسی بشر کو کتاب اور نبوت دے۔ پھر وہ نبی کہنے لگے کہ میری عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ کرو ——— تو حاصل اخلاص کا یہ ہوا کہ تمام عبادتیں صرف اللہ تعالےٰ ہی کے لیے کرنی چاہیئے۔

قبولیتِ اعمال کے لئے اخلاص کے ساتھ اتباعِ نبوی ضروری ہے

دوسرا اصول یہ ہے کہ عمل میں اتباع کی شان موجود ہو۔ ہر فعل میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جائے۔ جو عبادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے نمونہ پر ہوگی، وہ مقبول ہوگی ورنہ نہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص اخلاص کے ساتھ ظہر کی چھ رکعتیں پڑھے تو یہ عند اللہ مقبول نہیں۔ کیونکہ یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نمونے کے خلاف ہے۔ ایسے ہی اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ روزہ مغرب تک تو ہوتا ہی ہے۔ مَیں آج عشار کے وقت افطار کروں گا تو یہ قبول نہیں ——— نیز نمونے بنانے کی

ضرورت نہیں بلکہ نمونے بنے ہوئے موجود ہیں۔ کیونکہ دین کامل اور مکمل ہو چکا ہے۔ اس میں ہر قسم کی ہدایات موجود ہیں۔ چنانچہ بعض مشرکین حضرت سلمان فارسی رضؓ سے کہنے لگے کہ تمہارا نبی تمہیں ہر چیز کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ قضائے حاجت کا طریقہ بھی بتلاتا ہے۔ تو آپؓ نے جواب میں فرمایا کہ ہاں آپؐ ہم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں حتیٰ کہ قضائے حاجت کا طریقہ بھی بتلاتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ ہم فارغ ہوتے وقت قبلہ کی طرف منہ نہ کریں اور نہ ہی پیٹھ کریں۔ تو جب حدیث میں ایسی ایسی چیزیں موجود ہیں تو اور کس چیز کی کمی ہوگی۔

اس لئے جتنا اخلاص کم ہوتا جائے گا اتنا شرک بڑھتا جائے گا، اور جتنی اتباع میں کمی ہوگی اتنی ہی بدعات داخل ہوتی جائیں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی ہمارے سامنے نمونہ کے لئے موجود ہے۔

سیرِ حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے صرف اسوۂ محمدیؐ ہی موجود ہے

یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اپنے مقتدا کی سیرت دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکتی ——— حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گھریلو زندگی کا آج ہمیں کوئی علم نہیں۔ اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عملی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ صرف مسلمان ہی یہ دعوےٰ کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی ہمارے سامنے موجود ہے۔ چنانچہ کھانے پینے، سونے غرض زندگی کے ہر کام کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔

چین میں آٹھ صحابہ کرامؓ تشریف لے گئے اور وہاں جا کر تجارت شروع کر دی۔ تو صحابہ کرامؓ چونکہ دیانتدار تھے، اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے الصحابۃ کلھم عدول"۔ تمام صحابہ کرامؓ عادل ہیں ——— دیانتداری سے وہاں تجارت شروع کی تو تمام بازار ٹھنڈا پڑ گیا ——— تاجروں نے حکومت کے پاس شکایت کی کہ یہ لوگ عرب سے آئے ہیں اور ملک کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کو ایسے ہی چھوڑ دیا گیا تو یہ تمام دولت نکال کر

عرب میں لے جائیں گے ــــــــــ اس شکایت کا ردِ عمل یہ ہوا کہ ایک کمیشن صرف اس مقصد کے لئے بنا اور وزیر اعظم خود اس کے صدر بنے۔ اور آکر صحابہ کرامؓ سے کہنے لگے۔ "تم ہمارے ملک کو ویران کرتے ہو اس لئے تم یہاں سے نکل جاؤ" ــــــــــ صحابہؓ نے فرمایا کہ آپ کے تاجروں نے غریبوں کو لوٹ رکھا تھا جب ہم نے دیانتداری سے کام شروع کیا تو ان کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا، اور حسد کی وجہ سے یہ شکایت لے کر آپ کے ہاں پہنچے ہم تو آپ کے ملک کو آباد کرنے آئے ہیں۔ ویران کرنے نہیں آئے ــــــــــ وزیر اعظم نے کہا کہ ہم کو بہر حال شکایت ہے اس لیے تم یہاں سے چلے جاؤ ــــــــــ

صحابہ کرامؓ نے فرمایا اگر ہمارا قصور ہو تو ہم اقرار کرنے کے لیے تیار ہیں اور بلا قصور تم نکالنا چاہتے ہو تو ہماری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ رعایا نے کہا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ چنانچہ حکومت دب گئی۔ انہی آٹھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی برکت ہے کہ آج چین میں آٹھ کروڑ مسلمان ہیں ــــــــــ (تو نیت کی درستگی اور دیانت کی وجہ سے آٹھ نفوس قدسیہ پر مشتمل یہ چھوٹا سا گروہ جو اپنی زندگی کا مقصد اتباعِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم بنا چکا تھا۔ اتنی بڑی تعداد پر غالب آیا اور رہتی دنیا تک اپنے انمٹ نقوش چین پر ثبت کر دیئے۔ آج بھی توحید کی آواز چین کے در و دیوار سے بلند ہو رہی ہے)

توحید کی قوت اور شرک کی بے بسی

ایران پر چڑھائی کے لئے جب مسلمانوں کا لشکر گیا تو راستے میں دریا آ گیا۔ حضرت سعدؓ نے لشکر سے فرمایا کہ جس خدا کے بندے ہو اسی کے قبضۂ قدرت میں یہ دریا ہے۔ اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دو۔ چنانچہ سب صحابہ کرام نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے اور تیرتے ہوئے دریا کو عبور کر گئے۔ ایک صحابیؓ کا پیالہ دریا میں گر پڑا، دوسروں نے کہا کہ اس کو پکڑ لو۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر پیالہ میرا ہوا تو یہ نہیں ڈوبے گا۔ (اللہ اس کی

حفاظت فرماویں گے) چنانچہ دریا کی موجوں نے پیالے کو دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا تھا۔ جب وہ صحابی وہاں پہنچے تو پیالہ وہاں پڑا ہوا تھا۔ یہ تمام چیزیں قلب کی قوت سے ہوتی ہیں اور قلب کی قوت توحید سے پیدا ہوتی ہے۔ شرک سے دل میں تذبذب آجاتا ہے۔ ان کے ہاں نہ شرک کا واہمہ تھا نہ بدعت کا شبہ۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ آٹھ سو صحابہؓ کو لے کر ماہان ارمنی عیسائی کے مقابلہ میں تشریف لے گئے۔ ماہان ارمنی حضرت خالدؓ سے کہنے لگا، میں تو سمجھا تھا کہ مسلمان عقلمند ہیں لیکن تم تو احمق ہو کہ اتنے آدمیوں کو لے کر ہزاروں کے لشکر کے مقابلہ کے لئے آ گئے۔ مجھے تمہارے نوجوانوں پر رحم آتا ہے۔

حضرت خالدؓ نے فرمایا کہ اے ماہان؟ تو کمانڈر انچیف بن کے آیا ہے یا واعظ بن کر آیا ہے؟ تو اگر لڑنا نہیں چاہتا تو صاف کیوں نہیں کہہ دیتا کہ میں لڑائی نہیں کر سکتا —— ماہان کو غصہ آیا تو فوجوں کو لڑنے کا حکم دے دیا۔

حضرت خالدؓ نے بھی صحابہؓ کو کفار میں گھس جانے کا حکم فرمایا ——

راوی کہتے ہیں کہ سات گھنٹے تک لڑائی ہوئی آخر کفار شکست کھا کر بھاگ گئے۔ مسلمان صرف سات شہید ہوئے اور عیسائیوں کے تیرہ ہزار آدمی مارے گئے ——

اس کی وجہ یہی تھی کہ آدمی جب دین کے لیے لڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ مدد فرماتے ہیں۔ اور ہمت تو صرف توحید سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ مشرک میں یہ جان نہیں کہ وہ اتنی قوت پیدا کر سکے حاصل یہ کہ ایک طرف اخلاص کامل اور دوسری طرف اتباعِ کامل کی ضرورت ہے۔ آج مسلمانوں میں شرک و بدعات داخل ہو رہی ہیں۔ اس لیے آج ذلت کی بھی یہ حالت ہے کہ خدا کی پناہ۔

اقوامِ عالم کی اصلاح کا ذمہ دار مسلمان ہے

اس کی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ ایک دوسرے سے حسنِ ظن رکھنا چاہیئے، بدظنی

سے بچنا چاہیئے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ضروری ہے لیکن کسی کو رسوا نہیں کرنا چاہیئے۔ حدیث میں ہے کہ اے اللہ! میں اس مکار دوست سے پناہ مانگتا ہوں، جو دوستی کا دعوٰے کرے لیکن جب میری بھلائی دیکھے تو اس کو دفن کردے اور جب میری برائی دیکھے تو اس کو افشا کردے۔

حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں لن یصلح اٰخر ھٰذہ الامۃ الا بما صلح بہٖ اولھا۔ اس امت کے آخر میں فتنہ و فساد رونما ہونے کی اصلاح قطعی طور پر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ امت اُس راستہ پر نہ آجائے گی جس راستہ پر امت کا پہلا طبقہ تھا۔ اور امت کی اصلاح پہلے اخلاصِ کامل اور اتباعِ کامل سے ہوئی تھی۔

آج مسلمان یہ شکایت کرتے ہیں کہ مجھے فلاں سِکھ نے ایذا پہنچا دی۔ فلاں ہندو یا عیسائی نے مجھے تکلیف دی ——— میں کہتا ہوں کہ تمام اقوامِ عالم کی برائیوں کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے۔ کیونکہ یہ دنیا کے معلم تھے۔ جب معلم درست ہوں تو دوسرے خودبخود درست ہو جاتے ہیں ——— حدیث میں ہے الاسلام یعلو ولا یعلیٰ۔ اسلام غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا۔ لیکن جب ہم اسلام کے دائرے میں ہی نہ آئیں تو ہم پست ہوں گے۔ ورنہ اسلام میں تو پستی نہیں ہے۔

بندہ کو اپنی مرضی ختم کردینی چاہیئے

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ نیت تبدیل کرنے سے عادت عبادت بن جاتی ہے ——— ایک شخص نے ایک مکان بنوایا اور اس میں روشندان بھی لگائے۔ بن جانے پر اپنے شیخ کو بلوایا۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ روشندان کس لیے بنوائے ہیں؟ اس نے عرض کی ہوا آنے کے لیے بنوائے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ کے بندے! اگر

یہ نیت بھی کر لیتے کہ اذان کی آواز آئے گی ثواب بھی ہوتا، اور ہوا بھی اس کے بند نہ ہوتی۔ کیونکہ نیت تو ان چیزوں کے لیے ضروری ہے جو نیت پر موقوف ہیں تو ثواب تو نیت پر موقوف ہے لیکن ہوا کا آنا نیت پر موقوف نہیں۔ پس ہر کام میں ثواب کی فکر ہی ہونی چاہیئے اور اللہ کی رضا کی طلب ہونی چاہیئے۔ عبد اللہ (اللہ کا بندہ) کا معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ ہی کی مرضی کے موافق کام کرے ——

کسی شخص نے ایک غلام سے پوچھا کہ تو کیا کھلئے گا؟ اس نے کہا جو کچھ مولا کھلائے گا۔ اس نے کہا کہ پیئے گا کیا؟ غلام نے جواب دیا کہ جو کچھ مولا پلائے گا —— اس نے پوچھا کہ تو پہنے گا کیا؟ اس نے جواب دیا کہ جو کچھ مولا پہنائے گا —— اس شخص نے کہا کہ اللہ کے بندے تیری بھی کچھ مرضی ہے یا نہیں؟ غلام نے جواب دیا کہ اگر اپنی مرضی ہوتی تو غلام نہ ہوتا۔

آیت متعلقہ بیان

جو آیت میں نے پڑھی تھی اس میں اسی اخلاص اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے ابراہیم! کہہ دو کہ میری نماز، میری قربانی، میرا مرنا، میرا جینا، سب اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اسی ملتِ ابراہیمیہ کی تکمیل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا —— اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں ملۃ ابیکم ابراھیم یعنی اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا اتباع کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس امت کو خود امتِ مسلمہ فرمایا ہے ۵ وسمٰکم المسلمین۔ ابراہیم علیہ السلام نے ہی تمہارا نام مسلمان رکھا ہے اور اسلام کے معنی اطاعت اور سونپ دینے کے ہیں اسلام کا اقرار کرنے کے بعد اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد نہ کرنا غداری ہے پسندیدگی کا بھی اظہار اور ناپسندیدگی کا بھی اظہار یہ اجتماع ضدین ہے۔

نام کے اور کام کے مسلمان

پنجاب کے ضلع انبالہ میں ایک بزرگ جمنا کے کنارے ایک بستی میں رہتے تھے۔ ایک دفعہ دریا کو طغیانی آئی تو وہ گاؤں بھی غرق ہونے لگا۔ لیکن ایک دیوار کی وجہ سے کچھ بچاؤ تھا۔ لوگ ان بزرگ صاحب کے پاس گئے اور عرض کی حضرت شاہ صاحبؒ! گاؤں غرق ہونے لگا ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو غرق ہونے سے بچائے۔ تو شاہ صاحبؒ نے پھاوڑا لیا اور جو دیوار باقی تھی اس کو بھی توڑنے لگے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ کیا کر رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا۔ "جدھر مولیٰ اُدھر شاہ دولا" تم مجھ سے اللہ تعالےٰ کا مقابلہ کرانا چاہتے ہو؟ اگر اللہ تعالےٰ چاہے کہ یہ بستی ڈوب جائے تو بندہ کو بطریق اولیٰ کہنا چاہیئے کہ یہ بستی ڈوب جائے ــــــــ

اسی طرح ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا حال ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس کا کیا حال پوچھتے ہو جس کی مرضی کے موافق دو جہاں کا کارخانہ چل رہا ہے۔ اس نے کہا کہ دونوں جہاں کا کاروبار آپ کی مرضی کے موافق چل رہا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں۔ اس طرح کہ دونوں جہاں کا کاروبار اللہ کی مرضی کے موافق چل رہا ہے۔ اور مَیں نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں ایسا فنا کر دیا ہے کہ اللہ کی مرضی ہی میری مرضی ہے ؎

نازم بچشم خود کہ روئے تو دیدہ است

افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

عوام صحابہ میں سے ایک صحابی زمین کاشت کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سنی تو وہیں کھڑے ہو کر دعا کی کہ اے اللہ مجھے آنکھیں اس لئے عزیز تھیں کہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وفات پا گئے تو ان آنکھوں کے ساتھ اب کسی دوسرے کو دیکھنا نہیں چاہتا۔

بس اسی وقت وہ صحابی نابینا ہو گئے ——— یہ تو بہر حال صحابی تھے۔ ان کا تو مقام ہے ہی۔ اس کے علاوہ اولیاء اللہ میں ایسے بزرگ ہوئے ہیں۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جن کی کتاب مدارسِ عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے۔ ان کے شیوخ میں سے ایک شیخ ہیں جب وہ بازار نکلتے تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتے تھے۔ لوگوں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے فرمایا اللہ تعالےٰ نے حافظہ بہت قوی دیا ہے جو چیز سنتا ہوں یاد ہو جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں جن کانوں کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث سُنوں ان کانوں میں کوئی دوسری آواز نہ پڑے۔ یہ لوگ کام کے مسلمان تھے۔ ہم تو نام کے مسلمان ہیں آج اگرچہ ہم ان جیسے تو نہیں ہو سکتے بلکہ جو بزرگ ہمارے قریب زمانے کے ہیں ان کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ مثلاً جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ان کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن ہم کم از کم ان کے راستہ پر تو چل پڑیں۔ وہ تو دوڑتے جاتے تھے ہم چلیں تو سہی۔ ہم بھی کبھی نہ کبھی ان شاء اللہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے اور بغیر سلفِ صالحین کے نقشِ قدم پر چلے دین و دنیا نہیں ملتی۔

بہر حال دین و دنیا کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر اخلاصِ کامل اور اتباعِ کامل پیدا کرے۔ یہی دو چیزیں کلیدِ نجات ہیں اور کامیابی کی ضمانت ہیں۔ جو بھی کامیاب ہوا وہ اسی طریق پر چل کر ہوا، اور جو راستہ سے ہٹ گیا وہ منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکا۔ اور زندگی کا مایہ یوں ہی گم کر بیٹھا۔

یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو توفیقِ عمل نصیب فرمائے۔ آمین

اللّٰھم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم
وارنا مناسکنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم

صحبتِ صالح

حکومتوں کے قوانین جرائم کے افعال تو روک سکتے ہیں۔ لیکن جرائم کی نفرت دل میں نہیں بٹھا سکتے۔ زانی زنا سے اور چور چوری سے قانون کی وجہ سے رُک سکتا ہے لیکن زنا اور چوری کی نفرت اس کے دل میں قوانین سے نہیں بیٹھ سکتی، جرائم کی نفرت اور معصیت سے بیزاری اہل اللہ کی صحبت معیت سے نصیب ہوتی ہے ـــــــــــ

از حضرۃ حکیم الاسلام مدظلہ

ترتیب

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہ ونؤمن
بہ ونتوکل علیہ - ونعوذ باللہ من شرور انفسنا
ومن سیئات اعمالنا - من یھدہ اللہ فلا مضل لہ
ومن یضللہ فلا ھادی لہ - ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ
وحدہ لا شریک لہ - ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولانا
محمداً عبدہ ورسولہ - ارسلہ اللہ اِلیٰ کافۃ للناس
بشیراً ونذیراً - وداعیاً الیہ باذنہٖ وسراجاً منیراً -
امابعد :- فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصّٰدقین ط

صدق اللہ العلی العظیم (توبہ پ ۱۱ - ع ۱۴)

کثرتِ علم کے باوجود بے عملی کثرت سے ہے

بزرگانِ محترم!

یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے - اس میں حق تعالےٰ نے ایک بہت
اہم مضمون بیان فرمایا ہے - جس پر انسان کی دینداری کی بقاء موقوف ہے - اگر کوئی

دیندار بننا چاہے تو اس کے لئے اس پر عمل کرنا ضروری ہے ـــــ یہ مشاہدہ ہے کہ آج کل تقریروں، جلسوں اور لٹریچر کی کمی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی دینی حالت تنزلی میں ہے۔ صرف دین ہی نہیں بلکہ دنیا کے اعتبار سے بھی تنزلی کا شکار ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جب تک اسباب مرض معلوم نہ ہوں، اس وقت تک مریض کا علاج ناممکن ہے۔ اب دین میں کمی اس وجہ سے تو نہیں کہ کم علمی ہو۔ کیونکہ اس زمانے میں علم کے ذرائع اشاعت جتنے موجود ہیں وہ پہلے کبھی موجود نہ تھے۔ اسی طرح آج جو جلسے ہوتے ہیں وہ بھی ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں ایک ہزار دو ہزار آدمی تو معمولی بات ہے اور بعض جگہ تو لاکھوں تک بھی شرکت ہوتی ہے۔ بلکہ آج کل تو تمام دنیا ایک جلسہ گاہ بنی ہوئی ہے۔ ایک شخص ریڈیو میں بولتا ہے مشرق و مغرب تک اس کی آواز پہنچتی ہے۔ اور صرف دنیوی باتیں ہی نہیں بلکہ ترجمے اور تفسیریں بھی مختلف ممالک میں سنی جاتی ہیں۔ آپ کا ریڈیو پاکستان روزانہ ترجمہ قرآن مجید نشر کرتا ہے۔ اور مسائل تو بچہ بچہ جانتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دین میں وہ پختگی نہیں جو پہلے زمانوں میں تھی ـــــ دوسرا ذریعہ نشر علم کا قلم ہے۔ آج کے زمانے میں اس کی بھی کمی نہیں۔ قلم کی علماء نے دس قسمیں لکھی ہیں۔ پہلی قلم لوح محفوظ والی قلم ہے۔ جس کے متعلق حدیث شریف میں ہے کہ خلق اللہ القلم فقال لہٗ اکتب قال ما اکتب قال اکتب ما کان وما یکون۔ اور ایک قلم وہ ہے جس سے روزانہ کے حالات لکھے جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں جب عرش کے قریب پہنچے، تو قلموں کی کھسکھساہٹ سنی۔ آپ نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کس چیز کی آواز ہے۔ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ یہ دفتر ہے جس میں مخلوق کے واقعات کو لکھا جاتا ہے، اور ایک ایک انسان دن میں لاکھوں حرکتیں کرتا ہے۔ معلوم نہیں وہ دفتر بھی کتنا بڑا ہوگا۔

ایک قلم وحی ہے۔ وہ یہ کہ وحی آتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زید بن حارثہؓ

یا کسی دوسرے صحابی کو بلوا کر لکھوا دیتے تھے۔ اسی قلم پر ہمارے دین کی بقاء موقوف ہے۔ ایسے ہی اگر حدیث کی کتابت نہ ہوتی تو اتنی کتب بھی ہمارے پاس موجود نہ ہوتیں۔ پس یہ ذخیرہ احادیث اور قرآن کریم قلم کے ذریعہ ہی محفوظ کئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے آج ہم نماز، روزہ حج وغیرہ کے احکام پمفلٹوں میں شائع کرتے ہیں۔

ایک قلم تصوف ہے۔ جس سے تصوف کے ضروری مسائل اور تزکیہ نفوس کے طریقے محفوظ کئے جاتے ہیں۔ ——— اور ایک قلم سیاست ہے، جس سے تمام سیاسی معاملات محفوظ کر لئے جاتے ہیں۔ دین کے سلسلے میں آج جتنی قلمکاریاں ہیں، وہ پہلے کسی زمانہ میں نہ تھیں۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم تصنیف میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حجاز کے کتب خانوں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کتابیں محفوظ ہیں۔ اندلس کے کتب خانوں کے متعلق ایک عیسائی عورت اپنی کتاب "حاضر الاندلس و غاربھا" میں لکھتی ہے کہ تعصب میں آکر عیسائیوں نے ارادہ کیا کہ مسلمانوں کا لٹریچر ضائع کر دیا جائے۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے اس کام کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا، جس کا کام یہ تھا کہ کتب خانوں کو جلائے یا دریا برد کر دے۔ وہ عورت لکھتی ہے کہ پچاس برس تک یہ مہم جاری رہی۔ تاتاریوں نے حکومتِ بغداد کے کتب خانوں کو دریا میں ڈال دیا۔ تو وہ ایک بڑا پُل بن گیا۔ تاریخ کی کتب میں لکھا ہے کہ ایک ماہ تک دریا کا پانی سیاہ رہا۔ جب ایک کتب خانہ کی یہ حالت تھی تو باقیوں کا کیا حال ہوگا۔ انجیل کے شباب کے زمانہ میں بھی عیسائی اتنے کتب خانے نہ بنا سکے، اور نہ ہی یہودی تورات کے شباب کے زمانے میں ایسے کتب خانے بنا سکے۔ اور آج بھی جو انہوں نے تصانیف کی ہیں، وہ بھی مسلمانوں کی برکت سے ہیں۔ اندلس میں مسلمانوں نے جو یونیورسٹیاں بنائی تھیں، موجودہ یورپ کی ترقی انہیں کی مرہونِ منت ہے۔ وہیں سے یورپ کے لوگ پڑھ کر آئے، اور اپنے ملک میں علم پھیلایا۔ اسی کی برکت ہے کہ آج عیسائی اس قابل ہیں کہ تصنیف کر سکیں اور ان کو

اقرار ہے کہ یہ مسلمانوں ہی کے فیض سے ہے۔

ماحول کا اثر

الغرض مسائل کی اشاعت کثرت سے ہے لیکن اس کے باوجود دین مسلمانوں میں نہیں پھیلتا۔ اور نہ ہی سلف کی طرح ایمان میں مضبوطی ہے، اور نہ ہی ہمارا دل ایسا ہے کہ اعمالِ صالحہ اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جائیں —— وجہ اس کی یہ ہے کہ ہماری معاشرت غیر اسلامی ہے .... اور ماحول بھی غیر اسلامی بن گیا۔ دارالعلوم دیوبند میں دو ہزار کا عملہ ہے۔ ممکن نہیں کہ وہاں کوئی بے نمازی ہو۔ اذان ہوتے ہی سب کے سب ہر طرف سے دوڑتے ہیں۔ یہ تمام ماحول کا اثر ہے۔ ورنہ وہاں کوئی نماز کے متعلق کہنے والا نہیں ہوتا ——

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر کام پہلے ریا ہوتا ہے، پھر عادت ہوتی ہے، پھر عبادت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے :-

مروا صبیانکم بالصلٰوۃ اذا بلغوا سبعًا ویضربوھم علیھا اذا بلغوا عشرًا۔	اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب کہ وہ سات سال کے ہو جائیں، اور مار کر نماز پڑھاؤ جب کہ دس سال کے ہو جائیں۔

یہ مار کر نماز پڑھانا حقیقی نماز نہیں، کیونکہ وہ ڈر کے مارے پڑھتا ہے، یہاں تک کہ سجدہ کرتے ہوئے بھی ایک آنکھ سے دیکھتا رہے گا۔ جب دیکھا کہ باپ نہیں بھاگ جائے گا۔ لیکن جب اس کو عادت پڑ گئی اور ساتھ ساتھ کچھ علم آگیا، تو خیال کرے گا کہ یہ بہت ضروری چیز ہے۔ تو یہی عبادت بن جائے گی۔ ....

عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

ے بہر دنیا بہر دین و بہر نام   اللہ اللہ کردہ باید والسلام

اس لیے نمازی کو اس وجہ سے نہیں رکنا چاہیئے کہ شاید یہ ریا ہو ——

ظاہر کا اثر باطن پر

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ جو فقہ کے امام ہیں۔ مگر ان کا مذہب مدون نہیں ہوا۔ وہ فرماتے ہیں۔

طلبنا العلم لغیر اللہ فابیٰ	ہم نے علم غیر اللہ کے لیے طلب کیا لیکن
ان یکون الا للہ۔	علم تو صرف اللہ تعالےٰ کا ہو کر رہا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ظاہر کا اثر باطن پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً اگر ایک آدمی عورتوں کا سا لباس پہن لے، تو چند دن کے بعد اس کا دِل یہ چاہے گا کہ وہ کلام بھی عورتوں کی طرح کرے، بلکہ تمام حرکات و سکنات عورتوں جیسی کرے —— اسی طرح اگر کوئی بتکلف علمار کا سا لباس پہن لے تو وہ مخلوق کی خاطر بہت سے گناہوں سے بچے گا۔ ایسے ہی اگر کوئی درویشوں کا سا لباس پہن لے، تو اس کا اثر بھی قلب پر پڑے گا۔ اگر کفار کا سا لباس پہننا شروع کر دے تو چند دنوں میں دیگر افعال بھی کفار کی طرح ہی کرنے لگے گا ——

اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ فان لم تبکوا فتباکوا یعنی اگر تمہیں رونا نہ آئے ا رونے کی شکل ہی بنالو —— مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے ہاں بھی ظاہری افعال کا اثر حقیقی افعال کا سا مرتب ہوتا ہے — رونے کی شکل بنانے میں وہی اجر و ثواب ملے گا، جو حقیقۃً الحاح و زاری پر ملتا ہے — بہر حال ظاہر کا اثر نہ صرف باطن پر مرتب ہوتا ہے، بلکہ ایک درجہ میں عنداللہ بھی بلحاظ اجر و ثواب اس کا اعتبار ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ حنین سے واپس آرہے تھے، راستہ میں

ایک جگہ پڑاؤ کیا، کفار کے بہت سے بچے مسلمانوں کے لشکر کے پاس جمع ہو گئے۔ ان میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ بھی تھے ——— جب مؤذن نے اذان کہی تو ان بچوں نے بھی نقل اتارنا شروع کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو پکڑ کر لاؤ۔ سب بچے تو بھاگ گئے، مگر حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ ان میں سے بڑے تھے۔ انہیں بھاگتے ہوئے شرم آئی، وہ نہ بھاگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب ان کو حاضر کیا گیا۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ اب اسی طرح نقل اتارو۔ اور کہو اللہ اکبر۔ اللہ اکبر حضرت ابو محذورہؓ نے کہہ دیا، پھر آپؐ نے فرمایا کہ کہو اشہد ان لا الہ الا اللہ ان کو تامل ہوا۔ کیوں کہ اس میں توحید کا اقرار تھا۔ لیکن دبے لفظوں سے کہہ دیا — آپؐ نے پھر فرمایا کہ کہو۔ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ تو حضرت ابو محذورہؓ نے دوبارہ بھی کہہ دیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ کہو اشہد ان محمداً رسول اللہ ——— اس میں حضرت ابو محذورہؓ کو زیادہ تامل ہوا۔ کیونکہ توحید کے تو کسی درجہ میں مشرکین مکہ بھی قائل تھے۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے۔ لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک الا شریکا ھو لک ———

اور قرآن مجید میں بھی ہے کہ:۔ قل من رب السمٰوٰت السبع ورب العرش العظیم ○ سیقولون للہ۔ یعنی اگر آپؐ ان سے پوچھیں کہ ساتوں آسمانوں اور زمین کو اور اس کے بڑے عرش کو کس نے پیدا کیا، تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ——— توحید کے تو کسی درجہ میں قائل تھے۔ تو توحید کے کلمات کہنے میں اس قدر تامل نہ ہوا۔ لیکن رسالت کے وہ منکر تھے اور سارا جھگڑا رسالت کے نہ ماننے پر تھا۔ اس لئے ابو محذورہؓ پہلے تو چپ ہو گئے۔ لیکن پھر دبے لفظوں میں کہا اشہد ان محمداً رسول اللہ۔ آپؐ نے فرمایا کہ زور سے کہو تو ابو محذورہؓ نے زور سے دوسری مرتبہ بھی کہا ———

ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے یہ اذان اسلام کی حالت میں نہیں کہی تھی محض نقالی

تھی۔لیکن اس کا اثر دل پر اتر گیا۔ کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! اب تو میں آپؐ کا ہوں۔ اب اذان میں شوافع احناف کے خلاف ہیں۔ شوافع کہتے ہیں کہ ترجیع صفتِ اذان میں سے ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ یہ تعلیم تھی۔ یہ فقہاء کے اختلاف ہیں۔لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابو محذورہؓ نے جب ظاہر سے اسلام کا اقرار کیا تو اس کا اثر دل میں بھی اتر گیا۔ اور اسلام قبول کر لیا ـــــ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر رونا نہ آئے تو رونے کی شکل ہی بنا لو ـ پس اگر نماز کو جی نہ بھی چاہے تو بھی نماز نہ چھوڑنی چاہیئے۔ مگر یہ چیزیں ماحول سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ماحول اچھا ہو تو بچے بھی نمازی بن جاتے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ مطالبۂ پاکستان کے وقت بچوں کے کھیل بھی جلسے اور جلوس بن گئے تھے کیونکہ اس وقت ماحول ہی ایسا تھا۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک نوجوان طالب علم آیا۔ اور جلدی سے نماز پڑھ کر چل دیا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ تو نے نماز اچھی طرح سے کیوں نہ پڑھی؟ اس کے منہ سے نکلا کہ حضرتؒ میں چھوٹی کتابیں پڑھتا ہوں۔ حضرتؒ کو غصہ آیا اور فرمایا کہ یہ اعمال تو ماں باپ سے ورثہ میں ملتے ہیں۔ ان میں کتابوں کی ضرورت نہیں لیکن یہ جب ہوتا ہے جب ماں باپ بھی ایسے ہی ہوں۔ اگر عیسائی ذہنیت کا ماحول بن جائے تو دل اسی طرف مائل ہونے لگے گا۔

تربیت میں ماحول کا اثر

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ ایک شادی کے سلسلے میں تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ تو خیال ہوا کہ حضرت حاجی (امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ) صاحب کی زیارت بھی کر لوں۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ کو معلوم ہو گیا، کہ یہ فطرتِ سلیمہ رکھتے ہیں۔ تو آپؒ نے پوچھا کہ آپ کسی سے بیعت بھی ہوئے یا نہیں؟

آپ نے کہا کہ نہیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ پھر مجھ سے بیعت ہو جاؤ۔ حضرت گنگوہیؒ نے کہا کہ میں اس شرط پر بیعت ہوں گا کہ آپ مجھے ذکر و شغل کا حکم نہ فرمائیں گے۔ حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے تو بیعت ہونے کو کہا ہے شغل کا تو میں نے کہا ہی نہیں اور وعدہ بھی فرمایا کہ آئندہ بھی نہیں کہوں گا۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے بیعت فرمایا اور یہ فرمایا کہ دو تین دن یہاں ٹھہر جاؤ۔ آپ وہیں تھانہ بھون میں تین دن ٹھہرے جب رات کے وقت اڑھائی تین بجے دیکھا کہ سب لوگ اٹھ کر تہجد ادا کر رہے ہیں۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو شرم آئی انہوں نے بھی اُٹھ کر نمازِ تہجد پڑھی —— پھر جب لوگوں کو ذکر و شغل میں دیکھا، آپ بھی ذکر میں مشغول ہو گئے۔ دوسرے دن پھر یہی حالت ہوئی۔ تیسرے دن خود بخود خوشی سے تہجد پڑھی، اور ذکر و شغل میں مشغول ہو گئے۔ تیسرے دن حضرت کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ حضرت آپ نے تو سب کچھ ہی کرا دیا۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے تھوڑا ہی کہا تھا۔ میں نے وعدہ خلافی نہیں کی۔ اب آپ جا سکتے ہیں، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ اب تو میں نہیں جاتا —— چالیس دن وہاں ٹھہرے اور اس تھوڑے عرصہ کے بعد خلافت لے کر واپس ہوئے۔ بس یہ عبادت پہلے ریا تھی، پھر عادت ہوئی، پھر عبادت ہو گئی اور ساتھ ہی خلافت بھی مل گئی ——

میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ جب میری عمر آٹھ برس کی تھی۔ ایک دفعہ میرا گنگوہ جانا ہوا وہاں ذکر و شغل کا ماحول تو تھا ہی۔ گنگوہ کی مسجد میں بہت سے دھوبی کپڑے دھوتے تھے، وہ جب کپڑے کو مارتے تو الا اللہ کی ضرب بھی ساتھ کہتے۔ یہ ماحول کا اثر تھا ورنہ ان کو پڑھنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔

—— مقولہ مشہور ہے۔ "ہر چہ در کان نمک رفت نمک شد"

بس ماحول کا اثر یہی ہے۔ جو نیک ماحول میں ہو گا، اس کا بھی اثر ضرور ہو گا —— حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا بھی ایک ماحول تھا کہ جو بھی اس میں آتا وہ متاثر ہوئے بغیر

نہ رہتا۔ اور ان کا ماحول بھی بہت قوی تھا۔ حتیٰ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد انہی کا درجہ تھا۔ اُمّت کا اجماع ہے کہ "الصحابۃ کلھم عدول" وہ معصوم تو نہیں تھے لیکن محفوظ تو ضرور تھے۔ اُمّت کا اتفاق ہے کہ کوئی شخص کتنا بڑا غوث اور قطب بن جائے لیکن ادنےٰ صحابی کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے کہ جو ماحول ان کو میسّر آیا وہ کسی کو میسّر نہ آسکا۔ ایسے ماحول سے ابوجہل جیسا بدبخت ہی متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔ اور جبری طور پر تو وہ بھی مؤمن تھا۔ چنانچہ اپنے گھر میں کہتا تھا کہ بات تو ٹھیک ہے لیکن اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیں پھر ان کی غلامی کرنی پڑے گی۔ اسی سے ان کو عار تھی —— ..... بہر حال اگر ایک گھرانہ یہ عہد کرے کہ ہم گناہ چھوڑ دیں گے، تو اُن کے ماحول میں جو داخل ہو گا۔ انہی کی طرح ہو جائے گا۔

قول و فعل میں مُطابقت کا اثر

حضرت مولٰنا عبید اللہ صاحب سندھیؒ ایک سیاسی مفکر تھے۔ روس کے انقلاب میں وہیں تھے۔ فرماتے تھے کہ میں اسٹالن سے ملا، اور اسلامی نظام اور اس کے اصول مع دلائل اس کے سامنے رکھے۔ تو اسٹالن نے کہا کہ یہ بالکل ٹھیک ہے، اور اگر دنیا میں کوئی نظام جاری ہوا تو اسلام ہی جاری ہو کر رہے گا۔ لیکن یہ بتلایئے کہ اس کا کوئی عمل دنیا میں بھی موجود ہے .... اس پر مولٰنا خاموش ہو گئے —— تو آج دنیا قول کو نہیں دیکھتی بلکہ فعل کا مطالبہ کرتی ہے —— امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔ فمن وافق قولہ فعلہ فنجا ومن لم یوافق قولہ فعلہ فقد ھلک —— یعنی جس آدمی کا قول اس کے فعل کے موافق ہوا، نجات پا گیا، اور جس کا قول فعل کے موافق نہ ہوا، وہ ہلاک ہو گیا۔ —— آج اسلامیہ جمہوریہ کا اعلان کیا گیا۔ لیکن دنیا اس قول کو نہیں دیکھتی بلکہ عمل کو دیکھتی ہے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم دنیا کے سامنے ایک عملی نقشہ پیش

یہ شخص بڑے سے بڑا عالم ہو۔ لیکن جب تک وہ اپنے کہے کے مطابق عمل نہ کرے،
وہ اپنے قول کا خود بھی تذبذب رہتا ہے۔

ماحول قوانینِ حکومت سے بھی بڑھ کر ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آنے والوں میں نماز روزہ وغیرہ کا اہتمام تو تھا ہی۔ مگر حضرتؒ کے ہاں یہ بھی قانون تھا کہ کوئی کسی کے لئے اذیت کا موجب نہیں ہوگا۔ چنانچہ تھانہ بھون کی خانقاہ میں ایک دفعہ کسی صاحب کا ایک رومال گر پڑا لیکن کسی نے وہاں سے نہ اٹھایا اور تین دن تک پڑا رہا۔ ماحول کی وجہ سے کسی کو چرانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اسی وجہ سے حجروں کو تالا لگانے کا دستور ہی نہیں تھا۔

حجاز کی حکومت ہے۔ وہاں بادشاہ کا جذبہ یہ ہے کہ اسلامی قانون نافذ ہو۔ اب ایک عورت زیور پہن کر سفر کرتی ہے۔ تو اس کو کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ تلواروں اور بندوقوں سے دلوں میں ڈر پیدا نہیں ہوتا۔ پولیس اور ہتھیاروں کی کمی نہیں۔ لیکن دنیا میں فسق و فجور کی کثرت ہو رہی ہے۔

ہم حج پر گئے تو دیکھا کہ چند بوریاں بھری ہوئی رکھی ہیں۔ ایک شخص نے پولیس میں جا کر خبر دی کہ فلاں جگہ کھجوروں کی بوریاں پڑی ہیں۔ پولیس نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ان میں کھجوریں ہیں؟ معلوم ہوا کہ تُو نے ٹٹول کر دیکھی ہیں؟ اور چرانے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ لیکن موقع نہیں ملا۔ اس شخص کو اس پر بھی سزا ملی۔

ہندوستان میں مختلف میلے ہوتے ہیں۔ مسلمان بھی ہندوؤں کو دیکھ کر میلے کرنے لگے ہیں۔ ان میں ہر طرح سے فسق و فجور اور چوریاں ہوتی ہیں۔ لیکن مکہ مکرمہ میں لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے اور کبھی چوری نہیں ہوتی۔ مکہ والے کبھی چوری نہیں کرتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان سے غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ غلبہ دیانت کا ہے۔ مگر پورے کا

ہاتھ ایک دفعہ کاٹا جائے تو برسوں تک چوری سے نجات ملتی ہے۔ اسلامی حدود رجم اور قطع ید وغیرہ کو وحشیانہ سزا کہنا انہی سے ہو سکتا ہے جن کے نزدیک زنا یا چوری کوئی غیر وحشی فعل ہیں —— ادیانِ سماویہ میں زنا سے بڑا کوئی جرم نہیں تھا۔ ایک عورت کے زنا کرنے سے سارا خاندان بدنام ہو جاتا ہے۔ شہرت پر الگ دھبہ آتا ہے اور نسل کا بھی اختلاف ہوتا ہے۔ تو یہ فعل بھی تو وحشی ہے اگر وحشی فعل پر وحشیانہ سزا ہو تو اس میں کیا جرم ہے؟ طرہ تو یہ ہے کہ آج کل قانون میں اس کو جائز قرار دیا گیا ہے کہ صرف جبراً زنا کرنا ہی جرم ہے۔ فریقین کی رضا ہو جائے تو جرم ہی نہیں۔ بہر حال ان چیزوں کا ماحول کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔

حکومتوں کے قوانین جرائم کے افعال کو تو روک سکتے ہیں لیکن جرائم کی نفرت دل میں نہیں بٹھلا سکتے۔ زانی زنا سے اور چور چوری سے قانون کی وجہ سے رک سکتا ہے لیکن زنا اور چوری کی نفرت اس کے دل میں قوانین سے نہیں بیٹھ سکتی۔ جرائم کی نفرت اور معصیت سے بیزاری اہل اللہ کی صحبت و معیت سے نصیب ہوتی ہے۔

غیبت کے متعلق اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتاً فکرھتموہ —— کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے .... تو غیبت کو مردہ بھائی کے گوشت کھانے کے ساتھ تشبیہہ دی گئی ہے جو کہ نجس ہے۔ لیکن غیبت سے بچے گا کب؟ جب دل میں معاصی سے نفرت ہوگی۔ ورنہ حکومت کا قانون تو یہاں نہیں لاگو ہوگا۔

جھوٹ کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ انسان جب جھوٹ بولتا ہے۔ اس کے منہ میں ایک بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور فرشتہ اس کی وجہ سے اس سے دور ہو جاتا ہے۔ جب وہ جھوٹ ختم کر لیتا ہے تو وہ فرشتہ واپس آ جاتا ہے —— گویا فرشتے کو معصیت سے نفرت ہے۔ اسی طرح انسان میں جب ملکوتی صفات آتی ہیں تو وہ بھی معاصی سے متنفر اور بیزار ہو جاتا ہے تو یہاں حکومت کی طرف سے احتساب نہیں ہے۔ جس کی بنا پر جھوٹ سے بچے

لیکن دل میں معاصی سے نفرت آچکی ہے اس لئے جھوٹ سے بھی بچے گا اور معاصی سے بھی بچے گا۔

مشرکین کے بارے میں اللہ تعالےٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں۔ انما المشرکون نجسٌ۔ یعنی مشرکین (اعتقادی طور پر) نجس اور ناپاک ہیں —— معلوم ہوا کہ شرک اور ایسے ہی دوسرے معاصی معنوی نجاستیں ہیں۔ آدمی جس طرح ظاہری نجاست کی آلودگی سے بچتا ہے اور دور بھاگتا ہے۔ اسی طرح جن کا باطنی احساس زندہ ہے وہ معنوی نجاستوں سے بچتے ہیں۔ اور اپنے باطنی احساس سے ان نجاستوں کو پہچانتے بھی ہیں ——

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص آپ کے پاس آرہا تھا کہ راستے میں ایک عورت پر نظر پڑگئی۔ تو یہ نظر تو گناہ نہیں تھی۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ النظرۃ الاولیٰ لک والثانیۃ علیک —— یعنی پہلی نظر میں کوئی گناہ نہیں اور دوسری میں گناہ ہے —— لیکن اس شخص نے قصداً دوسری دفعہ بھی نظر اٹھا کر دیکھا۔ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ ما للرجال یاتوننا وفی قلوبھم اثر الزنا —— یعنی لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس آتے ہیں اور ان کے دلوں میں زنا کا اثر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے قلب اور روح کا حاسہ تیز تھا جس سے یہ گناہ نظر آگیا تھا۔ اور وہ تیز کیوں تھا؟ اس لئے کہ آپکو صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میسر تھی۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ گناہ نظر آجاتے تھے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جب مسجد میں آتے اور لوگ وضو کرتے ہوتے تو آپ نظر نیچی کر لیتے —— لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب انسان وضو کرتا ہے تو اس کے اعضاء کے تمام گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ جب کلی کرتا ہے تو منہ کے گناہ جھڑتے ہیں۔ جب سر کا مسح کرتا ہے تو سر کے گناہ جھڑتے ہیں اور جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں کے گناہ جھڑتے ہیں —— تو فرمایا کہ جب گناہ جھڑتے ہیں، مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص فلاں گناہ کا مرتکب ہوا ہے اور اس سے مجھے بدظنی پیدا ہوتی ہے تو میں نظریں نیچی کر لیتا ہوں تاکہ گناہ کا علم نہ ہو اور بدظنی پیدا نہ ہو —— جن کی روحانیت

قوی ہوتی ہے ان کو معاصی نظر آجاتے ہیں۔

محاسبۂ آخرت کی دنیا میں صورتِ مثالی

اور قیامت میں تو اعمال بھی سب کو نظر آنے لگیں گے۔ حدیث میں ہے کہ قیامت میں انسان کے سامنے دو چیزیں ہوں گی۔ ایک جہنم اور دوسرے اعمال کی صورتِ مثالی۔ اعمال کی صورتِ مثالی کی مثال یہ ہے کہ دیوانِ غالب اب چھپا ہے۔ تو غالب نے جس شعر میں جس خیال کا اظہار کیا ہے۔ اس شعر کے نیچے اس کی تصویر کھینچ کر اس خیال کو ظاہر کیا گیا ہے ——— حدیث میں علم کی صورتِ مثالی دودھ بتائی گئی ہے اور نماز کی صورتِ مثالی "حسین عورت" اور سخاوت کی صورتِ مثالی ایک عظیم الشان درخت بتائی گئی ہے۔ جس کے سایہ میں سخی آدمی بیٹھے گا، جیسا کہ اس کی سخاوت سے دنیا میں غریبوں نے فائدہ اٹھایا۔ یہ تو اعمالِ صالحہ کی صورِ مثالیہ ہیں۔ اسی طرح اعمال سیئہ کے بارے میں بھی حدیث میں ہے کہ جو شخص مالدار ہو، اور وہ زکوٰۃ ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اس کا وہ خزانہ سانپ کی شکل میں متشکل ہوگا۔ اور اس مال دار کے گلے کا طوق بن جائے گا جو اس کو کاٹے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں، کیونکہ مال کی ظاہری صورت بہت عمدہ ہوتی ہے اور اس کا تصور بھی دل کو خوش کرتا ہے۔ چنانچہ ایک آدمی کے پاس اگر مال ہو وہ اسے خرچ بھی نہ کرتا ہو تو چوری ہو جانے پر اس کو بہت رنج ہوتا ہے۔ اور اگر ناجائز طریق سے حاصل کیا جائے مثلاً چوری کی جائے تو اس میں ایک قسم کا زہر بھی ہوتا ہے کیونکہ اس پر سزا ہوتی ہے۔ اس لئے اس عملِ بد (یعنی عدم ادائے زکوٰۃ) کو سانپ کی شکل دی گئی۔ حاصل یہ ہے کہ ہر عمل کو اس کے اوصاف کے مطابق شکل دی جائے گی... اور یہی صفاتِ مذمومہ اگر خود آدمی میں راسخ ہو جائیں تو آخرت تو آخرت دنیا میں بھی آدمی پر اس کا پرتو پڑتا ہے۔ دیکھنے میں وہ صحیح شکل وصورت کے لحاظ سے آدمی ہی ہے

لباس میں ہے - مگر حقیقتِ آدمیت اس میں نہیں ہوتی - جن کو اللہ تعالیٰ نے بینائی دی ہے - وہ اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں -

شیخ تقی الدین ابن دقیق العید بہت بڑے عارف باللہ، صاحب کشف و کرامۃ تھے - جب بغداد کی مسجد میں داخل ہوتے تو منہ پر نقاب ڈال لیتے - لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی - آپ نے فرمایا کہ جب میں مسجد میں جاتا ہوں تو کوئی کتا نظر آتا ہے اور کوئی خنزیر نظر آتا ہے تو میں منہ پر نقاب ڈال لیتا ہوں تاکہ مسلمانوں سے بدظنی پیدا نہ ہو ——

یہ ایک الگ عالم ہے جو اہل اللہ پر مخفی نہیں - وہ خوب واقف ہیں ....

اقبالؒ کہتے ہیں ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں مقاماتِ آہ و فغاں ابھی اور بھی ہیں

اس جہان کی ایجادات نے اس صورتِ مثالی کو سمجھنا تو اب اور بھی آسان کر دیا ہے - چنانچہ سی - آئی - ڈی (C.I.D) کے محکمہ کے پاس ایسے آلات موجود ہیں جن کے ذریعے سے وہ ہر خفیہ بات کو معلوم کر لیتے ہیں، اور تہہ تک پہنچ جاتے ہیں مجرم کو انکار کی گنجائش نہیں رہتی - امریکہ میں فیصلے ایسے ہی ہوتے ہیں ——

حق تعالیٰ بھی اس وقت تک کسی کو سزا نہیں دیں گے - جب تک پہلے اس کو تمام زندگی کا ریکارڈ نہ دے دیں گے - اور پھر تمام اعمال کی صورتِ مثالیہ صحف کی صورت میں اس کے سامنے پیش کر دی جائے گی - (جیسے کہ آج کل ٹی - وی میں اعمال بعینہٖ موجود و متشکل باقی رہتے ہیں) -

حدیث شریف میں ہے کہ زمین کے جس ٹکڑے پر کوئی نیک عمل کیا ہو گا - نماز پڑھی ہو گی تو وہ ٹکڑا گواہی دے گا - اور جس ٹکڑے پر کوئی گناہ کیا ہو گا، تو وہ ٹکڑا بھی گواہی دے گا کہ اس نے فلاں گناہ میرے اوپر کیا تھا - اسی پر بس نہیں بلکہ ملائکہ علیہم السلام بھی گواہی دیں گے - اس سے بڑھ کر تمام اعضاء میں قوتِ گویائی دے دی جائے گی - اور زبان سے یہ قوت سلب کر لی جائے - تو جس عضو سے جو کام کیا ہو گا، وہ

خود گواہی دے گا کہ اس نے فلاں کام میرے اوپر کیا ہے۔ اتنی حجتوں کے بعد اس کو انکار کی ہمت نہ ہوگی، اور خود زبانِ حال سے اقرار کرے گا کہ میں اس سزا کا مستحق ہوں۔ پھر خواہ اللہ تعالےٰ معاف ہی فرمادیں یا سزا دیں۔ لیکن معافی اقرارِ گناہ کے بعد ہوگی۔

ترتیبِ اصلاح

دلوں کو متقی بنانا دین کا کام ہے۔ انسان کا نہیں۔ اور یہ ماحول کے بہتر ہونے سے ہوتا ہے اور اس کی ابتدار اپنے گھر سے کرنی چاہیئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے یہ فرمایا گیا۔ قوا انفسکم واھلیکم نارًا ــــ یعنی اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ ــــ جب گھر نیکی کا نمونہ بن گیا تو پھر حکم فرمایا۔ وانذر عشیرتک الاقربین ــــ تو آپ نے اپنے رشتہ داروں کو بلایا، اور ایمان لانے کی تبلیغ کی۔ جن میں کچھ سعادت تھی، وہ متوجہ ہوئے اور ایمان قبول کرلیا اس کے بعد فرمایا لتنذر ام القریٰ ومن حولھا۔ وحی آپ کی طرف اتاری گئی تاکہ آپ مکہ والوں کو اور اردگرد والوں کو ڈرائیں ــــ پھر فرمایا۔ لیکون للعلمین نذیرًا ــــ تاکہ آپ تمام جہان والوں کے لئے ڈرانے والے ہوں ــــ چنانچہ پھر آپ نے تمام بادشاہوں کی طرف خطوط لکھے، اور ایمان کی تبلیغ کی بس اصلاح کا یہی طریقہ ہے کہ اصلاح کی ابتدار پہلے اپنے گھر سے کرنی چاہیئے۔ نیکی بدی میں انسان ایک بھیڑ چال ہے۔ بارہا کا میرا مشاہدہ ہے کہ اگر مجلس میں ایک نے مصافحہ کیا تو تمام ہی شروع ہوجاتے ہیں۔ ایسے ہی اگر ایک ابتدار کرے تو دوسروں سے بھی تمام بری عادتیں چھوٹ جاتی ہیں ــ اور ترتیب بھی یہ ہونی چاہیئے کہ اولاً گناہوں کو چھوڑنا چاہیئے پھر نیکیوں کو اختیار کرنا چاہیئے ــ اور گناہوں میں بھی پہلے کبائر کو پھر صغائر کو چھوڑنا چاہیئے ــــ

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا۔ اور اُس نے عرض کیا کہ حضورؐ میں ایمان تو لاتا ہوں مگر جتنے بُرے کام کرتا ہوں ان سب کو چھوڑ نہیں سکتا۔ حضورؐ نے فرمایا تم صرف جھوٹ کو چھوڑ دینے کا وعدہ کرتے ہو؟ اس نے کہا... جی ہاں — اور خوشی خوشی یہ وعدہ کرکے چلا گیا۔ مگر پھر جب گناہ کا خیال آتا تو محاسبہ کا خیال پہلے آتا۔ چنانچہ جب شراب پینے چلا تو خیال ہوا کہ یہ فعل چھپے گا نہیں...... یا جھوٹ بولوں گا۔ یا پھر حد لگے گی اور رسوائی ہوگی۔ جب چوری کا جذبہ پیدا ہوا تو بھی خیال ہوا کہ چوری چھپے گی نہیں، خواہ مخواہ رسوائی ہوگی۔ تو چوری سے بھی رُک گیا۔ آخر میں جب زنا کا جذبہ اٹھا تو بھی خیال ہوا کہ رسوائی ہوگی۔ کیونکہ جھوٹ نہ بولنے کا سچا عہد کرکے ایمان قبول کیا تھا۔ تو اس عہد سے تمام ہی گناہ از خود چھوٹ گئے۔ چنانچہ یہ تینوں گناہ اس سے چھُوٹ گئے۔ صبح کو حاضر ہوا تو عرض کی۔ یا رسول اللہ آپ نے چھڑائی تو ایک بُرائی اور چھُوٹ گئیں ساری برائیاں۔ طبیبِ کامل مختصر سا نسخہ ہی تجویز کیا کرتا ہے۔ جس سے تمام امراض کا علاج ہو جاتا ہے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک دیہاتی آیا اور بعیت ہو گیا۔ کہنے لگا کہ مولوی جی! آپ نے پوچھا ہی نہیں میں تو افیون بھی کھاتا ہوں۔ تو آپ نے حرام کہہ کر افیون نہیں چھڑائی بلکہ فرمایا کہ جتنی افیون کھاتے ہو، بیس روز تک اس سے نصف کھایا کرو۔ پھر بیس دن اس سے نصف کھایا کرو۔ کرتے کرتے اِن شاء اللہ تعالےٰ چھوٹ جائے گی — — لیکن وہ آدمی پکا تھا۔ جب سنا کہ یہ حرام ہے تو ایک دم ہی چھوڑ دی۔ خانقاہ سے چلا گیا۔ اور بیمار ہو گیا، خوب دست جاری ہوئے چھ ماہ تک بیمار رہا۔ آخر صحت ہوئی تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور پانچ روپے بھی آپؒ کی خدمت میں پیش کئے۔ حضرتؒ چونکہ غریب آدمی سے کچھ لیتے نہیں تھے۔ اس لئے واپس کر دیئے۔ اس نے کہا کہ حضرتؒ میں چھ ماہ میں پانچ روپے کی افیون کھاتا تھا تو میرا نفس خُوش ہوا کہ اچھا ہوا پانچ روپے بچ گئے۔ میں نے کہا یہ پانچ روپے اب نفس کے لیے نہیں ہیں،

اب یہ افیون چھڑوانے والے کو ہی دیتے ہیں۔ پھر آپؒ نے اس میں سے کچھ تھوڑا سے لے لیا۔

اصلاح کا عزم

آج ساری مصیبت ہی یہ ہے کہ اصلاح کا عزم ہی نہیں ہوتا۔ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ ماحول بہتر نہیں۔ ماحول کوئی ایسی بارش تو نہیں جو آسمان سے برسے۔ آخر ماحول کا بہتر بنانا بھی تو عزم ہی سے ہوتا ہے ؎

تو ہی اگر نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں

ہر یکے ناصح برائے دیگراں۔ شریعت نے یہ تعلیم دی ہے کہ اپنے نفس سے ہمیشہ بدظنی رہے اور اپنے سوا ہر ایک سے حُسنِ ظن ہو۔ اور دنیا نے اس کے برعکس کیا ہوا ہے ــــ دہلی کے آخری تاجدار بادشاہ ظفرؔ ان سے سلطنت چھن گئی تھی ــــ آخر عمر میں صوفی ہو گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر ــــ رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی جب اپنی برائیوں پہ نظر ــــ تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

تو میں نے عرض کیا کہ دین کا اثر اس وجہ سے کم نہیں کہ علم نہیں، بلکہ معاشرہ خراب ہے۔ اس لئے پہلے ماحول اور معاشرہ کی اصلاح کرنی چاہیئے۔

آج خیر خواہی سے اسلامی نظام کا مطالبہ ہو رہا ہے، اور حکومت بھی خیر خواہی ہی سے اس کو نافذ کرنا چاہتی ہو گی۔ لیکن تمام کام قانون سے تو نہیں ہوتے۔ زنا کا اعلان حکومت تو نہیں کر رہی ــ یہ جو زنا ہو رہے ہیں، یہ ماحول کی خرابی سے ہیں۔ اسی طرح چوری دیکھ لیجئے آج بھی چوری زنا قانوناً جرم ہے۔ گویا اسلامی نظام اگر مکمل طور پر نافذ نہیں، بعض اسلامی قوانین تو آج بھی نافذ ہیں۔ اس کے باوجود زنا چوری آج بھی ہو رہے ہیں۔ اگر کل اسلامی نظام نافذ ہو گیا اور معاشرت ایسی ہی رہی تو بھی زنا چوری

ہوتے رہیں گے۔ اس لئے تمام کام حکومت پر ہی نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ کم ازکم جتنے اجزاء اسلامی قانون کے نافذ ہیں ان پر تو عمل کرنا چاہیئے۔ ان پر بھی عمل نہیں۔

میں نے یہ آیت پڑھی تھی جس میں صرف تقویٰ ہی نہیں بلکہ صحبت صالح اختیار کرنے کا بھی حکم ہے۔ اس لئے اہل علم اور درویش صوفیاء کی صحبت اختیار کرنی چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی صحبت کی مثال عطار کی دکان سے دی ہے۔ کہ اگر انسان جائے تو خوشبو لے کر آتا ہے اگرچہ عطر نہ خریدے۔ اور بری صحبت کی مثال لوہار کی دکان سے دی ہے، اگر آدمی جائے اور کچھ نہیں تو دھواں اس کو ضرور پہنچے گا۔ اگرچہ کپڑے نہ جلیں۔ بہرحال نیک صحبت اور صالحین کی معیت اختیار کرنے کی ضرورت ہے ——— بقدرِ ضرورت آیت کی تشریح ہو گئی۔ وقت بھی کافی ہو گیا۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حسنِ خاتمہ نصیب فرماوے، اور اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرماوے۔ آمین!

اللھم ربنا تقبل منا۔ انک انت السمیع العلیم۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

راہِ نجات

چار اصول نجات کے ارشاد فرمائے گئے۔ علم، عمل، اخلاص اور اپنی آخرت کا فکر۔ یہ چار بنیادیں ہیں، جس سے آدمی کی آدمیت بنتی ہے۔ انسان کی انسانیت ترقی کرتی ہے۔ اگر انسان میں علم نہ ہو، تو یہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ جب ایسے نجات نہیں مل سکتی۔ اگر علم آگیا۔ روشنی آگئی مگر عمل نہیں ہے، تو کورا علم کسی کو نجات نہیں دلائے گا۔ بلکہ وبالِ جان بن جائے گا۔ اگر علم کے ساتھ عمل بھی ہو، مگر عمل کے ساتھ نفاق ہے، اخلاص نہیں ہے، وہ عمل بھی بیکار ہے۔ نجات نہیں دلائے گا۔ اگر علم بھی ہے، عمل بھی ہے، اور اخلاص بھی ہے مگر انسان میں ناز اور شیخی ہے کہ میں سب سے بڑا عبادت کرنے والا ہوں، آخرت کا خطرہ نہ ہو، وہ اخلاص بیکار ہے، وہ ختم ہو گیا۔ چار چیزیں جمع ہوں گی، تب انسان کی انسانیت بنے گی۔

از: حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

ترتیب

الحمدللہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔ من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ۔ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ۔ ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہٗ۔ ارسلہ اللہ الیٰ کافۃ للناس بشیرًا ونذیرًا۔ وداعیًا الیہ باذنہٖ وسراجًا منیرًا۔ امابعد: ــــ فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الناس کلھم ھالکون الا العالمون۔ والعالمون کلھم ھالکون الا العاملون۔ والعاملون کلھم ھالکون الا المخلصون۔ والمخلصون علی خطر عظیم ــ (او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام)

صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

تمہید

میرے محترم بھائیو، اور بہنو!

یہ ایک حدیث ہے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی۔ جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہے۔ اس میں سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسی چند

بنیادی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔

کہ انسان کی نجات دنیا میں بھی آخرت میں بھی، انہی باتوں میں منحصر ہے۔ انہی چند اصولوں کی اس وقت مجھے تشریح کرنی ہے اور میں کوشش کروں گا کہ مختصر وقت میں ان کی کچھ ضروری شرح آپ حضرات کے سامنے عرض کروں۔

آدمی کی نجات اس کے اندرونی جوہر سے ہے

پہلے اتنا اُصول سمجھ لیجئے کہ انسان کو جو کچھ بھی نفع پہنچتا ہے، وہ جبھی پہنچتا ہے جب کوئی خوبی اور بھلائی اُس کے نفس میں آجائے۔ نفس کے اندر پیوست ہو جائے۔ باہر کتنی ہی خوبیاں پھیلی ہوئی ہوں، لیکن وہ انہیں اپنے اندر نہ لے، اس کے لئے نفع کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی ——— ایک باغ ہے اس میں قسم قسم کے پھول مہک رہے ہیں، اور خوشبوؤں سے فضا بھری ہوئی ہے، لیکن آدمی ناک بند کر کے بیٹھ جائے اور کوئی خوشبو اندر نہ جانے دے، اس کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا ——— دُنیا میں خوشبوئیں بھری ہوئی ہیں، بھری رہیں، اسے نفع جب پہنچے گا جب خوشبو اندر پہنچے۔ اور دماغ اس سے مستفیض ہو۔ اگر دنیا کے اندر ہزاروں خُوب صُورت اور خوش رُو نوجوان پھر رہے ہوں، بہتر سے بہتر حُسن وجمال کا نقشہ سامنے ہو، مگر ایک آدمی آنکھ بند کئے بیٹھا ہے، اسے کچھ پتہ نہیں کہ کون خوب صُورت ہے کون بدصُورت ہے۔ تو اس کا دل نہ عشق سے آشنا ہوگا، نہ محبت سے آشنا ہوگا، نہ اسے کوئی نفع پہنچ سکے گا ——— دُنیا کی فضا میں ہزاروں نغمے گونج رہے ہوں، بہتر سے بہتر آوازیں پھیلی ہوئی ہوں، لیکن اس کے کان میں سننے کی قوت نہیں ہے، یا اس نے کانوں میں روئی ٹھونس لی ہے، کوئی نغمہ اس کے کان میں نہیں پہنچتا، اسے اس سے کوئی نفع نہیں ہوگا ——— کتابوں میں ہزاروں مسائل لکھے ہوئے ہوں، علم پھیلا ہوا ہو لیکن اس کے دل کا دروازہ بند ہو، اندر علم نہ پہنچے، اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دنیا میں ایمان

بھرا ہوا ہو، لاکھوں مومن موجود ہوں، لاکھوں اولیاء موجود ہوں، اور اگر نبوت کا زمانہ ہو، تو نبی بھی موجود ہوں، مگر وہ اپنے دل کے دروازے بند کر دے، نہ ایمان کو اندر داخل ہونے دے، نہ علم و معرفت کو، اسے انبیاء و اولیاء کے وجود سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا

اتنی بات آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ آدمی کی نجات اور اس کا نفع، اس کے اندرونی جوہر سے ہے۔ باہر کی چیز کو جب تک اندر نہ داخل کرے، اسے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا نہ اس کے لئے کوئی عزت کا ساماں ہو سکتا ہے۔

اصل کمال وہی ہے جو انسان کی ذات میں ہو

آپ نے نام سنا ہو گا حکیم سقراط کا۔ یہ یونان کا ایک بڑا حکیم گزرا ہے۔ فنِ طب کا یہ موجد ہے۔ اس فن کو اس نے مرتب کیا ہے۔ غرض بہت بڑا طبیب، حکیم، فلسفی اور عالم ہے۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ رات اور دن جنگلوں میں، پہاڑوں میں اور باغات میں جڑی بوٹیوں کا امتحان کرنے کے لئے مارا مارا پھرتا تھا۔ گل بنفشہ کی کیا خاصیت ہے، ملٹھی کی کیا خاصیت ہے، فلاں بوٹی کیا نفع پہنچائی گی، کسی چیز کو کھا کر دیکھ رہا ہے، اور کسی کو سونگھ کر دیکھ رہا ہے —— غرض محقق تھا۔ دن بھر اسی میں گزارتا تھا ——

یہ ایک دفعہ دن بھر کا تھکا ماندا شہر میں آیا۔ شہر میں آ کر کسی دکان پر بیٹھا، تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ بادشاہِ وقت کی سواری نکل رہی تھی۔ جلوس آ رہا تھا۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار تھا۔ سامنے فوجیں، سپاہی، نقیب اور چوب دار گزر رہے تھے۔ ہٹو اور بچو کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ مگر یہ بے چارا اتنا سویا ہوا تھا، خدا جانے کتنے دنوں کا جاگا ہوا ہو گا، اس کی آنکھ نہ کھلی یہاں تک کہ بادشاہ کی سواری قریب آ گئی۔ تو بادشاہ کو بڑا غصہ آیا، کہ یہ بڑا بدتہذیب آدمی ہے، میں اس ملک کا بادشاہ ہوں، میری سواری آ رہی ہے، اور یہ پیر پھیلائے ہوئے لیٹا ہوا ہے،

اور سو رہا ہے، کوئی ادب اس کے اندر نہیں ہے۔ بادشاہ نے غصّے میں اپنے ہاتھی یا گھوڑے سے اتر کر اس کے ایک ٹھوکر ماری، اور کہا او بے ادب! جانتا نہیں ہے کہ میں کون ہوں؟ یہ بے چارہ آنکھیں مل کر اُٹھ بیٹھا، اور آنکھیں ملنے لگا۔ جیسے سویا ہوا آدمی جاگنے کے وقت آنکھیں ملا کرتا ہے۔ بادشاہ نے پھر ڈانٹ کر کہا ارے نامعقول! تو جانتا نہیں کہ میں کون ہوں؟ اس نے بڑے اطمینان سے آنکھیں ملتے ہوئے کہا کہ جی ہاں! ابھی تو میں جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ اسی لیے آنکھیں مَل رہا ہوں۔ اور اب تک میں اتنا جان چکا ہوں کہ آپ شاید جنگل کے درندے معلوم ہوتے ہیں۔ اس واسطے کہ درندوں کی عادت ہے کہ زمین پر پیر مارتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ ٹھوکریں مارتے ہیں۔ چونکہ آپ نے ٹھوکر ماری ہے۔ میں سمجھا کہ کوئی بھیڑیا یا شیر آگیا ہوگا، کوئی جنگل کا درندہ ہے ——

بادشاہ کو اور زیادہ غصّہ آیا کہ اب تک تو یہ ٹانگیں پھیلائے ہوئے لیٹا ہوا تھا، اب اس کی زبان بھی میرے سامنے پھیل گئی ہے۔ ایسی بدتہذیبی کے کلمات ——!

بادشاہ نے ڈانٹ کر کہا، ارے احمق، جاہل! تو نہیں جانتا کہ میں بادشاہِ وقت ہوں۔ اتنے قلعے میرے قبضے میں ہیں۔ اتنے خزانے میرے قبضے میں ہیں۔ تاجِ شاہی میرے سر پر ہے۔ قبارِ شاہی میرے کندھے پر ہے —— اتنی فوجیں کھڑی ہوئی ہیں —— اتنے ملک میرے تحت میں ہیں۔ اور تو میرے ساتھ یہ گستاخی کر رہا ہے ——؟

اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ آپ نے اپنی بڑائی بیان کرنے کے لئے تاجِ شاہی کو پیش کیا، قبا کو پیش کیا، قلعوں کو پیش کیا، پیسوں اور روپوں کو پیش کیا ملکوں کو پیش کیا۔ ان میں سے ایک چیز بھی تو آپ کے اندر کی نہیں ہے۔ یہ تو باہر باہر کی چیزیں ہیں۔ اس میں تیرا کیا کمال ہوا۔ اگر چاروں طرف سونا پھیلا ہوا ہے، اور تیرے دل میں جہالت کی گندگی بھری ہوئی ہے، اس میں تیرا کیا کمال نکلا ——؟ تو نے بہترین لباس پہن رکھا ہے اور دلِ جہالت و بداخلاقی سے بھرا ہوا ہے۔ تو لباس سے

تجھے کیا فائدہ پہنچا؟ یہ تو باہر کی چیز ہے ــــ تو نے جتنی چیزیں پیش کیں، قلعہ یا فوج، ان سے تو نے اپنا فخر پیش کیا۔ یہ سب چیزیں تیرے باہر باہر کی ہیں۔ اپنے اندر کی بات بتلا، کہ تیرے اندر کیا کمال ہے؟ جس کی بنا پر تو دعویٰ کرتا ہے ــــ اگر تیری عزت پیسے سے ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے اگر کوئی پیسہ چھین کرلے جائے تو تو بے عزت ہو گیا، عزت ختم ہو گئی۔ تیری عزت اگر تاج سے ہے، تو کسی نے تاج اتار لیا، یا تو رات کو میز پر رکھ کر سویا، تو تو بے عزت ہو گیا۔ اس لئے کہ تاج سر پر نہیں رہا۔ لباس اتار دیا تو بے عزت ہو گیا۔ اس لئے کہ عزت تو کھونٹی پر ٹنگ گئی۔ تیری عزت اگر ان چیزوں پر ہے، تو یہ سب چیزیں تیرے سے باہر باہر کی ہیں۔ تیرے اندر کا جوہر کون سا ہے؟ اور کہا کہ اگر تجھے فخر کا یا شیخی کا دعوٰے ہے تو یہ تاج بھی اتار، یہ لباس بھی اتار، یہ قلعہ اور فوج بھی چھوڑ، اور ایک لنگی باندھ کر دریا میں میرے ساتھ کود پڑ، اور وہاں اپنے کمالات دکھلا، کہ تیری ذات میں کون سا جوہر ہے، تب تو میں سمجھوں گا کہ تو باکمال ہے ــــ تو نے کمال میں باہر کی چیزیں پیش کر دیں۔ ان میں ایک چیز بھی تیرے اندر کی نہیں۔ اس میں تیرا کوئی کمال نہیں۔ اب بادشاہ بے چارہ شرمندہ، کیا جواب دے اس کا، بادشاہ چپ ہو گیا ــــ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گویا سقراط نے یہ بتلایا کہ انسان کا کمال اندر کے جوہر سے حاصل ہوتا ہے۔ باہر کے جوہر سے اس کا کمال نہیں۔ سونا اگر اچھا ہے، اس سے آپ کی اچھائی تو نہیں ثابت ہو گی۔ کپڑا اگر بہت بے نظیر ہے، کپڑے کی خوبی ثابت ہوئی، آپ کی خوبی تو اس سے ثابت نہیں ہوئی۔ محل اور بلڈنگ اگر بہت اعلیٰ ہے، تو وہ خوب اور اچھی نکلی، لیکن آپ کی خوبی اس سے ثابت نہیں ہوتی۔ خوبی وہ ہے جو انسان کے نفس کے اندر پیوست ہو۔ ایسا کمال ہو کہ اگر آپ زمین کے اوپر رہیں تو بھی باکمال۔ زمین کے نیچے دفن کر دیا جائے، تب بھی باکمال، لباس پہن لیں، جب بھی باکمال۔ لباس اتار دیں، جب بھی باکمال۔ کمال اپنے اندر ہونا چاہیئے۔ باہر نہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ یہ تو ایسا ہو جائے گا جیسے فن نحو کا امام سیبویہ تھا۔ عربی گرامر کا بہت بڑا عالم گزرا ہے، بڑے اونچے درجے کا امام سمجھا گیا ہے۔ جب یہ تعلیم پا تا تھا

تو استاذ جو تقریریں کرتے تھے، یہ نوٹ کرتا رہتا تھا۔ اور اتنی بڑی ایک کاپی اُس نے بنائی کہ کئی سیر کے کاغذات تھے، جس میں تمام یادداشتیں لکھی ہوئی تھیں ——— تو طالب علمی کے زمانے میں وہ کاپیاں اور نوٹ بکیں اس کے پاس لپٹے ہوئے رکھے تھے، اتفاق سے روٹی جو لینے گیا، تو اس دستر خوان میں جس میں روٹیاں تھیں، اسی میں اس نے وہ کاغذ بھی لپیٹ دیئے۔ کتا جو آیا، روٹی لے کر چلا، تو وہ کاغذات بھی پوٹلی میں ساتھ لے گیا۔ اب یہ چیختا ہوا اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے، اور کتا آگے آگے جا رہا ہے ——— لوگوں نے کہا سیبویہ! کہاں جا رہا ہے؟ کہاں بھاگ رہا ہے؟ اس نے کہا، کتا میرا علم لے کر چلا گیا، اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔ لوگوں نے کہا، کمبخت! وہ علم ہی کیا ہوا جسے کُتا لے کر بھاگ جائے ——— اس نے کہا، واللہ باللہ میری تو عمر بھر کی کمائی اُس میں تھی، جو کُتا لے کر جا رہا ہے ———

تو جیسے سیبویہ نے سارا علم کتے کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کے اندر کوئی چیز نہیں رہی تھی، اسی طرح سے اگر آدمی کے اندر کوئی کمال نہ ہو، تو اُسے کتا بھی لے کر بھاگ جائے گا۔ شیر بھی لے کر بھاگ جائے گا، بھیڑیا بھی لے جائے گا، دشمن بھی لے جائے گا۔ وہ کمال ہی کیا ہوا کہ دوسرا لُوٹ کر لے جائے، اور آدمی کورا رہ جائے۔ کمال وہ ہے کہ انسان کے نفس میں ہو۔ ہزار آفتیں آئیں مگر وہ باکمال ہے۔ ہزار مصیبتیں آئیں، دشمن چڑھ آئیں، مگر وہ باکمال بنا رہے کمال اس کے نفس میں پیوست اور چھپا ہوا ہو، وہی اصل کمال ہے۔

دِل ——— ایک عجیب کیمیا ہے

آپ نے مولانا رومیؒ کا نام تو سُنا ہوگا، بہت بڑے عارف کامل ہیں، مثنوی لکھی ہے، جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ:-

ع ہست قرآں در زبانِ پہلوی

گویا فارسی زبان میں اللہ نے ان سے قرآن لکھوا دیا ——— بہرحال بہت بڑے تصوف کے امام گزرے ہیں۔ انہوں نے ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ اس واقعہ سے عبرت دلانی مقصود ہے۔ اس کو آدمی اگر غور سے سنے، اور تدبر کرے۔ اس سے بڑی عبرت اور نصیحت حاصل ہوگی ـــ مولانا نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں میں باہم لڑائی ہوگئی۔ رومیوں کا دعوےٰ یہ تھا کہ ہم بڑے صناع، دستکار ہیں اور بہترین صنعتیں بناتے ہیں، ہمارے ہاتھ میں حکمت ہے۔ بلڈنگیں بھی اعلےٰ سے اعلےٰ بناتے ہیں۔ کپڑا بھی بہتر سے بہتر بناتے ہیں، برتن وغیرہ، غرض ہر سامان بہتر بناتے ہیں ——— چینیوں نے کہا ہم سب سے زیادہ صناع ہیں۔ ہم سے بڑا دستکار اور ماہر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ دونوں میں لڑائی ہوئی، جھڑپ شروع ہوئی۔ دونوں میں سے ہر ایک کہتا ہے کہ ہم زیادہ ماہر ہیں۔ اتنی جھڑپ ہوئی کہ آخر مقدمہ بادشاہِ وقت کے پاس پہنچا۔ بادشاہ نے کہا کہ جھگڑا کیا ہے؟

رومیوں نے کہا کہ ہم بڑے صناع، دستکار اور ماہر ہیں، چینیوں نے کہا کہ ہم زیادہ ماہر ہیں ———

بادشاہ نے کہا دعوےٰ سے کام نہیں چلتا۔ اپنی اپنی صنعت بنا کر دکھلاؤ۔ ہم مقابلہ کر کے سمجھیں گے کہ کون زیادہ تم میں ماہر ہے۔ بادشاہ نے ایک بہت بڑا ہال بنوایا اور بیچ میں پارٹیشن کر کے ایک دیوار کھڑی کر دی، اور رومیوں سے کہا کہ آدھے مکان میں تو تم اپنی صنعت دکھلاؤ، گویا نقاشی کرو، اور چینیوں سے کہا کہ آدھے مکان میں تم اپنا کام دکھلاؤ، اس کے بعد میں ہم ایک دوسرے کے کام کا مقابلہ کر کے دیکھیں گے، جس کا کام اعلےٰ ہوگا، اُسے ڈگری دیں گے، اُسے پاس کریں گے۔

چنانچہ مکان میں ایک طرف رومیوں نے اپنی دستکاری دکھلانی شروع کی، اور ایک طرف چینیوں نے ———

چینیوں نے تو یہ کیا کہ دیوار کے اوپر کے پلاستر کر کے رنگ برنگ پھول، بوٹے اور بیلیں ایسی بنائیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ باغ و بہار ہے، ساری دنیا کے چمن اور

گلشن اسی دیوار کے اندر آگئے ہیں۔

رومیوں نے کیا کیا ؟ ایک پھول نہیں بنایا، ایک بوٹا نہیں بنایا، دیوار پر پلاستر کر کے اس کو صیقل کرنا شروع کیا۔ اور اسے مانجھنا شروع کیا۔ مانجھتے مانجھتے اتنا چمکا دیا کہ دیوار بالکل آئینہ بن گئی۔

جب دونوں اپنے کام سے فارغ ہوئے، تو بادشاہ کو اطلاع کی کہ ہم نے اپنی اپنی دستکاری بنالی ہے، اور محنت کر کے اپنے کاموں کا نمونہ تیار کیا ہے۔ آپ دونوں کو دیکھ کر فیصلہ دیجیے کہ کس کی صنعت زیادہ اعلیٰ ہے۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ دیوار بیچ میں سے ہٹادی جائے، جو پارٹیشن کے طور پر درمیان میں قائم کی تھی۔ دیوار کا ہٹانا تھا کہ چینیوں نے جتنے پھول بوٹے بنائے تھے وہ سب کے سب اُدھر نظر آنے لگے، کیوں کہ دیواریں تو صیقل ہو چکی تھیں —— اب بادشاہ حیران ہے کہ جو پھول پتے اُدھر بنے ہوئے ہیں، وہ ادھر بھی نظر آرہے ہیں، جو رنگ اِدھر لگے ہوئے تھے، وہ اُدھر بھی ہیں۔ بلکہ ادھر یہ زیادہ دیکھنے میں آیا کہ اِدھر کے پھول پتوں میں چمک بھی ہے۔ یہاں چونکہ دیواروں میں چمک تھی، ان میں عکس آرہا تھا، تو پھول پتوں میں چمک بھی تھی۔ بادشاہ نے کہا کہ رومیوں کی صنعت بڑھ گئی چینی ہار گئے، اس لیے کہ رومیوں نے اپنی صنعت بھی دکھلائی، اور ان کی بنی بنائی صنعت کو چھین کر اپنا کر لیا، تو دوگنی صنعت ہو گئی۔ لہٰذا رومی کامیاب ہیں۔ ہم انہیں پاس کرتے ہیں، اور چینی فیل ہو گئے۔ ان کی صنعت کوئی بڑی صنعت نہیں نکلی ——

مولانا رومیؒ یہ مثال دے کر کہتے ہیں کہ :-

اے عزیز! تو بھی رومیوں کی صنعت اختیار کر، چینیوں کی مت کر، تو اپنے دل کو مانجھ کر، صیقل کر کے ایسا آئینہ بنالے کہ دنیا کے سارے نقش و نگار تجھے گھر کے اندر بیٹھے ہوئے دل کے اندر نظر آئیں ——

؎ ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و چمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ ای درِ دل کشا بچمن درآ

بڑے ستم کی بات ہے کہ دنیا کی رنگینیوں پر فریفتہ ہوکر کبھی اس باغ میں، کبھی اس چمن میں، کبھی اس بوٹے پہ، کبھی اس پتّی پر پھر رہا ہے۔ تُو اگر رومیوں کی صنعت اختیار کرکے دِل کو مانجھ لے، یہ ساری پھول پتیاں گھر بیٹھے تجھے دِل ہی میں نظر آئیں گی، اور ساری دنیا تیرے دِل میں چمک اٹھے گی۔ دل کو مانجھ کر رومیوں کی صنعت پیدا کر، تو اللہ میاں کے ہاں تُو بھی پاس ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دِل اللہ نے بڑی عجیب کیمیا بنائی ہے۔ باہر کی چیزیں آدمی چھین کر اندر لے آئے تو اس کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ اور باہر باہر چمن کھلے رہیں اور دل اندر سے خالی رہے۔ اس کے لئے نہ نجات کی صُورت ہے نہ نفع کی صُورت ــــ تو اصل چیز یہ ہے کہ انسان اپنے دل کو مانجھے، صیقل کرے، آئینہ بنائے۔

قلب کے دو دروازے

اللہ نے انسان کے دل میں دو دروازے رکھے ہیں، ایک دروازہ کھلتا ہے، تو اسے عرش کی چیزیں نظر آتی ہیں، اور ایک دروازہ کھلتا ہے، تو اسے فرش کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ دِل میں آنکھ، کان، ناک کے راستے سے جب آدمی دیکھے گا، تو ظاہری چمک دمک، پھول بوٹے سب نظر آئیں گے۔ اور اگر ان آنکھ، کان، ناک کے دروازوں کو بند کرکے دل کے اندر کے دروازے کھولے گا، تو عرش کی چیزیں نظر آئیں گی، وہاں کے علوم اور کمالات اترنے شروع ہوں گے، تو قلب کے اندر دونوں راستے ہیں۔ اگر اوپر کے دروازے بند کر دوگے، صورتیں، شکلیں نظر پڑیں گی۔ نیچے کا دروازہ بند کر دوگے، حقیقتیں کھلنی شروع ہو جائیں گی۔ دل میں دونوں قسم کی صلاحیتیں موجود ہیں ــــ اعلےٰ ترین صلاحیت یہ ہے کہ آدمی اوپر کی چیز کو جذب کرے، علم خداوندی کو، کمالات کو، معرفتِ خداوندی کو، اخلاقِ ربانی کو، اور ملائکہ کی صفات کو جذب کرے، تو صحیح معنےٰ میں کامل انسان، اور کامل بشر بنے گا۔

مولانا رومیؒ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اندر کی صنعت پیدا کرو۔ باہر کی صنعت کے اوپر فریفتہ ہو نامت سیکھو، باہر کی چیزیں بھی اگر لو گے، وہ بھی جبھی کام دیں گی جب اندر کچھ جوہر موجود ہو گا۔ اور اگر اندر خالی ہے، تو باہر کی چیزیں نفع نہیں دے سکتیں۔ اس واسطے اپنے دِل کو صاف کر کے اسی طرف آنا پڑے گا۔

علم، روشنی اور غلبہ کا ذریعہ ہے

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ایسی ہی بنیادی چیز کا ذکر فرمایا ہے، کہ جس سے انسان کا اندرون روشن ہو۔ قلب میں روشنی اور آراستگی پیدا ہو۔ آپؐ نے فرمایا:۔

الناس کلھم ھالکون الا العالمون ـــــ سارے انسان تباہ و برباد ہونے والے، سب ہلاک ہو جانے والے ہیں، اگر بچیں گے تو اہل علم بچ سکتے ہیں، یعنی جہالت میں انسان کی نجات نہیں ہے۔ علم میں انسان کی نجات ہے، دنیا کا علم ہو، یا دین کا علم ہو۔ علم ہی سے راستہ نظر پڑ سکتا ہے، جہالت سے راستہ نظر نہیں پڑتا ـــ جہالت فی الحقیقت ایک اندھیری ہے، اور علم فی الحقیقت ایک چاندنا ہے، تو چاندنے میں راستہ نظر پڑا کرتا ہے، اندھیرے میں راہیں نظر نہیں پڑتیں، جہالت میں نہ دنیا کی بھلائی سامنے آسکتی ہے نہ آخرت کی بھلائی۔

آج دنیا بھی اگر سجی ہوئی ہے اور آراستہ ہے تو وہ بھی انسان کے علم کی وجہ سے سج رہی ہے، اگر آخرت درست ہے، وہ بھی انسان کے علم ہی کی وجہ سے درست ہے۔ آج یہ آپ کا شہر جگمگا رہا ہے، لاکھوں قمقمے بجلی کے روشن ہیں، شہر میں چاندنا ہے۔ کوٹھیاں اور بنگلے روشن ہیں۔ یہ چاندنا آپ کے علم کا ہے، بجلی کا نہیں ہے۔ اگر آپ علم و سائنس کی قوتیں استعمال نہ کرتے۔ تو نہ قمقمہ بنتا، نہ بجلی بنتی۔ بجلی اور قمقمہ نہ ہوتا تو یہ گھر اور شہر روشن نہ ہوتا۔ علم نے قمقمہ کو بنایا، بجلی کو دریافت کیا، اور علم نے یہ صناعیاں

کیں، اس کی وجہ سے روشنی ہوئی —— تو درحقیقت یہ علم کا چاندنا پھیلا ہوا ہے، اگر انسانوں میں جہالت ہوتی، فنِ سائنس کو نہ جانتے، یہ چاندنا سامنے نہ آتا —— یہ چھت میں آپ کو جو چمک نظر آرہی ہے۔ یہ آپ کے علم کی چمک ہے، بجلی کی نہیں ہے، بجلی تو خود آپ کے علم سے آئی ہے۔

جہالت ذریعۂ مغلوبیت ہے

یہی علم کی قوت ہے جو انسان کو اونچا بناتی ہے، اور دنیا کے اوپر غالب کرتی ہے۔ اگر جہالت ہو تو آدمی مغلوب ہو جاتا ہے۔ زمین بے چاری علم نہیں رکھتی، رات دن جوتیوں میں پامال ہے، جانور علم نہیں رکھتے، رات دن آپ کی غلامی میں مبتلا ہیں۔ کسی جانور کے کندھے پر آپ نے ہَل رکھا ہے، اس سے کھیتی باڑی کرا رہے ہیں۔ کسی جانور کی پشت پر زین کس رکھا ہے، اور انسان سوار ہوا پھر رہا ہے۔ گھوڑا طاقت میں انسان سے چوگنی طاقت رکھتا ہے۔ مگر انسان کے آگے دبا ہوا ہے۔ اس لئے کہ غریب کے پاس علم کی قوت نہیں۔

اور یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ اللہ نے جانوروں کو علم نہیں دیا، عقل نہیں دی۔ اگر کہیں گھوڑے اور بیل میں عقل آجاتی، اور انسان اس پر زین کسنے لگتا، گھوڑا کہتا کہ ٹھہر جایئے، پہلے دلیل سے ثابت کیجئے کہ آپ کو مجھ پر سوار ہونے کا حق ہے۔ میں کیوں نا آپ پر سوار ہو جاؤں؟ اور میں کیوں نہ زین کس دوں؟ —— تو دو گھنٹے تو مناظرہ ہوتا، معلوم نہیں بحث میں کون جیتتا۔ کون ہارتا۔ نہ سواری ہوتی، نہ کھیتی باڑی ہوتی۔ تو شکر کرو کہ اللہ نے انہیں جاہل بنایا اور انہیں عقل نہیں دی۔

اس سے اتنی بات بھی معلوم ہوئی کہ کہیں جہالت بھی نفع دیتی ہے، محض علم ہی نفع نہیں دیتا۔ اگر دنیا میں جاہل نہ ہوں، تو غلامی کرنے والا کوئی نہ ہو، اور جب غلام کوئی نہ ہو، تو آقا کی آقائی کیسے کام دے گی؟ —— لیڈروں کی لیڈری جبھی چلتی ہے

جب پبلک جاہل ہو ـــــ اگر سارے پڑھے لکھے عالم بن جائیں تو لیڈر کام نہیں کر سکتا۔ بے چارے لیڈروں کی عزت تبھی بنتی ہے، جب پبلک میں جہالت ہو ـــــ تو جانوروں سے فائدہ تبھی اٹھایا جا سکتا ہے جب جانوروں کے اندر عقل و شعور نہ ہو۔ ان میں شعور ہوتا، تو نہ کھیتی ہوتی، نہ سواری ہوتی، نہ حشم خدم ہوتا۔ بہر حال ان تمام چیزوں پر انسان نے غلبہ پایا ہے، وہ بدن کی طاقت سے نہیں پایا۔ بدن میں تو طاقت میں گھوڑا، بیل ہم سے زیادہ ہے، وہ غلبہ علم اور عقل کی طاقت سے پا رکھا ہے۔

بچپن میں ہم نے ایک حکایت عورتوں سے سنی تھی، واللہ اعلم۔ قصہ واقعی ہے یا فرضی۔ واقعہ اگر فرضی بھی ہو تو مثال دینے اور عبرت پکڑنے کے لئے کافی ہے۔ وہ قصہ ہم نے یہ سنا تھا اپنی ماں بہنوں سے جو انہوں نے نصیحت کے لئے سنایا تھا، کہ ایک شیر کا انتقال ہونے لگا، تو اس نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ دیکھو بیٹا! ہر ایک سے ملنا، ہر ایک کے پاس جانا۔ اس انسان کے پاس مت جانا، یہ بڑی ظالم چیز ہے، اگر کہیں اس کے پاس چلے گئے، تو تم خطرہ اٹھاؤ گے، مصیبت میں مبتلا ہو گے، وہ شیر صاحب، جو سارے جنگل کے بادشاہ تھے، انتقال فرما گئے۔ ان کی جگہ ان کے صاحبزادے "یعنی شیر کا بچہ" ولی عہد بنے۔

شیر کا بچہ تجربہ نہیں رکھتا تھا، جوان ہوا، مگر عقل تو آتے آتے ہی آتی ہے کیسی بھی عقل ہو، جانور ہونے کی ہو یا انسان ہونے کی ہو، عمر گزرنے کے بعد آتی ہے۔ بچپہ ہر ایک کا ناتجربہ کار ہوتا ہے، جانور کا ہو یا انسان کا ہو ـــــ تو شیر کے بچے کا بچپن تھا۔ باپ تو اٹھ گیا، شیر کا انتقال ہو گیا۔ اس شیر کے بچے نے کہا کہ میرے باپ نے کہا تھا کہ تو انسان کے پاس مت جانا، یہ بڑی ظالم چیز ہے۔ دیکھنا تو چاہیئے انسان ہوتا کیا ہے ج اور میرا باپ بہت ڈر رہا تھا، میرا باپ تو سارے جنگل کا بادشاہ تھا، اتنی طاقت والا تھا، وہ بھی ڈر رہا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ انسان بڑی طاقت والی کوئی چیز ہو گی ـــــ شیر تو دو گز کا تھا، انسان معلوم نہیں کوئی دس گز لانبا ہو گا، بیس گز کا ہو گا، کیا چیز ہو گی انسان ہے دیکھنا تو چاہیئے، تو جو پاس کے حالی حوالی تھے۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو بڑوں کی

نصیحت پر عمل کرنا چاہیئے۔ باپ نے کہا تھا کہ انسان کے پاس بھی مت جانا، یہ بڑی ظالم چیز ہے، تم ارادہ مت کرو، کہیں کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ، اس نے کہا نہیں بھائی۔ کم سے کم ایک دفعہ دیکھنا تو چاہیئے کہ یہ انسان کیا چیز ہے ——

باپ کی نصیحت نہیں مانی، اور انسان کو دیکھنے کی خاطر چلے۔ اتفاق سے سب سے پہلے گھوڑے پر نظر پڑی کہ چھلانگے مارتے ہوئے جا رہا ہے۔ شیر کے بچے نے سمجھا کہ یہی انسان معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ باپ تو ڈیڑھ گز لانبا تھا، اور یہ تو بہت ڈیل ڈول کا ہے، میرا باپ جو ڈرتا تھا یہ اس سے دوگنا چوگنا ہے، واقعی ٹھیک ڈرتا تھا۔ تو گھوڑے کے قریب جاکے ڈرتے ڈرتے اس سے کہا کہ جناب ہی کا نام انسان ہے ؟ — گھوڑے نے کہا کس ظالم چیز کا نام لیا۔ میرے سامنے انسان کا نام مت لینا، وہ تو بڑی ظالم چیز ہے جسے انسان کہتے ہیں۔ میں بہت ڈیل ڈول کا ہوں مگر انسان میری کمر پر زین کستا ہے، اس پہ سوار ہوتا ہے، اس کے ہاتھ میں کوڑا ہوتا ہے۔ میری پیٹھ پر کوڑے پڑتے ہیں۔ میں بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہوں، انسان ہے کہ مارتے مارتے باز نہیں آتا۔ تو سب چیزوں کا ذکر کرنا، مگر اس ظالم انسان کا نام مت لینا، یہ بڑی مصیبت کی چیز ہے —— شیر کے بچے نے کہا، یا اللہ! انسان کتنے ڈیل ڈول کا ہوگا۔ یہ ایسا لانبا چوڑا جانور، یہ بھی انسان سے ڈر رہا ہے، اور میرا باپ بھی ڈرتے ڈرتے مر گیا، کیا چیز ہوگی انسان —— ؟ اور آگے چلے تو اتفاق سے اونٹ نظر پڑا۔ اس نے کہا یہ ہوگا انسان۔ کوئی کل ہی سیدھی نہیں۔ گردن ادھر کو جا رہی ہے، کمر ادھر کو جا رہی ہے۔ ٹانگیں ادھر کو نکل رہی ہیں۔ بس یہی انسان ہوگا۔ یہ تو گھوڑے سے بھی چار ہاتھ اونچا ہے۔ اس نے قریب جاکر اونٹ سے کہا۔ کیا آپ ہی کا نام انسان ہے ؟ ——

اس نے کہا، ارے لاحول ولا قوۃ، کس ظالم چیز کا نام لے دیا۔ یہ بڑی ظالم چیز ہے، اس کا نام میرے سامنے مت لینا، اس واسطے کہ میں تو اکیلا ہوں۔ میرے علاوہ میرے سو سو بھائی بند، اور ناک میں نکیل، جو آگے جا رہا ہے۔ اس کی دم میں پچھلے

کی نکیل بندھی ہوتی ہے اس طرح سو سو کی قطاریں ہوتی ہیں۔ اور انسان کا ایک بچہ ہمیں ہکاتا ہے۔ ہم گڑگڑاتے ہیں، بل بلاتے ہیں۔ مگر ایک بچہ ہنکا کر لے جاتا ہے۔ سو اونٹ کی بھی ایک انسان کے آگے نہیں چلتی۔ یہ بڑی ظالم چیز ہے۔ اس کا نام میرے سامنے مت لینا ——— شیر کے بچے نے کہا، یا اللہ! انسان کتنی بڑی چیز ہوگا۔ یہ اتنے بڑے ڈیل ڈول کا، یہ بھی ڈر رہا ہے، اور گھوڑے نے تو اپنی مصیبت بیان کی، اس نے تو اپنی برادری کی مصیبت بیان کی کہ سو اونٹ مل جائیں، تب بھی انسان کے ایک بچے سے عاجز ہیں ——— پھر یہ ڈرتا ڈرتا آگے بڑھا تو اتفاق سے ہاتھی نظر پڑ گیا، اس نے کہا یہ انسان ہوگا، اس لئے کہ اچھے خاصے چار ستونوں پہ بلڈنگ بنی ہوئی ہے۔ چھت پڑی ہوئی ہے۔ اس پر ایک بڑا حوضہ رکھا ہوا ہے۔ یہ انسان ہوگا۔ ڈرتے ڈرتے ہاتھی سے جاکر کہا، کہ جناب ہی کا نام انسان ہے؟ آپ ہی کو آدمی کہتے ہیں۔

اس نے کہا، ارے استغفر اللہ، کس مصیبت کا نام لے دیا، میرے سامنے اس کا نام مت لے، یہ بڑی ظالم چیز ہے، میرے ڈیل ڈول پر مت جانا، قد و قامت میرا اونچا نظر آرہا ہے کہ ایک عمارت سے کھڑی ہوئی ہے۔ مگر ایک انسان کا بچہ میری پشت پر سوار ہوتا ہے، لوہے کا ہنٹر اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ذرا میں چیخا، اس نے میرے سر پر لوہے کا ہنٹر مارا، میں چنگھاڑتا ہوں اور کچھ نہیں کر سکتا۔ گھوڑے کے منہ میں تو لگام بھی ہوتی ہے۔ میرے پر تو بے لگام ہی سوار ہوتا ہے، تو نہ لگام، نہ نکیل، مگر انسان کے سامنے میں مجبور ہوں ——— شیر نے کہا، یا اللہ! انسان کیا چیز ہوگی، ڈرتے ہوئے ملتا ہے جو ملتا ہے، جو ملا وہ کانپ رہا ہے کہ انسان بڑی ظالم چیز ہے۔

آگے چلا تو اتفاق سے ایک بڑھئی کا بچہ آٹھ دس برس کا، وہ ایک بڑا بھاری شہتیر چیر رہا تھا، اور بہت بڑا آرہ اس میں ڈال رکھا تھا، اسے چیرے جا رہا تھا، اور جتنا وہ چیر چکا تھا، اس میں ایک کھونٹی ڈال دی تھی، تاکہ اوپر نیچے نہ ہل سکے۔ تو شیر کو یہ وہم بھی نہیں گزرا کہ یہ انسان بھی ہو سکتا ہے، اس لئے کہ ذرا سا تو وہ آٹھ نو برس کا بچہ، اسے خیال نہیں گزر سکتا تھا کہ یہ آدمی ہوگا، وہ دیکھ کر آیا تھا، اونٹ کو، گھوڑے کو، اور

ہاتھی کو، اور سب کو دیکھا کہ انسان سے ڈر رہے ہیں۔ تو وہ اس بچے سے تھوڑا ہی ڈر سکتے ہیں۔ اسے وہم بھی نہیں گزرا کہ یہ انسان ہوگا۔ مگر تحقیق کے لئے اس سے پوچھا کہ انسان کہاں ملے گا؟ بڑھئی نے کہا کہ انسان تو مجھے ہی کہتے ہیں۔ اس نے کہا اچھا تو انسان ہے؟ آدھ گز کا اتنا سا بچہ؟ کہ جی ہاں، انسان تو مجھے ہی کہتے ہیں —— اس نے کہا لاحول ولا قوۃ۔ میرا باپ بڑا بے وقوف تھا، جو تجھ سے ڈر رہا تھا۔ میں ایک چپت میں تیرا کام تمام کردوں گا، اور شیر نے یہ کہہ کر اٹھایا پنجہ ——

بڑھئی کے بچے نے سمجھا کہ بھئی یہ تو شیر ہے۔ اب موت آگئی۔ اگر اس نے ایک طمانچہ بھی ماردیا، میں تو ختم ہوجاؤں گا، تو تدبیر سے کام کرنا چاہیئے، بڑھئی کے بچے نے کہا کہ آپ تو جنگل کے بادشاہ ہیں، میں کیا چیز ہوں آپ کے آگے۔ آپ بڑی طاقت والے۔ مگر ایک کام ہے جو میں نہیں کرسکتا، آپ ہی جیسا طاقت ور کرسکتا ہے اگر آپ اس کام کو انجام دے دیں ——؟

شیر نے کہا، ہاں بتلاؤ، کیا کام ہے؟ کہا یہ شہتیر جو میں نے چیرا ہے بڑی مصیبت سے اسے چیرتے چیرتے یہاں تک لایا ہوں۔ اوپر میں نے کھونٹی لگا رکھی ہے۔ اب وہ کھونٹی مجھ سے نکلتی نہیں، آپ اگر اس میں ہاتھ ڈال کے یہ کھونٹی نکال دیں تو بڑا کام ہوگا۔ اس نے کہا یہ کونسا بڑا کام ہے، میں ابھی نکالتا ہوں، تو شیر نے دونوں ہاتھ اس میں دیئے، بڑھئی کے بچے نے چپکے سے وہ کھونٹی نکال دی، دونوں پھٹ برابر ہوئے تو شیر صاحب پھنس گئے؟ اور چیں چیں کر رہے ہیں، نکلا جاتا نہیں، اور وہ بڑھئی کا بچہ کھڑا ہوا ہنس رہا ہے۔ کہ دیکھ لیا انسان کو —— ؟ اب وہ شیر ہے کہ پھنس رہا ہے، نہ نکل سکتا ہے، نہ جاسکتا ہے۔ اس کے ہاتھ پیر ان دونوں پھٹوں کے اندر پھنس گئے، کھونٹی نکل گئی، اور بڑھئی کے بچے نے ہنسنا شروع کیا —— اس وقت شیر کے بچے نے کہا کہ واقعی جو اپنے ماں باپ کی نصیحت نہیں مانتا، وہ اسی ذلت و خواری کا شکار بنتا ہے —— گویا عورتوں نے ہمیں یہ قصہ عبرت دلانے کے لئے سنایا تھا کہ اپنے بڑوں کی نصیحت ماننی چاہیئے۔ جو اس نصیحت کے خلاف کرتا ہے، وہ یوں ذلت

میں مبتلا ہوتا ہے، اور مصیبت کا شکار ہوتا ہے۔

مجھے اس سے یہ سنانا مقصود ہے کہ بڑھئی کے اتنے سے بچے نے جو شیر پر قابو پایا، اور ہاتھیوں پہ قابو پایا، اونٹوں اور گھوڑوں پر قابو پایا، وہ بدن کی طاقت سے قابو نہیں پایا۔ بدن کی طاقت اونٹ کی انسان سے زیادہ ہے۔ اگر اونٹ بلا ارادہ انسان پر گر پڑے تو انسان پس کے رہ جائے، چکنا چور ہو جائے۔ ہاتھی اگر کسی انسان پہ آ پڑے تو انسان تو بے چارہ پس کے رہ جائے۔ کچھ بھی طاقت نہیں۔ تو بدن کی طاقت سے انسان غالب نہیں آیا۔ علم اور عقل کی طاقت سے غالب آیا ہے۔ وہ طاقت آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ وہ دل میں ہوتی ہے۔ انسان کی انسانیت فی الحقیقت اس طاقت میں چھپی ہوئی ہے۔ اگر بدن ہمارا بہت ڈیل ڈول کا ہو جائے، پہلوان بن جائیں اور اندر عقل نہ ہو، ہم غلبہ نہیں پا سکتے، انسان کا غلبہ تو علم و عقل اور فضل و کمال سے ہے۔

انسانی عقل و شعور کی قوّت

یہ جو ساری دنیا عاجز ہے۔ شیر نے بھی کہا کہ انسان کا نام مت لو، بھیڑیئے نے بھی کہا، یہ اس کی عقل سے ڈر رہے تھے، بدن سے نہیں ڈر رہے تھے۔ آج یہ مشینیں چل رہی ہیں۔ مشین لگا دی اور پہاڑوں کے بڑے بڑے پتھر پس پس کر اس میں چونا بن رہے ہیں۔ تو نہ پہاڑ کی پیش چلتی ہے، نہ درختوں کی پیش چلتی ہے۔ ساری چیزیں کٹ رہی ہیں دنیا ہے کہ پسی جا رہی ہے۔ انسان کے آگے عاجز ہے، انسان کھڑا ہوا ہے، کہیں چکی بنا دی کہیں مشین بنا دی ——— زمین کے خزانے انسان نے نکال نکال کے استعمال کئے۔ اور زمین بے چاری چوں نہیں کر سکتی۔ اب آپ کے افریقہ میں جگہ جگہ سونے کی کانیں ہیں۔ ہزار ہا فٹ گہرے غار کھود کر گویا انسان نے زمین کا جگر نکال لیا۔ مگر زمین کچھ بھی نہیں بول سکتی ـــ سونا اس کا نکال باہر کیا۔ چاندی اس کی نکالی، ہیرے اس کے نکال ڈالے۔ انسان کے آگے سب چیزیں عاجز ہیں، اور یہ تصرف کر رہا ہے، یہ بدن کا تصرف نہیں، یہ علم و عقل کا تصرف ہے۔

توسائنس انسان کے بدن سے نہیں، انسان کے دماغ سے پیدا ہوئی، عقل سے نکلی، دنیا میں جتنی سجاوٹ ہے جتنی زینت اور آرائش ہے، وہ انسان کے علم کی ہے۔ آخرت جتنی منور ہوگی وہ انسان کے علم سے منور ہوگی، عمل سے منور ہوگی۔ بدن کے ڈیل ڈول سے منور نہیں ہوگی۔

اُمتِ محمدیہ کے نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام

حدیث میں ہے کہ معراج کی شب میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب ساتویں آسمان پر پہنچے ہیں تو ساتویں آسمان پر فرشتوں کا قبلہ ہے جس کو بیت المعمور کہتے ہیں ——— انسانوں کا قبلہ مکہ میں ہے جس کو بیت اللہ اور کعبۂ محترمہ کہتے ہیں۔ اس میں آپ لوگ طواف وسجدے کرتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، ادھر کو رُخ کرتے ہیں۔ استقبال قبلہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ساتویں آسمان پر فرشتوں کا قبلہ ہے، فرشتے اس میں طواف کرتے ہیں ——— اور حدیث میں ہے کہ روزانہ ستر ہزار فرشتہ طواف کرتا ہے، اور آج جنہوں نے طواف کیا ہے اب ابدالآباد تک انہیں نوبت نہیں آئے گی، اگلے دن پھر ستر ہزار، اس سے اگلے دن پھر نئے ستر ہزار، ابد تک اسی طرح نئے نئے ستر ہزار آتے رہیں گے، اور طواف کرتے رہیں گے، پھر چھٹے آسمان میں اس کی سیدھ میں دوسرا قبلہ ہے۔ چھٹے آسمان کے فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں۔ پانچویں آسمان میں اس کی سیدھ میں اور قبلہ ہے، اس کا وہاں کے لوگ۔ غرض ساتوں آسمانوں میں اوپر نیچے ایک سیدھ میں قبلے ہیں ——— زمین پر ٹھیک اسی کے سیدھ میں قبلہ ہے، جس کو آپ کعبہ کہتے ہیں ——— حدیث میں ہے اگر بیت المعمور سے کوئی پتھر ڈالا جائے، تو ٹھیک بیت اللہ الکریم کی چھت پر آکر گرے گا، اس سیدھ میں ہے ——— اصل میں قبلہ یہ محل اور مکان ہے، عمارت قبلہ نہیں ہے اگر عمارت نہ بھی رہے۔ معاذاللہ اس کو ڈھا دیا جائے، نماز جب بھی ادھر ہی کو منہ کرکے پڑھنی پڑے گی۔ اس واسطے کہ قبلہ ان پتھروں کا، یا اس مکان کا نام نہیں ہے، بلکہ اس موضع اور محل کا ہے، جہاں وہ عمارت بنی ہوئی ہے، اور ساتویں زمین سے لے کر

ساتویں آسمان تک ایک ہے، وہی قبلہ ہے۔ وہ ایک کلی ہے جس کے ارد گرد ساتوں آسمان اور زمینیں گھوم رہی ہیں۔

اسی لئے اگر آپ فضا میں جائیں، پچاس ہزار نہیں پچاس لاکھ فٹ بلندی پر جائیں، تب بھی رُخ ادھر ہی کو کرنا پڑے گا، کیونکہ قبلہ کی فضا یہاں سے آسمانوں تک ایک ہی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک لاکھ میل اوپر پہنچ کر آپ نیچے کی طرف مُنہ کرکے نماز پڑھیں گے۔ سامنے رُخ کریں گے، کیونکہ نیچے سے اوپر تک وہ ایک کیل ہے جو در حقیقت اوپر تک چلی گئی ہے۔ وہی کعبۂ محترم ہے۔ اس محل اور مقام کا نام کعبہ ہے، عمارت کا نام نہیں ہے ——— تو فرشتوں کا کعبہ ساتویں آسمان پر ہے۔ چھٹے آسمان والوں کا قبلہ چھٹے آسمان پر ہے، پانچویں والوں کا پانچویں پر، اسی طرح سے قبلے ہیں۔

اسی طرح جو یہ زمین پر قبلہ ہے، اس کی سیدھ میں نچلی زمین پر بھی قبلہ ہے۔ اس کی سیدھ میں اس کی نیچے کی زمین پر۔ سات زمینیں ہیں، سات آسمان ہیں۔ تو نیچے سے اوپر تک قبلہ ہے۔

بہر حال ساتویں آسمان پر حُضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی، جو بیت المعمور کی دیواروں سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

اور وہ جگہ غالباً اس لئے دی گئی کیونکہ دنیا میں انہوں نے بیت اللہ الکریم کی تعمیر کی ہے۔ تو جیسا عمل تھا، ویسی جزا سامنے آئی۔ ساتویں آسمان پر بیٹھنے کے لئے بھی انہیں بیت اللہ دیا گیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ:-

"اے محمدؐ! (صلے اللہ علیہ وسلم) اپنی امت کو میرا سلام کہہ دینا، اور کہہ دینا کہ الجنۃ قیعان۔ جنت تمہارے حق میں چٹیل میدان ہے۔ اس میں کوئی چیز بنی ہوئی نہیں، جو بھی محلات اور باغات ہوں، وہ تمہارے لئے کچھ نہیں۔ تم جب کوئی عمل کرو گے۔ تمہیں جب ہی ان محلات کا

استحقاق پیدا ہوگا۔ تم اپنی جنت خود بناؤ گے، بنی بنائی جنت تمہاری نہیں ہے، خود تمہیں بنانی پڑے گی، جیسے عمل کرو گے، ویسا ہی وہاں ثمرہ مرتب ہو جائے گا، جیسی نیکی کر کے بھیجو گے، ویسی ہی وہاں جزا مہیا ہو جائے گی — تو تم یہاں بیٹھ کر جنت بناؤ، جب جا کے تمہارا مقام جنت میں ہو گا۔ تم نے کچھ عمل نہ کیا، اور تم یہ امید لگائے بیٹھے رہے کہ جنت میں محلات ملیں گے، تم نے بنائے ہی نہیں تو ملیں گے کہاں سے؟ تم خود تعمیر کرو گے، جب تمہیں ملیں گے" ——

دُنیا میں ہر انسان معمار ہے

ہمارے دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، صاحب کشف بزرگوں میں سے تھے، اور اولیائے کاملین میں سے تھے۔ مولانا میں کچھ تھوڑی سی مجذوبیت کی شان تھی۔ جیسے مجذوب ہوتے ہیں کہ کوئی لٹک لگ گئی، کوئی بات لگ گئی، بس اسی طرف چل پڑے۔ یہ کچھ عادت تھی۔

ایک دن رات کو بیٹھے اور لٹک لگی، یہ دُعا مانگنا شروع کی، کہ یا اللہ مجھے تین لاکھ روپے دے دے۔ اب کیوں دے دے تین لاکھ، کاہے کے لئے دیدے، بس کچھ نہیں —— آدھی رات گزر گئی دُعا مانگتے مانگتے۔ یا اللہ مجھے تین لاکھ روپے دے دے —— مجذوب جو ٹھہرے، تو مجذوبیت میں ایک بڑ ہاتھ لگ گئی اور دعا شروع کر دی — تین چار گھنٹے گزر گئے، رات کے دو بج گئے —— اسی دُعا مانگنے کی حالت میں بیٹھے ہی بیٹھے مولانا کو نیند آگئی۔ تو خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑا محل سفید رنگ کا ہے، کئی میلوں میں چلا گیا ہے اور بالکل ایسا جیسے انڈا سفید ہوتا ہے۔ گویا اعلیٰ قسم کا وہائٹ ہال بنا ہوا ہے۔ اور اس کے اوپر دیواروں کے کناروں پر بڑے بڑے موتی لگے ہوئے ہیں جو سورج سے بھی زیادہ روشن ہیں،

تمام محل کے ارد گرد چاندنا پھیلا ہوا ہے۔ ہزاروں سورج لگے ہوئے ہیں۔ مولانا کو محل بہت پسند آیا۔ ہزاروں لوگ وہاں پھر رہے ہیں۔ مولاناؒ نے ان سے پوچھا کہ بھائی! یہ محل کس کا ہے؟۔ لوگوں نے کہا یہ مولانا محمد یعقوب صاحب کا محل ہے اور یہ جنّت ہے۔ اور جنت میں یہ اللہ نے ان کا مکان بنایا ہے ——— مولانا بہت خوش ہوئے۔ اس میں داخل ہونا چاہا۔ تو دربانوں نے روک دیا کہ ابھی داخلہ کا وقت نہیں آیا۔ جب وقت آئے گا جب داخل ہوں گے۔ اس سے پہلے داخل نہیں ہو سکتے ——— اب مولانا اس کے ارد گرد گھوم رہے ہیں۔ بڑا پسند آیا۔ سبحان اللہ! بڑا عجیب محل ہے، جس کے باہر اتنی چمک دمک ہے، تو اندر کیسے کیسے سامان ہوں گے ——— ایک طرف کو جو گئے، تو دیکھا کہ ایک کونے میں ایک موتی ندارد۔ وہ موتی ٹوٹا ہوا ہے، اور وہاں اندھیرا پڑا ہوا ہے۔ سارے محل کے ارد گرد تو چاندنا اور روشنی، اور کونے میں ایک موتی نہیں ہے وہاں اندھیرا۔ مولاناؒ نے لوگوں سے پوچھا کہ بھائی یہاں موتی لگایا ہی نہیں گیا۔ یا تھا اور نہیں رہا۔ کہ نہیں تھا تو، ابھی ٹوٹا ہے۔ کیوں ٹوٹ گیا ——— ؟ کہا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب اللہ تعالیٰ سے تین لاکھ روپے مانگ رہے تھے، حکم دیا کہ محل کا ایک موتی توڑ کے بھیج دو، یہ تین لاکھ سے زیادہ قیمت کا ہے۔ تو وہ توڑ کے بھیج دیا گیا۔

اب مولانا کی آنکھ کھلی۔ اب دوسری دعا مانگنا شروع کی، یا اللہ! مجھے نہ تین لاکھ چاہیئے، نہ تین ہزار چاہیئے، نہ تین سو چاہیئے۔ اگر میرے جنت کے محل کی اینٹیں توڑ توڑ کے میرے دنیا کے مکان کی تعمیر ہوئی، تو میری آخرت تو ویران ہو جائے گی۔ مجھے یہاں نہیں چاہیئے، مَیں تو وہیں لوں گا۔ اب یہ دعا شروع کر دی کئی گھنٹے اسی میں لگ گئے کہ مجھے نہیں تین لاکھ چاہیئے، مَیں نہیں لینا چاہتا۔ پھر آنکھ لگی۔ دیکھا تو پھر وہی محل ہے۔ اب جو کنارے پہ گئے تو وہ موتی لگا ہوا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ مولانا نے مانگتے مانگتے یہ عرض کر دیا کہ اس وقت یہ مجھے نہیں چاہیئے۔ موتی پھر لگا دیا گیا۔

مجھے یہ بات اس پر یاد آگئی کہ جنت کی تعمیر تو ہم کرتے ہیں۔ اگر ہم تعمیر نہ کریں۔ وہاں اندھیرا پڑا رہے گا۔ بلاشبہ اللہ نے جنت میں بڑی بڑی نعمتیں بنائی ہیں۔ مگر ہمارے حق میں کچھ نہیں۔ جب تک ہم کچھ کرکے نہ جائیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ زمین میں سونا بھی ہے، چاندی بھی ہے۔ مگر آپ کے لئے کچھ بھی نہیں جب تک محنت کرکے مشین نہ لگائیں۔ مشین لگاؤ پھر نکالو سونا، ایک شخص گھر میں بیٹھا رہے، چاہے ساری زمین میں سونا بھرا ہوا ہو، اس کے لئے کچھ نہیں۔ تو یہ کہا جائے گا کہ افریقہ سونے سے بھرپور ہے مگر ملے گا اُسے جو محنت کرے گا، یہ نہیں کہہ سکتے کہ افریقہ میں سونا نہیں۔ تو جنت میں سونے اور چاندی کے محلات ہیں، مگر ملیں گے تب جب آپ یہاں محنت کریں گے۔

حدیث میں ہے کہ جنت میں ایک محل تعمیر کیا جاتا ہے۔ ملائکہ اس کی تعمیر کرتے ہیں۔ تعمیر کرتے کرتے ایک دم تعمیر رک جاتی ہے۔ دوسرے فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم تو تعمیر بنا رہے تھے" رک کیوں گئے"؟ ۔ وہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی فلاں عمل کر رہا تھا، ہم اس کے لئے مکان بنا رہے تھے، اس نے عمل کرنا چھوڑ دیا۔ مٹیریل بھیجنا چھوڑ دیا، ہم نے تعمیر روک دی۔ تو درحقیقت جنت کی تعمیر آپ یہاں بیٹھ کر کرتے ہیں۔ ہر انسان معمار ہے۔ کوئی دنیا میں بیٹھ کر جہنم بنا رہا ہے کوئی جنت بنا رہا ہے۔ اپنی اپنی محنت کر رہے ہیں۔ مگر جو کچھ کرے گا، اسی کا نتیجہ سامنے آئے گا ——— تو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے وہ دُعا، روک دی، اور کہا کہ مجھے وہ موتی نہیں چاہیئے۔ اس واسطے کہ اگر میری آخرت دنیا میں مل گئی، آخرت میں کچھ نہیں رہے گا۔ تو اصل چیز محنت اور کمال ہے، وہ ہوگا تو وہاں ملے گا، ورنہ نہیں۔

——— تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم! اپنی اُمت کو میرا سلام کہہ دینا، اور کہہ دینا کہ الجنۃ قیعان۔ جنت تمہارے حق میں چٹیل میدان ہے، اس میں تمہارے لئے کوئی چیز نہیں۔ جتنا کر لوگے، وہ تمہارے

لئے ہو جائے گا، ورنہ اس میں کچھ نہیں۔ تو جو کچھ آدمی کو ملتا ہے، اپنی محنت سے ملتا ہے تمنائیں کرنے سے نہیں ملتا۔ دنیا کو دار الکسب بنایا گیا ہے، جو محنت اٹھائے گا، وہ پالے گا۔ اگر آپ صبح سے شام تک دکان پر بیٹھ کر محنت نہ کریں، آپ پیسے لے کر گھر نہیں آسکتے۔ اگر کاشت کار کھیت پر جا کر محنت نہ کرے، تو چار دانے لے کر اپنے گھر نہیں آسکتا۔ اگر ایک صناع محنت نہ کرے، برتن نہ بنائے، بازار میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔ کیونکہ دنیا تو محنت کی جگہ ہے، جو کرے گا، وہ پائے گا۔ جو نہیں کرے گا، اسے کچھ نہیں ملے گا۔

سب سے زیادہ محنت طلب ایمان کا علم ہے

سب سے بڑی چیز جو انسان کے لئے محنت طلب ہے وہ علم ہے۔ علم ہی سے دنیا میں اور آخرت میں بھی چاننا ہے۔ سائنس کا علم ہوگا، تو دنیا سجے گی۔ ایمان کا علم ہوگا، تو آخرت سجے گی۔ دنیا کا سجانا بھی ایک حد تک ٹھیک ہے۔ مگر بھائی! اس کو اگر سجا دو گے بھی، تو ایک دن ختم ہو جائے گی۔ اس لئے اگر سارا سرمایہ اس کے اوپر لگا دیا، یہ تو ہاتھ سے چھننے والی ہے، تو پھر سرمایہ اس چیز میں کیوں نہ لگایا جائے، جو باقی رہنے والی ہے۔ بقدرِ ضرورت اس میں لگاؤ۔ بقایا سرمایہ اس میں لگاؤ، جس کی ابد الآباد تک ضرورت ہے۔

کیسی حکمت کی بات نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بتائی۔ فرمایا:۔

اعمل للدنیا بمقدار بقائك فیها۔ واعمل للاٰخرة بمقدار بقائك فیها	دنیا کے لئے اتنی محنت کرو، جتنا دنیا میں رہنا ہے۔ آخرت کے لئے اتنی محنت کرو جتنا آخرت میں رہنا ہے۔

دنیا میں رہنا ہے پچاس برس، چالیس برس، دس بیس برس، آخرت میں ابد الآباد تک کے لئے رہنا ہے، تو کم سے کم وہاں کی محنت زیادہ ہونی چاہیئے۔

یہ ہم نہیں کہتے کہ آپ یہاں کے لئے کچھ نہ کریں۔ نہیں یہاں کے لئے آپ سب کچھ کریں۔ رہنے کے لئے گھر بھی بنائیں، کپڑا بھی بنائیں، کھائیں بھی، مگر سارا سرمایہ اسی میں نہ لگائیں۔ کچھ سرمایہ آگے کے لئے بھی چھوڑیں۔ کرنا دھرنا تو وہاں ہے سب کچھ، اس واسطے جب تک وہاں کی کوئی چیز حاصل نہیں ہوگی، وہاں کا کام نہیں بنے گا۔ اور وہاں کی سب سے بنیادی چیز علم ہے۔ جب تک وہ قلب کے اندر نہیں ہوگا، چاندنا نہیں پیدا ہو سکتا۔ تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

الناس کلھم ھالکون الا العالمون۔ — سارے انسان ہلاک ہونے والے ہیں، تباہ ہوجانے والے ہیں، مگر علم والے بچیں گے۔

جو اہل علم ہیں ان کے لئے نجات ہے۔ جہالت کے ساتھ نجات نہیں ہے۔ جاہل کو بھی اگر نجات ملتی ہے، تو کسی عالم کے ساتھ لگ کر ملتی ہے۔ اگر مزدور کو بھی کچھ ملے گا تو وہ کسی سرمایہ والے سے ملے گا۔ جب اس کی نجات بنے گی۔ سرمایہ دار وہ ہے جو اپنے علم اور قابلیت سے دکان پر بیٹھ کر لاکھوں روپے کی کمائی کر رہا ہے۔ وہ اپنے علم کے زور سے پل رہا ہے۔ جو بے چارے علم نہیں رکھتے، وہ اس کے ساتھ لگ گئے ہیں، تو ہزار پانچسو کی روزی اس کے ذریعہ سے ہو رہی ہے۔ مگر انجام یہی نکلا کر ان کی سمجھداری اور قابلیت سے دولت پیدا ہوئی ہے، جہالت سے پیدا نہیں ہوئی۔ دنیا کی بات ہو یا آخرت کی، دونوں چیزیں ہیں علم سے متعلق —— تو آپ نے ارشاد فرمایا:۔

الناس کلھم ھالکون الا العالمون۔ — تمام انسان ھلاک ہونے والے ہیں، علم والے بچیں گے۔

علم محض کارآمد نہیں

مگر علم والے بھی غرّہ نہ کریں۔ علم والے بھی ناز نہ کریں کہ بس ہمارے لئے

تو نجات ہے" نہیں۔ دوسرا جملہ بھی فرمایا :۔

والعالمون کلھم ھالکون — علم والے بھی سب تباہ و برباد ہیں۔ بچیں گے

الا العاملون۔ — وہ جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

اگر عمل نہ ہو، تو علم محض کوئی کار آمد چیز نہیں ہے، بلکہ اور زیادہ وبال بن جاتا ہے۔ علم جب کار آمد بنتا ہے، جب اس کا استعمال کیا جائے، اس کو عمل میں لایا جائے۔ علم محفوظ بھی جبھی رہتا ہے جب عمل میں آئے۔ ترقی بھی جبھی ہوتی ہے جب عمل میں آئے۔ اگر آپ ایک علم سیکھ لیں، لیکن استعمال میں نہ لائیں، چند دن کے بعد بھول جائیں گے۔ کام کے اندر لاتے رہیں، وہ ذہن کے اندر حاضر رہے گا، محفوظ رہے گا۔ ہم تو اپنا تجربہ آپ سے عرض کرتے ہیں ——— اور غالباً ہر طالب علم کو یہی تجربہ ہوگا کہ جن مسائل پر ہمارا عمل ہے، ان کا علم محفوظ ہے، اور جن مسائل پر عمل کی نوبت نہیں آتی، وہ یاد ہی نہیں رہتے۔ مثلاً نماز کے مسائل تو وہ ہیں، اگر آپ پوچھیں تو شاید میں فوراً بتلا دوں۔ لیکن اگر حج کے مسائل پوچھیں گے، تو ذرا کتاب دیکھنی پڑے گی۔ اس لئے کہ ہر روز عمل کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ عمر میں ایک مرتبہ حج کر لیا۔ یاد ہی نہیں رہتے۔ اور اگر بیع و شراء کے مسائل پوچھیں اس میں تو شاید ایک مسئلہ بھی بے کتاب دیکھے بتانا مشکل ہوگا، اس لئے کہ خرید و فروخت کی نوبت تو کبھی آتی ہی نہیں۔ جو یہ یاد رہے کہ یہ بیع باطل ہے، یہ بیع فاسد ہے۔ یہ بیع اچھی ہے۔ یہ بیع مکروہ ہے۔ اس لئے کہ ان مسائل پر ہمارا عمل نہیں۔ بلکہ آپ لوگوں کو اگر مسائل معلوم ہو جائیں۔ آپ کو بنسبت عالم کے بیع و شراء کے مسائل زیادہ یاد رہیں گے، کیوں کہ رات دن آپ کو سابقہ پڑے گا۔ جن مسائل پر عمل ہوتا رہتا ہے، ان کا علم محفوظ رہتا ہے، اور جن مسائل پر عمل نہ ہو، علم محفوظ نہیں رہتا۔ اسی لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، علم محض کار آمد نہیں ہے، جب تک اس کا استعمال نہ ہو، اس پر عمل نہیں، وہ علم بیکار ہے، بلکہ وہ اور اللہ کی طرف سے زیادہ حجت بن جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن علماء کی ایک جماعت کو بلایا جائے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے، ہم نے تمہیں علم دیا، اور بڑا علم دیا، بلکہ کئی کئی قسم کے علوم دیئے۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا ؟ وہ عرض کریں گے، ہم نے مسائل بتائے، ہم نے نصیحت کی، ہم نے کتابیں تصنیف کیں۔ فرمایا، کیں مگر کیوں کیں ؟ لیقال انک عالم۔ تاکہ دنیا میں شہرت ہو جائے کہ تم بڑے عالم تھے۔ تو وہ ہو گئی۔ وہ چیز مل گئی جس کے لئے تم نے محنت کی تھی۔ مجھ سے اب کیا چاہتے ہو ؟ اس قسم کے علماء کو گھسیٹ کر اوندھے منہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔ علم ان کے کام نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ اس کے اوپر عمل نہیں تھا۔ تو علم محض بے کار ہے۔ جب تک کہ اس کے ساتھ عمل نہ ہو، بلکہ احادیث کے دیکھنے سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جو بے چارے بے پڑھے لکھے لوگ ہیں مگر کچھ نہ کچھ نیکی کرتے ہیں۔ ان کی نجات جلدی ہو جائے گی، علماء کی دیر سے ہو گی۔ اس واسطے کہ عالم سے تو یہ کہا جائے گا کہ آپ تو یہ بات بھی جانتے تھے، پھر اس پر عمل کیوں نہ کیا ؟ یہ مسئلہ معلوم تھا، اس پر کیوں نہ عمل کیا ؟ اور جو بے چارہ بے پڑھا لکھا ان پڑھ تھا، اس سے اجمالاً کہا جائے گا کہ نماز پڑھی تھی ؟ اس نے کہا حضور پڑھی تھی۔ زکوٰۃ دی تھی ؟ جی ہاں دی تھی۔ کہ اچھا جاؤ جنت میں۔ اس لئے کہ نہ زیادہ علم نہ زیادہ عمل، اس لئے زیادہ علم بھی ایک مصیبت کی چیز ہے، مواخذہ بڑھ جاتا ہے۔

آپ کے سامنے کوئی بے وقوف سا سیدھا سادھا آدمی آجائے، تو ایک آدھ بات پوچھ کے آپ کہیں گے، جاؤ چھٹی، اور جو ذرا سمجھ دار ہے، جو کچھ زیادہ بولتا ہے، اس سے سوالات بھی زیادہ کریں گے۔ امتحان لینے والا جب بیٹھتا ہے، اگر کوئی طالب علم سیدھا سادھا بے وقوف سا ہے، ایک دو موٹی بات پوچھی، نمبر دے دیئے، جاؤ تمہیں پاس کر دیا۔ اور اگر کوئی ذکی ہے، بولتا زیادہ ہے۔ ممتحن اس سے زیادہ سوالات کریں گے، کہ یہ بات تم نے کیوں کہی ؟ اور یہ کیوں کہی ؟ اس کے نمبر مشکل سے آتے ہیں ــــ اسی واسطے حدیث میں ہے کہ:ــ

علیکم بدین العجائز: بوڑھیوں کا دین اختیار کرو۔

پُرانے زمانے کی بڑی بوڑھیاں جو ہیں، وہ اپنے دین پر چل رہی ہیں، نہ ان کے دل میں شک ہے نہ شُبہ، نہ زیادہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا پکا دین ہے۔ ایسا دین اختیار کرو، جس میں نہ شکوک ہوں، نہ سوالات ہوں۔ جلدی سے نجات مل جائے۔ زیادہ علم وبال بن جاتا ہے، اگر اس پر عمل نہ ہو۔ اور اگر عمل ہوا، پھر اس میں شک نہیں ہے کہ ترقی بھی بڑی ہے، درجات بھی بڑے ہیں۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محض علم پر غرّہ مت کرو۔ علم کارآمد نہیں ہے جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ اور اس کا استعمال نہ ہو، تو دو چیزیں فرمائی گئیں کہ آدمی کی نجات جہالت میں نہیں بلکہ علم میں ہے اور محض علم میں نہیں ہے بلکہ عمل میں ہے

بڑا عمل بلا اخلاص معتبر نہیں

پھر آگے ایک بات اور ارشاد فرمائی:۔

والعاملون کلهم هالکون الا المخلصون۔

— عمل کرنے والے سب تباہ و برباد ہیں، ان کے عمل کو بھی نہیں پوچھا جائے گا۔ عمل کرنے والے بھی سب تباہ و برباد، بچیں گے کون؟ مخلصین، جو اپنے عمل میں خلوص رکھتے ہیں، للّٰہیت رکھتے ہیں۔ دکھلاوے کے لئے عمل کرے، وہ وبال کی چیز ہے۔ شہرت پسندی کے لئے عمل کرے، وہ تباہی کی چیز ہے۔ خالص خدا کی رضا کے لئے عمل کرے، وہی عمل کارآمد ہوتا ہے، اسی پر انسان کی نجات ہے۔

— تو فرمایا لوگوں کی نجات شکل و صورت سے نہیں ہوگی، علم سے ہوگی۔ پھر فقط علم سے نہیں ہوگی، عمل سے ہوگی، پھر فقط عمل سے نہیں ہوگی، اخلاص سے ہوگی، للّٰہیت سے ہوگی۔ دو رُخے پن سے عمل کرے کہ خدا کو بھی خوش کر لوں، اور کچھ بندوں کو بھی خوش کر لوں۔ وہ عمل معتبر نہیں ہے۔ فقط اللہ کی رضا کے لئے ہو،

وہی عمل معتبر ہوگا، ورنہ نہیں ہو سکتا۔ تو فرمایا کہ:۔

والعاملون کلھم ھالکون — عمل کرنے والے بھی سب تباہ و برباد ہیں

الا المخلصون۔ — خلوص والے بچیں گے۔

اگر کسی عمل کی شکل و صورت بڑی ہو، لیکن اس میں اخلاص نہ ہو، تباہی کا ذریعہ ہے۔ اور چھوٹا سا عمل ہو، بالکل معمولی سا ہو، مگر خلوص اور للّٰہیت ہو تو وہ عمل نجات کا ذریعہ بن جائے گا۔ حدیث میں خلوص کی تین مثالیں فرمائی گئیں، اور تین ہی مثالیں حدیث میں بلا خلوص کے عمل کی فرمائی گئیں۔ اور نتائج الگ الگ ——

ابھی جیسے میں نے ایک حدیث کا جزء سنایا، کہ علماء کی ایک جماعت بلائی جائے گی۔ حق تعالےٰ اپنا احسان جتلائیں گے کہ ہم نے تمہیں قسم قسم کے علم دیئے، تم نے کیا کیا —— ؟ کہیں گے، ہم نے نصیحت کی۔ ہم نے درس و تدریس کیا۔ ہم نے تبلیغ کی، ہم نے تصنیف کی —— فرمائیں گے، کی مگر کیوں کی ؟ لیقال انک عالم۔ تاکہ دنیا میں شہرت ہو جائے کہ تم بڑے عالم تھے، تو فقد قیل۔ وہ شہرت ہو گئی۔ تمہارا مقصد مل گیا۔ اب ہم سے کیا چاہتے ہو۔ یہاں تمہارے لئے اب کیا ہے ؟ —— انہیں جہنم میں ڈالا جائے گا ——

حدیث میں ہے کہ مالداروں کی ایک جماعت بلائی جائے گی، جن کو لاکھوں کی رقم اللہ نے دی تھی۔ حق تعالےٰ احسان جتلائیں گے۔ ہم نے تمہیں لکھ پتی، کروڑ پتی بنایا۔ لاکھوں کا مال دیا۔ اور ایک ہی قسم کا نہیں۔ نقد الگ دیا، باغات الگ دیئے، بلڈنگیں الگ دیں۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا —— وہ کہیں گے، ہم نے صدقہ کیا، خیرات کیا، ہم نے یتیموں کو، بیواؤں کو دیا —— فرمایا، دیا مگر کیوں ؟ لیقال انک جوادٌ —— تاکہ دنیا میں شہرت ہو کہ تم بڑے سخی داتا ہو۔ بڑے دینے والے ہو۔ تو وہ تو ہو چکی شہرت۔ ہم سے کیا چاہتے ہو ؟ یہ جماعت بھی اوندھے منہ جہنم میں ڈالی جائے گی ——

حدیث میں فرمایا گیا کہ ایک جماعت شہیدوں کی بلائی جائے گی۔ حق تعالےٰ

فرمائیں گے ہم نے تمہارے بدنوں میں طاقت دی۔ تمہیں پہلوانی کے بدن دیئے۔ تم میں قوتیں دیں۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا ——؟ عرض کریں گے کہ ہم نے جہاد کیا، ہم نے جانیں لڑا دیں۔ ہم نے گردنیں کٹا دیں، خون بہا دیا۔ فرمائیں گے یہ کیا، مگر کیوں ؟ لیقال انک جری۔ تاکہ دنیا میں تمہاری شہرت ہو کہ تم بڑے بہادر ہو، تم بڑے جواں مرد تھے۔ فقد قیل۔ وہ شہرت ہو گئی۔ اب ہم سے کیا چاہتے ہو جب؟ اس جماعت کو بھی اوندھے منہ ہی جہنم میں ڈالا جائے گا۔

آپ نے دیکھا کہ علم سے تبلیغ کرنا، کتنا بڑا عمل ہے، پیغمبروں کا عمل ہے، مگر اکارت ہو گیا۔ اس لئے کہ اس میں خلوص نہیں تھا۔ سخاوت کتنا بڑا عمل ہے، صدقہ خیرات لاکھوں کروڑوں دیا۔ اتنا بڑا عمل بے کار ہو گیا۔ اس لئے کہ اس میں خلوص نہیں تھا۔ شہرت پسندی کا جذبہ تھا۔ جہاد کتنا بڑا عمل ہے کہ آدمی نے جان تک دیدی۔ مگر عمل مقبول نہیں ہوا۔ اس لئے کہ اس میں خلوص نہیں تھا۔ تو عمل کا ڈھانچہ کام نہیں دیتا جب تک عمل کے اندر جان نہ ہو، روح نہ ہو۔ روح اخلاص اور خلوص ہے، اس سے عمل کے اندر جان پیدا ہوتی ہے۔ اگر جان نہ ہو، تو مردہ لاش کتنی ہی موٹی تازی ہو، پہلوانوں جیسی ہو، وہ تو دفن کرنے کے قابل ہوتی ہے، کار آمد نہیں ہوتی۔ کار آمد جبھی ہے جب اس کے اندر جان اور روح ہو —— تو عمل کی شکل کتنی ہی بڑی ہو، اگر اس میں اخلاص کی روح نہیں ہے، خلوص کی روح نہیں ہے، وہ عمل کار آمد ثابت نہیں ہو گا۔ تو بڑے بڑے اعمال کی تین مثالیں آپ نے سنیں۔ جو خلوص نہ ہونے کی وجہ سے بے کار ہو گئے۔

چھوٹا عمل خلوص کی وجہ سے ذریعہ نجات ہے

تین مثالیں حدیث میں چھوٹے چھوٹے اعمال کی بیان کی گئیں۔ کوئی بڑے عمل نہیں تھے۔ خلوص کی وجہ سے نجات کا ذریعہ بنے —— حدیث میں ہے کہ تین آدمی سفر کے لئے نکلے، چند میل دور نکلے تھے کہ زور کی بارش آئی۔ سامان کچھ پاس

تھا نہیں - تو انہوں نے کہا کہ بھائی بارش شدید آگئی، پہاڑ میں قریب یہ غار نظر آ رہا ہے، اس میں چھپ کر بارش سے بچو، جب بارش ختم جائے گی پھر اس غار سے اپنا سفر شروع کریں گے، تو تینوں مل کر اس کے اندر اتر گئے، وہ صاف ستھرا تھا - اس میں بیٹھ گئے - حدیث میں ہے کہ جب بارش شدید ہوئی تو اوپر سے ایک بڑی چٹان اور پتھر جو منوں وزن کا تھا - لڑھکا - تو وہ ٹھیک اس غار کے منہ کے اوپر آکر رُک گیا اور غار کا منہ بند ہو گیا - اب نکلنے کی کوئی صورت نہیں - تینوں نے دیکھا تو سمجھ گئے کہ ہماری موت کا وقت آگیا ہے - اس لئے کہ چٹان کو ہلا نہیں سکتے ـــــ اس کا ہٹنا ممکن نہیں - کوئی صورت نہیں - دو وقت کا ہمارے پاس کھانا پینا ہے - کھاتے پیتے رہیں گے - اس کے بعد سسک سسک کر مرنا اور جان دینا ہے - چنانچہ مرنے کے ارادے سے بیٹھ گئے - غم ان کے دلوں پر چھا گیا، آنسو جاری ـــ اب بے چارے کچھ نہیں کر سکتے - جب ایک دن گزر گیا، اور وہ ناشتہ بھی ختم ہونے لگا اور یقین ہو گیا کہ اب ہماری موت لازمی ہے - تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ بھئی! مرنا تو ہے ہی، کوئی تدبیر ہی کرنی چاہیئے - دوسروں نے کہا کہ بھئی تدبیر کر بھی کیا سکتے ہیں - یہ تو منوں وزن کی چٹان ہے، نہ اسے ہلا سکتے ہیں، نہ اسے توڑ سکتے ہیں - سوائے اس کے کہ مریں اور کیا کریں گے - اس نے کہا نہیں، میری سمجھ میں ایک تدبیر آئی ہے - کم سے کم وہی کر لو - دونوں نے کہا کہ بھئی! کیا تدبیر ہے؟ اس نے کہا، مادی تدبیر تو ہے نہیں - کہ کسی پھاوڑے سے پتھر کو توڑ دیں - یہ تدبیر نہیں - بلکہ روحانی تدبیر ہے - اور وہ یہ کہ ہم تینوں بیٹھ کر اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیں - اگر کسی کی زندگی میں کوئی نیک عمل ایسا ہوا ہے، جس میں کامل خلوص اور للّٰہیت تھا - اس عمل کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کریں - یہ تو ہم کر سکتے ہیں - سب نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے - اب باری باری سب نے اپنے اعمال پیش کرنے شروع کر دیئے -

ایک کھڑا ہوا اور اس نے کہا اے اللہ! تو دانا اور بینا ہے، تو جانتا ہے کہ

میں ایک غریب آدمی تھا۔ میرے ہاتھ پلے کوئی پیسہ نہیں تھا مگر صورتِ حال یہ تھی کہ میرے پاس ایک بکری تھی، اسی کے دودھ پر میرا گزر تھا۔ تو میں یہ کیا کرتا تھا۔ کہ میری ایک ماں تھی، بیوی تھی، چند بچے تھے۔ میں بکری کا دودھ نکالتا اور رات کو سب سے پہلے وہ دودھ اپنی ماں کے سامنے پیش کرتا کہ اس کا حق مقدم ہے۔ یہ بڑی بوڑھی ہے، اس کی وجہ سے ہم ہیں۔ اس کا حق مقدم ادا ہونا چاہیئے۔ تو میں وہ دودھ اس کے سامنے پیش کرتا۔ جب وہ پیٹ بھر لیتی اور دودھ بچ رہتا، اس میں سے بچوں کو پلاتا، اس میں سے بچ رہتا تو بیوی کو پلاتا، اس سے بچ جاتا تو اخیر میں میں پیتا تھا، کبھی نہیں بچتا تھا تو میں فاقہ کر لیتا تھا، مگر ان کے حقوق کو مقدم سمجھتا تھا۔

ایک دن میں دودھ لے کر آیا۔ ذرا دیر ہوگئی، تو میری ماں کی آنکھ لگ گئی۔ میں اس کی پائنتیوں دودھ کا پیالہ لئے کھڑا رہا کہ جب بھی اس کی آنکھ کھلے گی، میں دودھ کا پیالہ پیش کروں گا۔ بچے رو رہے تھے، بلک رہے تھے، ان کا حق مقدم نہیں، ماں کا حق مقدم ہے۔ میں دودھ کا پیالہ لئے کھڑا رہا۔ آدھی رات کہیں اس کی آنکھ کھلی، جب کہ بچے سو چکے تھے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔

اس نے بھوک سے بیتاب ہو کر کہا کہ دودھ! میں جھٹ پیالہ لے کر پہنچا، اس نے دودھ پیا، اور مجھے بڑی دعائیں دیں، جو بچا میں نے بیوی اور بچوں کو پلایا، جو کچھ بچا تو میں نے بھی پی لیا۔ اے اللہ! یہ جو میں نے عمل کیا، اس میں کوئی دونئی نہیں تھی، کوئی دکھلاوا اور سناوا نہیں تھا، صرف تیری رضا کے لئے میں نے یہ عمل کیا تھا، اگر واقعی تیرے ہاں میرا یہ عمل خلوص کی وجہ سے قبول ہوا۔ تو اے اللہ! اس مصیبت سے ہمیں نجات عطا فرما ——— حدیث میں ہے کہ ایک تہائی پتھر ہٹ گیا، اور غار کا منہ کھل گیا۔

اب دوسرا کھڑا ہوا، اس نے کہا، اے اللہ! تو جانتا ہے۔ دانا بینا ہے، میں ایک مزدور قسم کا آدمی تھا، کچھ روپیہ پیسہ میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔ میرے

ایک چچا کی بیٹی تھی، جو بڑی حسین وجمیل تھی۔ مجھے اس کے ساتھ عشق پیدا ہوا۔ میں نکاح کا پیغام نہیں دے سکتا تھا، اس لئے کہ میرے ہاتھ پلے کچھ بھی پیسہ نہ تھا، اور وہ ذرا بڑے گھر لینے کی تھی۔ میں نے اس کے سامنے تنہائی میں جا کر اپنا مقصد پیش کیا۔ مطلب یہ تھا کہ میں بدکاری میں مبتلا ہوں۔ اس نے کہا میری ایک شرط ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک ہزار گنی یا ایک ہزار پونڈ کی تھیلی جب تو لا کر دے گا۔ تب میں اس بدعملی پر آمادہ ہو سکتی ہوں۔ ورنہ نہیں۔ میں نے جا کر مزدوری کی محنت کی۔ برس دن میں جا کر کوئی ایک ہزار گنی جمع کی۔ اور وہ سونے کے ٹکڑوں کی تھیلی بھر کر میں لے آیا، اور تنہائی میں اس عورت کو بلایا۔ اور میں نے کہا کہ تیری یہ شرط پوری کر دی، اور یہ ایک ہزار گنیوں کی تھیلی سامنے موجود ہے، اب تجھے انکار کرنے کی ضرورت نہیں، اس نے کہا بے شک اب میں انکار نہیں کر سکتی۔ شرط پوری ہو گئی۔ میں نے پورا ارادہ کیا کہ میں بدعملی اور سیاہ کاری میں مبتلا ہوں۔ جب میں پوری طرح آمادہ ہوا، اس عورت نے کہا کہ اے شخص! اتق اللہ۔ اللہ سے ڈر، یہ جو تو بدعملی کرنا چاہ رہا ہے، قیامت کے دن کھلنے والی ہے۔ مجھے اور تجھے اللہ کے آگے جواب دینا ہے۔ خدا سے ڈر، اور تقویٰ اختیار کر۔ تو میرا دل لرز گیا، اور کانپ گیا۔ میں اسی وقت کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا میں نے یہ ہزار گنی چھوڑی۔ اور ہمیشہ کے لئے توبہ کرتا ہوں، میں کبھی بدی کا ارادہ نہیں کروں گا۔ تو محض تیرے ڈر کی وجہ سے اے اللہ میں چھوڑ کر چلا آیا۔ بدعملی سے بھی بچا، اور وہ ہزار گنی بھی میں نے چھوڑی اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد سامنے نہیں تھا۔ محض تیری رضا کے لئے میں نے یہ کام کیا۔ اگر تیرے ہاں مقبول ہوا تو ہمیں نجات دے —— حدیث میں ہے کہ ایک تہائی پتھر اور سرک گیا۔ دو تہائی غار کا منہ کھل گیا۔

اب تیسرا کھڑا ہوا، اور اس نے کہا کہ اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں بھی ایک غریب آدمی تھا۔ کھانے پینے کو میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میرے ایک دوست نے سفر کا ارادہ کیا۔ اور سو روپے میرے پاس امانت رکھوائے، اور یہ کہا کہ جب

میں سفر سے واپس ہوں گا، میری امانت واپس کر دینا، اور تجھے اجازت ہے کہ تو میری عدم موجودگی میں خرچ کر لینا۔ جب میں آؤں گا تو دے دینا، کیونکہ امانت کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس روپے رکھوائے جائیں، تو بعینہٖ انہیں روپوں کا واپس کرنا ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ خرچ کر کے آدمی دوسرے دے دے۔ سَو روپے کے نوٹ اگر رکھوائے تھے، تو وہی نوٹ بعینہٖ واپس کرنے پڑیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ انہیں خرچ کر کے بدل کر نوٹ دے دے اور سو روپے پورے کر دے۔ سوائے اس کے کہ رکھوانے والا اجازت دے دے کہ تم خرچ کر سکتے ہو، جب تو آپ خرچ کر سکتے ہیں، اور بدلے میں نوٹ دے سکیں گے۔ اگر وہ اجازت نہ دے تو بعینہٖ اسی چیز کا واپس کرنا واجب ہے، جو آپ کے پاس رکھوائی گئی تھی —— تو اس شخص نے ۱۰۰/- روپے امانت رکھوائے اور ساتھ ہی اجازت دے دی، کہ تم خرچ کر سکتے ہو۔ اے اللہ! میں نے انہیں خرچ کیا، ان سَو روپے سے میں نے چند بکریاں خریدیں۔ بکریوں کا دودھ بیچنا شروع کیا، تو اس کی رقم آنی شروع ہوئی اس رقم سے کچھ اور بکریاں خریدیں، ان بکریوں کا دودھ بڑھا تو اور خریدیں —— تو نقد بھی جمع ہونا شروع ہوا۔ بکریوں کا غلہ بھی بڑھ گیا —— اس نقد سے پھر میں نے گائے خریدی، تو گائے کا غلہ بڑھنا شروع ہوا، اور بڑھا تو میں نے اونٹ خریدے غرض گائے، بیل، بکری، اونٹ اور بہت سا سامان جمع ہو گیا، پھر میں نے کچھ جائداد خریدی، کھیت خریدے، باغات خریدے، اس سے لاکھوں روپے کی آمدنی شروع ہو گئی۔ جب دس پندرہ برس گزر گئے، اور لاکھوں روپے میرے پاس جمع ہو گئے، تو اس نے کہا کہ بھائی میرا سَو روپیہ واپس کرو۔ تو میں بجائے اس کے سو روپیہ دے دیتا، میں نے ساری تجوریاں پیش کیں، سارے جانور پیش کئے، سارے باغات پیش کئے، کہ یہ ہے تیری امانت۔ اس نے کہا کہ میری امانت تو سَو روپے تھی۔ یہ لاکھوں روپے تو نہیں تھے۔ میں نے کہا کہ لاکھوں روپے ان سو روپے سے ہی بنے ہیں —— یہ لاکھوں روپے بھی تیرے ہی ہیں۔ اس لئے کہ سَو روپیہ تیرا تھا —— اس نے کہا،

نہیں مجھے سو چاہیئے - لاکھوں نہیں چاہیئے۔ میں نے کہا یہ لاکھوں بھی تیرے ہی ہیں۔ آخر میں نے اس کو قبضہ دلا دیا۔ اور ساری بلڈنگیں، سارے باغات، اور سارے چوپائے سپرد کر دیئے۔ اور میں پھر ویسا ہی بھک منگا بن گیا۔ پھر وہی فاقہ مستی ہوگئی۔ ایک پائی میرے ہاتھ میں نہیں تھی۔ اے اللہ! میں نے یہ عمل تیری رضا کے لئے کیا۔ میں نے اپنے ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر نہیں کیا۔ اگر یہ عمل تیرے ہاں مقبول ہے تو ہمیں نجات دے۔ حدیث میں ہے کہ جو ایک تہائی چٹان رہ گئی تھی وہ بھی سرک گئی، غار کا پورا منہ کھل گیا، اور انہیں نجات ہوئی —— یہ باہر آئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔

دیکھیئے سخاوت، تبلیغ، شہادت اور علم پڑھانے جیسا عمل بے کار ہو گیا جہنم سے نہیں بچا سکا۔ اس لئے کہ ان میں خلوص نہیں تھا اور یہ چھوٹے چھوٹے اعمال کہ ماں کا حق ادا کیا۔ وہ تو فرض واجب ہے، ادا کرنا ہی ہے۔ اسی طرح زناکاری سے بچ گیا، وہ تو اس کا فرض ہے زنا سے بچنا، اس نے کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ اسی طرح سے امانت سپرد کر دی اس کے فرائض میں تھا کہ امانت سپرد کرتا۔ کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے اعمال تھے مگر خلوص سے کئے، تو دنیا میں نجات کا سبب بن گئے، اور اللہ کے ہاں مقبولیت کا سبب بن گئے۔ اللہ اگر عمل قبول نہ کرتا۔ تو یہ نجات نہ ہوتی، اور چٹان نہ ہٹتی۔ تو خدا کے ہاں بھی مقبولیت ہوئی، دنیا میں بھی نجات ملی، حالانکہ عمل بالکل حقیر سے تھے لیکن خلوص تھا —— اور وہ بڑے بڑے تین اعمال تھے۔ وہ جہنم سے نہیں بچا سکے، اس لئے کہ ان میں خلوص نہیں تھا۔ تو اصل بنیادی چیز اخلاص ہے۔ خلوص سے جو عمل ہوگا، وہی اللہ کے ہاں قبول ہوگا اس لئے کہ خلوص عمل کی روح ہے۔ کسی چیز کے ڈھانچے کی قیمت نہیں ہوتی۔ اس کی جان کی قیمت ہوتی ہے۔ لاش کی قیمت نہیں، جاندار میں جان کی قیمت ہوتی ہے۔ تو عمل کا ڈھانچہ مقبول نہیں۔ کتنا ہی بنا سنوار کے نماز پڑھیں۔ نیت یہ ہو کہ لوگ ہمیں نمازی کہیں، وہ کوئی مقبول چیز نہیں ہے۔ منہ پر مار دینے کے قابل ہے۔

بنیادی اور اساسی چیز انسان کے لئے خلوص، للّٰہیت اور اخلاص ہے۔ اللہ کی رضا کے لئے عمل کرنا ہے، مخلوق کے دکھلاوے کے لئے عمل کرنا یہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ اس لئے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

والعاملون کلھم ھالکون الا المخلصون

عمل کرنے والے بھی سب کے سب برباد ہیں۔ خلوص والے بچیں گے، جنہوں نے سچائی اور اخلاص سے عمل کیا۔

گویا تین بنیادی چیزیں فرمائی گئیں کہ:-

الناس کلھم ھالکون الا العالمون۔ انسان ہلاکت اور تباہی سے بچنے والے نہیں ہیں مگر علم والے بچیں گے۔ علم اور عمل ہی نجات کا ذریعہ بنے گا، خلوص للّٰہیت نجات کا ذریعہ بنے گا۔ گویا علم بھی ہو، اس کے ساتھ عمل بھی ہو، اس کے ساتھ اخلاص بھی ہو۔ تب جا کے نجات کا ثمرہ پیدا ہوگا۔

غرور اخلاص کو ختم کر دیتا ہے

مگر اخلاص کے بعد ایک چیز اور ارشاد فرمائی:-

والمخلصون علی خطر عظیم

خلوص ہو تو آدمی غرور نہ کرے، اترائے نہیں کہ میں نے بڑے خلوص سے عمل کیا، مرتے دم تک خطرہ ہے، جب خاتمہ اخلاص پر ہو جائے، تب اطمینان کرے کہ اب نجات ہوئی ہے۔ ورنہ خاتمہ سے پہلے پہلے اگر کہیں اتراہٹ پیدا کی، کہیں دل میں کبر و غرور آ گیا کہ میں بڑا مخلص ہوں، سارا عمل ختم ہو جائے گا۔ سب عمل نامقبول ہو جائے گا —— تو اخلاص اس وقت تک معتبر نہیں ہوتا جب تک انسان کے اندر خدا پر بھروسہ کرنے کا جذبہ نہ ہو۔ ناز و اتراہٹ نہ ہو، کبر اور غرور نہ ہو کہ میں کوئی چیز ہوں۔ میں نے کوئی عمل کیا۔

مدارِ نجات صرف اللہ کا فضل ہے

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک واقعہ ارشاد فرمایا، حدیث میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص عابد زاہد تھا، رات دن اللہ کی یاد میں لگا رہتا تھا، اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں عمل کرتا ہوں، محنت بھی کرتا ہوں مگر بہرحال بیوی ہے، بچے ہیں، کھیتی باڑی ہے، کمائی ہے، کچھ نہ کچھ اس میں بھی وقت لگانا پڑتا ہے، کوئی ایسی صورت ہو کہ یہ سارے جھگڑے ختم ہوں، اور چوبیس گھنٹے میں خدا ہی کی یاد میں لگا رہوں، اس زمانے کی شریعتوں میں یہ بات جائز تھی، آج کی شریعتوں میں یہ بات جائز نہیں ہے، اس زمانے میں یہ جائز تھا کہ آدمی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے پہاڑ کی چٹان پر چلا جائے، تو اس شخص نے رہبانیت اختیار کی، اور وہ یہ کہ بیوی بچے اور مال و دولت کو چھوڑ کر سمندر کے بیچ میں پہاڑ کا ایک ٹیلہ تھا، وہاں جا کے چھپر ڈالا، کہ یہاں بیٹھ کے اللہ کی عبادت کروں گا، اب یہاں نہ بیوی سامنے ہوگی، نہ اولاد نہ تجارت نہ دکان سامنے ہوگی، بس میں ہمہ تن اپنے خدا کو یاد کروں گا، وہاں بیٹھ گیا۔

—— اب کھانے پینے کے لئے تو چاہیئے ہے اللہ نے اس کے لئے یہ سامان کیا کہ اسی کڑوے سمندر میں ٹیلے کے اوپر نہایت میٹھا چشمہ نکل آیا، اور اسی سے ٹھنڈا پانی بہہ پڑا۔ اور اسی ٹیلہ کے اوپر انار کا درخت اُگا یا، جس کو بڑے بڑے انار لگنے لگے، اور بڑا میٹھا اور بہت ہی قوی قسم کا انار —— اس عابد کا کام یہ تھا کہ روزانہ ایک انار کھا لیتا، اور ایک کٹورا پانی کا پی لیتا۔ اور صبح و شام اللہ کے ذکر میں مصروف —— نہ رات کو سونا، نہ دن کو آرام کرنا، بس دن بھی اور رات بھی اللہ کے ذکر میں مصروف —— پانچ سو برس اس عابد نے اسی طرح سے گذارے ہیں، کہ ایک کٹورا پانی کا اور ایک انار روز، اور چوبیس گھنٹے خُدا کی یاد اور عبادت ——

مرتے وقت اس نے اللہ سے دعار کی کہ یا اللہ! جب تُو نے مجھے عمر بھر عبادت کی توفیق دی اور پانچ سو برس عبادت میں لگے، میری موت سجدہ کی حالت میں ہو، اور میرے بدن کو تو قیامت تک محفوظ رکھ، تاکہ میں قیامت تک تیرا سجدہ گذار بندہ سمجھا جاؤں۔ بقیہ زمانہ بھی گویا میں نماز ہی میں لگا ہوا ہوں۔ جب میرا بدن قیامت تک سجدہ میں پڑا ہوا ہے، تو یہ ایسا ہے جیسے میں قیامت تک نماز ہی پڑھتا رہا۔ یہ دُعار قبول ہوئی ــــ عین سجدہ کی حالت میں اس کا انتقال ہوا۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں آج تک اس کا بدن اس پہاڑ کے ٹیلے پر محفوظ ہے۔ لیکن اللہ نے اس کے ارد گرد بڑے بڑے گنجان درخت پیدا کر دیئے ہیں ــــ لوگ وہاں جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہیبت پیدا کر دی، اس لئے کہ اگر لوگ جاتے اور دیکھتے کہ ایک مردہ سجدہ میں پڑا ہوا ہے، تو بڑا فتنہ پھیل جاتا، کوئی پوجا پاٹ شروع کر دیتا، کوئی اس کی عبادت شروع کر دیتا۔ اللہ نے مخلوق کو بچانے کے لئے بڑے بڑے عظیم درخت اُگا دیئے، ان کی وجہ سے اندھیرا ہو گیا، اور اندھیرے سے وہاں ایک ہیبت پیدا ہوئی، تو لوگ جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اس لئے نگاہوں سے وہ قصہ اوجھل ہے ــــ اس طرح سے اس عابد نے پانچسو برس گذارے ہیں۔

حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ مرنے کے بعد اس کی پیشی ہوئی حق تعالےٰ کے سامنے، حق تعالےٰ نے فرمایا، اے بندے! میں نے تجھے اپنے فضل و کرم سے بخشا، اور ملائکہ سے فرمایا کہ جنت کے اعلیٰ مقامات میں اس کا نام لکھ دو، اور اس کا داخلہ جنت میں منظور ہے اور جہنم سے اس کو بچا دیا گیا۔

اس عابد کے دل میں خطرہ یہ پیدا ہوا کہ پانچ سو برس تو میں نے محنت کی، بیوی، بچوں کو چھوڑا، شہر کو چھوڑا، اور اب بھی انہوں نے اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا۔ کم سے کم میری تسلی کے لئے ہی کہہ دیتے کہ تیری نمازوں کی وجہ سے تجھے نجات دی، تو نے پانچ سو برس سجدے کئے تھے، اس کے صلے میں تجھے جنت دی۔ اب بھی اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا۔ گویا میں نے ان کے سامنے کچھ کیا ہی نہیں،

یہ ایک وسوسہ پیدا ہوا، عقیدہ تو کفر کا تھا۔ لیکن وہ عقیدے سے بری تھا مگر دل میں ایک خطرہ گذرا، ان اللّٰہ علیم بذات الصدور۔ وہ تو دلوں کی کھٹک سے واقف ہے۔ وہ تو دلوں کے خطروں کو جانتے ہیں۔ جوں ہی یہ وسوسہ پیدا ہوا، حق تعالٰی نے ملائکہ علیہم السلام سے فرمایا۔ بجائے جنت میں لے جانے کے اس عابد کو جہنم کی طرف لے جاؤ۔ جہنم میں داخل نہیں کرنا مگر اتنی دور کھڑا کر دو کہ وہاں سے جہنم پانچ سو برس کے راستے پر ہو، وہاں لے جایا گیا۔ ایک دم جو جہنم کی طرف سے گرم ہوا اور لپیٹ آئی ہے، اور اس کے بدن کو لگی، تو تمام بدن میں کانٹے پڑ گئے، پیاس پیاس چلانا شروع کیا، جیسے معلوم ہو کہ اس کا اندر بالکل خشک ہو گیا، تری باقی نہیں رہی، جہنم میں جل کر تو کیا کیفیت ہوتی، اتنی دوری پر ہے، جہنم کی لو اور اک لپٹ لگی۔ سارا بدن لکڑی کی طرح خشک ہو گیا۔

حدیث میں ہے ایک ہاتھ نمایاں ہوا، جس میں ٹھنڈے پانی کا کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑا کہ اے خدا کے بندے! یہ پانی مجھے دینا، وہ ہاتھ پیچھے ہٹ گیا، آواز یہ آئی، کہنے والا تو کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، پانی تو ملے گا، مگر اس کی قیمت ہے مفت نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے کہا کیا قیمت ہے؟ آواز یہ آئی جس نے پانچ سو برس خالص عبادت کی ہو۔ وہ عبادت اگر کوئی دے تو اس کے بدلے میں ایک کٹورا مل سکتا ہے، ورنہ مفت نہیں دیا جا سکتا، —— اس نے کہا میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے، اور بڑی خالص عبادت ہے۔ اس میں کوئی نفاق شامل نہیں۔ اس نے وہ پانچ سو برس کی عبادت پیش کی، بدلے میں کٹورا مل گیا، پی کر ذرا اس کے دم میں دم آیا۔

حق تعالٰی نے، ملائکہ کو ارشاد فرمایا، اس کو واپس لاؤ، واپس لایا گیا، اس کی پھر پیشی ہوئی۔ حق تعالٰی نے فرمایا اے بندے! تیرے پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت تو ادا ہو گئی، اور وہ قیمت تو نے از خود تجویز کی کہ پانچ سو برس عبادت کی قیمت ایک کٹورا پانی ہے — وہ تو ہم دے چکے، معاملہ برابر سرابر ہو گیا، تو نے

پانچ سو برس کی عبادت دی۔ ہم نے ایک کٹورا پلایا، اور وہ تو نے خود تجویز کی کہ یہ قیمت ہے ہم نے نہیں کہا تھا۔ لہٰذا اس سے تو ہم ادا ہو گئے۔ اب حساب دے، وہ جو دنیا میں تو نے لاکھوں کٹورے پانچ سو برس پیئے، ان کے بدلے میں کیا عبادت لے کر آیا ہے اور وہ جو انار کے لاکھوں دانے تو نے کھائے ہیں۔ تو انار کے ایک ایک دانے کے بدلے میں کتنے سجدے لے کر آیا ہے؟ یہ تو دانہ اور پانی تھا۔ وہ جو تو نے ہماری ہوا کے ذریعے لاکھوں سانس لئے ہیں، جس سے تیری زندگی قائم تھی۔ اب ایک ایک سانس کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کر آیا ہے، اور وہ جو تیری آنکھوں میں ہم نے نور پیدا کیا تھا، جس سے تو اچھے اور بُرے کو دیکھتا تھا۔ ایک ایک تارِ نگاہ کے بدلے میں کتنے سجدے لے کر آیا ہے؟ کتنی عبادتیں لے کر آیا ہے؟ اور وہ جو تیرے بدن میں ہم نے طاقت دی تھی، اس کا حساب دے، اس طاقت کے بدلے میں کتنی عبادتیں کیں۔ اور وہ جو تیرے دل میں توفیق اور ارادہ پیدا کیا تھا، اس کا بدلہ کیا لے کر آیا ہے؟ —— تو طاقت ہم نے دی۔ ارادہ تیرے قلب میں ہم نے پیدا کیا۔ توفیق ہم نے دی، دانہ پانی ہم نے پیدا کیا۔ تیرے بدن میں جان اور ہمت ہم نے پیدا کی، اور پھر بھی تجھے دعویٰ ہے کہ میں نے کچھ کیا، اور میرے کئے کے بدلے میں کچھ ملے۔ ارے یہ تو ہمارا کیا کرایا ہے، تو نے کیا کیا جس کے بدلے میں تو چاہتا ہے تجھے صلہ ملے —— لیکن اگر کیا تو اب حساب دے، یہ عابد گھبرا گیا، اور کہا:

"یا اللہ! بے شک نجات آپ کے فضل سے ہوتی ہے، کسی کے عمل سے نہیں ہوتی۔ عمل کی تو یہ قدر و قیمت ہے کہ پانچ سو برس کی عبادت کرے، تو وہ ایک کٹورا پانی کے برابر بھی نہیں"

اور وہ بھی اللہ کا فضل ہے، اگر وہ توفیق نہ دے، آدمی عبادت نہیں کر سکتا۔ بدن میں جان بھی ہو، سب کچھ ہو، مگر دل میں ارادہ ہی پیدا نہ ہو۔ ارادہ بھی ہو، مگر ہمت نہ ہو، کسل اور سستی بڑھ جائے۔ وہی توفیق دیتے ہیں، وہی ہمت دیتے ہیں، تب تو آپ سجدے کرتے ہیں۔ وہ نہ ہمت دیں تو سجدہ کیسے کریں؟

تو غرّہ اور اِترانے کے کیا معنی — ؟ ادھر کی ہی ساری چیزیں ہیں۔

ہر عمل توفیقِ خداوندی ہی سے وجود میں آتا ہے

وہ ایک شخص کا قصہ مشہور ہے کہ ایک لکھ پتی آدمی تھا، اس کے ہاں ایک ملازم تھا، تو وہ تو لکھ پتی تھے۔ ایک وقت کی بھی نماز بھی نہیں پڑھتے تھے۔ انہیں پتہ بھی نہیں تھا، کہ نماز کہتے کسے ہیں — اور یہ جو بوڑھا ملازم تھا، وہ بڑا پکا نمازی، فرض ہی نہیں سنتیں بھی، اور پچاسوں نفل پڑھ کے بھی دم نہ لے۔ یہ رات دن کہتے، کہ اے جب دیکھو نماز، جب دیکھو نماز، جب دیکھو بڈھے کو تو نماز۔ یہ تو نماز ہی نماز کا رہ گیا۔ ایک دن اس کے آقا بازار میں کچھ سامان لینے گئے اور ملازم سے کہا کہ ہمارے ساتھ چل۔ بوڑھا ملازم ساتھ ہو گیا۔ راستے میں مغرب کی اذان ہوئی۔ بوڑھے نے کہا صاحب! میں تو جاتا ہوں مسجد میں نماز پڑھنے، آقا نے چلا کے کہا کہ کمبخت! جب دیکھو نماز، جب دیکھو نماز، ارے تجھے اور بھی کوئی کام نماز کے سوا رہ گیا — خیر کہا — کہ جا اچھا، جلدی سے پڑھ کے آ۔ اب وہ آقا صاحب مسجد کی سیڑھیوں پہ کھڑے ہو گئے۔ وہ مسجد میں داخل ہوا، جماعت کے ساتھ نیت باندھ لی، جب فرض پڑھ لئے۔ تو اس کے بعد سنتیں پڑھیں۔ اب یہ آقا کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کا جی گھبرایا؛ کہ جلدی سے آئے، بازار کا وقت نکلا جا رہا ہے، سنتیں پڑھ کے اس نے اوابین کی نیت باندھ لی۔ اب ان کے دل میں غصہ اور گھٹن، کہ اس کمبخت کو اس کی بھی خبر نہیں۔ اب خدا جانے کب تک نفلیں پڑھے گا، جب اس نے دو نفلوں سے سلام پھیرا، اس نے دوسری نفلوں کی نیت باندھنے کا ارادہ کیا، تو انہوں نے چلا کر کہا کہ ارے کم بخت! آتا کیوں نہیں ——— ؟ تو جواب میں بوڑھے نے کہا کہ جی آنے نہیں دیتے، اور یہ کہہ کے بوڑھے نے پھر نیت باندھ لی۔ یہ گھٹ کے کھڑے ہو گئے۔ اب بڑے خشوع و خضوع سے دو رکعتیں پڑھیں۔ پانچ دس منٹ میں سلام

پھیرا، اور بوڑھا پھر نیت باندھنے کے لئے کھڑا ہونے لگا، تو انہوں نے چلا کے کہا کہ او منحوس! آتا کیوں نہیں ـــ ؟ کہ جی آنے نہیں دیتے، اور یہ کہہ کے پھر نیت باندھ لی۔ اب یہ اور غم و غصہ میں ـ جب چھ پوری ہو گئیں اور وہ پھر لگا کھڑا ہونے ـ تو انہوں نے کہا کہ آتا کیوں نہیں ؟ کہ جی آنے نہیں دیتے، کہ بھئی کون نہیں آنے دیتا؟ کہ جو آپ کو اندر نہیں آنے دیتے، وہ مجھے باہر نہیں آنے دیتے۔ تمہیں وہاں روک رکھا، مجھے یہاں روک رکھا ہے ـ

حقیقت یہی ہے کہ جو نماز نہیں پڑھتا، اسے پڑھنے نہیں دیتے۔ اس کو دھتکار دی ہے۔ بندہ کی کیا مجال تھی وہ اللہ سے گریز کرے اور بھاگے۔ جب وہی قبول نہ کریں تو یہ مجبور ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ عبادت نہ کرنے والا دھتکارا ہوا ہوتا ہے۔ پسند نہیں کرتے، اور جب توفیق دیتے ہیں، تو آپ کا نہ بھی جی چاہے، تب بھی آپ نماز پڑھیں گے، تب بھی آپ روزہ رکھیں گے۔ یہ سب اُدھر کی توفیق کے اوپر ہے۔ اگر کوئی بڑی سی بڑی عبادت بھی کرے، وہ دل میں اترائے نہیں، کہ میں نے کچھ کیا ہے۔ شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے توفیق دے دی۔ ہزاروں بندے ہیں جنہیں توفیق نہیں ہوتی۔ توفیق ملنا یہ خود مستقل نعمت ہے۔ اللہ نے توفیق دے دی۔

تو اصل یہی ہے کہ نجات ہمارے عمل سے نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہو گی، مگر بھئی اس کا یہ مطلب مت سمجھ جائیو کہ آج سے نماز صفر ہو جائے کہ نجات اللہ کے فضل سے ہو گی، ہمارے عمل سے تو ہونی نہیں، پھر محنت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جائیں مسجد میں، اور نمازیں پڑھیں، بس جس پر فضل ہونا ہوگا ہو جائے گا۔ نجات بھی ہو جائے گی، عمل کی کیا ضرورت ہے۔ یہ مت سمجھنا۔ بلاشبہ نجات اللہ کے فضل سے ہو گی۔ مگر فضل کی علامت یہ ہے کہ آپ عمل کر رہے ہیں ـ تو یہ عمل کرنا علامت ہے کہ فضل آپ کی طرف متوجہ ہے، اگر عمل نہ کرتے، تو یہ اس کی علامت تھی کہ فضلِ خداوندی آپ کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ تو عمل ضروری ہے۔ کیونکہ وہ فضلِ خدا کی علامت ہے۔ نجات بیشک اللہ کے فضل سے ہو گی۔

جو عبادت ہی صورۃً ہو تو اس پہ اترانا کیا؟

غرض تعلیم یہ دی گئی کہ کتنا بھی عمل کرے، مگر غرہ نہ کرے، ناز نہ کرے کہ میں نے کیا ہے۔ شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے توفیق دے دی۔ میرے اندر کچھ کرنے کی قوت نہیں تھی۔

ملائکہ علیہم السلام قیامت کے دن یوں کہتے ہوئے ہوں گے:۔

ماعبدناک حق عبادتک وما عرفناک حق معرفتک — اے اللہ! ہم نے کوئی حق تیری عبادت کا ادا نہیں کیا۔ ہم تجھے پہچان بھی نہیں سکے جیسے پہچاننے کا حق ہے۔

ہم اب تک جاہل اور لاعلم ہیں۔ تیرے کمالات کا اب تک بھی ہم اندازہ نہیں کر پائے۔ تیری ذات بہت بڑی ہے۔ تو فرشتے جو لاکھوں برس سے عبادت کر رہے ہیں، وہ بھی یہ کہیں گے کہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکے۔ ہم ایک پچاس، ساٹھ برس کی عمر لے کر آئے اور اس میں بھی چودہ برس لڑکپن کے نکال دو، کہ اس میں عبادت فرض نہیں ہوتی، اور اخیر کے دس پندرہ برس بڑھاپے کے نکال دو جس میں آدمی معطل ہو جاتا ہے۔ مشکل سے تیس پینتیس برس رہ جاتے ہیں، اور اس میں بھی سارے اوقات نماز کے نہیں ہیں، چوبیس گھنٹے میں سے بھی ہم بیس گھنٹے سونے اور اپنا مال و دولت کمانے میں لگاتے ہیں۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے میں لگاتے ہیں۔ اس پر بھی لگے غرہ کرنے کہ ہم نے بھی کچھ کیا ہے۔ یہ بڑی نادانی کی بات ہوگی، ہم تو کچھ بھی نہ کر سکے۔ جب لاکھوں برس عبادت کرنے والے ملائکہ جو نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، نہ سوتے ہیں، نہ غفلت میں ہیں، وہ کہیں کہ ہم کچھ نہیں کر سکے، اور ہماری یہ چند منٹ کی عبادت، اور عبادت بھی حقیقی نہیں، عبادت کی صورت بنا رکھی ہے۔ کھڑے ہوئے اللہ کے سامنے ہیں، دل میں وسوسے بھرے ہوئے ہیں۔ دل میں کہیں یہ ہے

کہ جلدی سے دو رکعت پوری ہوں تو دکان پہ جاؤں، سودا بیچنے کا حرج ہو رہا ہے۔ تاکہ جلدی پہنچ جاتا، آج شنبہ کا دن ہے، گاہک زیادہ آئیں گے۔ یہ نماز جلدی سے جلدی ختم ہو، تاکہ پیسے کماؤں، یہ صورت اور تصویر عبادت کی ہم نے بنائی۔ عبادت نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کا فضل اور انعام ہے کہ وہ اسے عبادت مان لیں، ورنہ یہ عبادت اس قابل نہیں کہ اسے قبولیت نصیب ہو۔ یہ محض ان کا فضل ہے، اور ان کا مفتی فتوٰے دے دے کہ ہاں ہوگئی نماز۔ تو اترانے کا، اور غرہ و غرور کا کوئی موقع نہیں ہے۔ بلکہ جتنا بھی ہو، آدمی شکر ادا کرے کہ میرے پروردگار نے مجھے توفیق دے دی۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

لن ینجی احدکم عملہ — تم میں سے کسی کو کسی کا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ — اللہ کا فضل نجات دلائے گا — صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا

ولا انت یارسول اللہ — یارسول اللہ! کیا آپ کا عمل بھی آپ کو نجات نہیں دلائے گا؟ — فرمایا —

لا۔ الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہٖ — مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا، جب تک اللہ ہی کا فضل دستگیری نہ کرے۔ — اور مجھے اپنی رحمت میں نہ ڈھانپ لے، میرا عمل بھی نجات دلانے والا نہیں ہے۔ فضلِ خداوندی ہی نجات دلانے والا ہے۔

حق تعالٰی کے سامنے اعترافِ قصور ہی شکر ہے

جب انبیاء علیہم السلام بلکہ سردار انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام جن سے بڑھ کر مخلوقات میں کوئی نہیں ہے، فرمائیں کہ مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلا سکتا۔ اللہ ہی کا فضل نجات دلائے گا، تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے کہ ہم اپنے کسی عمل پر ناز کرنے لگیں، ہم کسی عمل پر اترائیں کہ ہم نے بڑا کام کیا۔ بندہ کا کام یہی ہے کہ سب کچھ

کرکے کہے کہ میں کچھ نہیں کرسکا، خدا کی ثنا خوانی یہی ہے کہ ہم سے کچھ ثنا خوانی ممکن نہیں ہے، نہ ہم اللہ کی پوری تعریف کرسکتے ہیں، نہ پوری پوری عبادت کرسکتے ہیں، نہ ہم شکر ہی ادا کرسکتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ عاجزی اور قصور کا اعتراف کریں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے حکم دیا

اعملوا آل داؤد شکراً ۔ اے داؤد ہمارا شکر ادا کرو۔

واقعی انبیاء علیہم السلام ہی اللہ کے کلام کو سمجھتے ہیں، جیسے سمجھنے کا حق ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا، اے اللہ! شکر میں ضرور ادا کروں گا، جب آپ ارشاد فرما رہے ہیں، میرا فرض ہے کہ میں تعمیل کروں، اور میں ضرور ادا کروں گا مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ شکر کس طرح سے ادا کروں؟ ــــ اس واسطے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا، تو اس کے ادا کرنے کی توفیق آپ ہی دیں گے، تو توفیق ایک نعمت بن گئی، اس نعمت پر پھر مجھے شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اور جب اس کا شکر ادا کروں گا تو پھر ایک نعمت بن گئی تو پھر اس کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ ہر نعمت سے پہلے تو نعمت نکلتی ہے، شکر ادا کروں تو کس طرح، میں تو شکر کی ابتدا بھی نہیں کرسکتا، آپ کے شکر ادا کرنے سے قاصر ہوں۔

جواب آیا حق تعالیٰ کی طرف سے کہ اے داؤد! اگر تم نے یہ سمجھ لیا کہ تو ہمارا شکر ادا کرنے سے عاجز ہے، تو یہی شکر کی ادائیگی ہے، اسی کے معنیٰ شکر ادا کرنے کے ہیں۔ اس لئے کہ حقیقی معنے میں کوئی ہمارا شکر ادا نہیں کرسکتا۔ شکر نعمت کے مقابلے میں ہے، اور نعمتیں غیر محدود ہیں، ان کی کوئی انتہا نہیں ہے ــــ اور ہمارا دماغ بھی محدود، ہماری قوتیں بھی محدود، الفاظ و آواز بھی محدود، تو ہم شکر ادا کریں گے، تو اس میں حد لگی ہوئی ہوگی، اور نعمتوں کی کوئی حد نہیں۔ تو لامحدود کا شکر محدود ادا کیسے کرسکتا ہے؟ سوائے اس کے کہ اپنی ہاری مان لے، قصور کا اعتراف کرے، اپنے عجز کا اقرار کرے۔ یہی ہے فی الحقیقت شکر کی ادائیگی کہ آدمی اپنی عاجزی

مان لے، کہ میں بالکل عاجز ہوں، اللہ کے ہاں تو سب سے بڑی عبادت یہی ہے کہ اپنے نفس کا قصور مان لے۔ وہ کون ہے جو اس کی عبادت کا حق ادا کرے، لاکھوں برس عبادت کر کے جب ملائکہ کہیں گے کہ ہم کچھ نہیں کر سکے، ہم کیا چیز ہیں جو ہم کہیں کہ ہم نے عبادت کر لی، ہماری عبادت یہی ہے کہ جو حکم ہے اس کی پوری طرح تعمیل کر کے یوں کہیں، کہ یا اللہ! قصور ہوا ہے، ہم پوری طرح کچھ نہیں کر سکے، آپ معاف کر دیں، بس یہی ہماری عبادت ہے۔ یہ جبھی ہوگا، جب آخرت کا فکر چڑھا ہوا ہو۔ تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الناس کلھم ھالکون، سب انسان تباہ و برباد ہیں، بچیں گے علم والے، علم والے تباہ و برباد ہیں، بچیں گے عمل والے، عمل والے تباہ و برباد ہیں، بچیں گے خلوص والے، اور خلوص والے خطرے میں ہیں جب تک خلوص کے اوپر موت نہ ہو جائے، خاتمہ جب ایمان پر ہو جائے، جب مطمئن ہو کہ ہو گئی نجات — ممکن ہے کہ اس سے پہلے مرتے دم تک خدانخواستہ کوئی بات پیش آجائے، دل میں ایمان نہ رہے، دل ہی ایمان سے ہٹ جائے، عمل کی توفیق چھن جائے۔ بہت سے لوگ دیکھے گئے ہیں کہ پوری زندگی نیکیوں میں گذاری، اور مرنے کا وقت آیا تو لہو و لعب اور بری باتوں میں مبتلا ہو گئے، بہت سے دیکھنے میں آئے ہیں کہ پوری زندگی تو بری باتوں میں گذاری، خاتمہ کے وقت ایسی اچھی زندگی ہوئی کہ رات دن طاعت اور عبادت، اور بہترین خاتمہ ہوا، تو آدمی غرہ نہ کرے معلوم نہیں خاتمہ کیسے ہونے والا ہے، تو فرمایا گیا:-

والمخلصون علیٰ خطرٍ عظیم — مخلصین خطرہ میں ہیں

خطرہ جب ٹلے گا، جب موت آجائے گی، اب اطمینان کا وقت آیا، کہ اس چیز سے نجات پا گئے۔

روحانی زندگی کے عناصر اربعہ

نجات کے گویا چار اصول فرمائے گئے، ایک علم، ایک عمل، ایک اخلاص،

اور ایک اپنی آخرت کا فکر۔ یہ چار بنیادیں ہیں جس سے آدمیت بنتی ہے۔ انسان کی انسانیت ترقی کرتی ہے اگر انسان میں علم نہ ہو، جہالت ہو، تو یہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے، جہالت سے نجات نہیں مل سکتی۔ اگر علم آگیا، روشنی آگئی، مگر عمل نہیں ہے، تو ذرا علم بھی کو نجات نہیں دلائے گا، بلکہ وبال بن جائے گا، اگر علم کے ساتھ عمل بھی ہو، مگر عمل کے ساتھ نفاق ہے، اخلاص نہیں ہے، وہ عمل بھی بے کار ہے، نجات نہیں دلائے گا، اگر علم بھی ہے، عمل بھی ہے، اور اخلاص بھی ہے، مگر انسان میں ناز اور شیخی ہے، کہ میں سب سے بڑا عبادت کرنے والا ہوں، آخرت کا خطرہ نہ ہو، وہ اخلاص بے کار ہے، وہ ختم ہو گیا۔

چار چیزیں جمع ہوں گی، تب انسان کی انسانیت بنے گی۔ علم، عمل، خلوص، اور فکر۔ تین چیزیں اس میں قلب کی ہیں اور ایک چیز ہاتھ پیر کی ہے، علم بھی قلب میں ہوتا ہے ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا، اخلاص اور للّٰہیت کا جذبہ بھی قلب میں ہوتا ہے، ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا، آخرت کا خوف اور خطرہ یہ بھی قلب میں ہوتا ہے، ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا۔ ہاتھ پیر صرف عمل کرتے ہیں۔ دل کا عمل فی الحقیقت علم، خلوص اور تفکر ہے، یہ تین چیزیں قلب میں ہوں، اور ایک باہر ہو، تب آدمی آدمی بنے گا، اس کی نجات کا سامان ہوگا۔

یہ گویا ایسا ہے جیسے آپ کا بدن چار چیزوں سے بنا ہے۔ آگ، پانی، مٹی، ہوا۔ تو آپ کی روح چار چیزوں سے بنی ہے، علم، عمل، اخلاص، اور فکر — اگر یہ آگ، پانی، مٹی، اور ہوا نہ ہو تو بدن ختم ہو جائے گا۔ اور اگر یہ چار چیزیں نہ ہوں تو روح ختم ہو جائے گی۔

اصل بنیادی چیز صحبت و معیت ہے

انسان کی حقیقی زندگی ان چار چیزوں سے ہے — علم درسگاہوں میں، مکاتیب میں اور علماء کے پاس ملے گا، عمل، عمل کرنے والوں کی ہیئت دیکھ کر ملے گا۔ خلوص ملے گا، مخلصوں کی جماعت میں بیٹھ کر، فکر پیدا ہوگا متفکروں کی جماعت میں

بیٹھ کر، غافل لوگوں میں کر فکر نہیں پیدا ہوتا، وہ تو اور غفلت میں مبتلا کر دیں گے، بد عمل لوگوں کی صحبت ہوگی، وہ تو بد عملی پیدا کریں گے، عمل کہاں سے آئے گا؟ جاہلوں کی صحبت رہے گی، جہالت ملے گی، علم کہاں سے آجائے گا؟

تو سب سے بڑی چیز صحبت و معیت ہے جس سے علم، عمل، اخلاص اور تفکر پیدا ہوتا ہے۔ ؎

صحبتِ صالح ترا صالح کند　　صحبتِ طالح ترا طالح کند

نیکوں اور سچوں کی صحبت اختیار کریں گے تو سچائی آئے گی، بُروں کی صحبت اختیار کریں گے، لہو و لعب اور کھیل کود کے جذبات پیدا ہوں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، نیک صحبت کی مثال ایسی ہے، جیسے عطار کی دکان۔ جو عطر بیچتا ہو، کہ اس کی دُکان پر جا کے آپ عطر نہیں بھی خریدیں گے تو کم از کم خوشبو تو آ ہی جائے گی۔ دماغ تو معطر ہو ہی جائے گا، فرحت تو پیدا ہو ہی جائے گی، اور بُری صحبت کی مثال ایسی ہے، جیسے لوہار کی دکان، کہ کچھ بھی نہیں ہوگا، آگ کا کوئی پتنگا ہی لگ جائے گا، کچھ دُھواں ہی چڑھ جائے گا، بدبُو پیدا ہو جائے گی، تو کچھ تکدر، کدورت اور انقباض ہی لے کر آئیں گے، نیک لوگوں کے پاس جب جائیں گے، کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا، تو ان کے ایمان کی گرمی قلب میں کچھ نہ کچھ گرمی پیدا کر دے گی، اللہ کی طرف توجہ بڑھ جائے گی، کچھ آخرت کی طرف توجہ بڑھ جائے گی، کوئی کلمہ ان کی زبان سے نکلے گا، دل کی گرہیں ہی کھلتی چلی جائیں گی، عمل کا راستہ ہی صاف ہو جائے گا، نیک کی صحبت میں بیٹھ کر کوئی نہ کوئی فائدہ پہنچے گا، اور بُرے کی صحبت میں بیٹھ کر بُرائی کی طرف طبیعت چلے گی۔

اور اس دنیا میں بُری صحبت جلدی اثر کرتی ہے، نیک صحبت دیر میں اثر کرتی ہے۔ بُروں کے پاس بیٹھ کر تو لگلے ہی دن بُرا بن جاتا ہے، اور نیکوں کے پاس بیٹھ کے کہیں مہینے بھر میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے، تو دنیا میں بدی جلدی اثر کرتی ہے، نیکی دیر میں اثر کرتی ہے، اس واسطے نیک صحبت آدمی کی زیادہ چاہیئے۔ بُری صحبت سے

زیادہ سے زیادہ بچنے کی ضرورت ہے، اصل بنیادی چیز صحبت و معیت ہے، کہ آدمی اچھا ماحول تلاش کرے، اچھے نیک لوگوں میں رہنے کا جذبہ پیدا کرے۔

اب یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ نیک لوگ علماء ہی ہوں، نیک وہ ہے، جو اللہ کے راستے پر پڑا ہوا ہو، چاہے وہ بڑا عالم نہ ہو، معمولی مسئلے جانتا ہو، مگر مخلص ہو، للّٰہیت ہو۔ بہت سے لوگ ایسے دیکھے گئے کہ علم کا تو نشان نہیں، لیکن نیکی اور تقویٰ اس درجہ میں بڑھا ہوا کہ بڑے بڑے علماء کو نصیب نہیں۔ تو بعض مرتبہ عمل کی دولت صحبت سے نصیب ہوتی ہے، صحبت یافتہ لوگ بڑے پکے دیندار ہوتے ہیں۔ بعضے علماء میں بھی وہ دین نہیں ہوتا جو بزرگوں کے صحبت یافتہ لوگوں میں ہوتا ہے، ان کا دین مضبوط ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی صحبت میسر ہو تو وہ کیمیا ہے، انسان کے دل میں پھر دین گھر کر لیتا ہے، اور آدمی دیندار بن جاتا ہے۔ تو تاکید کی گئی ہے کہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔

صُحبت و معیت کے ثمرات

حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے

سبعۃ یظلھم اللہ فی ظلہ یوم لا ظل الا ظلہ

سات قسم کے لوگ ہوں گے کہ قیامت کے دن انکو عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی جب کہ کوئی سایہ بجز اللہ کے سائے کے نہ ہوگا۔

ان میں سے ایک کے بارے میں فرمایا گیا۔ کہ وہ کون ہوں گے۔

رجلان تحابا فی اللہ

وہ دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے محبت کی اور دوستی اختیار کی۔

اور یہ معاہدہ کیا کہ بھائی ہم اس لئے دوستی کرتے ہیں، تاکہ ایک دوسرے کے دین کی حفاظت کریں گے، اگر میں نماز میں سستی کروں، تو تم مجھے کھینچ کے لے جانا، اور سزا دینا

کہ خبردار جو تُو نے نماز چھوڑی، اگر تم سُستی اختیار کرو گے، تو میں تمہیں لے جاؤں گا، اگر تم نے تلاوت قضا کی تو میں تمہارے سر پر مسلط ہوں گا، کہ تلاوت کرو قرآن کریم کی اور میں سُستی کروں تو تم۔ تو ہم ایک دوسرے کے دین کی حفاظت کے لیے دوستی کرتے ہیں ــــ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے جب ایک انتقال کرے گا، اور وہ اللہ کی رضا میں اور مقام کریم میں داخل ہوگا، بہشت بریں میں جائے گا، تو دعا کرے گا کہ اے اللہ! میں فلاں دوست کی دوستی کی وجہ سے، اس اعلیٰ مقام پر پہنچا ہوں، میرے فلاں دوست کو بھی اسی مقام پر پہنچا، اس کا خاتمہ بھی ایمان پر فرما۔ اس کی دعا قبول ہوگی، تو دونوں جنّتی بنیں گے، صحبت و معیت ہی سے تو یہ بات ملی، نیک صحبت اختیار کی، دونوں کے لیے نجات کا ذریعہ ہوگئی۔

ــــ اور یہی صورت اس کے برعکس سمجھ لیجئے۔ اگر دو آدمی اس لئے دوستی کریں، کہ بھئی! سینما میں ایک ساتھ جایا کریں گے، تھیٹر میں ساتھ جایا کریں گے، فلاں برائی میں ساتھ جایا کریں گے، چار آدمیوں نے مل کے دوستی کرلی کہ چوری کیا کریں گے لوگوں کی جیبیں کترا کریں گے، یہ بھی آپس میں دوستی ہوگئی، یہ بھی صحبت ہے، مگر یہ صحبت و معیت بدعملی کے لئے ہے۔ اس لئے اگر ایک جہنم میں جائے گا، تو وہ کہے گا خدا کرے وہ پہلا دوست بھی جہنم میں آئے، اسی کی وجہ سے میں اس مصیبت میں مبتلا ہوں، یہ دونوں چیزیں اپنا اپنا اثر دکھلائے بغیر نہیں رہتیں۔ تو علم اتنا اثر نہیں پیدا کرتا، جتنی صحبت اثر پیدا کرتی ہے، تو بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی سچا ماحول تلاش کرے، نیک لوگوں کے پاس اٹھنا بیٹھنا ہو، کبھی نہ کبھی یہ چیز کار آمد ثابت ہوتی ہے، کبھی نہ کبھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ بہرحال اس حدیث میں چار باتیں بتلائی گئیں، علم، عمل، اخلاص اور فکر۔ اس کے بغیر آدمی آدمی نہیں بنتا، اس میں جوہر نہیں پیدا ہوتا، وہ کھاتا پیتا ایک حیوان ہوگا، خوبصورت سہی، کہ اور کوئی جانور اتنا خوبصورت نہیں جتنا انسان ہے، مگر ہے جانور، جب علم اور عمل آئے گا، تو کہیں گے اب یہ جانور نہیں۔ اب اس میں انسانیت آگئی، یہی انسان اور حیوان میں فرق کی چیز ہے۔ اس واسطے سب سے

بڑی توجہ مسلم قوم کو بالخصوص تعلیم کی طرف کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ علم کا جوہر پیدا ہو۔ جہالت سے کوئی قوم دنیا میں آج تک نہیں پنپی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ پوری قوم مولوی بنے، سب کے سب عالم بنیں۔ یہ نہ فرض ہے، نہ واجب، نہ لازم، لیکن یہ ہر ایک پر فرض ہے کہ اتنا علم سیکھ لے کہ اپنے دین پر چل سکے، یہ معلوم ہو جائے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور مسلمان ہونے کے معنٰے کیا ہیں؟ اور اسلام کے کیا ارکان ہیں، جن کے کرنے سے آدمی مسلمان رہتا ہے، یہ بے شک لازم اور واجب ہے، اس کے بغیر نجات کی صورت نہیں ہے، تو سب سے بڑی چیز ادھر توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ تعلیم عام ہو، دین کا ایک چرچا ہو، اور چرچا اس کے بغیر نہیں ہوا کرتا، کہ تعلیم عام ہو۔

ہمارے ہاں مدارس ہیں، جیسے ابھی مولانا .... صاحب نے دارالعلوم دیوبند پر یہ تبصرہ کیا۔ اور یہ کہ وہاں کے فضلاء نے جگہ جگہ مدارس قائم کیے، تو ہزاروں کی تعداد میں مدارس ہیں، کوئی قصبہ خالی نہیں، اور اس تقسیمِ ملک کے بعد سے تو تقریباً یو، پی میں کوئی بڑا گاؤں بھی خالی نہیں رہا، جس میں لوگوں نے مدارس قائم نہیں کر دیئے، ہزاروں کی تعداد میں دیہات اور گاؤں میں مدارس ہیں — تو علم کا اور مسئلے مسائل کا ایک چرچا ہے، اور دیہات کے لوگ چونکہ بے چارے سادہ ہوتے ہیں، کوئی چالاکی، عیاری ان میں ہوا نہیں کرتی۔ ان میں جب علم آتا ہے تو سیدھا سیدھا اپنا عمل کرتے ہیں۔ کوئی فریب اور نفاق ان میں نہیں ہوتا، علم وہاں زیادہ اچھا اثر کرتا ہے، جہاں دلوں کی صفائی اور سادگی ہوتی ہے —— تو دیہاتی اتنے مسائل جانتے ہیں کہ چھوٹا موٹا مولوی ان کے سامنے چل نہیں سکتا۔ اگر ذرا مسئلہ کی غلطی کر جائے تو کہیں گے مولٰنا صاحب! تمہاری بات تو سر آنکھوں پر، مگر کہی بات غلط۔ مسئلہ تو یہ ہے، ہم نے فلاں بڑے مولوی صاحب سے سنا تھا۔ فوراً دیہاتی غلطی بتلائے گا، اور مولوی کو ماننا پڑے گا، تو وہ صحبت یافتہ ہونے کی وجہ سے اور دل کی سچائی کی وجہ سے بہت سے مسائل جانتے ہیں، یہ جب ہوا، جب تعلیم کا چرچا ہے

قصبوں میں، شہروں میں، دیہات میں دین پھیلا ہوا ہے۔

گناہ کا جمع ہونا بُرا ہے

عمل کی کوتاہی ہر ایک میں کچھ نہ کچھ ہوتی ہے، کچھ مجھ میں کوتاہیاں ہیں۔ کچھ آپ میں غلطیاں ہیں، ہر ایک کچھ نہ کچھ مبتلا ہے، مگر علم اور فکر تو صحیح رہنا چاہیے۔ تاکہ جب عمل کی توفیق ہو، تو ہم عمل کر گذریں، اور اگر علم ہی صحیح نہیں، تو جی بھی چاہے گا عمل کو۔ تو راستہ صحیح نہیں ملے گا۔ اس لئے قلب کے اندر علم رہنا چاہیے۔ کوتاہی اللہ معاف کرنے والا ہے، بہر حال انسان بشر ہے، اور بشر بھی ایسا جو بھول چوک سے مرکب ہے۔ بھول بھی ہوتی ہے۔ نفسانیت کا مادہ اس میں ہے، غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں، گناہ بھی ہو جاتا ہے، گناہ کا علاج اللہ نے توبہ بتلایا، جب تم گناہ کرو، ہاتھ کے ہاتھ توبہ کر لو، فرمایا گیا:۔ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہٗ۔ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ تو گناہ ہو جانا کوئی جرم نہیں، یہ تو انسان میں مادہ ہے۔ گناہ کا جمع رہنا بُرا ہے، کہ آدمی توبہ نہ کرے۔ توبہ کی، تو روز کا روز کھاتا صاف ہوتا رہے گا۔ تو آدمی اپنا کچا چٹھہ روزانہ درست کرتا رہے، جب ادھر سے کوئی اکاؤنٹنٹ حساب لینے والا آئے گا، تو کھاتے آپ کے درست ہوں گے، آپ کہیں گے، دیکھ لیجئے، اور اگر کوئی کلرک ایسا غافل ہے، کہ اس کے حساب میں غلطیاں ہیں، اور وہ سست پڑا ہوا ہے کہ جب مہینہ بھر میں اکاؤنٹنٹ کے آنے کا دن ہو گا، جب بیٹھ کر ایک رات میں کر لوں گا، اب وہ اکاؤنٹنٹ نے بجائے ایک مہینہ کے بیسویں دن آ کے کہا، لاؤ حساب، وہ سارا غلط پڑا ہوا تھا۔ اس نے اسی وقت حکم دیا، معطل یا برخواست۔ اس کی تنخواہ ضبط۔ اب حیران بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہیں ——

موت کا کوئی وقت معین نہیں

انسان کے عمل کا کھاتہ کھلا ہوا ہے، جب موت کا وقت آئے گا، اس وقت کچا چٹھہ درست کرلیں گے، یہ شیطانی وسوسہ ہے ــــــ موت کے لئے نہ بڑھاپا شرط ہے، نہ بیمار ہونا شرط ہے، ہزاروں انسان عارضۂ قلب میں مبتلا ہوکر مرجاتے ہیں، نہ بیمار ہوئے نہ کچھ۔ رات دن ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں، کہ ایک آدمی آج ہمارے سے مل رہا ہے، کل ہم سن رہے ہیں کہ اس کا انتقال ہوگیا، تو موت کے لئے بڑھاپا آنا ضروری نہیں ہے، کمزور ہونا ضروری نہیں، بڑے بڑے قوی بھی مرجاتے ہیں، جوان ہونا ضروری، بچے بھی مرجاتے ہیں۔ تو موت بچپن میں بھی آتی ہے، جوانی میں بھی آتی ہے، بڑھاپے میں بھی آتی ہے، بیماری سے بھی آتی ہے، بلا بیماری سے بھی آتی ہے۔ یہ خیال کرنا کہ مرنے کے قریب توبہ کرلوں گا، یہ شیطان کا محض ایک دھوکہ ہے، کسی کو کیا خبر ہے کہ موت کا وقت کب آنے والا ہے، اور کیا ضروری ہے کہ آدمی کے اوپر بڑھاپا آوے ــــــ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جوانوں کو زیادہ موت آتی ہے، بوڑھوں کو کم آتی ہے، جوان زیادہ مرتے ہیں، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ مجمعوں میں، بازاروں میں، درباروں میں دیکھیں تو بوڑھے کم نظر پڑیں گے، جوان زیادہ نظر پڑیں گے، اگر سارے بڑھاپے کو پہنچ کر ہی مرا کرتے تو بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہوتی، سفید ڈاڑھیاں زیادہ نظر پڑتیں، مرتے ہی نہ جب تک بڑھاپے کی عمر کو نہ پہنچ جائیں، مگر بڑھاپے کو پہنچنے ہی نہیں پاتے، پہلے ہی مرجاتے ہیں، اس لیے بوڑھوں کی تعداد کم نظر پڑتی ہے، جوان زیادہ نظر آتے ہیں۔

تو اس دھوکے میں رہنا کہ جب بڑھاپا آئے گا، اس وقت توبہ کرلیں گے، یا جوانی ہوئی مگر کوئی مرض ایسا آن پڑا، یہ یقین پڑا کہ بھئی اب چلو ڈیرے ہیں۔ بس اب چلنے والے ہیں، یہ غلط ہے، کیا خبر ہے کسی کو بیماری آئے نہ آئے ــــــ

روز کا روز اپنا حساب صاف کرتے رہنا چاہیئے۔ یہ نہ آدمی سمجھے کہ اخیر میں توبہ کروں گا۔ اور جس نے اخیر میں رکھا کہ کل کرلوں گا، کل کو ممکن ہے یہ کہے کہ کل کرلوں گا، تیسری کل آئی تو اس نے کہا نہیں، کل کو کروں گا، بس کل کل میں ساری عمر گذر جائے گی، موت کا فرشتہ سامنے آجائے گا، اور اس وقت توبہ کا کوئی موقع نہیں رہے گا۔

حدیث میں ہے کہ بعض لوگ مَلکُ الموت سے کہیں گے کہ اے مَلکُ الموت! ذرا سا وقفہ دے دو کہ میں توبہ کرلوں۔ فرمائیں گے ملک الموت' کہ میرے پچاسیوں قاصد تیرے پاس پہنچے، جب تو تُو نے توبہ نہیں کی، اب میں اخیر میں آیا ہوں' تو تجھے توبہ کی سُوجھ رہی ہے، وہ کہے گا میرے پاس تو آپ کا کوئی قاصد نہیں آیا ——؟ ملکُ الموت کہیں گے، ایک' دو' مَیں نے تو بیسیوں قاصد تیرے پاس بھیجے، انہوں نے تجھے نہیں سمجھایا، وہ کہے گا میرے پاس کوئی نہیں آیا، تو ملک الموت کہیں گے کہ تجھ پر بڑھاپا نہیں آیا؟ ارے بڑھاپا میرے ہی تو قاصد ہے جو خبر لے کر آیا تھا کہ موت کا وقت اب قریب ہے۔ کیا تیری ڈاڑھی اور سر میں سفید بال نہیں آئے؟ یہ سفید بال میرے ہی تو قاصد تھے جو بتلا رہے تھے کہ اب موت کا وقت قریب آگیا ہے، کیا تیرے پوتے اور نواسے نہیں پیدا ہوئے؟ — یہ پوتے اور نواسے میرے ہی تو قاصد تھے، جو بتلا رہے تھے کہ اب قبر میں جانے کا وقت قریب آگیا ہے، جب اتنے قاصدوں پر بھی تو نہ سمجھا، اور توبہ نہ کی، تو مَیں آخری قاصد ہوں، میرے بعد کوئی قاصد آنے والا نہیں۔ اب کون سا موقع ہے توبہ کا ——؟ اب تو گذر گیا وقت، جو کچھ ہونا تھا، ہو لیا۔

مقامِ عبرت

مَیں اس لیئے عرض کر رہا ہوں کہ جو کچھ کرنا ہو، جلدی سے کرلے، اس لیئے کہ وقت کم ہے کسی کو اپنی عمر کا پتہ نہیں، سال بھر جو ہمارے سامنے موجود تھے، آج

وہ ہمارے سامنے نہیں ہیں، آج جو ہیں، ان میں سے کیا خبر کون رہے گا، کون نہیں رہے گا، تو روزِ موت کا بازار گرم ہے، آنے والے آ رہے ہیں، جانے والے جا رہے ہیں۔
اس میں آدمی آنکھ بند کئے غفلت میں پڑا رہے۔ یہ بڑی ہی دانش مندی کے خلاف بات ہے۔ روز مرہ کا قصہ سامنے گذر رہا ہے ؎

من نمی گویم زیاں کن یا بفکر سود باش ۔۔۔ اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

نہ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ کرو یا وہ کرو۔ میں یہ کہتا ہوں جو کرنا ہو جلدی کر لو۔ اس لیے کہ وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ ہم میں سے کسی کی آدھی عمر گذر چکی ہے، کسی کی آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے، کوئی موت کے قریب پہنچ چکا ہے، کوئی قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہے، روزانہ سلسلہ آنے والوں کا، جانے والوں کا بھی جاری ہے، آخر پھر عبرت کا کون سا وقت آئے گا، جب اتنی چیزیں دیکھ کر عبرت نہ پکڑے؟ تو کیا ملک الموت کو دیکھ کر آدمی عبرت پکڑے گا، یا موت جب سر پر آ کھڑی ہو گی، جب عبرت پکڑے گا؟ اِس لیے ابھی سے عبرت پکڑ لینی چاہیئے، اور سمجھ لینا چاہیئے کہ وقت آ رہا ہے۔ اس کے لیے ہمیں کچھ کرنا ہے۔

اُخروی غذا بھی حاصل کرنی چاہیئے

اس کے لئے سب کچھ کرنے میں پہلی چیز ہے کہ اللہ کی رضا کا علم اور معرفت حاصل کر لیں، کہ وہ کن چیزوں سے خوش ہے، کن چیزوں سے ناخوش ہے، کونسا راستہ ہے کہ جس پر چل کر اس کو خوشی ہو گی، کونسا راستہ ہے کہ جس پر چل کر وہ ناراض ہو گا، وہ علم آپ کو شریعت سے معلوم ہو گا۔ وہ سائنس اور فلسفہ میں نہیں ملے گا، وہ ہیئت اور اقلیدس میں نہیں ملے گا، وہ قرآن و حدیث میں ملے گا کہ جس سے اللہ کی رضا اور ناراضگی کا پتہ چلے، اس کی خوشی و ناخوشی کا پتہ چلے۔

تو اس علم کو حاصل کیجئے، جس سے آخرت میں کچھ کام چلے، اور آخرت کا دروازہ کھلے، یہ جتنی نعمتیں ہیں، یہ یہیں کے لئے آرام دہ ہیں، یہ قبر میں آرام نہیں دیں گی، ہم یہاں بہترین مسہری اور گدے تکیئے پر لیٹ جائیں، مگر قبر میں آرام دینے کے لئے یہ گدے تکیئے آرام نہیں دیں گے، وہاں کی چیز اعمالِ صالحہ ہے، وہاں کا گاؤ تکیہ نیکی ہے، وہاں کا گاؤ تکیہ روئی، اون اور پلاسٹک کا نہیں ہے، وہاں دوسری چیزیں ہیں۔ یہاں روٹی، چاول اور غذاؤں سے پیٹ بھر جائے گا، قبر میں یہ چیزیں غذا نہیں بن سکتیں۔ وہاں عمل صالح کی غذا کام آئے گی، وہاں بستر بھی ہوگا تو عمل کا، ـــــ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب میت سچا جواب دے دے گا کہ میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام تھا، میرے پیغمبر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تھے۔ تو ایک منادی ندا کرے گا کہ ان صدق عبدی۔ بندے نے جو کچھ کہا سچ کہا۔

فافرشوہ من الجنۃ، اس کے لئے جنت کا فرش بچھاؤ،

والبسوالہ من الجنۃ، اس کے لئے جنت کا لباس بھی دو،

وافتحوالہ بابا من الجنۃ۔ اس کے لئے جنت کے دروازے بھی کھول دو۔

ہوائیں بھی اس کے لئے وہیں سے آنی چاہئیں، تو وہاں کی غذائیں اور نعمتیں دوسری ہیں، اس عالم کی دوسری ہیں۔ جہاں اللہ نے یہاں کی غذائیں دیں، کچھ وہاں کی غذاؤں کے بھی فکر کرنے کی ضرورت ہے، یہاں تھوڑا بہت فکر تھا وہاں کے لئے زیادہ فکر کی ضرورت ہے، مگر ہم نے الٹا قصہ کیا، کہ یہاں کی فکر زیادہ ہے، وہاں کی ذرہ برابر نہیں ہے، یہاں ہر آسائش کا خیال ہے، وہاں کی آسائش کا خیال نہیں ہے، کم سے کم تھوڑا بہت وقت کچھ ادھر بھی لگانا چاہیئے، اب موت کا بھی دھیان کر لینا چاہیئے۔ تو پہلی چیز تو علم ہے کہ اللہ کی خوشی اور ناخوشی معلوم ہو، دوسری چیز راستہ ہے، جو عملِ صالح ہے کہ اس راستہ پر چل کر

ہم پروردگار کے قریب ہوتے جائیں ۔ تیسری چیز قلب کے مقامات ہیں ، سب سے بڑی چیز اس میں اخلاص اور خلوص ہے ، کہ قلب کی راہ ہماری درست ہو جائے اور اس سے بھی بڑی چیز فکر ہے ، کہ آخرت کی دُھن لگی ہوئی ہو غفلت میں آدمی نہ گذارے ۔

مُسلمان کو متفکّر پیدا کیا گیا ہے

مسلمان کو متفکّر پیدا کیا گیا ہے ، غافل پیدا نہیں کیا گیا ، مسلم وہ ہے جو فکر مند ہو ، ہر وقت اسے ایک فکر چڑھا ہوا ہو ۔

حدیث میں ہے کہ :۔

الکافر یاکل بسبعۃ امعاء ، کافر سات انتڑیوں سے کھاتا ہے ، اور
والمومن یاکل بمعٍ واحد مؤمن ایک انتڑی سے کھاتا ہے ۔

تو مؤمن کی غذا کم ہوتی ہے ، کافر کی غذا زیادہ ہوتی ہے ـــــ ایک سائز کے دو آدمی لیں ، ایک مسلم اور ایک غیر مسلم ۔ وہ زیادہ کھائے گا ، یہ کم کھائے گا ،

وجہ اس کی یہ ہے کہ کافر کے قلب میں فکر نہیں ہے ، اور مؤمن کے قلب میں آخرت کا فکر لگا ہوا ہے ، کتنے سے کتنا ہی بدعمل مسلم ہوگا ، مگر جب اندر سے ٹٹولو گے تو کچھ نہ کچھ فکرِ آخرت ضرور ہوگا ۔ لکھ پتی ہے ، مگر وہ پوچھ رہا ہے ، مولانا یہ چیز جائز ہے ناجائز ہے ؟ یہ جائز ناجائز کیوں پوچھتا ہے ؟ ۔ موت کی فکر لگی ہوئی ہے جبھی تو پوچھتا ہے ، اگر اسے فکر نہ ہوتا ، کیا ضرورت تھی پوچھنے کی ، یہ کہنا کہ یہ معاملہ میں نے کیا ہے یہ حرام تو نہیں ہے ؟ ناجائز تو نہیں ہے ؟ کر بھی رہا ہے ، مگر فکر ی چڑھی ہوئی ہے ۔ اگر فکر نہ ہوتی سوال نہ کرتا ، کوئی مؤمن ایسا نہیں ہے ، جس کے اندر تھوڑا بہت آخرت کا فکر نہ ہو ، اور جب فکر ہوتی ہے ، تو کھانا بھی کم ہو جاتا ہے ، عیش بھی کم ہو جاتی ہے ۔ یہ کتنے ہی عیش

میں مبتلا ہو، لیکن اسی درجہ کا غیر مسلم لیا جائے، وہ پانچ گنے عیش میں ہوگا، یہ ایک گنے عیش میں ہے، اس لئے کہ اس کے دل میں پھر بھی ایک فکر چھپا ہوا ہے، کہ وقت آنا ہے، حساب دینا ہے، اسے اس کا کوئی فکر نہیں۔

فکرِ آخرت کو چمکانے کی ضرورت

تو فکر کا مادہ اللہ نے رکھا، جو ہر مؤمن کے ایمان کے ساتھ دل میں لگا ہوا ہے، مگر ذرا اسے اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، ایمان ہر ایک میں ہے، مگر عمل سے ذرا اُسے چمکانے کی ضرورت ہے، اسی طرح سے اس تفکر کو بھی چمکانے کی ضرورت ہے، فکر اس وقت تک چمکتا نہیں، جب تک خلوص نہ ہو، خلوص چلتا نہیں جب تک عمل کا جذبہ نہ ہو، عمل بنتا نہیں، جب تک علم نہ ہو، تو علم، عمل، خلوص اور فکر ضروری ہے۔

اس واسطے یہ چند باتیں میں نے عرض کیں، کہ تعلیم میں بھی بہت کوتاہی ہو رہی ہے۔ تعلیم کی مردوں کو اور عورتوں کو بھی ضرورت ہے، اور اس کے ساتھ اپنے عمل اور اخلاص کی، اور فکر کی بھی۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ چاروں چیزیں نہیں ہوں گی، تو ہلاکت ہی ہلاکت ہے، تباہی ہی تباہی ہے۔ نجات ان چار چیزوں میں ملے گی، تو فرمایا گیا، لوگ تباہ و برباد ہیں، بچیں گے علم والے، علم والے تباہ و برباد ہیں، بچیں گے عمل والے، عمل والے تباہ و برباد ہیں، بچیں گے خلوص والے، خلوص والے تباہ و برباد ہیں، بچیں گے فکر رکھنے والے، یعنی غفلت سے نجات نہیں ہوگی، ہلاکت ہوگی۔

اس واسطے یہ چند باتیں میں نے اس حدیث کی روشنی میں عرض کیں۔ امید ہے کہ آپ حضرات ان باتوں پر غور کریں گے، اور وقتاً فوقتاً سوچیں گے، دماغ میں یہ باتیں گھومیں گی، تو اس کا فکر رکھیں گے کہ کس طرح سے اس حدیث پر ہم عمل کریں،

کس طرح سے ہم اپنی انسانیت کو اجاگر کریں۔ تو سوچتے رہنا چاہیئے اور فکر رکھنا چاہیئے کہ ہم عمل کا کوئی نقشہ بنائیں، ایک آدمی ایک ہی نقشہ بناتا ہے، چار مل کر بناتے ہیں تو ذرا نقشہ اچھا کھلا بڑا بن جائے گا، اور قوم مل کر بنائے گی تو بڑا بہترین نقشہ بنے گا، سارے ہی عمل میں لگ جائیں گے۔ اس لئے بس اللہ سے دعا ہے کہ حق تعالیٰ ہمیں اور آپ کو، مردوں کو اور عورتوں کو نیکی کی، عمل کی، خلوص وللہیت کی اور فکر کی توفیق عطا فرما دے، دنیا میں بھی نجات عطا فرما دے، اور آخرت میں بھی نجات عطا فرما دے۔ آمین۔

اللھم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم
وارنا مناسکنا، وتب علینا، انک انت التواب الرحیم
وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین
برحمتک یا ارحم الراحمین

راہِ اعتدال

ہر شخص کی عقل مختلف ہے، اور عقل کے مطابق ہی
عمل کیا جائے، تو دین میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔
لہٰذا لٹریچر اور بزرگوں سے وابستگی دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔
یہی اعتدال کا راستہ ہے، اور یہی اہل السنت والجماعت کا طریقہ
ہے۔ اور جو لوگ شخصیتوں کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھیں گے، وہ عملِ
صحیح سے ہمیشہ محروم رہیں گے۔ اور عمل کرتے بھی ہیں، تو
بھی انہی شخصیتوں سے لیا گیا ہے۔

از: حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

ترتیب

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن
بہ ونتوکل علیہ۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا
ومن سیئات اعمالنا۔ من یھدہ اللہ فلا مضل لہ
ومن یضللہ فلا ھادی لہ۔ ونشھد ان لا الہ الا اللہ
وحدہ لا شریک لہ۔ ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولانا
محمداً عبدہ ورسولہ۔ ارسلہ اللہ الیٰ کافۃ للناس
بشیرًا ونذیرًا۔ وداعیا الیہ باذنہٖ وسراجًا منیرًا۔
اما بعد: ـــــــ فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھو الذی انزل علیک الکتٰب منہ اٰیٰت محکمٰت ھن ام الکتٰب و
اخر متشٰبھٰت۔ فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون
ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ و
ما یعلم تاویلہ الا اللہ۔ والراسخون فی العلم
یقولون اٰمنا بہٖ۔ کل من عند ربنا۔ وما
یذکر الا اولوا الالباب ـــــــ

(آلِ عمران پ ۳ ع ۶)

صدق اللہ العلی العظیم

بزرگانِ محترم:

پہلے ان آیات کا ترجمہ سمجھ لینا چاہیئے۔ اور وہ یہ ہے:۔

"اللہ وہ ذات ہے جس نے اپنے بندے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی کتاب یعنی قرآن مجید نازل فرمایا۔ اس میں بعض آیات تو محکمات ہیں اور بعض متشابہات ہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ متشابہات کی اتباع کرتے ہیں گمراہی پھیلانے کے لئے، یا ان کی تاویلیں کرنے کے لئے اور حالانکہ ان کی تاویلیں اللہ ہی جانتا ہے، اور جو لوگ علم میں پختہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ تمام ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت حاصل نہیں کرتے مگر عقل والے۔"

(پھر دُعا کی تعلیم دی گئی) اے اللہ! ہمارے دلوں کو کجی سے بچا۔ بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت نصیب فرمائی، اور اپنی طرف سے رحمت عطا فرما۔ بے شک تو بڑا بخشنے والا ہے۔ (دوسری دُعا یہ) کہ اے اللہ! تو تمام لوگوں کو جمع کرنے والا ہے۔ ایک ایسے دن جس میں کوئی شک نہیں۔ بے شک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

شانِ نزول

یہ تو آیات کا تقریباً لفظی ترجمہ ہوا۔ ان آیات میں ایک ایسا اُصول بیان کیا گیا ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو دین محفوظ رہے گا ــــــ اس کا بیان کرنا میرا مقصد ہے ــــ لیکن اس سے پہلے آیات کا شانِ نزول بھی سُن لیں، کیونکہ شانِ نزول سے آیات کے سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نصاریٰ نجران کی ایک جماعت مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس مناظرہ کے لئے آئی ــــ ان میں عبدالمسیح، ابو حارث، ابنِ علقمہ تینوں موجود تھے۔ ان میں عبدالمسیح بڑا مدبر تھا، اور ابو حارث

بہت ذہین اور ذکی تھا۔ اُس کا حافظہ بہت قوی اور علم بہت وسیع تھا، تورات و انجیل پر اس کی نظر تھی۔ تمام گرجاؤں کا لاٹ پادری اور اپنے مذہب کا قائد تھا۔

عقیدۂ نصاریٰ کی تردید

ان کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ اور اسی مسئلہ میں وہ مناظرہ کے لئے آئے تھے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشادات فرمائے۔ ان میں یہ بھی تھا کہ "اللہ تعالیٰ حَیّ" یعنی خود زندہ ہے، اور قیوم یعنی زندگی کو تھامنے والا ہے، اور عیسیٰ علیہ السلام پر فنا آنے والی ہے۔ جس پر فنا آئے اور اپنی زندگی کو وہ نہ سنبھال سکے وہ دوسرے کا اِلٰہ کیسے بن سکتا ہے؟ —— نیز آپ ایک لامحدود زمانہ تک خود وجود میں نہ آئے، اور اِلٰہ تو وہ ہونا چاہیئے جو خود موجود ہو، اور ہر زمانہ میں موجود ہو —— یعنی ازل سے ابد تک —— تو جو ایسا نہیں وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

• اور دوسری جگہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

کانا یاکلان الطعام۔ یعنی حضرت عیسیٰ اور مریم علیہما السلام دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ کھانے پینے کے محتاج تھے، اور جو کھانے پینے کا محتاج ہو، وہ زمین کا بھی محتاج ہے کیونکہ غلّہ اس سے پیدا ہوتا ہے اور سُورج کا بھی محتاج ہے کیونکہ غلّہ کی اصلاح اس سے ہوتی ہے۔ اس لئے عناصر اربعہ حتیٰ کہ بیل اور چارہ وغیرہ نباتات کا بھی محتاج ہے، اور حاجت مندی اور خُدائی دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں ——

کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں ایک صفت "صمد" ہونا بھی ہے۔ جس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہ ہو اور تمام کائنات اس کی محتاج ہو۔ جب عیسائیوں

سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا تو وہ آیات متشابہات میں پھڑ گئے۔ اور کہنے لگے کہ آپؐ کی کتاب میں ہی تو عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں موجود ہے .... وکلمتہٗ - وروح منہ —— اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جز ہیں۔ (بہرحال وہ اصل بات کا جواب نہ دے سکے، پھر آیات متشابہات کے بارے میں کلام کرنے لگے۔)

آیات کی دو۲ اقسام

ایسی آیات کے بارے میں کچھ تفصیل اور وضاحت ضروری ہے جو اس طرح سے ہے کہ آیات کی دو قسمیں ہیں محکمہ، اور متشابہہ محکمہ وہ آیت ہے جو بیّن المراد ہو، اور اس کا معنےٰ پوری طرح واضح ہو، خواہ لغۃً معنےٰ ہی ایک ہو یا مختلف ہوں تو دوسرے قواعد سے ایک کی تعیین ہو جاتی ہو۔

اور متشابہہ وہ آیت ہے جس کی مراد واضح نہ ہو۔ مثلاً اس کے کئی معانی ہوں، اور ایک کی تعیین نہ ہو سکتی ہو۔ یا ایک ہی معنیٰ ہو، لیکن اس مقام پر صحیح نہ آتا ہو ——

اب یہاں ایک طریقہ تو اہلِ فتن کا ہے کہ محض اپنی رائے سے ایک معنے متعین کر لیتے ہیں۔ خواہ وہ محکمات کے خلاف ہو —— اور دوسرا طریقہ اہلِ حق کا ہے کہ متشابہات کا رجوع محکمات کی طرف کریں، جو معانی محکمات کے ہوں انہی پر متشابہات کو بھی محمول کریں۔ اس طریق سے دین میں کسی قسم کی تفریق پیدا نہیں ہوتی اور اگر پہلے طریقے کو اختیار کیا جائے تو چونکہ ہر شخص کی عقل و رائے مختلف ہے اس لئے مذہب میں تفریق پیدا ہو جاتی ہے۔ عیسائیوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ——

کیونکہ آیت وروح منہ سے بظاہر عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہنے کی گنجائش

نکلتی ہے۔ اور اس کو دوسری آیات پر محمول کیا جائے تو بیٹا نہ ہونے کی بھی گنجائش نکلتی ہے ـــــ اب صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس "آیت متشابہہ" کو آیاتِ محکمات پر محمول کیا جائے اور آیتِ محکم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :- ان هو الا عبد انعمنا علیه۔ یعنی عیسیٰ علیہ السلام تو ایک بندے ہیں جن پر ہم نے انعام کیا ـــــ اور بندہ ہونا الوہیت کے منافی ہے۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں :- اِنَّ مثل عیسیٰ عند الله کمثل آدم خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون ـــــ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی طرح ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا، اور پھر فرمایا کہ ہو جا پس ہو گئے۔

اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کے مخلوق ہونے کی تصریح فرماتے ہیں، اور مخلوق و اِلٰہ میں منافات ہے۔

صفاتِ خداوندی کے بارے میں نصوصِ متشابہہ کا حکم

جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ آیت متشابہہ ہے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق بھی آیات متشابہات ہیں ـــــ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :- یریدون وجهه۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا بظاہر منہ ثابت ہوتا ہے ـــــ دوسری جگہ فرماتے ہیں :- یوم یکشف عن ساق۔ یہاں سے اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ثابت ہوتی ہے ـــــ غرض انسان کے تمام اعضاء ثابت ہو جاتے ہیں ـــــ

چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رحم اور امانت دونوں اللہ تعالیٰ کی کوکھ سے لپٹ گئے۔ اور کہنے لگے کہ "اے اللہ! جو ہم کو ملائے یعنی صلہ رحمی کرے تو اس کو ملا، اور جو ہم کو قطع کرے تو بھی اس کو قطع کر" ـــــ اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ

اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ میں نے اللہ تعالےٰ کو بہت اچھی صورت میں دیکھا ——— ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا، تو اس کی ٹھنڈک میرے دل کو محسوس ہوئی ——— اور ایک حدیث میں ہے کہ تمام مخلوق کے قلوب اللہ تعالےٰ کی دو انگلیوں کے درمیان میں ہیں ———

اب ان نصوص کا ایک مطلب تو یہ تھا کہ اللہ تعالےٰ کا جسم مان لیا جائے، اور ایک صورت یہ بھی کہ ان کو آیاتِ متشابہات پر محمول کیا جائے ——— بعض تو یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالےٰ ایک جسم ہیں۔ جیسے ہمارا جسم ہے۔ زیادہ سے زیادہ فرق یہ ہوگا کہ اللہ تعالےٰ کا جسم بہت بڑا ہوگا۔ یہ مجسمہ کہلائے ——— اور بعض نے یہ کہا کہ اللہ تعالےٰ جسم کے مشابہ ہیں۔ یہ مشبہہ کہلائے ——— اور ایک فرقہ کہنے لگا کہ یہ الفاظ ہی بے معنیٰ ہیں ان کا کوئی معنےٰ و مفہوم ہی نہیں۔ یہ معطلہ ہیں ———

اہلِ سنت والجماعت نے یہ عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالےٰ کی یہ تمام صفات ثابت ہیں، لیکن ان کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں، کیونکہ اللہ تعالےٰ خود فرماتے ہیں لیس کمثلہ شیءٌ۔ نیز الرحمن علی العرش استویٰ کی تفسیر میں امام مالک رحمۃ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں الاستواء معلوم والکیف مجھول، والایمان بہ واجب۔ والسوال عنہ بدعۃ۔

اور ان اعضاء کی طرح عوارضِ انسانیہ کا اثبات بھی اللہ تعالےٰ کے لیے نصوص میں ملتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالےٰ ہر رات آسمانِ دنیا پر آتے ہیں اور کہتے ہیں: انا الرزاق فھل من یسترزقنی۔ انا الملک فھل من یسئلنی۔ انا الغافر فھل من یستغفرنی۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالےٰ کو تین جگہ ہنسی آتی ہے۔ ایک اس وقت جب کہ صفِ اوّل لینے کے لئے نمازی دوڑ رہے ہوتے ہیں۔ دوسرے

اس وقت جب کہ پچھلی رات کو خاوند اٹھے اور اپنی بیوی کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور وہ بھی بیدار ہو کر نماز پڑھے۔ یا بیوی اٹھے، اور خاوند کے منہ پر چھینٹے مارے اور وہ اُٹھ کر نماز پڑھے۔ تیسرے اس وقت جب کہ جہنم سے سب سے پیچھے جو شخص نکالا جائے گا، تو اللہ تعالےٰ اس کے دل میں تمنائیں ڈالیں گے۔ چنانچہ وہ کہے گا کہ اے اللہ! میرا چہرہ آگ سے پھیر دے۔ اللہ تعالےٰ فرمائیں گے اگر چہرہ پھیر دیا جائے تو پھر تو کچھ نہیں مانگے گا؟ وہ کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔ ——— اللہ تعالےٰ فرمائیں گے کہ تیرا اعتبار نہیں، تو حلف اٹھا کہ میں کچھ نہیں مانگوں گا ——— وہ قسم اٹھا کر کہے گا کہ میں کچھ نہیں مانگوں گا ——— پھر اس کا چہرہ آگ سے پھیر دیا جائے گا۔

——— جب وہ جنت کی فضا کو دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ میں تو ابھی تکلیف ہی میں ہوں۔ اس لئے پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے جہنم سے نکال دے۔

اللہ تعالےٰ فرمائیں گے: ———

——— ویلک یا ابن آدم ما اغدرک ———

(تیری بربادی ہو بہت عہد شکن ہے ——— ؟)

پھر اللہ تعالےٰ فرمائیں گے کہ اور تو کچھ نہیں مانگے گا۔ تو وہ قسم اٹھا کر کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔ پس اس کو اللہ تعالےٰ جہنم سے نکال دیں گے، اور گھٹنوں کے بل وہ نکلتے ہوئے کہے گا کہ تبارک الذی نجانی منہا

——— پھر جب نہرِ حیات کو دیکھے گا، پھر اپنے آپ کو تکلیف میں پائے گا، تو پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے اس نہر تک پہنچا دے، اللہ تعالےٰ فرمائیں گے ویلک یا ابن آدم ما اغدرک ——— پھر اللہ تعالےٰ فرمائیں گے کہ اگر تمہیں وہاں پہنچا دیا جائے، پھر تو کچھ نہیں مانگے گا۔ وہ حلف اٹھا کر کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔ پس اس کو نہر تک پہنچا دیا جائے گا۔ وہ اُس نہر میں نہائے گا تو سیاہ اور جلا ہوا جسم روشن چاند کی طرح ہو کر نکلے گا۔

اور وہ خیال کرے گا کہ جتنا انعام میرے اوپر ہوا، وہ کسی پر بھی نہیں ہوا ـــــ پھر جب جنت کے دروازے دیکھے گا جن میں سے ہر ایک کی مسافت اتنی ہوگی جتنی مکہ مکرمہ اور عدن کے درمیان ہے، یہ سینکڑوں میلوں کا فاصلہ ہے اور ساتھ ہی جنت کی شفاف دیواروں سے اندر کی چیزیں دیکھے گا، تو پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے جنت کے دروازے تک ہی پہنچا دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ویلک یا ابن آدم ما اغدرک ـــــ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اگر تمہیں وہاں بھیج دیا جائے تو پھر تو کچھ نہیں مانگو گے۔ تو قسم اٹھا کر کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔ چنانچہ اس کو جنت کے دروازہ کے قریب ہی پہنچا دیا جائے گا ـــــ پھر جب جنت کی نعمتوں کو دیکھے گا تو یہی خیال کرے گا، کہ میں تو تکلیف میں ہوں ـــــ تو پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے جنت ہی میں داخل کر دیجئے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے :۔ ویلک یا ابن آدم ما اغدرک ـــــ

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم کو ایک دنیا جتنا ملک جنت میں دیا گیا، وہ شخص جنت میں جگہ نہ پائے گا۔ تو پھر حاضر ہو کر کہے گا کہ جگہ تو کہیں بھی نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم کو دو دنیا جتنا ملک دیا۔ پھر واپس جائے گا، تو جگہ اور زیادہ تنگ ہو جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے پاس جائیگا تو وہی عرض کریگا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جاؤ تمہیں تین دنیا جتنا ملک دے دیا۔ وہ دیکھے گا تو جگہ بہت ہی تنگ ہو چکی ہوگی۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ سے کہے گا اتستھزئ بی وانت رب العلمین ـــــ آپ تو میرے سے مزاح فرما رہے ہیں حالانکہ آپ رب العالمین ہیں ـــــ

...... اللہ تعالیٰ کو ہنسی آئے گی اور فرمائیں گے کہ جا تمہیں دس دنیا جتنا ملک دے دیا۔ پھر جب واپس جائے گا تو اس کو اپنی جگہ نظر آئے گی۔

ـــــ معلوم ہوا کہ جو شخص آخر کو جنت میں داخل کیا جائے گا اس کو دس دنیا جتنا ملک دیا جائے گا۔ اور حدیث سے اللہ تعالیٰ کا ہنسنا بھی معلوم ہوا۔

تو اہلِ سنت والجماعت کہتے ہیں کہ ایسی صفات تو ثابت ہیں اور کیفیت کا علم نہیں

انبیاء علیہم السلام کے بارے میں نصوص متشابہہ کا حکم

اور جیسے متشابہہ الفاظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی صفات پر کیا گیا، ایسے ہی بعض انبیاءؑ کے متعلق بھی الفاظ متشابہہ کا استعمال فرمایا گیا۔ تو ان میں طریقِ اعتدال یہ ہے کہ ایسی آیات کو محکمات پر محمول کیا جائے۔ ایسے ہی چونکہ نصوص میں تصریح ہے کہ انبیاء علیہم السلام صغائر اور کبائر سے منزہ ہوتے ہیں۔ اگر بعض انبیاءؑ سے کوئی ایسا فعل صادر ہو جو بظاہر بہتر معلوم نہ ہوتا ہو، تو وہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ نبی جو کچھ کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی کرتا ہے ــــ اگر عقل سے معانی متعین کئے گئے تو یہیں سے گمراہی شروع ہو جائے گی۔ اور ایک نیا مذہب نکل آئے گا ــــ میں کہا کرتا ہوں کہ اختلاف کنندہ تو وہ ہیں جو اہل السنۃ والجماعت سے کٹ کر ایک فرقہ بنا لیتے ہیں ــ اور جنگ کرنے والے بھی حقیقت میں اہلِ بدعت ہی ہوتے ہیں۔

حضرات صحابہ کرامؓ کے بارے میں متشابہہ الفاظ کا حکم

اور انبیاء علیہم السلام کی طرح ہی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا معاملہ ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم خود غرضی اور بے دینی سے بمراحل دور تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: والسّٰبقون الاوّلون من المھٰجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ ــــ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم

سے راضی ہونے کا اعلان فرما دیا، جو قیامت تک کے لئے ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا۔ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ذلک مثلھم فی التورٰۃ ومثلھم فی الانجیل۔

پہلے تو صحابہؓ کے متعلق لفظ "معہ" نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ ان کا سلسلہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے متصل ہے منقطع نہیں ہے۔ اور اشداء علی الکفار سے ان کے بغض فی اللہ کی تعریف فرمائی۔ اور رحماء بینھم سے ان کے حب فی اللہ کا ذکر فرمایا۔ اور یہ صفات بغیر دین کامل ہوئے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اور پھر تراھم الخ میں اللہ تعالے ان کے اعمال کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ رکوع وسجود میں مشغول رہتے ہیں، اور ہر وقت صرف اللہ تعالے کی رضا کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اور اسی پر بس نہیں بلکہ فرمایا کہ پہلی کتب میں بھی ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ گویا آدم علیہ السلام سے لے کر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تک صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقبول عند اللہ ہونے کی شہادتیں دی گئیں۔ اور قرآن مجید میں بھی ان کے مقبول ہونے کی شہادتیں موجود ہیں، جو قیامت تک باقی رہیں گی۔ پس اگر ان سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو بظاہر نامناسب ہو، تو اللہ تعالے کی رضا کے اعلان کو دیکھتے ہوئے مناسب تاویل کی جائے گی۔ مثلاً اگر بعض صحابہؓ نے بعض پر لفظ کذب استعمال کیا ہے تو یہ نہیں کہیں گے کہ ان کو جھوٹ بولنے کی عادت تھی۔ اور نہ یہ کہ وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کے مناسب حال کذب کے معنٰے کی تعیین کی جائے گی۔ اور وہ خطاء اجتہادی سمجھی جائے گی، جس میں ان کو ایک نیکی

ملے گی، مواخذہ پھر بھی نہیں ہو گا۔

اولیاء اللہ کے کلمات کے بارے میں مسلک حق

جیسا کہ حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ نے "انا الحق" کہا تو صرف ان کلمات کو دیکھ کر ان کے حق ہونے میں گستاخی نہیں کی جائے گی۔ بلکہ ان کی تمام زندگی کو دیکھ کر ان کے مناسب "انا الحق" کا معنے بیان کیا جائے گا ـــــــ اور اصل یہ ہے کہ صوفیاء کے نزدیک ایک درجہ فنا فی اللہ کا ہوتا ہے حضرت منصورؒ اس قدر فانی فی اللہ ہو چکے تھے۔ کہ انا سے مراد ذاتِ متکلم نہیں بلکہ ذاتِ حق تھی۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد انا اور انت کا مصداق ایک ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس فرعون نے "انا الحق" کہا تو اس کا ظاہری معنے ہی مراد لیا گیا، کیونکہ اس کی زندگی ہی ایسی تھی۔ کہ وہ خدائی دعوے کرتا تھا ـــــــ تو ایسے الفاظ متشابہہ کو پوری زندگی کے احوال کو سامنے رکھ کر کسی معنے پر محمول کیا جاتا ہے۔ حضرت منصورؒ کی زندگی اولیاء اللہ جیسی تھی، اور فرعون کی شیطان کی سی۔ تو اسی معنیٰ پر حمل کیا جائے گا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مقولہ ہے

ملکی اعظم من ملک اللہ (میرا ملک اللہ کے ملک سے بڑا ہے)

واقعہ یوں ہے کہ ایک دفعہ آپؒ پر بے خودی کی کیفیت طاری ہو گئی، تو آپ کے منہ سے نکلا ملکی اعظم من ملک اللہ ـــــــ جب افاقہ ہوا تو مریدین نے عرض کی کہ حضرت! آپ سے تو آج کلمہ کفر صادر ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تم نے مجھے کیسے چھوڑ دیا؟

پھر دوسری دفعہ آپ پر ایسی ہی حالت طاری ہوئی، تو مریدین نے حضرت

کو مارنا شروع کیا۔ لیکن معاملہ یہ تھا کہ مارتے پیر صاحب کو تھے اور لگتی ان کو خود تھی۔ چنانچہ وہ بے چارے بدحال ہو گئے ـــــ جب حضرت بایزیدؒ کو افاقہ ہوا تو انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ ـــــ مریدین نے عرض کی کہ آج بھی آپ سے وہی "کلمہ کفر" نکلا تھا، اس لئے ہم آپ کو مارنے لگے تو لگتی ہمیں تھی۔ جس سے ہمارا یہ حال ہو گیا۔

حضرت بایزیدؒ نے فرمایا، بتاؤ وہ کلمہ کیا ہے؟ مریدین نے بتلا دیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کلمہ تو عین ایمان ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا مُلک تو میں اور بقیہ ساری کائنات ہے۔ اور میرا مُلک خود اللہ تعالیٰ ہے، جس میں میں ہر وقت سیر کرتا ہوں، تو یقیناً میرا مُلک اللہ کے مُلک سے بڑا ہے۔

اب یہاں بھی اہلِ زیغ کا طریقہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی اس قدر تعریف کریں گے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیں گے۔ اور یا قرآن و حدیث کے ظواہر پر نظر کرتے ہوئے اولیاء اللہ کی توہین کریں گے۔ اور ایک "راہِ اعتدال" ہے۔ وہ یہ کہ قواعد قرآن و حدیث بھی اپنی جگہ پر صحیح رہیں، اور اولیاء اللہ کے کلام کا بھی ان کی زندگی کے مطابق معنٰی بیان کیا جائے۔ اور یہ "طریقِ حق" مفرط اور مفرّط کے نصیب نہیں ہوتا، بلکہ اعتدال پسند آدمی کو نصیب ہوتا ہے۔

حضرت نظامیؒ کا عجیب واقعہ

اس پر ایک واقعہ مولانا فخر الدین نظامی رحمۃ اللہ علیہ کا یاد آیا، جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ـــ حضرت نظامیؒ بہت بڑے مرتبہ کے بزرگ تھے۔ چودہ برس کی عمر میں ہی اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا ـــ بہت خوبصورت تھے، جب آپ مسجد میں تشریف لاتے تو لوگ دیکھنے کے لئے سڑک

کے کنارے پر جمع ہو جاتے۔ تو آپ جس کی طرف دیکھتے، وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔ آپ فرماتے کہ اور گھور کر دیکھو ———

وہ واقعہ یوں ہے کہ آپ کے ایک مرید نے عرض کی کہ اللہ تعالےٰ کی زیارت کی تمنا ہے اس کے لئے کوئی وظیفہ بتا دیجئے، جس سے اللہ تعالےٰ کی زیارت ہو جائے ——— آپ نے فرمایا کہ نمازِ فرض ترک کر دو ——— مرید کو بہت تعجب ہوا کہ نماز فرض کیسے ترک کر دوں؟

تین دن کے بعد پھر حاضر ہوئے اور پوچھا کہ حضرت! اللہ کے دیدار کی تمنا ہے، کوئی وظیفہ بتا دیں۔ حضرت نے فرمایا کہ تمہیں وظیفہ تو بتلا دیا کہ فرض نماز چھوڑ دو ——— وہ پھر بھی واپس چلا گیا۔ دو تین دن کے بعد حاضر ہوا، اور وہی عرض کی، تو آپؒ نے پھر وہی جواب دیا ——— آخر وہ مرید چلے گئے۔ فرض چھوڑنے کی تو ہمت نہ ہوئی۔ لیکن سنتیں چھوڑ کر سو گئے۔ خواب میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ ——— "اللہ کے بندے ہم نے کیا قصور کیا کہ ہماری سنتیں چھوڑ دیں۔"

اسی وقت جلدی جلدی اٹھے، وضو کر کے توبہ کی اور سنتیں ادا کیں ——— صبح کو یہ واقعہ حضرت نظامیؒ کو سنایا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر فرض چھوڑتے تو اللہ تعالےٰ خود تشریف لاتے، اور فرماتے کہ فرض کیوں چھوڑتے ہو ....؟

یہاں بھی دو ہی راستے نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ اولیاء اللہ کی ہر بات کو قرآن و حدیث سے قطع نظر کرتے ہوئے من و عن تسلیم کر لیا جائے ——— اور ایک یہ ہے کہ قرآن مجید کے قواعد اپنی جگہ صحیح رہیں، اور اولیاء اللہ کے کلام کے بھی مناسب معانی بیان کئے جائیں ———

★

اہلُ اللہ کی دو اقسام

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے والوں کی دو قسمیں ہیں ــــ ایک وہ جو ریاضت و مجاہدات سے اللہ تعالیٰ تک پہنچتے ہیں ــــ اور ایک وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ خود ہی چن لیتے ہیں اور ان کی تربیت کرتے ہیں۔ تو جو مجاہدات سے اللہ تک پہنچیں ان کو صوفیاء کی اصطلاح میں مرید کہتے ہیں۔ اور جن کو اللہ تعالیٰ خود چُن لیں ان کو مراد کہتے ہیں ــــ

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص تو اپنی دیانت، خلوص اور خدمت کی بناء پر اتنی ترقی کرے کہ بادشاہ اس کو اپنا نائب بنادے۔ اور ایک وہ لڑکا ہے جس کو بادشاہ خود چُن لے۔ اور اس کے لئے مربّی مقرر کر دے جو اس کی تربیت کریں۔ اگر وہ نہ پڑھے تو اُسے زبردستی پڑھائیں۔ زبردستی اس کی تعلیم و تربیت ہو۔

حدیث شریف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے ان لوگوں پر بہت تعجب آتا ہے جو جنت میں جانا نہیں چاہتے۔ لیکن ان کو زنجیر سے باندھ کر لایا جاتا ہے کہ انہیں جنت میں جانا پڑے گا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ :۔

اللہ یجتبی الیہ من یشآء ویھدی الیہ من ینیب (شوریٰ پ ۲۵ ع ۲)	یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں خود بخود اپنی طرف چُن لیتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کو راستہ بتا دیتے ہیں۔

پس قرآن مجید کی اصطلاح میں جن کو اللہ تعالیٰ خود چن لیں ان کو مجتبٰی اور جو مجاہدات سے واصل ہوں ان کو منیب کہتے ہیں ــــ حضرت حاجیؒ فرماتے ہیں کہ یہ شخص (حضرت نظامیؒ کے مرید باصفا) مرید نہیں تھے بلکہ مراد تھے۔ اگر یہ نماز نہ پڑھتے

تو اللہ تعالیٰ خود آ کر پڑھو لیتے۔ اور حضرت نظامیؒ کو معلوم تھا کہ ان کی نماز چھوٹ نہیں سکتی۔

اہلِ استقامت کا حال

پس اہلِ اللہ کی تعظیم کی بنا پر قرآن میں تاویل بھی گمراہی ہے اور قرآن مجید کے ظاہری قواعد پر نظر کرتے ہوئے اولیاء اللہ پر تنقید کرنا بھی گمراہی ہے ——— اور ایسے لوگوں کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم کے گھمنڈ میں رہتے ہیں۔ اور جن کو اپنے علم پر غرور اور فخر نہیں ہوتا وہ کسی بات کو اگر نقل بھی کرتے ہیں تو موجد ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ متبع ہونے کی حیثیت سے نقل کرتے ہیں۔

اس پر حضرت شیخ الہندؒ کا ایک واقعہ یاد آیا۔ وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ آپؒ بہت خوش معلوم ہو رہے تھے۔ تو حاضرین نے کہا کہ حضرت آج بہت خوش معلوم ہو رہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

بتیس سال سے دل میں ایک رائے تھی۔ اس کو ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ——— کیونکہ متقدمین سے کسی کا قول نہیں ملتا تھا، اور آج ایک تابعی کا قول نظر آیا۔ جس سے اس رائے کی تائید ہوتی، اس وجہ سے خوشی ہوئی —— اہلِ استقامت کا یہی حال ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک ہاتھ کتاب اللہ میں ڈال رکھا ہے، اور ایک ہاتھ بزرگوں کے دامن میں ——— اور یہ چیز جب نصیب ہوتی ہے جب انسان عارفین سے وابستہ ہو۔ آج دنیا میں ایک طبقہ ہے جس نے قرآن کو پسِ پشت ڈال دیا ہے اور اولیاء کرام کی اتنی تعظیم کی کہ ان کی ہر بات کو مذہب بنا دیا۔ اگر ایک بزرگ نے سماع کیا جو ان کی ایک خصوصی حالت تھی۔ تو اس کو بھی شریعت میں داخل کر دیا گیا

یہود اس لئے تباہ ہوئے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو چھوڑا۔ حتیٰ کہ ان کی توہین بھی کی اور بعض کو قتل بھی کیا، اور صرف کتابوں کو ہاتھوں میں رکھا، اور جو

مطلب اپنی خواہش کے مطابق ہوا، وہ لے لیا۔ اس سے ان میں غرور پیدا ہوا۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں :۔

ساصرف عن اٰیٰتی الذین یتکبرون فی الارض بغیر الحق۔ وان یروا کل اٰیۃ لا یومنوا بھا۔ وان یروا سبیل الرشد لا یتخذوہ سبیلا۔ وان یروا سبیل الغیّ یتخذوہ سبیلا۔ ذٰلک بانھم کذبوا باٰیٰتنا وکانوا عنھا غافلین (اعراف)

میں پھیروں گا اپنی آیتوں سے ان کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق، اور اگر دیکھ لیں ساری نشانیاں تو ایمان نہ لائیں ان پر، اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں اس کو راہ نہ ٹھہرائیں، اور اگر راستہ گمراہی کا دیکھیں تو اس کو راہ ٹھہرائیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو، اور ان سے بے خبر رہے۔

اس غرور کی اصلاح جب ہو سکتی ہے، جب اہل اللہ کی صحبت اختیار کی جائے —— اور نصاریٰ اس لئے گمراہ ہوئے کہ انہوں نے کتاب اللہ کو کلیۃً چھوڑ دیا، اور انبیاء علیہم السلام کو حتیٰ کہ احبار و رہبان کو بھی معبود بنا لیا —— یہ افراط تفریط گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لئے اصل اعتدال یہ ہے کہ قرآن و حدیث کو بھی نہ چھوڑا جائے اور اہل اللہ کا دامن بھی ہاتھ میں رہے۔

محض حروف قرآن کافی نہیں

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما

میں نے تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک ان کو مضبوطی سے تھامے

کتاب اللہ وسنتی — رہوگے۔ گمراہ نہیں ہوگے — ایک اللہ کی کتاب، اور دوسرے اپنی سنت (طریقِ عمل)۔

اور اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے :-

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (احزاب) — البتہ تحقیق تمہارے لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں عمدہ نمونہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کے حروف کافی نہیں، بلکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی بھی ضرورت ہے۔ بلکہ تقویٰ کی کیفیت قلوب سے قلوب کی طرف آتی ہے، کاغذات سے نہیں آتی۔

صحابہ رضی اللہ تعالٰی عنہم فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر پوری طرح مٹی بھی نہیں ڈالی تھی کہ ہم نے اپنے دلوں کو "منکر" (یعنی اوپرا) پایا۔ حالانکہ علم اور کتاب اللہ موجود تھی، اگر نہیں تھا تو صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود نہیں تھا۔ اس لئے کتابُ اللہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی بھی ضرورت ہے۔

چنانچہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

صلوا کما رأیتمونی اصلی — جس طرح میں نماز پڑھتا ہوں اسی طرح تم بھی نماز پڑھو۔

کیونکہ عمل کا نقشہ آپ ہی کو معلوم تھا۔ حالانکہ صلوٰۃ کا لغوی معنٰے صرف دُعا ہے۔ اور یہ معنٰے صحابہؓ بھی جانتے تھے۔ لیکن یہ معنیٰ اللہ تعالٰے کے مطلوب نہیں تھے۔ لیے آپؐ نے وضو کر کے دکھلایا۔ چنانچہ ایک دفعہ اعضاء کو دھویا، اور فرمایا کہ یہ وضو ایسا ہے کہ اس کے بغیر اللہ تعالٰے نماز قبول نہیں فرماتے — اور پھر اعضاء کو دو دفعہ دھویا اور فرمایا کہ جو شخص ایسا وضو کرے گا، اس کو دو اجر ملیں گے، پھر اعضاء کو تین تین دفعہ دھویا اور فرمایا کہ یہ میرا وضو ہے، اور مجھ سے پہلے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا وضو ہے۔

ایسے ہی حج کا حکم دیا تو حج کر کے دکھلایا۔ معاشرت کی تعلیم دی تو وہ کر کے دکھلائی۔ حالانکہ ان کے لغوی معانی سب کو معلوم تھے لیکن وہ معانی شرعاً مطلوب نہیں تھے لہٰذا شخصیتوں کو چھوڑ کر صرف لٹریچر پر کفایت کرنے سے دین نہیں سیکھا جا سکتا۔

عقلِ محض سے دین فہمی کا انجام

کیونکہ ہر شخص کی عقل مختلف ہے اور عقل کے مطابق ہی عمل کیا جائے۔ تو دین میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا لٹریچر اور بزرگوں سے وابستگی دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ یہی اعتدال کا راستہ ہے اور یہی اہل السنت والجماعت کا طریقہ ہے، اور جو لوگ شخصیتوں کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھیں گے۔ وہ عملِ صحیح سے ہمیشہ محروم رہیں گے اور جو عمل کرتے بھی ہیں تو بھی انہی شخصیتوں سے لیا گیا ہے ——

مَیں نے مشکوٰۃ شریف حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی۔ ایک طرف تو آپ احادیث کا ترجمہ کراتے تھے، اور دوسرے آپ رکوع اور سجدہ کر کے کیفیت بھی بتلاتے تھے —— مَیں نے عرض کی حضرت! اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس لئے تو معلوم ہے کہ کرنے والوں کو دیکھا ہے۔ پھر فرمایا کہ مَیں نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے مشکوٰۃ شریف پڑھی، تو آپ نے بھی رکوع اور سجدہ کی کیفیت عمل کے ساتھ بتلائی۔ مَیں نے عرض کی۔ حضرت اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اسی وجہ سے تو معلوم ہے کہ کرنے والوں کو دیکھا ہے۔

اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مَیں نے مشکوٰۃ شریف حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، انہوں نے بھی اسی ہیئت سے رکوع اور سجدہ بتایا۔ مَیں نے عرض کی کہ حضرت یہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اسی لئے

تو معلوم ہے کہ کرنے والوں کو دیکھا ہے۔ ایسے ہی شاہ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ محمد اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے شیخ ابو طاہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے اور ان سے اسی ہیئت کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔

مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ہے کہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ اگر کوئی مرجاتا تو چھ چھ مہینے تک رونے کی وصیت کرتے، اور رونے والی عورتیں نہ ہوتیں تو کرایہ پر رونے والی لی جاتیں، جو چھ مہینے تک روتیں تاکہ لوگ یہ خیال کریں کہ مرنے والا بہت بڑا آدمی ہے جس پر چھ ماہ تک ماتم ہوتا رہا ——— جب میں نے یہ حدیث پڑھی تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رونے کی ہیئت بناکر مجھے بتایا پھر فرمایا کہ شاید تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہوگا کہ میں نے ایسا کیوں کیا ——— ؟ لیکن حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی ہیئت بتلائی تھی۔ اور فرمایا تھا کہ شاید تم کو یہ خیال ہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا ——— ؟۔ حضرت مولانا شاہ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ایسے ہی ہیئت بتلائی تھی، یہاں تک کہ یہ سلسلہ ایسے ہی حضرت عبد اللہ ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما تک پہنچتا ہے۔

دین فہمی کے لئے اشخاص بھی ضروری ہیں

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی سند بہت بلند تھی۔ ایک دفعہ سہارن پور کے سفر میں آپ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ تو آپ نے فرمایا کہ چونکہ میری سند عالی ہے، اس لئے تم مجھ سے اجازتِ حدیث لے لو ——— لیکن شرط یہ ہے کہ سہارن پور آنا پڑے گا ——— میں نے عرض کی بہت اچھا۔ لیکن اتفاق سے میں وہاں نہ جاسکا، اور ایک سال گزر گیا۔ پھر دوسری دفعہ ایک سفر میں

ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، تو آپ نے فرمایا کہ مجھ سے حدیث کی اجازت لے لو۔ پھر میں نے وعدہ کیا، لیکن کچھ عرصہ گزر گیا اور میں نہ جا سکا۔ آخر آپ نے مدینہ منورہ کو ہجرت کر جانے کا ارادہ فرمایا۔ تو میں یہ سن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے فرمایا کہ تم کو وقت پر خیال آیا۔ دو تین سفر ابھی باقی تھے۔ پھر آپ نے حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدظلہ العالی کو فرمایا کہ حدیث کی تمام کتابیں لے آؤ۔ وہ تمام کتابیں لے آئے۔ بعض کا اوّل آخر پڑھا، اور بعض کا اوّل آخر مجھ سے پڑھایا اور فرمایا کہ میں تم کو بھی اس عمل کی اجازت دیتا ہوں۔ اسی طرح دین کا سمجھنا اشخاص پر موقوف ہے، ورنہ عبارت سے بعض اوقات صرف ترجمہ بھی سمجھ نہیں آتا۔ مثلاً "کیا بات ہے" ایک جملہ ہے۔ اس کو اگر ایک خاص لہجہ سے ادا کیا جائے تو یہ استفہام کے معنٰے میں ہوتا ہے۔ اور تفخیم شان، تحقیرِ شان اور تعجب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن معنٰے مراد کی سمجھ الفاظ سے نہیں آتی۔ بلکہ لب و لہجہ سے آتی ہے۔ اس طرح لٹریچر کے ساتھ عمل کی ہیئت کی بھی ضرورت ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب آیت وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر۔ نازل ہوئی تو حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک سیاہ دھاگا اور ایک سفید دھاگا اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ صبح تک کھاتے پیتے رہتے اور دونوں دھاگوں کو بھی دیکھتے رہتے۔ جب کافی روشنی ہوئی اور دونوں دھاگے ممتاز ہونے لگتے تو آپ کھانا پینا بند کر دیتے۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فرمایا:۔

ان وسادتک لعریض۔ یعنی تمہارا تکیہ بہت چوڑا ہے جس کے نیچے صبح صادق اور صبح کاذب دونوں آگئیں۔

پھر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ سیاہ دھاگے سے مراد صبحؐ

کاذب، اور سفید دھاگے سے مراد صبح صادق ہے۔

اب حضرت عدیؓ نے وہی معنے سمجھا جو لغوی تھا۔ لیکن شرعاً وہ معنے مطلوب نہ تھا۔ اور نہ وہ معنے اللہ تعالےٰ کی مراد تھی۔ ایسے ہی قرآن مجید میں نماز کا حکم ہے، اس کا لغوی معنے دعا رہے۔ حالانکہ یہ معنیٰ اللہ تعالےٰ کی مراد نہیں۔ حج کا معنے قصد کرنا ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ کی مراد نہیں۔ پس جیسے قرآن مجید کا ماننا ضروری ہے۔ ایسے ہی ان کو تنقید سے منزہ سمجھنا ضروری ہے، جن کے واسطے سے قرآن مجید ہم تک پہنچا ہے اور جن کے تقویٰ کی شہادت خود اللہ تعالےٰ نے دی۔ ان سے راضی ہونے کا اعلان بھی فرمایا۔ اور جن کے متعلق فرمایا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہما کے پاس ایک آدمی آیا۔ جو قدریہ خیال کا تھا۔ تو آپ نے اس کو سلام کا جواب نہ دیا۔ اور فرمایا کہ تُو نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ مطلب کے خلاف کہا ہے۔ ایسے ہی حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے بیٹے کے سامنے ایک حدیث بیان کی کہ عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکو۔ تو آپ کے بیٹے نے کہا چونکہ یہ فتنہ کا زمانہ ہے۔ اس کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے ہم ضرور عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع کریں گے —— واقع میں یہ بات صحیح تھی، لیکن چونکہ یہ حدیث کا مقابلہ تھا۔ اس لئے حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں تم سے حدیث بیان کرتا ہوں، اور تم اپنی رائے پیش کرتے ہو —— چلے جاؤ —— میں ساری عمر تمہارا منہ نہیں دیکھوں گا، چنانچہ بہت سفارشیں کرائیں، لیکن ساری عمر اپنے لڑکے کا منہ نہیں دیکھا —— اور ان حضرات کا آپس میں اگر بظاہر کچھ جھگڑا ہو جائے تو اس میں اتنی خیر ہوتی تھی کہ ہماری صلح میں بھی نہیں ہوتی ——

لوگوں کی دو اقسام

غرض آیات کی دو قسمیں بیان کی گئیں — اور لوگوں کی بھی دو قسمیں بیان کی گئیں — فرمایا گیا کہ جن کے قلوب میں کجی ہوتی ہے وہ متشابہات کی عقل سے رکیک تاویلیں کرتے ہیں۔ پس ان معانی کی تعیین میں سلف صالحین کی اتباع ضروری ہے، اور ان کو تنقید سے بالاتر سمجھنا بھی ضروری ہے۔ تعجب ہے کہ لوگ صحابہؓ کو مقتدا بھی مانتے ہیں، پھر ان پر تنقید کیسے کرتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہو سکتیں —

اس پر حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ یاد آیا۔ وہ یہ کہ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے ایک کتاب لکھ کر مولٰنا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نقل کرنے کے لئے دی۔ اس میں ایک جگہ کتابت کی غلطی تھی۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بوجہ غایت ادب نہ تصحیح کرتے ہیں نہ ہی اس کو اسی طرح غلط لکھنے کی جرأت ہوئی۔ جب تحریر ختم ہوئی، حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ حضرت! اس لفظ کی سمجھ نہیں آئی۔ تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی — عین کی بجائے ہمزہ لکھ دو۔ پھر آپ نے تصحیح فرمائی —

بہرحال ان اقسام کے بیان کے بعد زیغ سے بچنے کی دعاء کی تعلیم ہے — اے اللہ! ہمارے دلوں کو کجی سے بچا، اور کجی سے بچنا چونکہ اللہ تعالےٰ کی رحمت پر موقوف ہے۔ اس لئے طلب رحمت کی دعاء بھی تعلیم فرمائی۔ اور جب ہدایت نصیب ہو جائے تو اس کا تھامنا اور سنبھال کر رکھنا مشکل ہے۔ اس لئے موت کا استحضار ضروری ہوا، اس کے خوف سے ہدایت

کو دانتوں میں مضبوط پکڑا جائے ــــــــ

اور یہ چیز تربیت سے اصلاح سے آتی ہے، جو بزرگوں کی صحبت میں ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ بیٹا بن کر سب نے کھایا، باپ بن کر کسی نے نہیں کھایا۔ اس لئے انکساری اور بزرگوں کی خدمت ضروری ہے۔

حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تواضع کی یہ حالت ہے کہ قیامت کے دن کہیں گے ما عرفناک حق معرفتک ــــ

ــــ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :- ....

اللھم لا احصی ثناءً علیك کما اثنیت علی نفسك -

آدم علیہ السلام سے ایک اجتہادی خطاء ہوئی تھی۔ اس پر بھی انہوں نے عاجزی اور زاری کی اور فرمایا :- ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخٰسرین ــ

اور ابلیس نے اللہ تعالےٰ کی نافرمانی بھی کی اور بجائے معافی مانگنے کے تکبر کیا ــ اس کا علاج سوائے اہل اللہ سے تعلق کے مشکل ہے ؎

؎ قال را بگذار، مردِ حال شو
پیش مردے کاملے پامال شو

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تواضع اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک انسان یہ خیال نہ کرے کہ میں نصرانی کے کتے سے بھی بدتر ہوں ــــــ

حدیث شریف میں ہے کہ بندہ جب دعوےٰ سے کہتا ہے کہ میں نے عبادت کی، تو اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ قوت تو میں نے ہی دی تھی، اعضاء تو میں نے دیئے تھے، پھر تو نے کیا کیا ــــ ہے اگر بندہ تواضع اختیار کرے، اور کہے کہ :-

اے اللہ! سب کچھ تیری رحمت سے ہی ہوا، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اولاً حرکت تو تُونے ہی کی تھی، ارادہ تونے ہی کیا تھا، چل کر تو ہی آیا ـــــ گویا اس کو بلند فرماتے ہیں ـــــ

ایک حدیث میں ہے کہ :- لا یدخل الجنتہ من کان فی قلبہ مثقال ذرۃٍ من کبر ـــ یعنی جس کے دل میں ایک ذرہ بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

پستی سے سر بلند ہوا اور سرکشی سے پست ٭ اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

بارش، پتھر اور مٹی دونوں پر برابر پڑتی ہے۔ لیکن پتھر کو اس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اور مٹی سے قسم قسم کی اشیاء پیدا ہوتی ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیات کی قسمیں بیان کیں، اور لوگوں کی اقسام بھی بیان کیں اور ایمان کی حفاظت کا طریق بھی بتا دیا۔

اب میں ختم کرتا ہوں، وقت بھی کافی ہو گیا۔

اللّٰھم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وارنا مناسکنا وتب علینا۔ انک انت التواب الرحیم وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

مقصدِ حیات

عبادتِ خداوندی دنیا سے چلی، قبر میں پہنچی۔ میدانِ محشر میں پہنچی۔ اور جنت تک پہنچ گئی —— یہ چیز ایسی ہے جو زندگی کا مقصد بن سکتی ہے —— اگر زندگی ابدی ہے تو عبادت بھی ابدی ہے۔ کھانا پینا ابدی نہیں۔ یہ قبر تک ختم ہو گیا۔ قبر میں کوئی کھانا پینا نہیں ہو گا۔ اور اگر کچھ کھانا پینا ہو گا بھی تو وہ بھی ذکر اللہ ہی ہو گا۔ جنت میں کھانا پینا ہو گا۔ مگر محتاجگی نہیں ہو گی —— اصل محتاجگی "ذکر اللہ" کی ہو گی۔ اور وہ زبان پر جاری ہو گا۔

از: حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

ترتیب

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن
بہ ونتوکل علیہ۔ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا
ومن سیئات اعمالنا۔ من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ
ومن یضللہ فلا ھادی لہ۔ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ
وحدہ لاشریک لہ۔ ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولانا
محمداً عبدہ ورسولہ۔ ارسلہ اللّٰہ الیٰ کافۃ للناس
بشیراً ونذیراً۔ وداعیا الیہ باذنہٖ وسراجاً منیراً۔
اما بعد: ـــــــ فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

وما امروا الا لیعبدوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین۔ حنفاءَ
ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ وذٰلک دین القیمۃ۔
صدق اللّٰہ العلی العظیم (بینۃ پ۳۰)

تمہید

بزرگانِ محترم!

دنیا میں انسان جب بھی کوئی حرکت کرتا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ کسی دانش مند اور عقلمند انسان کی حرکت بلا مقصد نہیں ہوتی ـــ

آپ جب مسجد کی طرف آنے کے لئے حرکت کرتے ہیں تو نماز مقصد ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ اپنا گھر چھوڑتے ہیں اور محنت مشقت اٹھا کر مسجد میں آتے ہیں — ایک طالب علم اسکول، مکتب یا مدرسہ کی طرف جاتا ہے تو محض حرکت مقصود نہیں ہوتی، بلکہ حرکت سے تعلیم مقصود ہوتی ہے، اسے پڑھنا اور علم حاصل کرنا ہے۔ اس لئے وہاں جاتا ہے، — ایک شخص اگر اپنے شیخ کے پاس خانقاہ کی طرف جاتا ہے، تو اس حرکت کا مقصد اخلاقی تربیت ہوتی ہے کہ میرے نفس کی اصلاح ہو جائے۔ محض حرکت مقصود نہیں ہوتی — آپ ریل سے سفر کر کے کسی جگہ کے لئے حرکت کریں تو کوئی نہ کوئی اسٹیشن ضرور ہو گا جہاں آپ کو اترنا ہو گا جو آپ کی منزلِ مقصود ہو گی — بلا مقصد کے حرکت دیوانوں اور مجنون آدمی کا کام ہوتا ہے۔ دانش مند جب بھی کوئی حرکت کرے گا، اس کا کوئی مقصد ضرور ہو گا۔ اور وہ مقصد اس کے عقلمند ہونے پر دلالت ہو گی ورنہ اس کو بے وقوف کہیں گے —

غرض یہ عقلی اور حسی قاعدہ ہے کہ کوئی حرکت مقصود نہیں ہوتی۔ حرکت سے وہ منزل مقصود ہوتی ہے جس کی طرف آدمی جاتا ہے۔

سفرِ انسانی کی ابتدا و انتہا

اس اُصول کے پیشِ نظر آپ غور کریں تو زندگی بھی ایک حرکت ہے ایک طرف سے آپ چلے ہیں اور ایک طرف جا رہے ہیں۔ اور یہ کوئی چھوٹی موٹی حرکت نہیں کہ دس میں میل کا سفر کر لیا، بلکہ ایک لامحدود حرکت ہے جو دُور تک جانی والی ہے، اور بہت پہلے سے ہوئی ہے۔

آپ تو یہ سمجھے ہوئے ہوں گے کہ جب ہم ماں کے پیٹ سے نکلے تو حرکت شروع ہوئی۔ نہیں ایسا نہیں بلکہ ماں کا پیٹ تو ایک اسٹیشن ہے۔ حرکت اوپر سے آرہی ہے۔

اس جگہ جو انسان کی حرکت ہوتی ہے یہ "عالم الست" سے چلی ہے جس کو قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔ اور احادیث نے اس کی تفسیر بیان کی ——— تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالٰے نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کی کمر پر اپنا دلھنا ہاتھ مارا، جیسا ہاتھ اللہ تعالٰے کی شان کے مناسب اور اس کی جناب کے لائق ہے ——— ہم جیسا ہاتھ تو نہیں ہے۔ ہمارا ہاتھ تو جسمانی ہے اور وہ جسم سے پاک ہے۔ تو جیسا ہاتھ اس کی جناب کے لائق اور شان کے مناسب ہے ویسا ہی ہاتھ مراد لینا چاہیئے ——— تو داہنا ہاتھ مارا تو آدم علیہ السلام کی کمر میں سے ساری وہ اولاد نکل پڑی جو جنتی ہونے والی تھی اور قیامت تک آنے والی تھی ——— اس کے بعد بایاں ہاتھ مارا تو ساری وہ اولاد نکل پڑی جو جہنمی ہونے والی تھی ——— تو نیک اور بد سارے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکل آئے۔ اللہ نے ان کو ایک وادی میں جمع کیا، اربوں، کھربوں انسان جو قیامت تک آنے والے تھے کا ایک مجمع تھا۔ کوئی صف بندی نہیں تھی کہ ترتیب ہو۔ بلکہ کسی کا منہ کسی کی طرف، کسی کی پشت کسی کی طرف اور کسی کا مونڈھا کسی کی طرف، جیسے ہجوم میں ہوتا ہے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا جن کے منہ آمنے سامنے تھے ان میں تو محبت قائم ہو گئی، اور جن کی پشتیں ملی ہوئی تھیں ان میں عداوت قائم ہو گئی، اور جن کے پہلو ملے ہوئے تھے ان میں کچھ محبت اور کچھ عداوت ——— یہی وجہ ہے کہ ایک انسان مشرق کا اور ایک مغرب کا، ایک ایشیا کا اور ایک افریقہ کا، کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن جب جمع ہوتے ہیں تو ان میں دیرینہ محبت معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ پہلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ وہی عالم الست کا اثر ہوتا ہے ——— تو فرمایا گیا الارواح جنود مجندۃ ——— روحیں جمع کر دی گئیں۔ وہیں آپس میں محبتیں اور عداوتیں قائم ہو گئیں، جو دنیا میں آکر ظاہر ہوئیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ماں کے پیٹ میں دو بچے پاؤں پھیلاتے ہیں۔ دونوں حقیقی بھائی ہیں۔ لیکن آپس میں عداوت، کشمکش اور کسی وجہ سے مناسبت نہیں۔ وہ

اس سے لڑتا ہے اور وہ اس سے لڑتا ہے ——— اور دو اجنبی اس طرح سے ملتے ہیں جیسے حقیقی بھائی ہیں۔ یہ ازل سے ہی کسی میں محبت اور کسی میں عداوت ڈال دی گئی۔...... اس طرح سے یہ روحیں وہاں جمع کی گئیں۔

یہ بھی حدیث میں فرمایا گیا کہ وہاں جوڑیاں بھی قائم کر دی گئیں جس کا جس سے نکاح ہونے والا تھا، وہ عورت اس کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ گویا وہیں تقرر کر دیا گیا کہ یہ زوج اور زوجہ بنیں گے۔ تو اس طرح سے لوگوں کی جوڑیاں بنا کر کھڑے کر دیئے گئے۔ ان سب کو حق تعالیٰ نے مخاطب فرمایا اور بلا واسطہ حق تعالیٰ نے ان سب سے کلام فرمایا، اور سب کو اپنا جمال دکھلایا۔ جس سے ہر ایک کے دل میں اپنے مالک کی محبت قائم ہو گئی ——— اور یہ بھی فرمایا کہ:۔

الست بربکم ——— ؟ (کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟)

حدیث میں ہے کہ سب انسان ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ اس کا کیا جواب دیں۔ سب سے پہلے جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بولے۔ فرمایا:۔

بلیٰ ۔ (بے شک آپ ہمارے رب ہیں)

آپ کا فرمانا تھا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی زبان سے یہ کلمہ نکلا کہ بلیٰ، بلیٰ بے شک آپ ہمارے رب ہیں ——— انبیاء علیہم السلام کے بول سے سب انسانوں کے دل میں ڈال دیا گیا۔ اور تمام انسان بولے کہ بلیٰ، بلیٰ، بلیٰ بے شک آپ ہمارے پروردگار ہیں ——— گویا سب سے پہلے معلم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کی تعلیم سے سب انبیاء علیہم السلام بولے۔ اور انبیاء علیہم السلام کے بولنے سے پورے انسانوں تک یہ تعلیم پہنچ گئی۔

تو سب نے اللہ کے مالک ہونے اور رب ہونے کا اقرار کیا، اور اس کی ربوبیت کو مانا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اس عہد کو یاد رکھنا۔ دنیا میں جب جاؤ گے تو اس عہد کو بھولنا نہیں۔ ہم انبیاء علیہم السلام کو بھیجیں گے، جو آکر تمہیں یاد بھی دلائیں گے۔ پھر اپنی زندگی

صحیح کر کے کل کو ہمارے سامنے آنا، اور اس عہد کو دل میں رکھ کر لانا۔ یہ مت کہنا کہ ہمیں تو کسی نے کچھ بتلایا ہی نہیں تھا، ہم کو کسی نے تعلیم ہی نہیں دی تھی۔

ان تقولوا یوم القیٰمة انا کنا عن هذا غٰفلین۔ (القرآن)	قیامت کے دن یہ کہنے کا موقع نہیں ہوگا کہ ہم تو غافل تھے۔ نہ کسی کو رب جانتے تھے نہ کسی کو مالک و خالق۔ ہمیں یہ کسی نے بتلایا ہی نہیں تھا۔

تو فرمایا کہ ہم اپنا "رب ہونا" بتلا رہے ہیں۔ اور ہم سب کے باپ آدم علیہ السلام کو اللہ نے گواہ بنایا اور فرمایا کہ اے آدم! میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے اپنی ربوبیت کا اقرار ان سب کے دل میں ڈال دیا۔ زمین کو گواہ کیا اور آسمان کو بھی گواہ کیا، کہ ہم نے تمہیں تعلیم دے دی، اور اپنا جمال دکھلا کر اپنی محبت بھی پیدا کر دی، اور سوال کا جواب دلا کر اپنی ربوبیت کا اقرار کرا لیا کہ میں تم سب کا رب ہوں، اور یہ کہ تم غافل نہیں ہو۔

یہی وجہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی انسان اپنے دل میں ایک جمال محسوس کرتا ہے کہ میرا مالک اور خالق کوئی ضرور ہے۔ "اور وہ ہے بھی ایک" —— یہ انسان کو عقل سمجھاتی ہے۔ اسی وجہ سے ہر ایک کی فطرت میں اقرار موجود ہے۔ ہر ایک کے اندر عشق و محبتِ خداوندی ڈلی ہوئی ہے، جسے ہر انسان محسوس کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام آکر اسے دعوت دیتے ہیں۔ اس کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ محبت کو کس طرح ظاہر کیا جائے۔ اس ربوبیت کے اقرار کو کس عمل سے نمایاں کرے۔ وہ تعلیم دے کر اس کی تفصیل کر دیتے ہیں۔ اجمالاً ہر ایک انسان کے دل میں یہ جذبہ موجود ہے۔

احوالِ برزخ

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا یہ سفر وہاں سے شروع ہوا تھا،

وہاں سے یہ حرکت شروع ہوئی، آدم علیہ السلام کی کمر میں سے نکلے، اقرارِ توحید کے بعد پھر آدم علیہ السلام کی کمر میں لوٹا دیئے گئے —— اس کے بعد پھر آدم علیہ السلام کی اولاد ہوئی۔ پھر اولاد کی اولاد، اور آگے یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اور انسان اپنے اپنے والد کی پشتوں میں منتقل ہوتے رہے۔ تو پہلی منزل جہاں سے انسان چلا ہے وہ آدم علیہ السلام کی پشت ہے، اور پھر اپنے باپ در باپ کی طرف منتقل ہوا —— اس کے بعد پھر ہر انسان اپنی اپنی ماں کے پیٹ کی طرف منتقل ہوا۔ نو مہینے وہاں قیام کیا۔ یہاں اسے کچھ غذا ملی۔ کچھ اسے سمجھایا گیا، نو مہینے کی مدت گذار کر گاڑی آگے چلی، پھر دنیا کا اسٹیشن آگیا —— پھر دنیا میں کسی کی عمر چالیس برس، کسی کی پچاس، کسی کی ساٹھ اور سو برس اور کسی کے دو سو برس —— پہلی امتوں کی بارہ بارہ سو، اٹھارہ اٹھارہ سو برس عمریں ہوئیں۔ اب عمریں کم ہوگئیں —— تو انسان آتے رہے اور اپنی اپنی عمر کے مطابق قیام کرتے رہے۔ جب دنیا میں اس کی عمر ختم ہوئی تو عالم برزخ میں پہنچ گیا، جس کو قبر کہتے ہیں —— اور قبر یہ نہیں ہے جس کو ڈیڑھ گز کا گڑھا بتلایا جاتا ہے۔ یہ تو اس کی علامت ہے۔ وہ ایک مستقل جہان ہے جس کو برزخ کہتے ہیں، جو دنیا اور آخرت کے بیچ میں ہے۔ اس کا تعلق کچھ دنیا سے ہے اور کچھ آخرت سے ہے۔ مرنے والا بالکل دنیا میں بھی نہیں رہتا اور بالکل آخرت میں بھی نہیں پہنچتا، بلکہ بیچ بیچ میں رہتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ قبر میں جنت کی کچھ کھڑکیاں کھول دی جاتی ہیں، اور آدمی جنت میں اپنے مقام کو دیکھتا ہے، اور تمنا کرتا ہے کہ یارب اقم الساعۃ۔ اے اللہ جلدی قیامت کر دے تاکہ اس مقام کریم تک پہنچ جاؤں —— وہاں سے خوشبوئیں آتی رہتی ہیں اس میں "یہ مست" رہتا ہے۔ تو آخرت بھی سامنے ہے اور دنیا بھی سامنے ہے کہ کوئی ثواب پہنچائے تو پہنچ جاتا ہے۔

قبر پر زیارت کے لیے کوئی جائے تو حدیث میں ہے کہ قبر کی زیارت کا ادب یہ ہے کہ قبلہ کی طرف پشت کر کے میت کی طرف منہ کرے۔ میت اسے دیکھتا ہے اور

پہچانتا ہے ـــــ تو اُدھر اس کا رخ جنت کی طرف ہے اور اِدھر اس کا رخ دنیا کی طرف ہے۔ وہاں سے ہوائیں آ رہی ہیں، اِدھر سے دعائیں اور ثواب پہنچ رہا ہے ـــــ خود اہلِ برزخ بھی دنیا والوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ مرنے والے کو جب نعمتیں ملتی ہیں اور قبولیت ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے اللہ جتنے میرے عزیز اور مسلمان بھائی ہیں اس وقت تک انتقال نہ کریں جب تک انہیں توبہ نصیب نہ ہو جائے۔ جب تک وہ اپنے گناہوں سے معافی نہ چاہ لیں۔ تاکہ پاک صاف ہو کر یہاں پہنچیں جیسے تُو نے مجھے پہنچا دیا ـــــ تو ہر ہر میت اہل دنیا کے لئے دعا کرتا ہے، اور دنیا والے میت کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ جیسے اللهم اغفر لهم وارحمهم ـــــ اے اللہ ان کی مغفرت فرما کر ان پر رحم فرما اعلِ درجاتهم في الفردوس۔ ان کے درجات فردوس میں بلند فرما ـــــ تو ہم ان کے لئے دعا گو ہیں۔ وہ ہمارے لئے دُعا گو ہیں۔ ان کی دعا کا ہدیہ ہم تک پہنچتا ہے، اور ہمارے ثواب کا ہدیہ ان تک پہنچتا ہے۔

اسی واسطے فرمایا گیا کہ میت پر زیادہ رونے کی ضرورت نہیں۔ روئے دھوئے تو جب جب ہمیشہ کے لئے جدائی ہو۔ یہ چند دن کی جُدائی ہے۔ ہم بھی وہیں پہنچ جائیں گے، جہاں وہ پہنچا ہے۔ تو زیادہ رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے۔ قبر پہ جا کے آپ ثواب پہنچائیں ان کو مل گیا۔ انہوں نے دعا کا ہدیہ بھیجا وہ آپ کو مل گیا۔ تو یہ کیا جُدائی ہوئی ـــــ؟

یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارا کوئی عزیز ہندوستان چلا جائے تو وہاں سے خط کی بھی آمد و رفت ہے، ہدیہ بھی جاتا ہے۔ سلام و کلام بھی پہنچتا ہے۔ اس لئے آدمی روتا نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ جب جی چاہے گا مل لوں گا، اور آدھی ملاقات تو گویا ہوتی ہی رہتی ہے۔

اسی واسطے فرمایا گیا کہ میت پر اتنا رونا دھونا کہ آدمی نوحہ، بیان، بکار کرے،

ماتم کرنے لگے، گریباں پھاڑ ڈالے، رخسارے نوچ ڈالے۔ یہ اللہ تعالیٰ پر بے اعتمادی کا بھی اظہار ہے........ اور بے وقوفی بھی ہے۔ اتنا تو تب روئے جب یہ بات ہو کہ اب کبھی ملنا نہ ہوگا۔ یہ چند دن کی جدائی ہے پھر ملاقات ہوگی۔

حاصل یہ ہے کہ جس کو ہم قبر کہتے ہیں وہ ڈیڑھ گز کی جگہ نہیں ہے وہ دراصل عالم برزخ ہے، جو اتنا بڑا عالم ہے کہ دنیا جیسے لاکھوں عالم اس میں بن سکتے ہیں، تو انسان عالم برزخ کی طرف منتقل ہوگیا، اور جب بھی منتقل ہوتا ہے تو ترقی کی طرف منتقل ہوتا ہے آدم علیہ السلام کی کمر سے جب نکلا تو حدیث میں ہے کہ تمام انسان چیونٹیوں کی طرح تھے۔ ماں کے پیٹ میں آیا تو قد و قامت بڑھ گیا، غذا بھی ملنے لگی۔ دنیا میں آیا تو قد و قامت اور بڑھ گیا۔ غذا بھی بڑھ گئی۔ وہاں حیض کا خون ملتا تھا یہاں صاف دودھ ملنے لگا۔ مٹھائیاں عمدہ غلے، ترکاریاں، پھل پھول اور فروٹ ملنے لگے۔ ماں کے پیٹ میں نہ تھے وہ تنگ جہان تھا۔ جبکہ دنیا میں ماں کے رحم جیسے کروڑوں جہان بن سکتے ہیں۔

اب انبیاء علیہم السلام نے خبر دی کہ تم آہستہ آہستہ ترقی کے عالم میں پہنچ رہے ہو۔ اس کے بعد ایک اور عالم آنے والا ہے، اور وہ اتنا بڑا ہے، کہ دنیا جیسے کروڑوں عالم اس میں بن جائیں اور وہ عالم برزخ ہے۔ وہاں نعمتیں اور راحتیں بھی زیادہ ہوں گی۔ دنیا میں اگر بے چین رہے مگر ایمان تھا تو قبر کے اندر راحت ملے گی۔ ہزار برس تک اکرام سے پڑے سوتے رہنا۔ دنیا میں زیادہ سونے کی ضرورت نہیں کچھ اللہ کا نام لو، عبادت کرلو۔ باقی تکلیف اگر ہوتی ہے تو اٹھالی جائے، کیونکہ دنیا تو تکلیف ہی کی جگہ ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب سوال و جواب قبر میں ہو چکے گا۔ اور منکر نکیر کو سب کا جواب دے دے کہ میرا رب اللہ ہے۔ میرا دین اسلام تھا۔ میرے پیغمبر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تھے۔ تو غیبی آواز پیدا ہوگی کہ ۔ ان صدق عبدی۔

—— میرے بندے نے سچ کہا۔ فافرشوه من الجنة والبسوه من الجنة وافتحوا له باباً من الجنة —— اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دو۔ جنت کے فرش بچھاؤ۔ جنت کا لباس بھی دو۔ .... اور ویوسع له قبره مد بصره۔ قبر اتنی وسیع کر دی جاتی ہے کہ جہاں تک نگاہ پہنچتی ہے میدان ہی میدان نظر آتا ہے —— آسمان تک ہماری نگاہ پہنچتی ہے زمین سے آسمان تک پانچ سو برس کا راستہ ہے۔ قبر میں ہر انسان کو اتنا بڑا عالم ملے گا جتنا زمین سے لے کر آسمان تک کا مقام ہے۔ تو عالم برزخ میں دنیا جیسے لاکھوں عالم بن جائیں۔ معلوم ہوا کہ انسان ترقی کی طرف ہے۔

برزخ میں پہنچ کر پھر انبیاء علیہم السلام نے خبر دی کہ ایک اور عالم آنے والا ہے جو اس سے بھی بڑا ہوگا۔ اور وہ عالم محشر ہے۔ اس عالم کی کل عمر تو چند صدیوں کی ہوگی۔ اُس عالم کا پچاس ہزار برس کا ایک ہی دن ہوگا۔ ایک دن میں سارے اولین و آخرین انسان جمع ہوں گے۔ اس کے بعد پھر انبیاء علیہم السلام نے فرمایا کہ ایک اور عالم آنے والا ہے جس کا نام جنت ہے۔ وہ اتنا بڑا عالم ہے کہ عالم برزخ جیسے کروڑوں عالم اس میں بن جائیں۔ اس لئے کہ عالمِ برزخ میں ایک آدمی کو اتنا حصہ ملتا ہے جتنا زمین سے لے کر آسمان تک کا مقام ہے، اور جنت میں ادنیٰ جنتی کو جو حصہ ملے گا وہ اس دنیا کے دس گنا کے برابر ہوگا۔ تو اندازہ کیجئے جنت کتنا بڑا عالم ہے۔

تو انسان عالمِ الست سے چلا تو عالمِ رحم میں آیا۔ عالم رحم سے چلا، عالم دنیا میں آیا، عالمِ دنیا سے چلا تو عالم برزخ میں آیا۔ عالم برزخ سے منتقل ہوا تو عالمِ حشر میں پہنچا۔ عالمِ حشر سے منتقل ہوا تو عالمِ جنت میں پہنچا۔ اور جنت میں روزانہ ترقی ہوگی، نئے نئے عالم انسان پر کھلیں گے، عجائبات ظاہر ہوں گے۔ طرح طرح کی نعمتیں نمایاں ہوں گی۔

اس لیے کہ انسان میں تجدد پسندی کا جذبہ ہے کہ نئی نئی چیزیں اس کے

سامنے آنی چاہئیں۔ اگر ہمیشہ پرانی چیزیں رکھی رہیں تم آدمی کا دل گھبرا جاتا ہے۔ اگر روز پلاؤ کھانے کو ملے تو دوسرے دن جی گھبرا جائے۔۔۔ کسی دن دال، کسی دن چاول کسی دن پلاؤ، روز نئی چیز ہو تو انسان کی طبیعت بہلتی رہتی ہے۔ اور روز ایک ہی غذا ہو، چاہے وہ اعلیٰ ہو تو بھی آدمی کا دل گھبرا جاتا ہے۔

اسی واسطے دنیا میں موٹر کاریں ہیں، ہر سال ان کا نیا ماڈل تیار کیا جاتا ہے۔ مکانات کے نقشے بدلتے رہتے ہیں۔ کل کچھ اور رنگ کا مکان تھا۔ آج اور رنگ کا۔ آج کل امریکن اسٹائل مکان چلے ہیں۔ ان کا کچھ اور ہی نمونہ ہے۔۔۔ سو برس کے بعد دنیا میں معلوم نہیں کیا نمونہ بن جائے گا ۔۔۔۔۔۔ تو یہ انسان کی فطرت ہے کہ نئی سے نئی چیز سامنے آئے۔۔۔ جنت کی نعمتیں کتنی ہی پُر لطف ہوں لیکن اگر ایک ہی قسم کی نعمتیں ہوتیں اور ابدالآباد تک رہتیں، تو آدمی گھبرا جاتا۔۔۔ اس لئے روز نئے نئے سامان ہوں گے۔

حدیث میں ہے کہ جنت میں ایک عالیشان محل ہے۔ جس میں انسان مقیم ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر جو نگاہ اٹھاتا ہے تو اب تک معلوم تھا کہ سبز رنگ ہے۔ دوبارہ جو نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ اب سُرخ ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد نگاہ کی معلوم ہوگا کہ زرد رنگ ہو گیا۔ تو محلات کے رنگ نئے نئے آتے رہیں گے۔ نئے نئے جہاں کھلتے رہیں گے۔ نئی نئی نعمتیں سامنے آتی رہیں گی۔ اور نشاط پہ نشاط پہنچتا رہے گا۔۔۔ معلوم ہوا کہ جنت میں بھی حرکت ہی رہے گی ۔۔۔۔۔۔ اور وہ ختم ہونے والی نہ ہوگی بلکہ ۔۔۔۔۔۔ عروج ہوتا رہے گا۔ گویا اصل ترقی وہاں ہو گی۔

بہر حال مجھے ان ترقیات کی تفصیل بیان کرنا نہیں صرف یہ بتلانا ہے کہ انسان حرکت میں ہے۔ اب بھی آپ حرکت میں ہیں۔ قبر و حشر میں بھی حرکت میں رہیں گے۔۔۔ جنت میں جا کر عالم متعین ہو جائے گا۔ مگر نعمتوں اور لذائذ کی ترقی جاری رہے گی۔۔۔

تو اتنی لمبی حرکت کا کوئی مقصد ہونا چاہیئے۔ تھوڑی سی حرکت گھر سے مدرسہ اور خانقاہ تک کی جائے تو اس کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ چند گھنٹوں کی حرکت ہوتی ہے یہ تو ہزاروں برس کی حرکت ہے۔ تو اتنی طویل حرکت ہو اور بلا مقصد ہو۔ یہ عقلِ بالغ نہیں کہتی۔ عقلِ سلیم یہ قبول نہیں کرے گی کہ یہ انسان ایسے ہی بے کار حرکت کر رہا ہے، اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ عقل اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ اللہ نے اسے عبث و بے کار پیدا نہیں فرمایا۔

زندگی کی حقیقت

بلکہ یہ آپ کی زندگی، یہ خود ایک مستقل حرکت ہے، جو آدمی کے اندر بہت زور سے چل رہی ہے اور بہت دور تک چلتی رہے گی۔ جب تک آدمی کا بدن حرکت کرتا ہے کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہے۔ جب حرکت ختم ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ آدمی مرچکا ہے۔ قلب حرکت کرتا رہے، کہتے ہیں کہ قلب زندہ ہے۔ اگر قلب کی حرکت ختم ہو جائے، کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کا انتقال ہو گیا ——— تو حرکت بند ہو جانے کا نام موت، اور حرکت کے جاری رہنے کا نام زندگی ہے ——— انسان کی آنتیں جب تک حرکت کرتی رہتی ہیں فضلات خارج ہوتے رہتے ہیں، آدمی تندرست رہتا ہے۔ اگر آنتیں حرکت نہ کریں، ان میں غذا پڑی رہے، حبس ہو جاتا ہے، وہی موت کا پیش خیمہ ہے ——— تو آنتیں، دل، جگر اور دماغ سب حرکت میں ہیں، حتیٰ کہ عقلِ انسانی بھی حرکت میں ہے۔ آدمی اس سے کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے۔ کل کیا ہو گا؟ پرسوں کیا ہو گا ——؟ گویا ہر وقت دماغ حرکت میں ہے۔ اگر حرکت بند ہو جائے، کہا جائے گا کہ فلاں آدمی بے وقوف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عقل نہیں ——— تو ایک ایک قوت اور عضو حرکت کرتا رہتا ہے۔ دیکھا جائے تو نہ صرف انسان بلکہ زندگی بھی حرکت میں ہے۔

اس لئے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ انسان ازلی تو نہیں کہ ہمیشہ سے تھا، مگر ابدی ضرور ہے کہ پیدا ہو گیا تو اب مٹنے والا نہیں۔ ابد الآباد تک وہ زندہ رہے گا۔ جگہیں بدلتی رہیں گی ایک عالم سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے اور پھر چوتھے عالم میں۔ تو مکان اور جہان بدلتے رہیں گے اور انسان باقی رہے گا۔

کیا مقصدِ زندگی خورد و نوش ہے؟

تو اس قدر طویل زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ——— مقصد بھی اتنا طویل ہونا چاہیئے جتنا لمبا سفر ہے۔ سفر تو ہزاروں برس کا ہو اور مقصد معمولی سا ہو، وہ اس کے اوپر چسپاں نہیں ہو گا۔ مقصد اتنا اونچا اور بلند ہونا چاہیئے جو اس کی لمبی عمر کے مناسب ہے، جتنا ہی بڑا سفر اتنا ہی بڑا درشن ہونا چاہیئے۔ تو وہ کیا مقصد ہے جس کے لئے ہم پیدا کئے گئے، اور اتنا لمبا سفر اختیار کیا؟

فرض کیجئے یہ مقصد ہو کہ بس آپ روٹی کھا لیجئے۔ یہ بھی ایک مقصد ہے کہ کچھ پیسے جمع کیے، کچھ روٹیاں کھائیں، کچھ مزے اڑائے۔ بس آدمی ختم ہو گیا ——— تو اتنا لمبا سفر، اور اس کے لئے مقصد صرف روٹی ——— ؟ (کلا وحاشا)

روٹی تو جانور بھی کھاتے ہیں۔ پھر انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ جو گلے بھینس بکری ہیں وہ سب اس مقصد کو ادا کر رہی ہیں ـــ انسان اشرف المخلوقات ـــ اتنی بلند مخلوق اور اس کی زندگی کا صرف مقصد یہ کہ وہ روٹی کھالے اور ختم ہو جائے۔ (یا ایسے اسباب و وسائل میں زندگی گنوا دے جن کا نتیجہ بہر صورت روٹی ہو۔ مثلاً تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ یا باقی اسبابِ معاش جو روٹی کو نتیجہ کے طور پر میسر کرتے ہیں) یہ کوئی اہم مقصد نہیں ہے۔ اگر یہ اہم مقصد ہوتا تو جو اس مقصد کو زیادہ عمدگی سے انجام دیتا وہ اشرف المخلوقات ہونا چاہیئے تھا۔ وہ انسان نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے ہاتھی

بھینس اور گائے وغیرہ اشرف المخلوقات بنتے۔ انسان نہ بنتا۔ یہ اتنا نہیں کھا سکتا جتنا یہ جانور کھاتے ہیں۔ اگر کھانے کے لیے بیٹھ جائے تو ہاتھی کے برابر نہیں کھا سکتا۔ نہ پیٹ اتنا ہے نہ ہاضمہ اس جیسا ہے۔ اس لئے اس قدر طویل زندگی کا مقصد ظاہر ہے کہ وہ روٹی تو نہیں ہو سکتی۔ اتنی لمبی چوڑی حرکت کی زندگی، کیا محض اللہ نے اس لئے دی کہ چند لقمے کھا لئے جائیں۔ یہ تو عارضی سی بات ہے۔

پھر یہ کہ کھانے کا مقصد درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ بدن باقی رہے۔ اس کے باقی رہنے کا کیا مقصد ہے؟ پھر مقصد کی تلاش شروع ہو گئی۔ تو روٹی اگر مقصد بنتی، وہ مستقل چیز بنتی، حالانکہ وہ بدن کے پلنے کا ذریعہ ہے۔ پھر سوال اپنی جگہ قائم، کہ روٹی بدن کے پلنے کا ذریعہ ہوتی۔ پھر بدن کے پلنے سے کیا مقصد ——؟

اور اگر فرض کیجیے روٹی مقصد ہو بھی تو اتنی لمبی چوڑی عمر اور یہ مقصد ——؟ یہ مقصد تو پھر جانوروں کو بھی حاصل ہے۔ جانور بھی تو آخر کھاتے پیتے ہیں۔ اگر آپ نے کھا پی لیا تو کونسا کمال کیا ——؟

آپ کہیں گے صاحب ہم تو پلاؤ، زردہ اور مرغ کھاتے ہیں۔ جانور تو یہ نہیں کھاتے —— میں کہتا ہوں کہ جانور کیوں مرغ نہیں کھاتے۔ کیا بلی مرغ نہیں کھاتی اور شیر گائے کو نہیں پھاڑ کھاتا؟ آپ نے گائے کا گوشت کھا لیا تو کیا کمال کیا؟ بھینسا وہ بھی کھا لیتا ہے آپ بھی کھا لیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ مصالحہ نہیں ڈالتا۔ تو مصالحہ ڈالنا بھی کون سے کمال کی بات ہے؟ مصالحوں سے تو بلکہ گوشت کا اصل ذائقہ ختم ہو جاتا ہے۔ صحیح طور پر گوشت کو پکایا جائے۔ تھوڑا سا نمک مرچ ملا کے کھا لیا تو گوشت کا اصل ذائقہ تو رہے گا —— یہ مصالحوں کی بھرمار سے تو اصل ذائقہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

میں تو کہا کرتا ہوں کہ ہوائی جہاز کا کھانا بڑا اچھا ہوتا ہے۔ وہ گوشت کو خاص طریق سے پکاتے ہیں۔ نہ اس میں نمک، نہ مرچ، نہ مصالحہ، —— ترکاری سامنے

رکھدی۔ نمک مرچ ڈالو اور کھالو۔ اس طرح ترکاری کا اصل مٹھاس قائم رہتا ہے اور ہم اتنے مصالحے بھر دیتے ہیں کر ترکاری کا اصل مٹھاس اور حلاوت ختم ہو جاتی ہے۔

تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے بھی مُرغ کھایا اور بلی نے بھی مرغ کھالیا۔ اس نے اصل ذائقہ چکھا آپ نے بدلا ہوا۔ آپ تو گھاٹے میں رہے اور اس نے اصل گوشت کھایا .... یہ کون سا کمال ہے؟ اگر یہ کمال ہوتا، پھر بلی بھی اشرف المخلوقات ہوتی۔ تو کھانا کوئی مستقل کمال نہیں۔ کھانا ضرورت کے لیے ہے۔ تاکہ بدن باقی رہے اور بدن سے ہم کام لے سکیں۔ تو اصل مقصود وہ کام ہو گا۔ بلکہ جن پر کام کی زیادتی ہوتی ہے کھانا کھاتے ہوئے ان کا جی گھبراتا ہے۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ کام زیادہ ہے کھانا دانا تو ہوتا ہی رہے گا۔ معلوم ہوا کہ کھانے کو اصل مقصد نہیں سمجھتے۔ کام کو اصل مقصد سمجھتے ہیں۔ تو کھانا کوئی اہم چیز نہیں۔ اگر ہمیں کوئی ایسا طریقہ ہاتھ لگ جائے کہ بلا کھائے پیئے ہم کام کرتے رہیں، شاید کھانے کی طرف رُخ بھی نہ کریں۔ یہ تو مجبوری کی بات ہے کہ بلا کھائے پیئے زندگی باقی نہیں رہتی۔

مجھے اس پر اپنے بزرگوں کی ایک حکایت یاد آگئی —— حضرت مولینا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند جو میرے دادا بھی ہیں، ان کے زمانے میں آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی، جنہوں نے آریہ سماج کی بنیاد رکھی۔ وہ یو۔ پی میں سہارن پور کے ایک قصبے میں آئے اور آکر انہوں نے اعلان کیا کہ کوئی مسلمانوں کا عالم میرے مقابلہ میں مناظرہ کرنے کے لئے آئے۔ اور یہ بھی اعلان کیا، کہ کسی چھوٹے موٹے عالم سے میں مقابلہ نہیں کروں گا۔ مولبی کاسم (مولوی قاسم) کو بلاؤ۔ ان سے میں مقابلہ کروں گا —— حضرتؒ اس زمانے میں کچھ بیمار تھے مگر وہاں کے خدام نے لکھا کہ حضرتؒ یہ صورتِ حال ہے۔ اس لئے آپ ہی کو آنا ہو گا، کیونکہ اس نے تو اعلان اور چیلنج کیا ہے کہ مولبی کاسم سے مناظرہ ہو گا .... اسی بیماری کی حالت میں حضرتؒ تشریف لے گئے۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ تو آئیں گے نہیں۔

—— جب حضرتؒ پہنچ گئے تو جناب نے یہ سوچنا شروع کیا کہ جان کس طرح چھوٹے، بھاگوں کس طرح؟

منشی نہال احمد صاحب، حضرتؒ کے خادمِ خاص تھے۔ یہ بڑے ذہین و ذکی تھے۔ حضرتؒ نے ان کو پنڈت جی کے پاس بھیجا کہ آپ جا کے مناظرہ کی شرائط طے کرو کہ کن اصول اور شرائط پر مناظرہ ہوگا۔ کیا صورت اختیار کی جائے گی تاکہ پھر مناظرہ ہو سکے۔ منشی صاحب پہنچے تو پنڈت جی کچھ کھانے میں مصروف تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ جس کمرے میں پنڈت جی تشریف رکھتے ہیں، وہاں ایک بہت بڑی پرات (تھال) جس میں بہت سا حلوے، پوری، ترکاریاں اور بہت کچھ...... غرض دس پندرہ سیر وزن کا ملبہ اس کے اندر بھرا ہوا۔ وہ لے جایا گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک آدمی کی خوراک تو نہ تھی، انہیں خیال گزرا کہ کمرے میں ایک آدمی تو نہیں ہوگا۔ ایک آدمی آخر کتنا کھالے گا؟ پنڈت جی کے اعزاز میں بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا ہوگا۔ اس لئے یہ انتظار میں کمرہ سے باہر بیٹھے رہے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد جب وہ پرات آئی، وہ بالکل خالی تھی۔ وہ یہی سمجھے کہ کئی آدمی ہوں گے، ایک آدمی اتنا تھوڑا ہی کھا سکتا ہے —— اس کے بعد ان کو اندر بلایا گیا، دیکھا کہ پنڈت جی اندر اکیلے بیٹھے ہیں۔ یہ حیران ہوئے کہ ایک آدمی پندرہ بیس سیر کا ملبہ کس طرح کھا سکتا ہے؟ دل میں خیال کیا کہ جس کمرہ میں پنڈت جی بیٹھے ہیں۔ ممکن ہے اس میں کوئی دروازہ دوسری طرف ہو۔ لوگ کھا کے ادھر سے نکل گئے ہوں، مگر وہاں تو کوئی دروازہ بھی نہیں تھا۔ یہی ایک دروازہ تھا جس سے یہ خود داخل ہوئے تھے —— پھر انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ پنڈت جی کے ساتھ کسی اور نے بھی کھانا کھایا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں، اور تو کوئی شریک نہیں تھا —— اب یہ حیران ہوئے کہ یہ آدمی ہے، یا آدمی سے باہر کوئی خاص قسم کا انسان یا جانور ہے جو اتنا کھا گیا (کہ خدا کی پناہ)

جب واپس آئے تو انہوں نے حضرتؒ کو شرائط بتلائیں۔ اس کا سنانا تو مقصود

نہیں ہے ـــــ لیکن جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بات چیت کر چکے تو باہر آ کے اپنے ہمجولی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اور مولانا محمد حسن صاحب امروہیؒ جو حضرتؒ کے شاگرد اور ان کے ساتھی تھے، سے بات کی کہ بھائی مجھے تو ایک فکر پیدا ہو گیا، بڑی پریشانی ہو گئی اور اس کا حل بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ سب ساتھی متوجہ ہوئے کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ پریشانی یہ ہے کہ جب مناظرہ ہوگا؟ ہمارے حضرتؒ اِن شاء اللہ جیتے گیں، اس لئے کہ حق پر ہیں اور مناظرہ علم میں ہو گا تو علم میں ہمارے حضرتؒ سے بڑا کوئی عالم ہم نہیں دیکھتے۔ اس لئے حضرتؒ ہی غالب آئیں گے۔ لیکن اگر کھانے میں مناظرہ ہو گیا تو پھر کیا ہو گا؟ یہ ایک ہنسی کی بات تھی۔ لوگ ہنس کے چپ ہو گئے۔ شدہ شدہ بات حضرتؒ کے پاس پہنچ گئی۔

حضرتؒ نے انہیں بلایا۔ اور فرمایا۔ منشی جی! آپ نے کیا بات کی؟ ـــ یہ بے چارے بہت گھبرائے۔ اس لئے کہ مذاق کی بات تھی۔ اپنے دوستوں میں کر دی۔ اب اپنے شیخ کے آگے خاموش ـــــ! کہیں تو کیا کہیں؟

حضرتؒ نے فرمایا کہ جو تم نے کہا میں سُن چکا ہوں۔ ذرا تمہاری زبان سے سُننا چاہتا ہوں تاکہ تمہیں جواب بھی بتلا دوں۔ اس لئے کہ تم نے یہ ظاہر کیا کہ یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ اور حل طلب ہے۔ تو مجھے اس کا حل بھی بتلانا ہے۔ مگر اپنی زبان سے کہو۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ حضرت میری زبان سے یہ نکلا تھا، کہ اگر علم میں مناظرہ ہوا تو ان شاء اللہ ہمارے حضرتؒ غالب آئیں گے۔ لیکن اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہو گا ـــــ؟ اس لئے کہ پنڈت تو بیس سیر کا ملبہ کھا جائے گا اور آپ سے آدھی چپاتی بھی نہیں کھائی جائے گی۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک ہنسی کا جواب ہے۔ اور ایک حقیقی اور تحقیقی جواب ہے۔ ہنسی کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ کیا سارے مناظرں کے لیے مَیں ہی رہ گیا ہوں تم لوگ کس کام کے لئے ہو؟ اگر کھانے میں مناظرہ ہو گیا

مَیں تم کو آگے کر دوں گا ــــــــ

اس کے بعد فرمایا کہ تمہارے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو کون جیتے گا؟ ــــ فرمایا کہ کھانا بہائم اور جانوروں کی علامت ہے، تو مناظرہ بہیمیت اور جہالت میں ہوتا ہے یا علم میں؟ ـ فرمایا اگر بہیمیت میں مقابلہ ہوا تو ہم پنڈت جی کے مقابلہ میں بھینسے، ہاتھی کو پیش کریں گے کہ کھاؤ ان کے مقابلہ میں جتنا کھاتے ہو ـ ــــ؟

اور فرمایا کہ تمہارے دل میں یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ ـ فرمایا اس کے لئے بھی ہم تیار ہیں کہ کھانا کھلانے کے بعد پنڈت جی بھی ایک کمرے میں بند کر دیئے جائیں اور ہمیں بھی بند کر دیا جائے اور چھ مہینے کے بعد نکلیں جو زندہ ہوگا، وہ حق پر ہوگا ــ تو کھانا یہ بہائم کی عادت ہے، جو جہالت کا سرچشمہ ہیں ـ اور نہ کھانا یہ فرشتوں کی عادت ہے، جو علم کا سرچشمہ ہیں ــ اور مناظرہ علم میں ہوا کرتا ہے، جہالت میں نہیں ہوا کرتا، جہالت میں مناظرہ ہوا تو جانوروں کو مقابلہ میں پیش کریں گے ــ علم میں مناظرہ ہوا تو ہم مناظرہ کریں گے ـ

یہ بات اس پر یاد آگئی تھی کہ انسان جب اشرف المخلوقات ہے تو کھانا کھانا اس کی کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے کہ انسان ہی کھاتا ہو ـ انسان سے زیادہ بھینسا بھی کھاتا ہے ـ

ـ تو انسان کی زندگی کا یہ مقصد تو نہیں ہوسکتا کہ وہ روٹی کھالے ـ اور مقصد حاصل ہوگیا ـ اور اس لئے اتنا لمبا سفر کہ آدم علیہ السلام کی کمر سے نکلے ـ ماں کے پیٹ میں آئے ـ دنیا میں آئے، اور مقصد یہ ہو کہ کچھ کھا پی لے ـ یہ کیا مقصد ہوا؟ ـ یہ کوئی اہم چیز نہیں، یہ تو بہیمیت کی علامت ہے ـ گو انسان میں بہیمیت ہے ـ اللہ نے اس کو اجازت دی ہے کہ وہ کچھ کھائے پیئے ـ وہ بھی اچھا کھاتا پیتا ہے ـ خوشنما بنا کے

کھاتا پیتا ہے۔ مگر مقصدِ زندگی یہ نہیں ہو سکتا۔

روحانی قوّت کی کرشمہ سازیاں

ملائکہ علیہم السلام زندہ ہیں۔ وہ کون سی گوشت روٹی کھاتے ہیں؟۔ ذکرُ اللہ ہی سے تو زندہ ہیں۔ اصل زندگی ذکر اللہ کا نام ہے۔ چونکہ ہم اس کوچے سے واقف نہیں، ذکر اللہ کی کوئی کیفیت ہمارے قلب میں نہیں۔ اس لئے ہم غلطی سے یہ سمجھ گئے کہ زندگی کھانے پینے کا نام ہے ورنہ اصل میں زندگی محبوب کا نام لینا ہے کہ آدمی محبوب کا نام لے۔

اگر دنیا میں کسی کو کسی سے محبّت ہو جائے، اور محبوب چلا جائے۔ وہ فراق و ہجر میں رو رہا ہے، پریشان ہو رہا ہے۔ روتے روتے ضعیف ہو گیا۔ بالآخر چارپائی کو لگ گیا۔ اچانک اس نے کہا، او تیرا محبوب آگیا۔ ایک دم اٹھ کے بیٹھ جائے گا کہ کہاں ہے؟۔ یہ جو ایک دم جان آگئی یہ کہاں سے آئی۔ کیا کوئی روٹی کھائی تھی ——؟ کوئی پانی پیا تھا؟۔ محبوب کا نام ہی تو سامنے آیا —— معلوم ہوا کہ زندگی کی قوت درحقیقت محبوب کا وصال ہے، روٹی اور کپڑا یہ زندگی کی قوت نہیں ہے یہ تو عوارض میں سے ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے نا کہ ؎

ہر چند کہ پیر و خستہ و ناتواں شدم ہر دم نگاہ بروئے تو کردم بس جواں شدم

مَیں بوڑھا بھی ہو گیا، خستہ و کمزور بھی ہو گیا، ناتواں بھی ہو گیا۔ مگر جب تیرے چہرے پر نگاہ ڈالتا ہوں تو ایک دم جواں ہو جاتا ہوں، قوت آجاتی ہے اس لئے کہ محبوب کا جمال جب دل میں کھپ جاتا ہے تو قوت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

دنیا میں آدمی جب ان چھوٹے چھوٹے محبوبوں کی قوت سے زندہ ہوتا ہے۔ اگر کسی کے دل میں اللہ کی محبت سما جائے تو اس کی زندگی کا کیا ٹھکانہ؟ —— انبیاء علیہم السلام

حق تعالیٰ کی محبت میں غرق ہوتے ہیں اس لئے ان کی زندگی کی قوت محبوب کا نام اور اس کا ذکر ہے۔ روٹی پانی سے انبیاء علیہم السلام زندہ نہیں ہیں۔ ذکر اللہ سے زندہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اگر ایک حَبّۃ (دانہ) بھی نہ کھائیں، تو بھی ان کی زندگی میں فرق نہیں پڑ سکتا۔ وہ اپنی عبدیت ظاہر کرنے کے لئے کھاتے پیتے ہیں، اور اُمت کے لیے سُنت قائم کرنا مقصد ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ عمل کر کے نہ دکھائیں: ہم کس طرح سے کھائیں پئیں؟ ہمارے لئے نمونہ کیا بنے؟ تو اسوۂ حسنہ کے طور پر کھاتے ہیں۔ زندگی کی بقاء کے لیے نہیں، وہ اللہ کے ذکر سے ہے۔

آج اگر ہمیں یہ مقام میسر آجائے کہ ہم بھی ذکر اللہ سے زندہ رہ سکیں تو کبھی روٹی کی طرف رُخ بھی نہ کریں۔ یہ تو مجبوری کی بات ہے۔ ذکر اللہ سے ہم ناواقف غلط فہمی میں مبتلا کہ زندگی روٹی سے قائم ہے اس لئے روٹی کی طرف لپکتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میرے دادا، جنہوں نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ اولیائے کاملین میں سے تھے۔ انہوں نے وفات سے دو مہینے پیشتر یہ فرمایا کہ:-

"بحمد اللہ اب مجھے زندہ رہنے کے لئے کھانے پینے کی حاجت باقی نہیں رہی۔ محض اتباعِ سنت کے لئے کھاتا اور پیتا ہوں، ورنہ حاجت نہیں۔۔۔۔"

یعنی ذکرِ خداوندی دل و دماغ کے اندر اتنا رچ چکا ہے کہ اب اسی سے زندہ ہوں۔ پھر بھی اتباعِ سنت کے لئے کھاتے تھے تاکہ اس پر بھی اجر و ثواب مل جائے۔

۔۔۔۔ اگر ہمارے ہاتھ میں کوئی ایسا طریقہ آجائے کہ بلا کھائے پئیے ہم زندہ رہیں۔ کبھی کھانے پینے کی طرف دھیان نہ کریں۔ کون اس مصیبت میں پڑے کہ صبح سے شام تک چولہا جھونکو۔ اور کھیتی کرو، وہاں سے غلہ آئے، وہ پلے، ایک مصیبت ہے۔ جب ہم اس کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں تو کیا ضرورت اس مصیبت میں پڑنے کی۔۔۔۔؟

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اوّل تو روٹی مقصد نہیں ، جانور بھی کھاتے پیتے ہیں۔ اور اگر کسی درجہ میں یہ ہوتا بھی تو یہ مقصد جانوروں کو بھی حاصل ہے۔ انسان کو آخر اتنی بڑی زندگی کیوں دی گئی ——— ؟ یہ حقیر چیز ہے اور زندگی بڑی عظیم چیز ہے۔ عظیم چیز کے اوپر ایسا تھوڑا سا مقصد مرتب ہو۔ یہ حکمتِ خداوندی کے خلاف ہے۔

اصل میں کھانے کو چھوڑنا یہ کمال کی علامت ہے۔ کھانا کمال کی علامت نہیں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی بقدرِ ضرورت کھاتے پیتے ہیں ——— صحابہ کرامؓ کی حالت یہ تھی کہ دن بھر گھوڑے کی پشت پر سوار رہتے ، کھانے کی کچھ خبر نہ ہوتی تھی ، ہر وقت جہاد میں مشغول ہیں۔ بعضوں کے پاس بغل میں چند ٹکڑے پڑے ہوتے ، وہ کھا لیتے تھے۔ اور بعضوں کے پاس وہ چند ٹکڑے بھی نہ ہوتے تھے۔ کھجور کی چند گٹھلیاں ہی پڑی ہوتی تھیں۔ جب بھوک نے بہت ستایا ، بس وہ منہ میں ڈال کے نفس کو بہلا دیا کہ ہم بھی کچھ کھا لیں۔ ورنہ وہ کھانے کی کیا چیز ہوتی ہے۔ کھانا تو یہ تھا۔ اور محنت وجد و جہد یہ کہ چوبیس گھنٹے گھوڑے کی پشت پر سوار ہیں اور جہاد میں مصروف ہیں۔ اعلائے کلمۃ اللہ کر رہے ہیں۔ تو کمال ان کا سمجھا جائے گا۔ جنہوں نے کھانا ترک کیا۔ کھانا کھانا کوئی کمال کی چیز نہیں۔ اہلِ کمال جتنے بھی ہیں ، وہ کم ہی کھاتے ہیں۔ اس لئے انبیاءؑ نے کم کھایا اور صحابہ کرامؓ نے بھی کم کھایا۔ حتیٰ کہ اولیاء اللہ نے بھی کم کھایا۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس اللہ سرہٗ ، جو چشتیہ سلسلہ کے مشائخ میں سے ہیں ، وہ اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں کہ میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں ، جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے ، چالیس برس سے روزے رکھ رہا ہے ، اور کوئی روزہ نہیں چھوڑتا ———

شراح لکھتے ہیں کہ یہ خود حضرت شیخ قطب عالم ہی ہیں ——— تو چالیس برس تک پوری غذا کل یہ تھی کہ ایک بادام یومیہ کھاتے تھے۔ اور طاقت کا یہ عالم تھا کہ رات کو

جب ذکر اللہ میں مشغول ہوتے، تو شہر میں اس طرح آواز گونجتی تھی کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ ہمارے گھر کے دروازے پر ذکر کر رہے ہیں۔ یہ قوت کھانے کی نہ تھی یہ روحانی قوت تھی جو ذکر اللہ سے پیدا ہوتی تھی۔

اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال رکھنا شروع کیا، روزہ پر روزہ، بعض صحابہؓ نے بھی آپ کو دیکھ کر صوم وصال شروع کر دیئے۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا۔ ایکم مثلی یطعمنی ربی ویسقینی ——— تم میں مجھ ایسا اور میری مثل کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا پلاتا ہے۔ اس سے میرے اندر طاقت ہے۔ تو وہ کیا چیز کھلائی جاتی تھی؟ آسمان سے کوئی زردہ، پلاؤ اور بریانی کی رکابیاں نہیں اترتی تھیں۔ وہ ذکر اللہ کی طاقت تھی جو رگ و پے میں رچ بس گیا تھا، اور سرایت کئے ہوئے تھا۔ وہ روحانی قوت تھی اس قوت سے آپؐ کام کرتے تھے۔ یہ مادی قوت نہ تھی۔ اگر ساری عمر آپؐ ایک لقمہ بھی استعمال نہ فرماتے، آپؐ کی طاقت میں فرق نہیں آسکتا تھا۔ آپؐ نے اس لئے کھایا پیا ہے، تاکہ اُمت کے لئے نمونہ بن سکے۔ امت کے لئے راستہ بنے، جائز و ناجائز کا پتہ چلے، ورنہ کھانے کی محتاجگی نہیں تھی ——— حاصل یہ نکلا کہ کھانا کھانا کمال نہیں ہے۔ کھانے کو ترک کرنا، یہ کمال ہے۔ دنیا بھی اسی کو کمال سمجھتی ہے۔ اگر ایک شخص بہت کھاتا ہے تو کوئی خیال بھی نہیں کرے گا۔ اگر آپ کسی سے کہیں میں بہت باکمال ہوں اس لئے کہ میں بہت کھاتا ہوں تو وہ کہے گا۔ یہ کون سے کمال کی بات ہے؟ سبھی کھاتے ہیں، جانور بھی کھاتے ہیں۔ اور اگر کوئی ایسا شخص نظر پڑے جو ہفتہ عشرہ تک کھانا نہیں کھاتا، مخلوق اس کے پیچھے ہولے گی کہ معلوم ہوتا ہے ولی اللہ ہیں۔ معلوم ہوا دنیا بھی نہ کھانے کو کمال سمجھتی ہے۔ دنیا کے نزدیک کمال بھی کھانے کو ترک کرنا ہے۔ کھا لینا یہ کمال نہیں۔ اسی لئے روزے کو اصل عبادت فرمایا گیا۔ روزہ میں ترک طعام ہے کھانا تو نیت سے عبادت بنتا ہے، اپنی ذات سے عبادت نہیں، اور روزہ رکھنا یہ

اپنی ذات سے عبادت ہے۔ اللہ کے ہاں بھی مقبولیت نہ کھانے سے پیدا ہوتی ہے، کھانے سے نہیں ہوتی۔

تو اللہ والوں نے بہت ترک فرمایا ہے۔ ہم تم اللہ والے تھوڑا ہی ہیں ۔ ہم صبح سے شام تک کھاتے رہتے ہیں۔ صبح کا ناشتہ الگ، دوپہر کا کھانا الگ، شام کا الگ اور رات کا الگ ____ اور وہ بھی اتفاق سے چار دفعہ کھانے کے بعد گنجائش نہیں ہوتی۔ ذرا بھی اور گنجائش ہوتی تو ایک دفعہ کا اور اضافہ کر لیتے ____ بہر حال یہ کوئی بڑا کمال نہیں ہے۔ کمال کھانے کو ترک کر دینا ہے۔ تو اتنی بڑی زندگی کا مقصد متعین کرنا ہو، اور وہ ہو کھانا، یہ تو آپ بھی کمال نہیں سمجھتے۔ اس واسطے یہ اتنی لمبی حرکت کی منزلِ مقصود روٹی نہیں بن سکتی۔

کیا مقصدِ زندگی عزت و اقتدار ہے؟

پھر آخر کیا مقصد ہے؟ ہو سکتا ہے آپ کہیں دنیا میں اس سفر کا مقصد روٹی نہیں ہے، مگر کرسی، عزت، آبرو، جاہ و اقتدار اور منزلت ہو۔ یہ روٹی سے بہرحال اونچے درجے کی چیز ہے۔ آدمی اپنی عزت بچانے کی خاطر پیسہ اور روٹی داؤ پہ لگا دیتا ہے، تاکہ آبرو پر حرف نہ آئے، تو آبرو روٹی سے زیادہ اونچی چیز ہے۔

لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ زندگی کا مقصد یہ عزت بھی نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے کہ جس کو آپ عزت کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ دوسرے آپ کو اچھا سمجھیں۔ بس یہی تو عزت ہے۔ اس کے سوا تو کچھ نہیں کہ دوسرے یہ خیال کریں کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی عزت خیالی چیز ہے۔ کسی نے خیال کر لیا کہ آپ بڑے ہیں تو بڑے بن گئے۔ کسی نے خیال نہ کیا، آپ چھوٹے کے چھوٹے رہ گئے۔ تو ایک بے بنیاد چیز ہے جس کا نام عزت ہے، خیالی چیز ہے۔ اور پھر خیال

بھی دوسرے کا، اپنا نہیں ـــــ اگر اپنا خیال ہوتا، چلو صبح سے شام تک یہ خیال کئے بیٹھے رہتے کہ ہم بہت بڑے آدمی ہیں۔ بڑے باعزت ہیں ـــ یہ تو خیالی چیز ہے، اور خیال بھی دوسرے کا، جس پر ہمیں قبضہ حاصل نہیں ہے۔ کوئی دوسرا اگر خیال کئے بیٹھا رہے تو بڑے ہوں گے۔ اور اگر اس نے یہ خیال کر لیا کہ آپ بڑے نہیں، بس آپ حقیر ہو گئے۔ تو عزت ایک بے بنیاد چیز ہے، ایسی عزت محض خیالی پلاؤ ہے، اور کچھ نہیں ـــــ

عزت فی الحقیقت اللہ کے ہاں مقبول ہونے کا نام ہے۔ عزت کسی کے خیال کر لینے کا نام نہیں ہے، اللہ جس کو قبول کر لے، وہ باعزت ہے۔ جس کو ردّ کر دے، وہ بے عزت ہے۔ عزت و ذلت خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ بندے کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اگر بندے سے عزت کرائیں تو اس کی خوشامد کرتے پھریں ـــ تو ذلیل تو پہلے ہی تھے۔ اب ہاتھ جوڑتے پھریں کہ حضور میری عزت کی جائے۔ کیوں کہ عزت سے پہلے تو ذلت ہے، اب خوشامد کے بعد اور ذلیل ہو گئے، عزت تو کیا ہوئی تھی ـــــ؟

اور اگر آپ ڈنڈا لے کر کہیں کہ میری عزت .... وہ آپ کے ڈنڈا رسید کرے گا، کہ تو میری عزت کر۔ یہ تو پہلے سے زیادہ تذلیل ہو جائے گی۔ تو عزت نہ انسان کے دبانے سے ملتی ہے نہ خوشامد سے ملتی ہے۔ عزت خدا کی طرف سے ملتی ہے، جب کہ بندہ اللہ کی اطاعت کرے، یہ ان کا فرمانبردار بنے، وہ قبول کر لیں گے، ان کے قبول کرنے سے انسانوں میں قبولیت پیدا ہو گی۔ یہ اصل عزت ہے ـــــ

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہٗ جب کسی سے راضی ہوتے ہیں تو جبریل علیہ السلام کو فرماتے ہیں کہ میں فلاں بندے سے راضی ہوں، تو بھی اس سے راضی ہو جا۔ جبریل علیہ السلام راضی ہو جاتے ہیں تو

آسمان میں اعلان کرتے ہیں کہ فلاں بندہ میرے ہاں مقبول بن گیا (جو قبولیتِ خداوندی کی علامت ہے)۔ لہٰذا تم بھی اُسے مقبول بناؤ، پھر سارے فرشتے اس سے محبت کرتے ہیں۔ سب فرشتوں میں اس کی عزت قائم ہو جاتی ہے۔ ان ملائکہ کے اثرات زمین کے ملائکہ کے اوپر پہنچتے ہیں، وہ بھی عزت کرنے لگتے ہیں۔ زمین کے ملائکہ کے اثرات اولیاء اللہ کے قلوب پر پڑتے ہیں۔ تو اللہ والے بھی اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں، اور جتنے لوگ اہل اللہ سے وابستہ ہیں، نیک ہیں۔ پھر ان کی وجہ سے عوام میں بھی عزت آجاتی ہے، الغرض اس شخص کی مقبولیت پوری امت میں پھیلا دی جاتی ہے۔ یہ مقبولیت کب ہے؟ — کہ پہلے اس کو اللہ مقبول بنائے، پھر دوسروں کے اندر اس کی مقبولیت پیدا ہو گی۔ تو عزت یہ ہے کہ اللہ کسی کو مقبول فرمالے، اس سے راضی ہو جائے — انسان خیال باندھے کہ فلاں عزت والا ہے۔ یہ خیال ہی بے بنیاد ہے۔ تو عزت بنیاد والی کیا ہو گی؟ ورنہ دنیا میں انسانوں کی عزت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ ایک لیڈر کی ہے۔ پبلک میں اس کو مقبولیت ہوئی تو گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے۔ اور کل جو پبلک خفا ہوئی اور بدلی تو گلے میں جوتیوں کے ہار ڈال دیئے۔ بے چارا بے عزت پھر رہا ہے اب اسے کوئی پوچھتا ہی نہیں — یہ کوئی عزت نہیں ہے —— عزت کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اللہ کسی کو عزت دے۔ حق تعالیٰ قبول فرمالیں تو ہی عزت ہے۔ اور حق تعالیٰ تب ہی قبول فرماتے ہیں، جب کوئی نیکی اختیار کرے۔ مامورات کرے اور بدی سے بچے۔ بدعمل و بدکار کبھی باعزت نہیں ہو سکتا۔ تو اصل عزت نیکی میں ہے۔ حق تعالیٰ کے سامنے جھکنے میں اور اس کی اطاعت میں ہے۔ نہ یہ کہ لوگوں کے خیال میں آجائے کہ یہ باعزت ہیں۔ یہ خیال ہی بے بنیاد ہے۔ اس لئے کہ کل ہے پرسوں کو نہیں۔

حاصل یہ نکلا کہ زندگی کی اتنی لمبی چوڑی حرکت اس کا مقصد نہ تو روٹی بن سکتی ہے اور نہ کرسی اور عزت بن سکتی ہے۔ اس لئے کہ روٹی بہائم کی علامت ہے، اور اقتدار پسندی یہ خیالی چیز ہے۔ تو زندگی تو حقیقی ہو اور اس کا مقصد محض خیالی ہو۔ یہ بے جوڑ

بات ہے۔ سمجھ میں آنے والی نہیں ہے، حکمتِ خداوندی کے بھی خلاف ہے۔

مقصدِ زندگی قرآن کریم کی روشنی میں

تو یہ دونوں چیزیں مقصد نہیں بن سکتیں۔ پھر آخر مقصد کیا ہونا چاہیئے۔ لمبی زندگی کا مقصد بھی خود اتنا لمبا ہونا چاہیئے جو زندگی کے ساتھ آخر تک جائے۔ یہ دونوں باتیں روٹی اور کرسی لمبا مقصد نہیں۔ اس لئے کہ روٹی آپ اس وقت تک کھائیں گے، جب تک دنیا میں موجود ہیں، اور جب قبر میں پہنچ گئے، تو روٹی تو رہ گئی اور زندگی آگے تک جارہی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی آگے تک جارہی ہے اور مقصد پہلے ہی ختم ہوگیا۔ تو یہ مقصد کیسے بنے گا؟

اسی طرح دنیا کا جاہ و اقتدار جو تخیل اور خیال سے ہوتا ہے۔ وہ بھی کوئی پائیدار چیز نہیں ہے۔ جب انسان ختم ہوگیا اور یہاں سے منتقل ہوگیا، تو عزت بھی ختم ہوگئی۔ ایک بادشاہ جب انتقال کرجاتا ہے، وہ اپنا سارا اقتدار دنیا میں چھوڑ جاتا ہے۔ قبر میں اُس کا اقتدار ساتھ نہیں جاتا۔ اَب زندگی باقی ہے اور حکومت ختم ہوگئی۔ تو یہ اقتدار کیسے مقصدِ زندگی بن سکتا ہے کہ زندگی تو آگے جارہی ہے اور مقصد پیچھے رہ گیا۔ اس لئے نہ روٹی، نہ عزت و اقتدار اور حکومت مقصد بن سکتی ہے، بلکہ صرف ایک چیز مقصد بن سکتی ہے اس مقصد کو قرآن کریم نے پیش کیا۔ فرمایا:۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ۝

"میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا وہ میری عبادت اور اطاعت کریں"۔

انسان کی خلقت اور پیدائش کا اصل مقصد یہ ہے۔ اگر ایک انسان عبادت میں لگ گیا۔ اس نے زندگی کا مقصد پورا کرلیا۔ عبادت میں نہ لگا، زندگی رائیگاں چلی

گئی۔ مقصد پورا نہ ہوا ـــــ تو قرآنِ حکیم نے مقصد بتلایا ہے کہ زندگی کا مقصد فی الحقیقت اطاعتِ خداوندی اور عبادتِ خداوندی ہے۔ عبادتِ خداوندی ہو گی تو عزت بھی حاصل ہو گی۔ بھوکے نہیں رہو گے، روٹی بھی ملے گی۔ اصل مقصد یہ ہے۔

یہ مقصد کیوں ہے؟ اس لئے کہ روٹی اگر مقصد ہو تو عمر تو بہت آگے تک جا رہی ہے اور روٹی قبر کے کنارے پر ختم ہو گئی۔ وہ مقصد کیا ہوا جو پوری عمر پر مرتب نہ ہو۔ مقصد وہ ہے کہ جب تک عمر چلے، مقصد بھی چلتا رہے۔ وہ مقصد، مقصد نہیں بن سکتا کہ عمر تو آگے تک چلے اور وسیلہ قبل از وقت ختم ہو جائے۔

اسی طرح سے خیالی عزت بھی قبر سے آگے نہیں جا سکتی۔ جب قبر میں ہم پہنچ گئے، کوئی ہمارے لئے (بڑے ہونے کا) خیال باندھے نہ باندھے، ہمارے لئے برابر ہے ــ وہاں تو اپنے عمل کا امتیاز ہو گا۔ وہاں یہ تھوڑا ہی دیکھا جائے گا کہ پبلک ہمارے لئے کیا خیال لئے ہوئے ہے؟ ـــ یہ نہیں دیکھا جائے گا۔

ابدی زندگی کا ابدی مقصد

اور اگر طاعت و عبادت مقصد ہو تو یہ فی الحقیقت لمبا چوڑا مقصد ہے جو پوری عمر پر مرتب ہوتا ہے کہ جب تک انسان دنیا میں موجود ہے عبادت اس کے ساتھ رہے گی۔ قبر میں جب پہنچے گا، جب بھی عبادت موجود ہو گی۔

حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے لئے تو فرمایا گیا کہ:۔ الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلون ـــــ انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ حدیث میں آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ کانی انظر الی موسیٰ یلبی ـــــ میں موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ لبیک لبیک کہتے ہوئے میدانِ عرفات کی طرف جا رہے ہیں ـــــ

معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام حج بھی کرتے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے حضرت یونس علیہ السلام کو دیکھا، کہ وہ اونٹنی پر سوار ہیں، اور وہ حج کر رہے ہیں۔ اس اونٹنی کا لگام اون اور صوف کا ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ علیہ السلام نے طواف فرمایا۔ حضرت جبریل علیہ السلام بھی طواف میں ساتھ تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص "مربوع القامۃ" یعنی چوڑا سینہ اور بہت موزوں قد اور سُرخ و سفید چہرہ جیسے گلاب کا پھول ہوتا ہے اور اتنا تر و تازہ گویا ابھی حمام میں سے غسل کر کے نکلے ہیں کہ بالوں سے ابھی پانی ٹپک پڑے گا۔ اتنا شاداب اور تر و تازہ، اور نہایت حَسین و جمیل چہرہ —— حُضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون طواف کر رہے ہیں؟ —— کہا یہ حضرت عیسٰی علیہ السلام مسیح اللہ ہیں —— معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام طواف بھی کرتے ہیں، لبیک لبیک کہتے ہوئے میدانِ عرافات میں بھی جاتے ہیں۔ نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ قبر میں ذکر اللہ بھی کرتے ہیں۔

تو انبیاء علیہم السلام کے لئے تو ذکر اللہ اور عبادت صراحۃً احادیث سے ثابت ہے۔ ہمارے، آپ کے لئے اور عامۃ المومنین کے لئے تو یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ ہاتھ پیر سے عبادت کرتے ہیں .... مگر ہاں ایک عبادت ہم بھی کرتے ہیں۔ وہ عبادت ہم قلب سے کرتے ہیں۔ بدن تو رہتا نہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا تو بدن بھی محفوظ ہے، وہ تو بدن سے عبادت کرتے ہیں۔ ہمارا بدن تو مٹ مٹا جاتا ہے۔ اس لئے بدنی عبادت نہیں رہے گی مگر رُوحی عبادت ہم بھی کرتے ہیں۔ اور وہ قلب کے جذبے اور تخیل کی عبادت ہے۔ اس لئے کہ بدنی عبادت تو جب کریں جب بدن ہو۔ یہ عمل کا آلہ ہے۔ جب بدن نہیں رہے گا۔ آگے صرف روح ہی رہ جائے گی، روح عمل نہیں کر سکتی، مگر جذبات کی عبادت کر سکتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب منکر نکیر سوال و جواب کے لئے آتے ہیں اور دو تین سوال

کرتے ہیں کہ من ربک ؟ تیرا پروردگار کون ہے ؟ وما دینک ؟ تیرا دین کیا تھا ؟ ومن نبیك ؟ تیرے نبی کون تھے ؟ —— توحید، رسالت اور شریعت، ان تینوں کا سوال ہوتا ہے —— حدیث میں فرمایا گیا جب ملائکہ علیہم السلام مومن سے کہیں گے کہ من ربك ؟ تیرا پروردگار کون تھا ؟ - تو بموجب حدیث مومن کو جو اس وقت، وقت دکھلایا جائے گا - وہ ایسا ہوگا جیسے سورج غروب ہونے کو ہے، اور دھوپ میں زردی چھا چکی ہے، دن ختم ہو چکا اور مغرب آنے والی ہے - یتمثل له الشمس - قبر میں سورج کی صورت مثالی دکھلائی جائے گی —— تو فرشتوں کے جواب میں یہ بندۂ مومن کہے گا " دعونی اُصلی " —— میاں پرے کو ہٹو - وقت تنگ ہو گیا ہے - میری نماز قضا ہونے کو ہے مغرب آجائے گی —— تو ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے کہ اس سے " رب " کے بارے میں کیا سوال کرتے ہیں یہ تو رب کی عبادت کرنے کو ہے —— دوسرا کہتا ہے بہرحال ہماری ڈیوٹی ہے جو انجام دینی ہے - اور ہمیں یقین ہے کہ یہ جواب حق دے گا - اس کا چہرہ اور عمل ہی بتلا رہا ہے ——

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں بدنی عبادت تو نہیں کر سکتے، مگر تخیل کی عبادت تو کریں گے، جذبہ یہ ہوگا تبھی " دعونی اُصلی " کہیں گے، کہ میاں پرے کو ہٹو، نماز پڑھنے دو -

اس پر فرشتے کہیں گے کہ اب نماز کا وقت نہیں یہ تو عالمِ برزخ ہے وہ جو نماز پڑھنے کی تکلیف دی گئی تھی، وہ دنیا میں دی گئی تھی - برزخ اور عالمِ آخرت میں یہ تکلیف نہیں دی گئی - اس وقت اُسے پتہ چلے گا کہ یہ سورج کی صورت مثالی ہے - حقیقی دن نہیں ہے - مَیں تو قبر کے اندر ہوں -

—— مگر " دعونی اُصلی " کون کہے گا - جس نے دنیا میں نماز پڑھنے کی عادت ڈالی ہو - اگر دنیا میں نماز سے بے پرواہ رہے گا تو اس کی زبان سے " دعونی اُصلی " -

نہیں نکل سکے گا، کہ مغرب کا وقت آرہا ہے اور مجھے نماز پڑھنے دو —— اس لئے کہ زندگی میں روزانہ اصلی مغرب کی نماز کا وقت آتا تھا اور اسے نماز کی پرواہ بھی نہیں ہوتی تھی۔ تو جو یہاں بے پرواہ تھا، وہاں بھی بے پرواہ رہے گا۔ جسے یہاں پرواہ تھی وہاں جاکر بھی پرواہ دار رہے گا —— حدیث میں ارشادِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم ہے، تحشرون کما تموتون وتموتون کما تحیون —— تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت میں موت آئی۔ اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری۔ اگر زندگی ذکر و عبادت میں گزاری ہے تو موت کے وقت بھی ذکر و عبادت کا ہی دھیان ہوگا۔ اور جب قبر سے اٹھے گا جب بھی ذکر کا دھیان ہوگا۔

—— حدیث میں ہے کہ اگر کوئی حاجی میدانِ عرفات میں یا منٰی میں لبیک لبیک کہتے ہوئے مرگیا۔ جب وہ میدانِ محشر میں قبر سے اٹھے گا تو اس کی زبان پر لبیک لبیک جاری ہوگا۔

لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک۔

وہ یہی سمجھے گا کہ میدانِ عرفات میں جا رہا ہوں —— آگے جا کے پتہ چلے گا کہ یہ تو میدانِ محشر ہے، میدانِ عرفات نہیں ہے —— مگر زبان سے لبیک کیوں نکلا؟ اس لئے کہ لبیک کہتے ہوئے انتقال کر گیا تھا، اور لبیک کہتے ہوئے انتقال کیوں کیا؟ اس لئے کہ زندگی بھر یہ جذبہ تھا کہ کسی طرح حج کروں —— تو جس حالت پر آدمی زندگی گزارتا ہے۔ اسی حالت پر موت آتی ہے، اور جس حالت پر موت آتی ہے قبر سے اٹھتے ہوئے بھی وہی حالت ہوگی۔

—— معلوم ہوا ذکر اللہ اور عبادتِ خداوندی وہ چیز ہے کہ دنیا میں بھی ساتھ، قبر میں بھی ساتھ، اور میدانِ محشر میں بھی ساتھ۔

اور جنت میں بھی ساتھ رہے گی۔ حدیث میں ہے کہ یلھمون التسبیح۔ اہلِ جنت کو تسبیح الہام کی جائے گی۔ بلا ارادہ سانس کے ساتھ اللہ اللہ جاری ہوگا۔

ارادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جنت میں یہ تکلیف نہیں دی جائے گی کہ تم بیٹھ کے ذکر اللہ کرو، عبادت کرو، نمازیں پڑھو، وہ تو عیش کی جگہ ہے، ہر وقت راحت ہو گی مگر ان کے دلوں میں الہام کیا جائے گا "پاس انفاس" جیسے ہوتا ہے، جو صوفیائے کرام نے ذکر بتلایا ہے، ذکر اللہ کی وہ صورت ہو گی۔ ہر وقت سانس کے ساتھ اللہ اللہ جاری ہوگا، اصل غذا وہ ہوگی۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی ہوں گی لیکن کھانے پینے کی محتاجگی نہیں ہوگی۔ تفریح طبع کے لئے کھائیں پئیں گے۔ بھوک کی تکلیف نہیں ہوگی، کیونکہ جنت میں تکلیف کا کوئی نشان نہیں ——

تو عبادتِ خداوندی دنیا سے چلی، قبر میں پہنچی، میدانِ محشر میں پہنچی، اور جنت تک پہنچ گئی۔ یہ چیز ایسی ہے جو زندگی کا مقصد بن سکتی ہے۔ اگر زندگی ابدی ہے تو عبادت بھی ابدی ہے۔ کھانا پینا ابدی نہیں، یہ تو قبر تک ختم ہو گیا۔ قبر میں کوئی کھانا پینا نہیں ہوگا، اور اگر کچھ کھانا پینا ہوگا بھی۔ وہ بھی ذکر اللہ ہی ہو گا۔ جنت میں کھانا پینا ہوگا، مگر محتاجگی نہیں ہوگی — اصل محتاجگی ذکر اللہ کی ہوگی، اور وہ زبان پر جاری رہے گا۔

دنیوی زندگی کی رُوح

زندگی کا مقصد بنانے کے اگر کوئی چیز لائق ہے تو وہ عبادتِ خداوندی ہے۔ ذکرِ حق اور طاعتِ خداوندی ہے۔ یہ چیز ہے جس سے انسان انسان بنتا ہے۔

اکبر الٰہ آبادی ایک بڑے شاعر گذرے ہیں، جن کا "لسان العصر" لقب تھا۔ انہوں نے دو شعر کہے ہیں:۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے — یعنی جینا ہے اور مرنا ہے،
اب رہی بحث رنج و راحت کی — وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

رنج بھی گذر جاتا ہے، راحت بھی گذر جاتی ہے۔ نہ یہ ابدی نہ وہ ابدی۔ تو اکبر نے کہا کہ مرنا جینا سب کے لئے ہے اور رنج و راحت وقتی چیز ہے۔ آتی ہے گذر جاتی ہے، لیکن ان اشعار میں مقصدِ زندگی نہیں آیا۔ یہ تو آ گیا کہ ان چیزوں کی طرف توجہ نہ کرو۔ سوال یہ ہے کہ پھر کاہے کی طرف توجہ کرو؟ مقصدِ زندگی پھر کیا ہے؟ تو میں نے تین اشعار بڑھا دیئے ہیں، اور ان میں مقصد ظاہر کیا گیا ہے۔ اکبر کے تو یہ (مندرجہ بالا) دو شعر ہیں۔ میرے دو شعر اکبر ہی کے مطابق ہیں کہ جن کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیئے ؎

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے — یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی — وہ فقط وقت کا گذرنا ہے

آگے میں کہتا ہوں ؎

رہ گیا عزّ و جاہ کا جھگڑا — یہ تخیّل کا پیٹ بھرنا ہے

یہ خیالی چیز ہے، یہ لائقِ توجہ نہیں —— اور ؎

قابلِ ذکر ہی نہیں خورد و نوش — یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے

کھانا پینا یہ بہیمی کی علامت ہے۔ جانور بھی کھاتے پیتے ہیں۔ ہم بھی اسی کو کھا رہے ہیں۔ ایک مصیبت ہے جو گلے پڑی ہوئی ہے۔ تو یہ مقصد نہیں — آگے مقصد کا ذکر کرتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ ؎

مقصدِ زندگی ہے طاعتِ حق — نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

اصل مقصد یہ ہے کہ اطاعتِ خداوندی نصیب ہو جائے —— قرآن کریم میں اسی کو فرمایا گیا:۔ وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون ——

میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا، مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں — یہ نہیں فرمایا کہ وما خلقت الجن و الانس الا لیأکلون — میں نے اس لئے پیدا کیا کہ خوب کھائیں، خوب مزے اڑائیں۔ یا یوں فرمایا ہو کہ الا لیعزون —

یہ عزتوں کا خوب خیال باندھیں بلکہ فرمایا الا لیعبدون ۔ فقط میری عبادت کریں۔
آگے فرمایا :۔ ما ارید منہم من رزق و ما ارید ان یطعمون۔
میں ان سے رزق نہیں مانگتا یہ ہوں کہ وہ عبادت کریں ـــــ اور فرمایا ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین ـــ رزق دینے والے ہم ہیں۔ طاقتوں کے خزانے ہمارے ہاتھ میں ہیں ـــــ

مطلب یہ کہ ایک کام ہم اپنے ذمے لیتے ہیں۔ ایک تم اپنے ذمے لو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم ہماری عبادت کرو۔ اور ہمارا کام یہ ہے کہ ہم تمہیں رزق دیں ـــ تم عبادت کرنا ترک کرو گے ہم روٹی دینا ترک کر دیں گے۔ ہم تمہیں محتاج و مفلس کر دیں گے، گویا مقصدِ زندگی محض اور محض اطاعتِ حق ہے۔

"شبہ کا جواب"

یہاں ممکن ہے کوئی سوال کرنے ، اور سوال وہی کر سکتا ہے ، جو قرآن شریف پڑھا ہوا ہو اور قرآن شریف کے کچھ مقاصد اس کے سامنے ہوں کہ صاحب ! قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقصد جانوروں کا بھی ہے۔ وہ بھی عبادت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ ـــ تسبح لہ السموات السبع والارض ومن فیھن۔ وان من شیء الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم ـــــ کوئی چیز عالم میں ایسی نہیں جو خدا کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ درخت اور اس کی شاخیں ، آسمان و زمین ، چاند اور سورج سب اللہ کی تسبیح میں مشغول ہیں۔ زبان سب کی الگ الگ ہے۔ تسبیحیں سب کی الگ الگ ہیں۔ مگر ہیں سب تسبیح میں مشغول ـــــ اب اگر کوئی فرانسیسی زبان میں اللہ کو یاد کرنے لگے ، ہم نہیں سمجھیں گے۔ کوئی فارسی زبان میں مناجات کرنے لگے ، غیر فارسی دان نہیں سمجھ پائے گا۔ کوئی عرب عربی زبان میں دعا کرنے لگے ، ہم نہیں

سمجھ سکیں گے ـــــ جب ہم اپنے بھائی بندوں کی زبان نہیں سمجھتے تو جانوروں کی زبان نہ سمجھیں، تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے؟ طوطا کس زبان میں بول رہا ہے، کبوتر کس زبان میں گویا ہے۔ اگر ہم نہیں سمجھتے تو کیا ہوا۔ ہم اپنے بھائی بندوں کی زبان بھی نہیں سمجھتے۔ جو انسان اپنے بھائی بندوں کی زبان نہ سمجھے، وہ اگر جانوروں کی زبان نہ سمجھے تو تعجب کی کیا بات ہے ـــــ؟ قرآن میں یہی تو فرمایا گیا کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے ولٰکن لا تفقھون تسبیحھم۔ تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں پاتے۔ ان کی زبان الگ ہے، تمہاری زبان الگ ہے ـ پرندہ بظاہر تو سیٹیاں بجا رہا ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں اللہ کی تسبیح کر رہا ہے۔ شیر دھاڑ رہا ہے مگر حقیقت میں اللہ کا نام لے رہا ہے ـ ہاتھی چنگھاڑتا ہے مگر حقیقت میں اللہ کا نام لیتا ہے۔ شیر کی زبان دھاڑنا اور چنگھاڑنا ہے مگر ہے وہ بھی تسبیح ہے ــــ اور پرندوں کی زبان ہی سیٹیاں بجانا ہے۔ تم سیٹیاں سمجھتے ہو حقیقت میں تسبیح و تہلیل ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ ان کی زبان سے ہمیں واقف کر دے، تب ہمیں پتہ چلے گا کہ یہ تو وہی حمد و ثنا کر رہے ہیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ آپ کبھی تار گھر میں ٹیلی گراف دینے کے لئے گئے ہوں گے۔ تو آپ نے تار لکھ کر آفیسر کو دے دیا، اس نے جو مشین پر ہاتھ رکھ کر پیتل کا جو ایک کھٹکا ہوتا ہے اس کو حرکت دی تو وہ کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ شروع کی۔ آپ کہیں گے کہ یہ بڑا احمق آدمی ہے، میں نے تو اسے کہا تھا کہ بھائی تار دے دے، اور یہ کھٹ کھٹ کر رہا ہے ــــ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس کھٹا کھٹ میں ہی سارے علوم اور معلومات دوسرے ملک میں پہنچ رہی ہیں۔ ظاہر میں تو یہ کھٹا کھٹ معلوم ہوتی ہے اور حقیقت میں یہ اصطلاحات ہیں۔ ان کے ذریعے سے جو خبر یا پیغام دیا ہے، وہ دوسرے ملک پہنچ رہا ہے۔ دیکھنے میں کھٹ کھٹ کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اسی طرح سے پرندہ ظاہر میں تو سیٹی بجاتا ہے مگر حقیقت میں وہ تسبیح کرتا ہے۔ اللہ نے اسے شعور دیا ہے وہ عبادت کرتا ہے۔ جس طرح سے ہم تار کی اس

آواز کو محض آواز ہی سمجھتے ہیں ——— لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اس فن کو جان لیں تو یہ کھٹ کھٹ نہیں، علوم ہیں ——— بالکل اسی طرح جانوروں کی بولی ہے اگر ہم کسی طرح سے سیکھ جائیں، تب ہمیں پتہ چلے کہ یہ حمد و ثنا میں مصروف ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ نے پرندوں کی بولیوں کا علم دیا تھا ——— قرآن کریم میں فرمایا گیا: یاایھا الناس علمنا منطق الطیر..... سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں۔ اے لوگو! ہمیں جانوروں کی بولیوں کی تعلیم اللہ کی طرف سے دی گئی ہے۔ کوئی جانور بولتا تھا۔ فرماتے تھے کہ اس کا یہ مطلب ہے۔

حدیث میں جانوروں کی تصریحات بیان کی گئی ہیں کہ تیتر یہ تسبیح پڑھتا ہے ——— پندرہ مثالیں بیان کی گئیں ——— تیتر بولتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ کما تدین تدان۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ جیسی کرتوت ہو گی ویسے ہی نتیجہ سامنے آئے گا ——— یہ اس کی تسبیح ہے۔

حدیث میں ہے کہ بعض ملائکہ علیہم السلام کی یہ تسبیح ہے۔ سبحان من زین الرجال باللحی و زین النساء بالذوائب۔ پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو ڈاڑھیوں سے زینت دی، اور عورتوں کو چوٹیوں اور مینڈھیوں سے زینت دی ——— عورتوں کے لیے چوٹی اور مینڈھی رکھنا حسن ہے۔ مرد کے لئے داڑھی رکھنا حسن ہے۔ ہر ایک کا حسن الگ الگ ہے۔ مردانہ حسن ڈاڑھی سے اور زنانہ حسن چوٹی اور مینڈھیوں سے ہے ——— غرض بعض ملائکہ علیہم السلام کی تسبیح یہ ہے ——— تو مختلف طریقوں سے پرندے، چرندے اور درندے بلکہ ہر مخلوق کسی نہ کسی طرح کی تسبیح میں مشغول ہے ——— تو کوئی قرآن کریم پڑھنے والا ممکن ہے یہ سوال کرے کہ آپ نے انسان کو اشرف المخلوقات کہہ کر اس کی زندگی کا مقصد عبادت اور ذکر اللہ بتلایا۔ وہ جانور، کنکریاں اور پتھر بھی کرتے ہیں، پھر انسان نے کیا کمال کیا جو ذکر اللہ اور عبادت کرلی؟ جیسے آپ نے یوں کہا تھا کہ گدھا، گائے اور جانور بھی کھانا کھاتے ہیں اگر

انسان نے کھالیا تو کیا بڑی بات ہے؟ قرآن کریم کی رُو سے ہم کہیں گے ذکر و طاعتِ خداوندی جانور بھی کرتے ہیں اگر انسان نے کر لی تو کون سا کمال کیا؟ یہ کون سا بڑا مقصد ہے؟ تو ممکن ہے کسی کو یہ شُبہ پیدا ہو ——— ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشُبہ جانور بھی تسبیح و عبادت کرتے ہیں مگر وہ ارادی عبادت نہیں۔ وہ ارادہ سے عبادت نہیں کرتے۔ یہ ان کی طبیعتوں کی فطرت کا تقاضا ہے، جیسے مشین چلتی ہے تو مشین ارادہ کر کے نہیں چلتی۔ ارادہ چلانے والے کے ہاتھ میں ہے، اس کا کام تو بس یہ ہے کہ گھوم رہی ہے ——— تو جانور تسبیح وغیرہ جو کرتے ہیں، وہ اپنی طبیعت سے کرتے ہیں۔ ارادہ و شعور اور اختیار سے نہیں کرتے۔ یہ سمجھ کر کہ یہ عبادت ہے اور اس کا یہ ثمرہ نکلے گا۔ یہ عقل و شعور جانوروں کو نہیں دیا گیا ——— ارادی عبادت صرف انسان کرتا ہے، تو غیر اختیاری عبادت پر اجر و ثواب کچھ نہیں ملے گا۔ ارادہ و اختیار سے کی ہوئی عبادت پر اجر و ثواب ملتا ہے۔ اور انہیں افعال پر ترقی مدارج ہوتی ہے، اور جو بلا ارادہ خود بخود ہو اس پر نہ کوئی اجر و ثواب، نہ ہی ترقی مدارج کا وعدہ ———

حاصل یہ نکلا کہ جانور بھی عبادت کرتے ہیں مگر وہ غیر ارادی عبادت ہے، اس میں اختیار کا دخل نہیں۔ یہ ایک طبعی تقاضا ہے۔ جیسے ہم طبیعت کے تقاضے سے کھاتے پیتے ہیں، عقل و شعور سے نہیں کھاتے۔ بھوک جو لگتی ہے تو دلائل سے تھوڑا ہی لگتی ہے کہ آپ بیٹھ کر عقل سے سمجھیں کہ اس وقت مجھے بھوک لگنی چاہیئے۔ اس میں یہ برکات اور یہ فوائد وغیرہ ہیں۔ لیکن بھوک جب لگے گی تو آپ لاکھ دلیل سے اسے رَد کرنا چاہیں وہ تو تب بھی لگ کر رہے گی۔

جیسے انسان بے ارادہ کھاتا اور پیتا ہے اور اس پر اجر و ثواب نہیں ملیے ہی اگر کوئی بے ارادہ عبادت کرے اس پر بھی کوئی اجر و ثواب نہیں۔

انسان ارادہ، عقل و شعور سے اور اپنے معبود کو پہچان کر عبادت کرتا ہے اور اس

کی یہ شان ہے، اس کے یہ کمالات ہیں، اور یہ اس کی صفات ہیں، پھر حق عائد ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کروں۔ مجھ پر واجب ہے کہ میں اپنے مالک کو یاد کروں۔ دلائل سے سوچ کر، سمجھ کر، ارادہ اور اختیار سے عبادت کرتا ہے ___ کبوتر "کُتا": بلی اس شعور سے عبادت نہیں کرتے۔ سیٹیاں بجانا ان کی طبیعت کے تقاضے کی تسبیح ہے۔ اس واسطے یہ فرق ہو گیا۔

دوسرے لفظوں میں حاصل یہ نکلا کہ اتنی لمبی چوڑی زندگی کا مقصد ارادی عبادت ہے، جو جانوروں کو میسر نہیں۔

دُوسرے شبہ کا جواب

مگر ایک سوال پھر بھی شاید آپ کے ذہن میں پیدا ہو کہ اچھا صاحب! .... یہ ہم نے مان لیا کہ جانور ارادی عبادت نہیں کرتے، یا اختیاری عبادت صرف انسان کرتا ہے، مگر ملائکہ علیہم السلام تو ارادہ سے عبادت کرتے ہیں۔ وہ تو اپنے معبود کو پہچان کر شعور سے عبادت کرتے ہیں۔ پھر اگر انسان نے ارادہ اور شعور سے عبادت کر لی تو کیا کمال کیا ___ ؟ انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کام تو فرشتے بھی کر رہے ہیں۔ پھر سوال وہیں کا وہیں رہ گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشُبہ ملائکہ علیہم السلام ارادہ سے عبادت کرتے ہیں، اختیار سے عبادت کرتے ہیں۔ لیکن ارادے کی کی ہوئی عبادت ہی ان کے نفس کا تقاضا ہے۔ اس لئے کہ ان میں گناہ کا مادہ نہیں، وہ تو برائی کر ہی نہیں سکتے، وہ جب کریں گے نیکی ہی کریں گے، جب کریں گے عبادت ہی کریں گے۔ تو وہ بھی ان کی طبیعت کا تقاضا ہوا۔ فرق اتنا ہے کہ جانور طبیعت کے تقاضے سے بلاارادہ عبادت کرتے ہیں۔ ملائکہ علیہم السلام طبیعت کے تقاضے سے ارادی عبادت کرتے ہیں۔ تو دونوں جگہ طبیعت کا تقاضا ہی ہے، فرشتوں کی طبیعت میں گناہ کا

مادہ نہیں اور شر کا مادہ نہیں کہ وہ مقابلہ کر کے عبادت کریں۔ بس وہ عبادت ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔

انسان اپنے نفس کا مقابلہ کر کے عبادت کرتا ہے۔ نفس چاہتا ہے کہ میں آرام سے پڑ کے سوؤں۔ وہ کہتا نہیں لحاف اتار کے جا کر اپنے رب کی عبادت کر۔ سردیوں کے زمانے میں نفس کا تقاضا یہ ہے کہ گرم گرم لحاف میں پڑا رہے۔ مگر انسان اس گرمی کو چھوڑ کر لحاف کو اتار کر وضو کرتا ہے، اور اسے ٹھنڈے گرم کی خبر نہیں۔ ہوا میں چل کر مسجد کی طرف آتا ہے۔ مسجد میں آنے کے بعد بھی اونگھ آ رہی ہے مگر پھر بھی وہ عبادت کرتا ہے۔ تو اس کی عبادت اپنے نفس کے مقابلے میں ہے۔ فرشتے نفس کا مقابلہ کر کے عبادت نہیں کرتے۔ فرشتوں کے نفوس تو پاک ہیں۔ ان کا تقاضا ہی یہ ہے کہ عبادت کرو۔ فرق ہو گیا۔ تو یہ عبادت زیادہ قابلِ قدر ہے جو اپنا مقابلہ کر کے کی جائے۔ اس لئے کہ طبعی تقاضوں کے مطابق کئے ہوئے کام زیادہ قابلِ توجہ نہیں ہوتے ——

اگر آپ یوں کہیں کہ میں بڑے اعلےٰ درجہ کا انسان ہوں اس لئے کہ میں روٹی کھایا کرتا ہوں۔ لوگ کہیں گے کہ بھائی یہ کونسا کمال ہے؟ یہ تمہاری طبیعت کا تقاضا ہے، تم اسے پورا کرو گے ہی۔ کوئی ایسا کام بتاؤ کہ تم نے اپنے نفس کے خلاف کر کے کیا ہو؟ —— اور اگر کسی کی نسبت یہ معلوم ہو کہ فلاں صاحب ایک ایک ہفتہ تک کھاتے ہی نہیں۔ دنیا پیچھے دوڑ پڑے گی کہ صاحب کوئی ولی اللہ معلوم ہوتے ہیں۔ دنیا ہے کہ جھکی جا رہی ہے۔ کیوں ——؟ اس لئے کہ نفس کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ نفس کا تقاضا کھانا ہے، اور وہ ایک ایک ہفتہ کھانا نہیں کھاتے تو کھانا کمال نہیں، نہ کھانا کمال ہے۔

اس لیے فرشتہ اگر عبادت کرتا ہے تو نفس کے خلاف نہیں وہ ایسا ہے، جیسے تم نے روٹی کھالی۔ اگر طبیعت کے خلاف کر کے عبادت ہوتی تو کمال تھا، اور

قابلِ قدر تھا۔ معلوم ہوا کہ انسان کی عبادت فرشتے کی عبادت سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔ وہ طبیعت کے تقاضے پورا کرتا ہے، یہ طبیعت کا مقابلہ کر کے عبادت کرتا ہے۔ اپنے کو پہلے ختم کرتا ہے پھر عبادت کرتا ہے۔ یہ زیادہ قابلِ قدر ہے۔

اب گویا اس لمبی چوڑی زندگی کا مقصد یہ نکلا کہ عبادت ہو۔ ارادی ہو، اور نفس کی مخالفت کے ساتھ ہو۔ یہ کام انسان ہی کر سکتا ہے، اور کوئی نہیں کر سکتا اس واسطے فرمایا کہ:۔ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں ——— ایسی عبادت جو ارادی ہو اور نفس کی مخالفت سے ہو۔ تو انسان کی عبادت ہی کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ وہ ملائکہ علیہم السلام اور دیگر مخلوقات سے بڑھی ہوئی ہے اور افضل ہے۔ بہر حال مقصدِ زندگی اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے، وہ صرف عبادت اور طاعتِ خداوندی ہو سکتی ہے۔

طاعتِ خداوندی مقصدِ زندگی کیوں ہے؟

اس کی بنا، اور حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی جتنی بھی چیزیں ہیں، یہ سب آپ کے کام کی ہیں۔ چنانچہ سب آپ کے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ زمین بھی آپ کے کام میں لگی ہوئی ہے۔ سورج بھی آپ کے کام میں لگا ہوا ہے۔ دریا بھی آپ کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ الغرض کائنات کا ہر ذرہ اس کا خادم ہے، اور حضرتِ انسان مخدوم ہے۔

اس لئے کہ انسان کی زندگی کا دار و مدار ان چیزوں پر ہے۔ ان میں سے ایک بھی نہ رہے ——— تو انسان باقی نہ رہے گا ——— اگر سورج بالکل ہٹا دیا جائے تو زندگی ختم ہو جائے گی۔ نہ سورج نکلے گا، نہ چاندنا ہوگا، نہ حرارت اور گرمی باقی رہے گی۔ انسان باقی نہیں رہ سکتا۔ زندگی کا شیرازہ بکھر جائے گا ——— اسی طرح اگر دنیا میں سے ہوا کو کھینچ لیا جائے،

ایک لمحے کے لئے بھی آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ سانس ھی نہیں چل سکتا ۔ تو زندگی ختم ہو گئی ——— علیٰ ھٰذا القیاس دنیا میں پانی نہ رہے، اور ایک قطرہ و بوند بھی کسی کو نہ ملے، تو بھی انسان زندہ نہیں رہ سکتا ——— غرض آگ ، پانی ، مٹی ، ہوا ، زمین سُورج اور ستارے وغیرہ ذٰلک ان میں سے اگر ایک چیز بھی ختم کر دی جائے ، انسانی زندگی ختم ہو جائے گی .... معلوم ہوا کہ ہر چیز انسان کے کام کی ہے۔ انسانوں کے لئے ہی بنائی گئی ہے ۔ لیکن انسان خود ان میں کسی کے بھی کام کا نہیں۔ اگر سارے انسان ختم ہو جائیں ۔ سُورج کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ اگر ایک بھی انسان باقی نہ رہے ، زمین اسی طرح قائم رہے گی۔ آسمان اسی طرح قائم رہے گا۔ تو آپ نے اندازہ کیا کہ ان میں سے ایک چیز بھی نہ رہے۔ تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا ، اور سارے انسان ختم ہو جائیں تو ان چیزوں کا کچھ نہیں جاتا۔

معلوم ہوا کہ یہ ساری چیزیں تو انسان کے کام کی ہیں۔ مگر انسان ان میں سے کسی کے کام کا نہیں۔ آخر دنیا کے کروڑوں انسان ختم ہو گئے ، اور یہ سب کچھ اسی طرح موجود ہے ———

اِنسان صرف اللہ کے کام کا ہے

انسان ان میں سے کسی کے بھی کام کا نہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ساری چیزیں انسان کے کام کی ہیں۔ آخر انسان کس کے کام کا ہے ؟

جواب اس کا یہی ہے کہ جب انسان مخلوقات میں سے کسی کے کام کا نہیں ہے ، خالق کے کام کا ہو گا۔ اور خالق کا کام یہ ہے کہ اس کے سامنے اس کی اطاعت کرے، اس کے سامنے نیاز مندی برتے، عبادت کرے اور جھکے ——— تو انسانی زندگی کا مقصدِ اصلی نکل آیا جو طاعت اور عبادتِ خداوندی ہے ۔ اسی لیے یہ سارا کارخانہ قائم کیا گیا۔ کھانے اور پینے کا نظام قائم کیا گیا ——— کیونکہ انسان اس وقت تک عبادت نہیں

کر سکتا۔ اس لئے غذائیں، پانی اور ہوا کو پیدا کیا ــــــ اسی طرح جب تک چاندنا نہ ہو، عبادت نہیں کر سکتا، اللہ نے سورج چاند کو پیدا کر دیا۔ درخت، جانور، پہاڑ، پیدا کر دیئے۔ یہ سب کچھ اس لئے پیدا کیا کہ انسان یہ سب کچھ استعمال کر کے تیار ہو جائے، اور اپنے اللہ کی عبادت کرے ــــــ الغرض یہ سارے انتظامات انسان کے لئے، اور انسان اپنے مالک کے لئے ــــــ

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص گھوڑا پالے، تو گھوڑے کے لیے اصطبل بنائے گا اور اصطبل کے لئے ایک سائیس رکھے گا، جو گھوڑے کی خدمت کرے گا۔ گھاس دانہ اس کے لئے مقرر کرے گا تو اس کے لیے ملازم رکھے گا۔ یہ سارا گھوڑے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ اور گھوڑا کس کے لئے؟ صرف مالک کی سواری کے لئے ــــــ ...... اگر سواری کے وقت گھوڑا شرارت کرنے لگے، اور سواری کا کام نہ دے، وہ گھوڑا کس کام کا؟ وہ تو گولی مار دینے کے قابل ہے۔ مالک کہے گا میں نے سارے انتظامات اس کے لئے کئے، اور اس کو اپنے لئے رکھا۔ اگر میرے ہی کام کا یہ نہیں، تو یہ رکھنے کے قابل کہاں؟ اس لئے جب گھوڑا ختم ہو جائے گا، مالک اصطبل کو، سائیس کو، ملازم وغیرہ کو از خود ختم کر دے گا۔ اس لئے کہ یہ سب چیزیں گھوڑے کے لئے تھیں، اور گھوڑے کا مقصد تھا کہ مالک کو سواری کا کام دے۔ جب وہ مقصد پورا نہیں ہو گا، گھوڑا بھی ختم، اصطبل بھی، سائیس بھی ختم۔

ہم اور آپ اس اصطبل میں موجود ہیں ــ دنیا کو اللہ نے ایک اصطبل بنایا، جس میں غذائیں رکھیں۔ اصطبل کی چھت بھی بنائی، پھر اس میں آگ ہوا وغیرہ سب کچھ رکھا۔ یہ سب کچھ آپ کے لئے اور آپ اس لئے کہ مالک کی عبادت کریں۔ اگر انسان عبادت نہیں کرے گا، تو وہ گولی مار دینے کے قابل ہے ــ اور اگر سارے ہی مل کر عبادت چھوڑ دیں، تو سارے انسان ختم ہو جائیں گے۔ یہ اصطبل بھی ڈھا دیا جائے گا۔ اور اس میں جو سامان کھانے پینے کا ہے وہ بھی ختم کر دیا جائے گا۔ اور

اسی کا نام قیامت ہے۔

فرمایا گیا کہ قیامت اشرارِ خلق پر قائم ہوگی۔ ان لوگوں پر جو بدترین خلائق ہوں گے۔ جنہیں اچھے بُرے کی تمیز نہیں ہوگی، برسرِ بازار بُرائیاں کرتے پھریں گے جیسے جانور اور بہائم ہوتے ہیں۔ اللہ کی کوئی قدر قلوب میں باقی نہیں رہے گی۔ جب اس طرح کے انسان بن جائیں گے تو وہ بھی ختم کر دیئے جائیں گے۔ آسمان بھی اٹھا دیا جائے گا۔ زمین بھی ختم کر دی جائے گی۔ اس لئے کہ جب تخلیقِ انسانی سے مقصدِ خداوندی ہی پورا نہیں ہوتا، پھر یہ چیزیں بھی بیکار ہیں۔ یہ ساری چیزیں انسان کے لئے ہیں۔ اگر وہ مالک کے کام کا ہے تو ساری چیزیں برقرار رہیں گی۔ اگر وہ اپنے مالک کے کام کا نہیں، یہ ساری چیزیں ختم کر دی جائیں گی۔

عقلی اعتبار سے عبادتِ خداوندی کی ضرورت

آپ اللہ سے لو لگائیں تو یہ ساری کائنات آپ کی خدمت کرے گی۔ لیکن اگر آپ اپنے مالک کو چھوڑ کر اس کائنات سے لو لگائیں گے تو مالک کا کیا بگڑے گا۔ وہ یہ چاہے گا کہ یہ انسان گولی مار دینے کے قابل ہے۔

بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کسی صاحبِ جمال عورت سے نکاح کرے۔ بڑی شائستہ، مہذب اور حسین و جمیل ہو۔ اس کے لیے ایک بہت عمدہ بلڈنگ تیار کی، تاکہ یہ عورت آرام کر سکے۔ بلڈنگ میں کچھ فراش مقرر کئے تاکہ وہ اس کو جھاڑیں، اور صاف کریں۔ باورچی مقرر کئے تاکہ دو وقت کھانا پکائیں، تو اس نے یہ خیال کیا کہ اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اس لئے ایک لمبا چوڑا تاج محل قائم کیا۔ بڑی لمبی چوڑی اور عالیشان بلڈنگ قائم کی۔ یہ سب کچھ کاہے کے لئے؟ صرف بیوی کے لئے۔ اور بیوی کاہے کے لئے؟ صرف خاوند کے لئے ——

اگر یہ بیوی خاوند کی بجائے کسی نوکر سے ملاقات شروع کر دے۔ یا اس محل میں باہر سے کوئی آدمی آنے لگے تو خاوند پر کیا گزرے گی؟ ۔ وہ کہے گا یہ بیوی طلاق دینے کے قابل ہے، بلکہ گولی مار دینے کے قابل ہے، اس نے تو میری آبرو ختم کر دی ——— تو وہ بیوی کو ختم کر دے گا۔ جب بیوی ختم ہو گئی تو بلڈنگ کو کیا کرے گا؟ اسے بھی وہ ختم کر دے گا، اور جب بلڈنگ ہی نہ رہی تو فراش کو رکھ کر کیا کرے گا؟ باورچی وغیرہ کس کام آئیں گے؟ ۔ یہ تو ساری چیزیں بیوی کے لئے تھیں ۔ جب بیوی کو طلاق دے کے نکال دیا تو ان چیزوں کی کیا ضرورت باقی رہی؟ ——— یہ قصہ کب ہو گا؟ ۔ جب بیوی اپنے خاوند کی ہونے کی بجائے کسی نوکر کی بننے لگے ۔ فراشوں سے ہاتھ ملانے لگے، نوکروں سے آشنائی کرنے لگے ۔ ایسے میں یہ بیوی نکال دینے ہی کے قابل ہو گی ———

ٹھیک اسی طرح سے سمجھ لیجئے کہ اللہ نے انسان کو بڑی مخلوق بنایا ۔ اللہ کو انسان سے اس سے بھی زیادہ محبت ہے جتنی کہ ایک خاوند کو بیوی (بلکہ ماں کو بچے) سے ہو سکتی ہے ۔ اس کی ضرورت سے حق تعالیٰ شانہٗ نے ایک بڑی بلڈنگ تیار کی، اور آسمان کا خیمہ قائم کیا ۔ اور زمین کا فرش بچھایا ۔ جعل لکم الارض فراشًا ـــ زمین کو ہم نے تمہارے لئے فرش بنایا ۔ وجعلنا السماء سقفًا محفوظًا ۔ آسمان کو تمہارے لئے محفوظ چھت بنا دیا ـــ روشنی کی ضرورت تھی تو چاند سورج کے بلب لٹکا دیئے، تاکہ کائنات کے اندر روشنی ہو ـــ کاروبار کے لیے تیز روشنی کی ضرورت تھی تو دن میں سورج نکال دیا ۔ رات کو ہلکی روشنی کی ضرورت پڑتی ہے تو چاند اور ستارے نکال دیئے ۔ ان میں روشنی بھی ہے مگر آنکھوں میں چمک نہیں پیدا کرتی ـــ تو رات میں دھیمی اور دن میں تیز روشنی رکھی ۔ دن کاروبار کے لئے اور رات آرام کے لیے ہے ۔ فرمایا :۔ وجعل اللیل سکنًا ـــ رات کو سکون کے لئے بنایا گیا، تاکہ آرام کیا جا سکے ۔

وجعلنا النہار معاشًا — دن کو کام کاج کے لئے بنایا گیا۔ تاکہ کارخانے لگاکر کام کریں، تو اس میں تیز روشنی رکھی۔ رات کو دھیمی روشنی رکھی۔ پانی کی ضرورت تھی سو طرف دریا بہا دیئے۔ بارش سسٹم الگ قائم کیا تاکہ پانی ہر وقت ملتا رہے۔ مخلوق کو تکلیف نہ ہو۔ زمین کو فرش بنایا۔ یہ فرش بھی ہے اور گودام بھی ہے اس لئے کہ غذائیں اسی میں سے نکلتی چلی آرہی ہیں۔ گندم، چاول اور بے شمار نعمتیں بھی۔ تو یہ فرش اور بچھونا بھی ہے اور ساتھ ہی گودام بھی کہ اس میں سارے غلے رکھے ہوئے ہیں۔ ساری ترکاریاں رکھی ہوئی ہیں۔ بارشی سسٹم بھی اسی میں ہے۔ دریا بھی اسی میں ہیں۔ پھر پانی آسمان میں نہیں ہے۔ زمین کے اندر ہے، اور زمین کے بھی اوپر نہیں ہے تاکہ انسان کو تکلیف نہ ہو ——— سورج کی روشنی تھی۔ گویا وہ ایک لالٹین اور چراغ ہے جس سے انسانوں کو روشنی پہنچتی ہے۔ ایک گھڑی بھی جس سے صحیح اوقات معلوم ہوتے ہیں جس روز سے اس کے مالک نے اس کو بنایا ہے صحیح ٹائم دیتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ آج تک کبھی اس میں خرابی پیدا نہیں ہوئی، اور یہ ایک ہیٹر بھی ہے جس سے گرمی پہنچ رہی ہے تو سورج ایک ہے مگر منافع اس کے بیشمار ہیں۔ اسی طرح زمین ایک ہے مگر اس کے منافع بیشمار ہیں ———

یہ سارا قصہ اس لیے کیا تاکہ انسان کو تکلیف نہ ہو، کھانے کو ملے، پینے کو ملے، ہوا ملے۔ تاکہ اس کے کام کاج میں کوئی خلل نہ پڑے۔ مگر یہ ساری چیزیں انسان کے لئے ہیں۔ اور انسان اپنے مالک کے لئے ہے، تاکہ اس کی اطاعت و عبادت کرے۔ اس لئے کہ سب کچھ دینے والے وہ ہیں، اور محسن وہ ہیں۔ اس احسانِ عظیم کا بھی تقاضا ہے کہ اُس کی عبادت کی جائے۔

عبادت و طاعت کا عام مفہوم

اور پھر عبادت و طاعت کے مفہوم کو اتنا عام رکھا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق

ہو سکتی ہے، اور اسے ایک مخصوص انداز کے ساتھ متعین نہیں کیا بلکہ اس کو اتنا آسان کر دیا کہ مسلمانوں کی خدمت کرنا، دوستوں کی خدمت کرنا یہ بھی اللہ اللہ کرنا ہے۔ جو طاعت و عبادت میں داخل ہے۔

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب ہم حج کو گئے تو اس سال وہاں ہیضہ بہت پھیلا، چونکہ حضرت صاحبؒ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ سے بیعت تھے اور ان کے خلیفہ بھی تھے۔ فرماتے تھے کہ اس حج کے موقع پر ہزاروں حجاج بے چارے اسی بیماری میں انتقال کر گئے۔ کہتے تھے کہ میرے جتنے ساتھی تھے وہ سب بیماری میں مبتلا تھے۔ اور میرا یہ کام تھا کہ ایک کو دوا پلا رہا ہوں تو ایک کے لئے کھانا لے کے آرہا ہوں۔ بس خدمت میں لگا ہوا، نہ طواف کر سکتا تھا نہ حرم میں حاضری ہو سکتی تھی۔ اتنا کام رہ گیا کہ کبھی کسی کو دوا پلا رہا ہوں تو کسی کو لوٹے میں پانی وغیرہ دے رہا ہوں۔ وغیرہ، وغیرہ۔

غرض اسی پریشانی میں تھا۔ میں نے اپنے شیخ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے حال کی شکایت کی کہ حضرت میرا آنا نہ آنا تو برابر ہو گیا۔ کہ میں نہ طواف کے قابل، نہ مدینہ منورہ جانے کے قابل۔ میرے ہاتھ میں تو بس دوا کا پیالہ ہے .... اور بیماروں کے پاس پڑا ہوں ـــــ فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے اس طرح .... سے انگلی دبائی اور فرمایا۔ بیٹا یہ کیا بات کہی آپ نے؟ حج اور طواف بھی عبادت ہے مگر اس سے بڑھ کر مسلمانوں کی خدمت کرنا یہ عبادت ہے، تو اجر و ثواب اس سے کہیں زیادہ ملے گا جتنا حج اور طواف میں ملتا۔

ع دل بدست آور کہ حجِ اکبر است

آدمی اپنے دل کو قابو میں لائے کہ یہ سب سے بڑا حج ہے۔ تو فرمایا کہ حج کا فریضہ ادا کر لیا ہے۔ اب ان بیماروں کی خدمت کرو، ہزار طواف سے بڑھ کر اجر و ثواب ملے گا جو طواف میں نہیں ملے گا۔ گویا بتلایا کہ عبادت فقط صدقہ اور نماز میں نہیں ہے۔

عبادت کی بہت سی شاخیں ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ جو دارالعلوم کے سب سے پہلے صدرِ مدرس ہیں، اور مولانا رفیع الدین صاحبؒ جو سب سے پہلے مہتمم ہیں۔ نقشبندیہ خاندان کے بزرگ ہیں، اور صاحبِ کشف و کرامت بھی ہیں، اول الذکر دونوں حضرات بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ مولانا رفیع الدین صاحبؒ آئے، مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے تواضع کی، اور عرض کیا کہ حضرت آپ بھی کھائیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میرا تو روزہ ہے۔ نفلی روزہ تھا۔ غروب آفتاب میں کوئی دس منٹ باقی تھے ـــــ انہوں نے فرمایا کہ حضرت کھائیے ...... اللہ اس میں آپ کو زیادہ اجر دے گا۔ بس فوراً بیٹھ گئے۔ اور کھانا شروع کر دیا۔ روزہ توڑ دیا۔ حضرت فرماتے تھے کہ مجھے اس تعمیلِ حکم میں جو اجر ملا ہے اگر میں ہزار روزے بھی رکھتا تو وہ اجر و ثواب نہ ملتا، جو اس وقت روزہ توڑنے میں ملا۔

تو عبادت فقط نماز روزہ میں نہیں ہے۔ عبادت کھانے پینے میں بھی ہے۔ سونے جاگنے، چلنے پھرنے میں بھی ہے۔ گویا اللہ فقط مسجد میں نہیں ملتا۔ گھر میں بھی ملتا ہے۔ دسترخوان پر بھی ملتا ہے۔ ہر جگہ آدمی اللہ کا جمال دیکھ سکتا ہے، جبکہ سچی نیت سے چلے اور طریقِ شریعت کے مطابق چلے۔ اتباع کا جذبہ لے کر چلے۔ تو ہر چیز اُس کے لیے طاعت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اسلام دنیوی معاملات سے روکنے کے لئے نہیں آیا

حق تعالیٰ شانہ نے یہ فرمایا کہ یہ ساری دنیا تمہارے لئے ہے اور تم اپنے مالک کے لئے ہو۔ مملوک کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مالک کے سامنے نیازمندی سے جھکے، اور اطاعت کرے۔ جب آدمی اس میں مضبوط ہو جائے گا تو کوئی بھی دنیا کا کام کرے۔ اِس

میں خیر و برکت ہوگی۔

اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم کاروبار نہ کرو۔ دنیوی معاملات ترک کردو۔ اپنے تحفظ کی شکلیں اختیار نہ کرو۔ سب کچھ کرو مگر اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کرو۔ عابد اور بندے بن کے کرو۔ یہ سمجھ کر کہ اسباب میں کچھ نہیں رکھا۔ اس کے حکم کی تعمیل میں ہم نے یہ اسباب اختیار کئے ہیں۔ تو دینِ اسلام صرف راستہ درست کرنے کے لئے آیا ہے۔۔۔ آپ کے کاموں میں روڑے اٹکانے کے لئے نہیں آیا۔ قلب کا رُخ اللہ کی طرف پھیر لو، اور کام ساری دنیا کے کرو۔ وہ خیر بنتے چلے جائیں گے۔ مسلمان کی شان یہ ہے۔ کہ دل بیار، دست بکار — دل مالک میں لگا ہوا ہے، اور ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ دل کاروبار میں نہ اٹکا ہوا ہو، کاروبار میں ہاتھ اٹکے ہوئے ہوں، ایسے کاروبار میں بھی برکت ہے۔ یہ بھی عبادت ہی شمار ہوگی۔

تو اسلام کاروبار، اور تجارت و زراعت کو روکنے کے لئے نہیں آیا۔ سب چیزوں کی اجازت دی مگر یہ کہ میرے ساتھ تعلق قائم کر کے میرے حکم کے مطابق چلو۔ اس لئے اسلام آیا ہے۔ اگر اپنے نفس کے حکم کے مطابق چلوگے تو نفس تو ہر ایک کا آزاد اور باغی ہے۔ ظاہر ہے اس سے نہ دنیا بنے گی نہ آخرت — اگر یہ ساری چیزیں حکمِ خداوندی کے تحت کریں تو اس میں خیر و برکت ہوگی۔ دنیا بھی بنی، اور آخرت بھی بنی۔

تو دین کا کام قلب کا رُخ درست کرنا ہے جب وہ درست ہو جائے گا، سارا راستہ درست ہوتا چلا جائے گا، اور اگر خدانخواستہ وہ غلط ہوگا، سارے کام غلط ہوں گے۔ مثلاً آپ سفر میں جائیں، اور دو چار ہزار میل کا سفر کیا، لیکن رُخ بدل گیا، تو جتنا سفر کرتے جاؤ گے منزلِ مقصود سے دُور ہٹتے چلے جاؤ گے۔ تو سفر کی تیاری میں تو آپ نے کمی نہیں کی۔ روپیہ بھی خرچ کیا۔ سامان بھی لیا، لیکن بجائے ادھر کے ادھر کو چل پڑے۔ جانا تھا آپ کو نیروبی، اور راستہ فرانس کا اختیار کر لیا۔ اور اپنے دل میں یہ سمجھ رہے ہیں۔

کر نیروبی جارہا ہوں، جتنا چلو گے نیروبی سے دور ہوتے چلے جاؤ گے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ راستہ بھی چلو، روپیہ بھی خرچ کرو۔ مگر منزل متعین کر لو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جانا ہے۔ جنت کی طرف چلنا ہے۔ آخرت کی طرف چلنا ہے۔ رُخ صحیح کر لو ساری دنیا دین بنتی چلی جائے گی۔ اور رُخ اللہ تعالےٰ سے پھیر لو۔ یہ ساری چیزیں وبال بنتی چلی جائیں گی۔ خیر و برکت تو اس میں کیا ہوگی؟ اسلام کا کام راستہ درست کرنا اور صراطِ مستقیم پر چلنا ہے اور یہی حاصلِ عبادت ہے جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ تو فرمایا گیا:۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ٥

ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ ہماری عبادت کریں — اور عبادت کا مفہوم عام قرار دیا — اس لیے کھانا، پینا، سونا، جاگنا بھی عبادت ہے۔ جب کہ منزلِ مقصود ہماری ذات کو ٹھہرا دیا جائے۔ بس مقصود یہ ہے کہ مسلمان کی منزلِ مقصود اللہ ہو۔ وہ ہر کام کرتا جائے، خدا کی طرف چلتا جائے اس کا ہر کام باعثِ خیر و برکت ہوگا۔

اور فرمایا:۔

مَا ارید منھم من رزق وما ارید ان یطعمون۔ ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین ٥

ہم یہ نہیں کہتے کہ تم ہمیں رزق پہنچاؤ۔ تم ہمیں روٹی کھلاؤ۔ ہم تو غنی ہیں۔ روزی کا ذمہ دار اللہ ہے، وہ دینے والا ہے۔

ہم روزی نہیں مانگتے۔ تمہاری نیاز مندی چاہتے ہیں، روزی ہم دیں گے۔

اللہ اور بندہ میں معاہدہ

تو ایک کام اللہ نے اپنے ذمہ لیا، اور ایک کام بندہ کے ذمہ لگایا، اپنے ذمہ

یہ کیا کہ ہم رزق دیں گے، عزت دیں گے ـــــ تمہارے ذمہ یہ کیا کہ تم عبادت کرو.....
نیاز مندی برتو ـــ اب تم اپنا کام چھوڑ دو گے، وہ بھی اپنا کام چھوڑ دیں گے۔ اس لئے
جو عبادت ترک کر دے گا، تو روزی اور اقتدار و عزت، جو دیا جا رہا تھا، اس کو
بھی بند کر دیا جائے گا۔

اگر اسی کام میں لگے رہے جو آپ کے سپرد کیا گیا۔ پھر وہ بھی اپنا کام انجام
دیں گے۔ گویا معاہدہ ہے۔ لیکن جب یہ عہد شکنی کرے گا، تو دوسرے کے ذمہ عہد
پورا کرنا نہیں رہ جاتا۔

آج جو مسلمان پریشان ہیں کہ ہمارا غلبہ ختم ہو گیا، اقتدار ختم ہو گیا۔
حاسدین ہم پر چھا گئے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ تم نے اپنا کام چھوڑ دیا۔ انہوں
نے اپنا کام چھوڑ دیا ـــــ

ـــــ اور انہوں نے اس لئے نہیں چھوڑا کہ ان کے خزانے میں کوئی کمی تھی ـــ
معاہدہ تھا کہ یہ کام تمہیں کرنا ہو گا اور یہ ہم کریں گے۔ جب یہ عہد شکنی کرے گا، تو
دوسرے کے ذمہ عہد باقی نہیں رہے گا ـــ یہ اللہ کا قانون ہے۔ آپ نے اطاعت
کا عہد چھوڑ دیا، انہوں نے رزق دینے کا عہد چھوڑ دیا۔ رزق فقط روٹی کو نہیں کہتے۔
رزق، روٹی، عزت، اقتدار اور طمانیتِ قلب یہ سب کچھ اس میں آتا ہے ـــ آج ہم
دیکھتے ہیں کہ ہم سب پریشان ہیں۔ روٹی ہمیں کھا رہی ہے اور ہم روٹی کو کھا رہے
ہیں ـــ یہ کیوں ہے؟ ـــ اس واسطے کہ وہ جو اطمینانِ قلب والی روزی تھی وہ ملنا بند
ہو گئی۔ وہ ہم سے چھین لی گئی۔ اس لئے چھین لی گئی کہ ہم نے عہد شکنی کی۔ تو یہ
عہد یاد دلانے ہی کے لئے چند آیتیں پڑھی تھیں۔ اور یہ وہی آیتیں ہیں جو اس عہد
سے متعلق ہیں ـــ یہیں سے آپ نے زندگی شروع کی ہے۔ یعنی عہدِ الست سے۔
اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا کہ: ـــــ

الست بربکم ـــــ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟

—— میں تمہارا پالنے والا نہیں ہوں ؟ —— تمہیں روزی اور عزت دینے والا نہیں ہوں ؟ —— یہ ساری چیزیں رب میں داخل ہیں – تو اللہ نے سوال کیا، اور سب نے کہا کہ :——

قالوا بلیٰ	کیوں نہیں بے شک آپ ہی رب ہیں۔

سب کچھ آپ ہی ہیں —— تو فرمایا۔

شھدنا ان تقولوا یوم	فرمایا کہ تم بھی گواہ رہو —
القیٰمۃ انا کنا عن ھذا	کہیں قیامت کے دن یوں کہہ دو کہ
غافلین ٥	ہمیں تو یہ بات ہی نہیں بتلائی۔

ہم کس کی عبادت کرتے ؟ کس کو رب مانتے ؟ — اس لئے ہم نے بتلا دیا اور سمجھا دیا ——

او تقولوا انما اشرک	یہ بھی مت کہنا کہ جو ہمارے پچھلے
اٰبآؤنا من قبل وکنا ذریۃ	تھے وہ بہت برائیاں کر گئے،
من بعدھم افتھلکنا بما	ان کی وجہ سے ہمیں پتہ
فعل المبطلون ٥	نہیں تھا۔

کسی کی برائی سے کوئی نہیں پکڑا جائے گا، خود جو برائی کرے گا- اس کی اس کو سزا ملے گی۔ تم یہ مت کہنا کہ اشرک اٰبآؤنا — ہمارے ماں باپ نے شرک اور بت پرستی کی تھی - ہم تو بعد میں تھے۔ ہمیں کیوں پکڑا جاتا ہے۔ جواب میں ہم بتلاتے ہیں کہ ماں باپ کی وجہ سے کوئی نہیں پکڑا جائے گا۔ جیسے ماں، باپ سے عہد لیا تھا، تمہارے سے بھی عہد لیا تھا- ایک ایک فرد سے عہد لیا تھا۔ انہوں نے اگر عہد شکنی کی تھی تو تم نے کیوں کی ؟ —— قیامت کے دن یہ عذر نہیں چلے گا کہ پچھلوں کی برائی نے ہمیں اندھیرے میں رکھا- ہمیں تو کچھ پتہ نہیں تھا- ہم غفلت میں رہے۔

——— تو ہماری زندگی عہد الست سے چلی ہے۔ جہاں اقرارِ ربوبیت کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ میں خالق اور مالک ہوں، مجھے یاد رکھنا۔ اسی عہد کو یاد دلانے کے لیے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام آئے۔ یہ روز کی تقریریں اور وعظ اسی عہد کو یاد دلانے کے لئے ہیں کہ یہ عہد بھول نہ جانا۔

اس لئے جب بندہ اس عہد پر یکتا رہے گا۔ اور اس کے مطابق چلے گا، تو ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے عہد کو پورا کریں۔

بس یہ چند باتیں آیت کے تحت میں مجھے گذارش کرنی تھیں۔ وقت زیادہ ہو گیا ہے۔ اور بقدرِ ضرورت آیت کی تشریح بھی ہو گئی۔ اب دعا کیجیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حُسنِ اخلاق، عبادت، ریاضت اور توجّہ الی اللہ کی توفیق عطا فرمائے، اور ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ○

فلسفۂ موت

موت جیسے فزع اکبر ہے۔ جیسے عظیم ترین مصیبت ہے ویسے ہی عظیم ترین نعمت بھی ہے عظیم ترین انعام خداوندی بھی ہے۔ موت کے بارے میں صرف ایک پہلو ہی سامنے نہ رہنا چاہیئے۔ ہائے افسوس، ہائے افسوس کا۔ بلکہ خوشی کا بھی ایک پہلو ہے کہ یہ تحفۂ مؤمن بھی ہے۔ یہ طریقہ ہے راستہ ہے اللہ تعالٰی کو ملنے کا۔ یہ طریقہ ہے دنیا کی آبادکاری کا۔ یہ طریقہ ہے نئے نئے علوم پیدا ہونے کا۔ اور نئے مزیوں کے پیدا ہونے کا۔ اس لئے موت کا ایک ہی پہلو نہیں کہ اس سے ڈریں بلکہ موت میں پہلو خوشی کا بھی ہے کہ اس کا انتظار بھی کرے اس کی تمنا بھی کرے ....

از:- حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

ترتیب

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ و نؤمن بہٖ
و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من
سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ و من
یضللہ فلا ھادی لہ۔ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ و
وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و سندنا و مولٰنا
محمداً عبدہ و رسولہ۔ ارسلہ اللہ الی کافۃ للناس
بشیرًا نذیرًا۔ و داعیا الیہ باذنہ و سراجا منیرًا
امابعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا
اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِلٰی قَوْلِہٖ تَعَالٰی ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ
(بقرہ پ ۲ ع: ۱۹)
صدق اللہ العلی العظیم

تمہید

بزرگانِ محترم !۔

میری اس وقت حاضری کا مقصد ملتان میں نہ کوئی جلسہ تھا نہ کوئی مجلس تھی، نہ کوئی تقریب اور وعظ کا تخیل ذہن میں تھا۔ میری حاضری کا مقصد حضرت مولٰنا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (بانی مدرسہ خیر المدارس ملتان) کی وفات کے بعد یہ پہلی

حاضری تھی تاکہ تعزیت ادا کردں۔ تعزیت کے لئے ہجوم اور مجمع نہیں ہوتا، اگر مجھے پہلے سے علم ہوتا کہ جلسہ کا اعلان کیا گیا، تو میں روک دیتا اور مجھے امید تھی کہ مولٰنا محمد شریف صاحب (مہتمم مدرسہ خیر المدارس، فرزندِ ارجمند حضرت مولٰنا خیر محمد صاحبؒ) مان بھی لیتے، لیکن اچانک آکر معلوم ہوا کہ کوئی جلسہ بھی ہے اور اجتماع بھی۔ جلسہ اور تقریر میں ان سب کے لئے ضرورت پڑتی ہے نشاط کی، طبیعت میں انشراح ہو نشاط ہو۔ یہ ساری چیزیں مل جاتی ہیں مگر میں اس وقت حاضر ہوا ہوں ایک بجھے ہوئے دل کے ساتھ۔ مولٰنا رحمۃ اللہ علیہ کا غم سامنے ہے، یہاں آکر تازہ ہو گیا۔ حالانکہ ان کی وفات کو ایک عرصہ گزر چکا ہے مگر میرا تعلق اتنا قوی تھا ان سے، اور قلبی رابطہ برسہا برس سے تھا۔

—— مولٰنا مرحوم جب جالندھر میں مقیم تھے۔ پنجاب کا جو بھی میرا سفر ہوا دو جگہ اترنا لازمی ہوتا تھا۔ جالندھر میں مولٰنا مرحوم کی وجہ سے، اور امرتسر میں مولٰنا مفتی محمد حسن صاحب مرحوم کی وجہ سے۔ پاکستان بننے کے بعد مولٰنا مرحوم کا قیام ملتان میں ہوا۔ یہاں بھی ایک آدھ مرتبہ ان کی حیات میں حاضری ہوئی۔ اِس وقت ان کی وفات کے بعد یہ پہلا موقع ہے حاضری کا۔ تو وہ سارے تعلقات سامنے آگئے، وہ ساری تاریخ سامنے آگئی۔ اس وجہ سے دل پر غم کا ایک بوجھ ہے تو اس بجھے ہوئے دل سے میں کیا تقریر کروں اور کیا جلسے کا حق ادا کروں؟ اور اوپر خود میرا بھی اب ضعیفی کا عالم ہے قوت بھی وہ نہیں ہے جو پہلے تھی۔ جذبات بھی سرد پڑ چکے ہیں۔ ایسی حالت میں تقریر ہو تو کیا ہو؟

بہر حال جب ہو گیا ایک اجتماع اور حضرات جمع ہو گئے ان کا احترام بھی ضروری ہے۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ کچھ نہ کچھ عرض کیا جائے۔ اس لیے غم کے سلسلے میں تعزیتی تقریر ہوگی۔ کوئی خاص وعظ و نصیحت اس میں نہ ہوگا۔

★

عالم کی بقا روحانیت کی بقا سے ممکن ہے

حقیقت یہ ہے کہ مولٰنا مرحوم کی ذات ایک مقناطیسی ذات تھی جو قلوب کا رجحان تھا، اور دل کھینچتے تھے اور ان کی وفات جیسا کہ مقولہ مشہور ہے موت العالِم موت العالَم (عالِم کی موت فی الحقیقت عالَم کی موت ہے) اس لیے کہ عالِم کے ذریعے سے حیات پھیلتی ہے۔ وہ حیات یہ نہیں ہے جو کھانے پینے کی ہے، وہ حیات روحانی ہوتی ہے اور وہی حقیقی حیات بھی ہے اور وہی حقیقی روح بھی ہے، اسی لیے حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن کریم کو اپنی روح فرمایا ہے۔ اسی رُوح سے اقوام زندہ ہوں گی اور اسی روح کے نکل جانے سے پژمردگی طاری ہو گی — فرمایا ایک موقع پر کہ :—

وکذٰلك اوحینا الیك روحًا من امرنا (شوریٰ پ ۲۵)

اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے یعنی اپنی روح آپ کے اندر ڈالی ہے وہ عالم کی روح ہے، اور وہ کتاب اللہ اور قرآن کریم ہے جس کو روح بتلایا گیا ہے۔ فی الحقیقت یہ زندگی ہے سارے عالم کی۔ یہ روح ایک فرد سے نکل جائے تو وہ مردہ ہو جائے گا۔ پوری کائنات سے نکل جائے تو کائنات بھی مردہ ہو جائے گی۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے :-

لا تقوم الساعۃ حتی یقال فی الارض اللہ اللہ

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جس وقت اس عالم میں ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہوگا۔ جب ایک بھی باقی نہیں رہے گا تو قیامت آجائے گی۔ تو قیامت اس پورے عالم کی موت ہے۔ اس حدیث سے واضح ہے کہ اس عالم کی زندگی اور اس کی روح "اللہ اللہ" ہے۔ جب یہ رُوح نکل جائے گی، عالم مُردہ

ہو جائے گا۔ اس کا ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔ آسمان و زمین ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور ساری کائنات کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ غرض عالم کی روح وہ فی الحقیقت ذکر اللہ اور یادِ خداوندی ہے۔ نہ صرف پورے عالم کی بلکہ ایک ایک جزْ کی روح بھی یہی ہے۔

"ہر چیز تسبیح خواں ہے"

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ درخت کی ہر ہر ٹہنی بھی اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔ تسبیح بند ہو جاتی ہے اس پر زردی چھا جاتی ہے، وہ اس کی موت کا وقت ہوتا ہے۔ روح نکل گئی، موت طاری ہو گئی۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ تسبیح بند ہو جاتی ہے جب کہ وہ ٹھہر جاتا ہے۔ تسبیح بند ہو جانے کے بعد ٹھہرا ہوا پانی سڑتا بھی ہے بدبودار بھی ہوتا ہے۔ یہ اس کی موت کا وقت ہوتا ہے۔ تو پانی کی زندگی بھی تسبیح و تہلیل سے ہے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ امام کے لئے مکروہ تحریمی ہے کہ ایسے کپڑے پہن کر امامت کرائے کہ پسینے میں زرد ہوئے ہوں۔ پسینے کی بو آرہی ہو۔ اس کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے۔ ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ جب بدبودار کپڑے ہوں گے اور تعفن ہو گا تو مقتدیوں کو اقتداء کرتے ہوئے کراہت پیدا ہو گی۔ نشاط باقی نہیں رہے گا۔ جو ایک رابطہ ہے بندہ اور خدا کے درمیان میں وہ پورا قائم نہیں رہ سکے گا، اسی لئے فقہاء لکھتے ہیں کہ امام کے لئے صاف ستھرے کپڑے پہننا ضروری ہیں اتنے میلے نہ ہوں کہ ان میں سے بدبو آنے لگے۔ رنگ بدل جائے، ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ بدبو سے مقتدیوں کو عار پیدا ہو گی۔

حقیقی وجہ یہ ہے کہ کپڑا گندا ہو کر اس کی تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ ذکر اللہ منقطع ہو جاتا ہے، وہ بھی ختم ہو جاتا ہے، انقباض پیدا ہوتا ہے روح میں۔ تو درحقیقت سارے عالم کی روح ذکر اللہ ہے، یہ قائم ہے تو عالم قائم ہے۔ یہ نہیں رہے گی تو عالم قائم نہیں رہے گا۔ عالم کی جزیات ختم ہو جائیں گی تو ہر ہر چیز اللہ کی تسبیح میں مشغول ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وان من شیءٍ الا یسبح بحمدہٖ ولٰکن لا تفقھون تسبیحھم

کوئی چیز دنیا کی ایسی نہیں ہے جو حق تعالیٰ کی تسبیح میں مصروف نہ ہو۔ تم ان کی زبان نہیں سمجھتے یا آواز کو نہیں سنتے۔ تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہاتھی چنگھاڑ رہا ہے اور درحقیقت وہ اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے اپنی زبان میں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شیر دھاڑ رہا ہے، فی الحقیقت وہ اللہ کی تسبیح کر رہا ہے۔ پرندے سیٹیاں بجاتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ چہچہا رہے ہیں۔ حقیقت میں وہ ذکرِ الٰہی میں مصروف ہیں اپنی زبان میں۔ تو

ع ہر یکے را اصطلاحے دادہ ایم

ہر ایک کو اللہ نے ایک زبان دی ہے۔ وہ اپنی زبان میں اللہ کی حمد و ثناء اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے۔ ہم اس کی زبان کو نہیں سمجھتے، اور ہم ان کی زبان کو اگر نہیں سمجھتے تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہم اپنے ہی بھائی بندوں کی سب زبانیں کب سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی پشتونی آدمی پشتو میں اللہ کو پکارنے لگے، دعائیں مانگنے لگے، ہم کیا کریں گے، بیٹھے ہوئے دیکھتے رہیں گے۔ ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ٹھیٹھ پنجابی میں آپ بولیں تو میں کیا سمجھ لوں گا۔ کوئی انگریزی میں اللہ کو پکارے تو ہم کیا سمجھیں گے، تو ہزاروں زبانیں دنیا میں رائج ہیں انسانوں میں۔ ہم اپنے بھائی بندوں کی زبانیں نہیں جانتے۔ اگر پرندوں کی زبان بھی نہ جانیں تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟ ہر ایک کی ان کی ایک تسبیح ہے ——— اپنی زبان میں وہ اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ آپ نہیں سمجھتے نہ سمجھیں ۔ تو فرمایا گیا،۔

ولکن لا تفقھون تسبیحھم ۔ تم ان کی تسبیح کو نہیں پہچانتے باقی معجزے کے طور پر اگر اللہ کسی کو بتلا دے پرندوں کی بولیاں تو اس کی قدرت ہے جیسے سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ :۔

یا ایھا الناس علمنا منطق الطیر ۔ اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں بتلا دی گئی ہیں ۔

جب پرندے بولتے تو سلیمان علیہ السلام فرماتے کہ یہ فلاں بات کہہ رہا ہے ۔ وہ سمجھتے تھے ان کی بولیوں کو ۔ یہ آواز کبھی آسکتی ہے ہم لوگوں کے کان میں بھی معجزانہ طریق پر جیسے کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مٹھی بھر کے کنکریاں اٹھائیں تو کنکریوں میں سے زور زور سے آواز آرہی تھی سبحان اللہ سبحان اللہ ۔ تمام صحابہؓ سن رہے تھے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کنکریاں دے دیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ، تسبیح برابر جاری رہی ۔ انہوں نے وہ کنکریاں دیں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ۔ تسبیح برابر جاری رہی ۔ جب اور صحابہؓ کو منتقل کی گئیں تو تسبیح کی آواز سننا بند ہو گئی ۔ تسبیح جاری رہی ہو گی مگر سنائی نہیں دی ۔ اعجازی طور پر ہم سن بھی سکتے ہیں ۔ پرندوں کی بولیاں تو ان کانوں سے سنتے ہیں ، کنکریوں کی آواز بھی معجزانہ طریق سے سن سکتے ہیں ۔ جب اللہ کا کوئی معجزہ کسی پیغمبر کے ہاتھ ظاہر ہونا چاہے ۔

اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ ٹیلیگراف آفس میں جائیں اور جا کر کہیں کہ بھائی یہ تار دے دو ، کہ میں فلاں گاڑی سے پہنچ رہا ہوں ۔ اس نے پیتل کی ٹلی پر ہاتھ رکھ کر کھٹ کھٹ شروع کی ۔ تو آپ کہیں گے کہ احمق آدمی میں نے یہ کہا ہے ، کہ میرے آنے کی اطلاع دے دو ۔ تم نے کھٹ کھٹ شروع کر دی ، وہ کہے گا احمق تو تو ہے ۔ اسی کھٹ کھٹ میں یہ سارا علم پہنچ رہا ہے دوسرے ملک میں ۔ باقی تو اس کھٹ کھٹ کی آواز سے واقف نہیں ہے ۔ میں نے اس کی مشق کی ہے ،

اس کا فن حاصل کیا ہے۔ اس لئے مَیں جانتا ہوں کہ ایک دفعہ کھٹ ہوگی تو "الف" مراد ہو گا۔ دو دفعہ ہو گی تو "ب" مراد ہو گی۔ تین دفعہ ہو گی تو "ج" مراد ہو گا۔ تو کھٹا کھٹ سُن رہا ہے۔ اور حقیقت میں یہ علم ہے جو ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہو رہا ہے، تُو اس فن کو حاصل کرے گا۔ تو تجھے بھی معلوم ہو جائے گا۔ نہیں حاصل کرے گا، تو نہیں پتہ چلے گا۔

تو جس طرح ہم اس کھٹا کھٹ سے علم نہیں سُن سکتے، نہیں سمجھ سکتے اسی طرح جانوروں کی آوازوں کو ہم سنتے ہیں مگر تسبیح ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ ان کی زبان میں تسبیح ہے، ذکر ہے اپنی زبان میں، وہ کر رہے ہیں۔

ملائکہ علیہم السلام کو بھی مختلف تسبیحات دی گئی ہیں۔ وہ اپنی زبان میں تسبیح کرتے ہیں۔ ممکن ہے ان کی زبانیں بھی متعدد ہوں۔ اپنی اپنی زبان میں وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ بعض روایات میں ان کی تسبیحات بھی آئی ہیں۔ جیسے فرمایا گیا ہے کہ بعض ملائکہ کی تسبیح ہے کہ سبحان من زین الرجال باللحیٰ و زین النساءَ بالذوائب "پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو زینت دی ہے ڈاڑھیوں سے، اور عورتوں کو زینت دی ہے مینڈیوں اور چوٹیوں سے۔"

یہ ان کی زبان میں تسبیح ہے ان کی۔ وہ اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ تو مختلف تسبیحات ملائکہ بھی کرتے ہیں، جنات بھی کرتے ہیں۔ آسمان بھی تسبیح میں مصروف ہیں، زمین بھی تسبیح میں مصروف ہے۔ ستارے بھی تسبیح میں مصروف ہیں۔

الم تر ان اللہ یسجد لہٗ من فی السمٰوٰت ومن فی الارض والشمس والقمر والنجوم والجبال والشجر والدواب وکثیر من الناس

قرآن کریم نے خطاب فرمایا ہے کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ آسمانوں میں جو ہیں وہ بھی مصروف، پہاڑ بھی۔ اور یہ تو ہے تسبیح۔

ہر چیز نمازی بھی ہے

قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز نمازی بھی ہے اپنے اپنے انداز سے نماز بھی ادا کرتی ہے۔ فقط ذکر ہی میں مصروف نہیں ہے۔ دعوے کیا ہے قرآن کریم نے:۔

کلٌّ قد علم صلاتہٗ وتسبیحہٗ

ہر چیز نے اپنی نماز کو بھی پہچان لیا ہے اور اپنی تسبیح کو بھی جان لیا ہے۔ تو ہر ایک مخلوق نماز پڑھ رہی ہے۔ باقی اس کی نماز اسی انداز کی ہے جیسے اللہ نے اس کی ساخت بنائی ہے، جیسے اس کی ہیئت بنائی ہے اسی ڈھنگ کی اس کی نماز بھی ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ درختوں کی نماز میں قیام ہے۔ رکوع اور سجدہ نہیں ہے۔ وہ ایک پیر پر کھڑے ہوئے اللہ کے ذکر میں مصروف ہیں کہ جس قانون پر لگا دیا اس سے ایک انچ نہیں ہٹ سکتے۔ اطاعتِ خداوندی میں لگے ہوئے ہیں۔ چوپائیوں کی نماز میں رکوع ہے۔ ان کی ہیئت ہی ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ ہر وقت سر کو جھکائے ہوئے رکوع میں ہیں۔ حشرات الارض ہیں، سانپ، بچھو، کیڑے مکوڑے، ان کی نماز سجدہ سے ہے۔ قیام اور رکوع نہیں ہے۔ ان کی ہیئت اللہ نے ایسی بنائی ہے کہ وہ ہر وقت اوندھے پڑے ہوئے سجدہ میں ہیں۔ اسی طرح پہاڑوں کی نماز میں تشہد ہے۔ جیسے انسان زمین پر گھٹنے ٹیکے ہوئے بیٹھے ہیں، ان کی نماز تشہد کے ساتھ ادا ہو رہی ہے، تسبیح میں مصروف ہیں۔ جنت اور دوزخ کی نماز دعا مانگنا ہے۔ جنت بھی دعا کر رہا ہے کہ اے اللہ مجھے بھر دے اور وعدۂ خداوندی ہے کہ ہم بھر دیں گے۔ جہنم کی بھی یہی صدا ہے کہ مجھے بھر دیجئے، میری غذا مجھے پہنچایئے۔ قیامت کے دن دوزخ کو بھر دیا جائے گا۔ اہلِ جہنم جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ مگر دونوں کی آواز

بند نہیں ہوگی۔ جہنم کہے گا ھل من مزید اور لائیے ابھی تو میں خالی ہوں۔ جنت کہے گا میرے ہزاروں شہر خالی پڑے ہیں۔ آباد کاری فرمائیے، آپ کا وعدہ ہے کہ بھر دیں گے، تو جنت کے لئے حق تعالےٰ ایک مستقل مخلوق پیدا فرمائیں گے، جس سے آباد کاری ہوگی جنتوں کی۔ جہنم کے لئے مستقل مخلوق نہیں بنائیں گے۔ حدیث میں ہے کہ اپنا قدم رکھ دیں گے اس پر، جیسا قدم ان کی جناب کے لائق ہے، تو وہ کہے گا قَطْ قَطْ۔ بس بس۔ اب مجھ میں ہمت نہیں ہے میں بھر گیا۔ اس کی دعاء قبول ہو جائے گی۔ تو جنت اور جہنم کی نماز دعاء مانگنے سے ہے۔

ملائکہ علیہم السلام کی نماز ہے صف بندی، لاکھوں، کروڑوں ملائکہ صفیں باندھے ہوئے ہیں ہزار ہزار برس سے، کوئی جماعت رکوع میں ہے۔ کوئی جماعت سجدہ میں ہے۔ کوئی قیام میں ہے۔ صفیں بنی ہوئی ہیں۔ صف بندی ان کی نماز ہے۔ سیارے ہیں جو گھومتے ہیں، ان کی نماز حرکت دوراں ہے کہ جہاں سے چلے تھے پھر وہیں لوٹ آئیں۔ گھومنا ہی ان کی نماز ہے۔

"اسلام کی نماز کی عظمت اور جامعیت"

یہ حق تعالےٰ کا فضل اور احسان ہے کہ اسلام کی نماز میں ساری کائنات کی نمازیں اللہ نے جمع کر دی ہیں۔ درختوں کا سا قیام بھی ہے، چوپایوں جیسا رکوع بھی ہے حشرات الارض جیسا سجدہ بھی ہے۔ پہاڑوں کا سا تشہد بھی ہے۔ جنت و دوزخ کا سا سُوال و دُعاء بھی ہے اور سیارات کا سا دوران بھی ہے۔ اس واسطے کہ ایک رکعت پڑھنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ کم سے کم دو رکعت ہوں۔ دو ہوں، تین ہوں، چار ہوں، اگر نفل نماز ہے تو آٹھ ہوں، پڑھے جائیں۔ غرض تنہا نماز ایک رکعت پڑھنا اس کی ممانعت ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور ملاؤ تاکہ شفعہ بن جائے تو دو یا چار رکعت

کی نماز میں آپ کیا کرتے ہیں، جو کام پہلی رکعت میں کیا الحمد پڑھی، سورت پڑھی، تسبیح پڑھی ——— دوسری رکعت میں پھر وہیں سے شروع کر دیتے ہیں وہی الحمد، وہی سورت، وہی تسبیح، وہی تحمید۔ تو جہاں سے چلے تھے وہیں پھر آ گئے ایک دَور ہے تمہاری نماز میں۔ تو سیارات جیسی گردش بھی آپ کی نماز میں۔ تو جامع ترین نماز ہے کہ جتنی ہیئتیں ممکن ہیں عقلاً وہ سب دی گئی ہیں، تاکہ بندہ عبادت اور تذلل کے ساتھ پیش ہو، کھڑا ہو تو تذلل، بیٹھے تو اپنی ذلت کا اظہار، جھکے تب ذلت کا اظہار۔

عبادت کا صحیح مفہوم

غرض عبادت نام ہے اظہارِ تذلل کا۔ انتہائی درجہ کی ذلت اپنی پیش کی جائے۔ اس لئے کہ جس ذات کے سامنے آدمی کھڑا ہوتا ہے وہ انتہائی عزت کے مقام پہ ہے کہ اس کے بعد کوئی درجہ نہیں عزت کا۔ اس کے سامنے اتنی ذِلت پیش کی جائے کہ اس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ تو ذلیلِ محض بن کر آدمی اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہوگا۔ اس لئے کہ وہ عزت کے انتہائی مقام پر ہے اس کا فرض ہے کہ ذلت کے انتہائی مقام کو پیش کرے۔ کھڑے ہوتے ہیں آپ جامد و ساکت۔ یہ ایک درجہ ہے اظہارِ ذلت کا۔ رکوع کیا تو گردن جھکا دی، یہ دوسرا درجہ ہے اظہارِ ذلت کا۔ اس کے بعد ناک پیشانی زمین پر ٹیک دی۔ یہ آخری درجہ ہے اظہارِ ذلت کا۔ اس کے بعد ہاتھ اٹھائیے، دعائیں مانگیں، تو بھیک مانگنا، یہ سب سے زیادہ انتہائی درجہ ہے ذلت کا۔ تو جتنی ہیئتیں ہیں وہ سب اظہار تذلل کی ہیں۔ جتنے اذکار ہیں نماز میں یا عظمتِ خداوندی کا اظہار ہے یا اپنی نیازمندی کا اظہار ہے۔ انہی دو چیزوں پر مشتمل ہیں تمام اذکار، تو ذکر بھی،

افعال بھی، ہیئت بھی سب اظہارِ ذلت کے ہیں نماز میں۔

صرف نماز اپنی ذات میں عبادت ہے

اس لئے یوں کہنا چاہیے کہ حقیقی معنوں میں اگر عبادت ہے تو صرف نماز ہے۔ دوسری عبادات اور وجہ سے عبادت بنی ہیں، اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ نماز اپنی ذات سے عبادت ہے۔

"روزہ":- اس کا معنی یہ ہے کہ کھانے پینے سے آدمی مستغنی ہو جائے، تو کھانے سے، پینے سے، بیوی سے غنی ہونا، یہ اللہ کی صفت ہے۔ اس میں ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یہ مشابہت ہے حق تعالٰی کے ساتھ۔ کہ کھانے سے بھی بری، پینے سے بھی بری، بیوی سے بھی بری، تو یہ اظہارِ ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو اظہارِ عزت ہے۔ یہ عبادت تعمیل حکم کی وجہ سے ہے۔ حکم دیا تعمیل کرو تو بن گئی عبادت۔

"زکوٰۃ":- اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے۔ اس کے معنی عطا کرنے کے ہیں کہ فقیروں کو دو، عطا کرنا تو اللہ کی شان ہے۔ یہ تشبیہ ہے حق تعالٰی کے ساتھ۔ اس میں ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو عینِ عزت ہے۔ زکوٰۃ عبادت بنی اس لئے کہ حکم ہے کہ زکوٰۃ دو، تو تعمیلِ ارشاد نے اس میں پیدا کر دیئے معنی عبادت کے۔ اس طرح سچ بولنے کو عبادت کہتے ہیں اور وہ عبادت ہے لیکن سچ بولنا اپنی ذات سے عبادت نہیں یہ تو اللہ کی صفت ہے۔

ومن اصدق من اللہ قیلاً ۔ اللہ سے زیادہ کس کا قول سچا۔

ومن اصدق من اللہ حدیثاً ۔ اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔

تو سچ کہنا اور سچ بولنا حق تعالٰی کی شان ہے بندہ اگر سچ بولے گا تو مشابہت پیدا کرلے گا کمالاتِ خداوندی کے تھا۔ اس میں ذلت تھوڑا ہے یہ تو عینِ عزت

ہے۔ پھر بھی وہ عبادت ہے کہ حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔ اللہ کا کہنا ہے سچ بولو۔ تعمیل کے لئے گردن جھکا دی کہ سچ بولوں گا۔ سچ کو عبادت بنا دیا تعمیل حکم نے۔ اپنی ذات سے عبادت نہیں تھی۔ ورنہ اللہ کی صفت نہ ہوتی۔

صرف نماز پوری کائنات پر فرض ہے

لیکن نماز کی ہر ہیئت اظہارِ ذلت کے لئے ہے۔ ہر ذکر بھی اپنی ذلت کے اظہار پر مشتمل ہے اس واسطے نماز اپنی ذات سے عبادت ہے محض تعمیل حکم سے عبادت نہیں، اس کے اندر خاصیت ہی اظہارِ تذلل کی ہے یہی وجہ ہے کہ ساری کائنات پر فرض کی گئی ہے۔ زکوٰۃ، حج اور سچ بولنا فرض نہیں کیا گیا، فرمایا گیا کل قد علم صلوٰتہ وتسبیحہ ہر چیز نے اپنی نماز کو پہچان لیا۔ یہ نہیں فرمایا:۔ کل قد علم حجہ، کل قد علم زکوٰتہ۔ تو نماز کائنات کی ہر چیز پر فرض کی گئی ہے۔ انسان، جن، فرشتہ درخت، پہاڑ اور پتھر سب کے لئے عبادت اور نماز لازمی قرار دی گئی ہے تو اصل معنی کے لحاظ سے نماز ہی عبادت ہے۔ بقیہ عبادتیں تعمیلِ حکم کی وجہ سے عبادتیں بنی ہیں

ربط مع الحق بدوں نماز ممکن نہیں

یہی وجہ ہے کہ بندے کا حقیقی رابطہ اللہ سے بغیر نماز کے قائم نہیں ہو سکتا۔ آپ زکوٰۃ دیں گے تعلق مع الخلق درست ہو جائے گا۔ غریب کی خبر گیری ہو گی، وہ آپ کا ممنون ہو گا۔ تعلقات استوار ہو جائیں گے۔ اس تعمیل کی وجہ سے اللہ سے بھی تعلق پیدا ہو گا، مگر حقیقتاً وہ تعلق ہے مخلوق کے ساتھ۔ اس واسطے رابطہ بندے کا

اللہ سے بغیر نماز کے قائم نہیں ہو سکتا۔ اگر نماز میں قصور ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا رابطہ حق تعالےٰ سے قائم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر (نماز میں) دوسرا خیال لاتا ہے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں میرے ہوتے ہوئے غیر کی طرف توجہ کرتا ہے تجھے حیا نہیں آتی۔ اگر متنبہ ہو گیا بندہ، پھر تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ نہ ہوا تو پھر خود بے رُخ بن جاتے ہیں۔ توجہ ہٹا لیتے ہیں۔ اٹھک بیٹھک رہ جاتی ہے۔ تو نماز سے ہی فی الحقیقت رابطہ قائم ہوتا ہے۔

نماز سے دیدارِ خداوندی کی استعداد

اس لئے حدیث میں فرمایا گیا تمام نمازوں کے بارے میں اور خصوصیت سے صبح اور عصر کی نمازوں میں کہ ان دونوں سے استعداد پیدا ہوتی ہے دیدارِ خداوندی کی۔ نماز ہی سے اللہ کو دیکھنے کی صلاحیت بندہ میں آتی ہے۔ عمر بھر نماز پڑھتا رہے گا تو ابتداءً عقیدے کی آنکھ سے دیکھے گا، پھر کشف کی آنکھ سے دیکھے گا۔ اور پھر ایک وقت آئے گا کہ آخرت میں اس آنکھ سے بھی دیکھ سکے گا۔ تو مقصودِ اصلی عبادت سے معبود کو دیکھنا اور اس کا قرب حاصل کرنا ہے اور یہ صرف نماز سے ممکن ہے۔ تو حقیقی عبادت نماز ہی ہے۔

روحِ خداوندی ہر چیز میں موجود ہے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حق تعالےٰ نے قرآن کریم کو اپنی روح فرمایا۔ اس روح کے اندر یہ عبادات بھی شامل ہیں۔ تعمیلِ ارشاد ہی اس کی روح ہے فی الحقیقت، بندے میں اللہ نے قرآن کی روح ڈال دی تاکہ اس میں بندگی پیدا ہو اور اللہ کی معبودیت ظاہر ہو۔ وکذٰلک اوحینا الیک روحًا من امرنا۔

اے پیغمبر! عالم امر کی روح ہم نے آپؐ میں ڈال دی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جوتیوں کے صدقے سے وہ روح ہم تک پہنچ گئی، ہمارے اندر بھی وہ روح ہے ہم اس روح کو داخل رکھیں گے تو قوی رہیں گے۔ قوت کی علامت اس روح کی برقراری ہے اور ضعف کی علامت اس روح کا نکل جانا ہے۔

مسلم اقوام کی پریشانی کا علاج

دنیا میں مسلمان شکایت کرتے ہیں کہ فلاں قوم نے ہمیں تباہ کر دیا، فلاں قوم نے اپنی مکاریوں سے ہمیں پریشان کر دیا۔ ہماری جائدادیں ختم کر دیں۔ ہمارے جان و مال کو ختم کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ شکایت بالکل غلط ہے ——— شکایت تو کفار کو ہونی چاہیے کہ تمہاری ناہنجاری سے ہم بدعنوان بن گئے۔ اگر تم صحیح معنوں میں اپنے دین پر قائم رہتے ہم تمہاری ٹھوکروں کے نیچے رہتے، ہم تمہاری اتباع کرتے لیکن جب تم اپنے ہی پیر نہیں ہو تو ہم سے کیا توقع رکھتے ہو، کہ ہم تمہاری پیروی کریں یا پابندی کریں۔

تو حقیقت میں شکوہ ہے مسلمانوں کا، مسلمانوں کا حق نہیں ہے غیر اقوام سے شکوہ کرنے کا، مسلمان آیا تھا دنیا کی اقوام کو درست کرنے کے لئے۔ اس کو اقوامِ امام بنایا گیا، امام ہی کا وضو نہ ہو تو کیا مقتدیوں کی نماز ہو جائے گی؟ جب امام میں ہی حدث پیدا ہو گیا، ظاہر و باطن میں ناپاکی پیدا ہو گئی تو اقوام کیوں اس کی اقتدا کریں گی، اور کیوں کر اس کی پیروی کریں گی؟

اس لئے کہ وہ قوت اس نے ختم کر دی جو غالب اور قاہر تھی اقوام پر۔ وہ روح ہوا کی طرح بھری ہوئی تھی۔ جب تک وہ ہے مسلمان قوی ہے، وہ نکل گئی مسلمان ضعیف ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ گیند ہے اس میں ہوا بھری ہوئی ہے اگر آپ اسے

زمین پر پٹخ دیں تو گر دا ٹھا کے دس گز اوپر جاتی ہے اس لئے کہ ہوا بھری ہوئی ہے اس میں۔ اور اگر اس میں سوئی چبھو دی جائے تو ہوا نکل جائے گی، تو جہاں ڈالیں گے، وہیں پڑی رہ جائے گی۔ اس کو آپ پیروں سے پامال کر دیں، وہ اٹھنے کا نام نہیں لے گی، اس لئے کہ روح نکل گئی۔

روحِ اسلامی نکلنے سے مسلمانوں کا انجام

مسلمانوں کی روح قرآن پاک ہے۔ اقوام کی یہ مجال نہیں کہ اس کو دبائیں، دبائیں گے پٹخ دیں گے نیچے، تو یہ دس گز اوپر جائے گا، اور اوپر ہی جائے گا۔ الحق یعلو ولا یعلیٰ (حق غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا) لیکن یہ روح نہیں ہوگی، تو جہاں ڈالیں گے وہیں پڑا رہے گا۔ آج اگر مسلمان پامال ہو رہے ہیں، نہ اس لیے کہ کفار میں جان ہے۔ اس لئے کہ تم بے جان ہو گئے، جو روح تھی وہ نکال باہر کی، تو روح نکل جانے کے بعد آدمی لاشہ بن جاتا ہے۔ لاشہ کے لئے ہر انسان کا پہلا فرض ہوتا ہے۔ دبائے، جلائے یا اسے دفن کر دے (الغرض آنکھوں سے اوجھل کرنا سب کے نزدیک ضروری ہے، اس دنیا میں اب اس کا کوئی مقام نہیں) اس کو گھر نہیں چھوڑتے، باہر نہیں چھوڑتے۔ اس کے تعفن سے دنیا کی صحت خراب ہوگی۔ پہلا کام یہ کرتے ہیں اسے دفن کرتے ہیں، کوئی جلاتا ہے، کوئی پانی میں بہا دیتا ہے اور کوئی برا نہیں مناتا۔ لیکن اگر زندہ آدمی کو کوئی جلائے، تو گورنمنٹ ہی مدعی ہو جائے گی کہ اسے پھانسی دو۔ قوم بھی مدعی بنے گی کہ یہ بدکار ہے، مجرم ہے، روح کے ہوتے ہوئے کسی کی مجال نہیں ہے کہ دبائے، دبائے گا تو مجرم ثابت ہوگا۔ لیکن جب روح نکل جائے گی تو جس کا جی چاہے جلا دے، دفن کر دے، تو مسلمانوں کا یہ شکوہ کرنا کہ فلاں قوم نے ہمیں جلا دیا یا فلاں نے گرا دیا۔ میں کہتا ہوں غلط ہے۔ افسوس تم نے خود اپنے کو:

گرا دیا ہے، جب روح نکال دی تو زندگی ختم ہو گئی۔ زندہ آدمی کو کوئی نہیں جلا سکتا۔

عالم کی روح فی الحقیقت ذکر اللہ ہے

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ حقیقی معنٰی میں حق تعالٰے نے دینی روح (مسلمان میں) ڈال دی۔ اور وہ ہے قرآن مجید۔ وکذٰلک اوحینا الیک روحًا من امرنا۔ تو اس عالم کی روح فی الحقیقت ذکر اللہ ہے۔ جب یہ نکل جائے گی، تو عالم لاشہ کی مانند ہو جائے گا، اور لاشہ کا انجام پھولنا، پھٹنا، سڑنا، گلنا اور ریزہ ریزہ ہو جانا ہے۔ ایک ایک چیز کا ذرہ ذرہ پھٹ جائے گا قیامت کے دن۔ یہ عالم کی موت ہو گی اور یہ اس لئے واقع ہو گی کہ روح نکل جائیگی۔

روح کا حِسّی مرکز

اس رُوح کا سب سے بڑا حسی مرکز بیتُ اللہ شریف ہے، جس کے ذریعے چلتی ہے اسی میں تجلّیٔ خداوندی ہے، جس کے سامنے ہم جھکتے ہیں۔ یہیں سے بطفیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انوار و برکات چلتے ہیں۔ تو یہ مرکزِ روح ہے فی الحقیقت۔ قیامت کا جب قرب ہو گا اور روح اٹھنے والی ہو گی تو حدیث شریف میں ہے کہ بیتُ اللہ کو ایک حبشی غلام ریزہ ریزہ کر دے گا۔ ایک ایک پتھر اس کا جدا کر دے گا۔ تو سب سے پہلے بیتُ اللہ ختم ہو گا۔ پھر عالم پر قیامت طاری ہو جائے گی۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بادشاہ کا لشکر چلتا ہے تو سب سے پہلے شاہی خیمہ نصب کیا جاتا ہے تاکہ بادشاہ آکر ٹھہرے ان کے ارد گرد ان کے دربار کے

اُمراء کے خیمے لگتے ہیں، پھر فوجیوں کے خیمے لگتے ہیں، جب بادشاہ آتے ہیں تو بڑا شہر بن جاتا ہے لیکن جب کیمپ اجڑتا ہے تو سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھاڑا جاتا ہے لعد میں اور امراء کے خیمے اکھڑتے ہیں اور پھر میدان خالی ہو جاتا ہے یہی صُورت یہاں بھی ہے وہ خیمۂ خداوندی کہ تجلیاتِ الٰہیہ اس میں مقیم ہیں، سب سے پہلے اس کو عالم میں قائم کیا گیا۔ فرمایا گیا:- ان اول بيت وضع للناس للذی ببكة مبٰرکا وھدی للعٰلمین۔ سب سے پہلا گھر جو اللہ نے عبادت کے لیے قائم کیا وہ وہ ہے جو مکہ شہر میں ہے اس کا نام کعبہ مقدس ہے۔ یہ گویا خیمہ شاہی ہے جب عالم کو آباد کرنا ہوا تو سب سے پہلے خیمۂ شاہی نصب کیا گیا اور جب عالم کا خیمہ اکھڑے گا اور یہ دنیا ختم ہوگی، تو سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھاڑا جائے گا۔ جب بیت اللہ کی ایک حبشی غلام اینٹ سے اینٹ بجا دے گا اور تجلّیِ خداوندی اسے چھوڑ دے گی۔ اس کے بعد عام مساجد بھی ویران ہوں گی۔ تمام اہل اللہ کے ذکر خانے (خیمے) بھی ویران ہوں گے، اور ساری دنیا ویران ہو جائے گی۔ تو اولین چیز وہ شاہی خیمہ ہے جو سب سے پہلے نصب ہوتا ہے کیمپ میں اور اکھڑنے کے وقت سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھڑتا ہے،

تو اولین چیز جو قائم کی گئی وہ بیتُ اللہ ہے اور ابتداء میں قیامت کے قرب میں وہ سب سے پہلے اکھاڑا جائے گا۔ بہرحال وہ رُوح ذکر اللہ ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔ اسی کی بقاء سے عالم باقی ہے۔

"فلسفۂ موت" اور علماءِ ربانی کی شان

تو موت فی الحقیقت نام ہوا ذکر اللہ کے منقطع ہو جانے کا۔ یہ منقطع نہ ہو تو آدمی مرتا نہیں۔ اسی لیے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ۔ مثل الذاکر

فی الغافلین کمثل الحی فی الاموات - غافلوں کے اندر ایک بھی ذکر اللہ کرنے والا موجود ہے تو وہ مثل زندہ ہے، وہ غافلوں میں سے نہیں اس لئے مُردوں کے اندر وہ زندہ ہوتا ہے۔

تو علمار ربانی کی شان یہی بتائی گئی ہے کہ ان کا دل، روح اور دماغ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہتا ہے۔ یہ اثر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا، اور ان کا صدقہ ہے۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ فرمایا گیا ہے :۔ کان یذکر اللہ علی کل احیانہٖ - کوئی لمحہ آپؐ کا ذکر اللہ سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ زبان سے ذکر کریں۔ قلب سے ذکر کریں جس کو فکر کہتے ہیں۔ روح سے ذکر کریں جس کو توجہ کہتے ہیں اور معرفت کہتے ہیں - غرض کسی نہ کسی طریق پر ذکر میں مصروف رہتے ہیں۔ جب کوئی عالم ربانی اٹھتا ہے جس کے لئے کہا گیا ہے کہ موت العالِم موت العالَم۔ تو ایسے عالم کا اُٹھ جانا، پورے عالم کا اٹھ جانا ہے، کیونکہ وہ روح نکل جاتی ہے تو پورے عالم پر ایک پژمردگی چھا جاتی ہے — تو میں نے (ابتدا میں) عرض کیا تھا کہ مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے ان کے نام میں خیر ہے ان کے مسمّٰی میں اللہ نے خیریت ہی رکھی تھی۔ اور واقعۃً خیر ہی خیر تھے - حدیث کا پڑھنا پڑھانا، قرآن پاک کا پہنچانا، مواعظ سے تبلیغ و تلقین کرنا۔ اپنے پروردوں کی تربیت کرنا، غرض ذکر اللہ ہی ان کا مشغلہ تھا کسی بھی انداز سے ہو۔

ایسے عالم ربانی کا اٹھ جانا یقیناً پورے عالم کے لیے موت کا بھی اور علامات موت کا یقیناً اشارہ ہے۔ جب کوئی عالم ربانی اٹھتا ہے تو قلوب محسوس کرتے ہیں کہ ایک قسم کی ظلمت طاری ہو گئی ہے۔ پورے عالم میں، روحانیت میں کمی آگئی۔ ہر شخص محسوس نہیں کرتا، صاحبِ دل جانتا ہے کہ نورانیت میں کتنی کمی آتی ہے، اسی واسطے فرمایا گیا کہ — الموت الفزع الاکبر — موت سب سے زیادہ گھبرا دینے والی چیز ہے — مگر مجھے ساتھ یہ بھی عرض کرنا

ہے کہ موت جہاں گھبرا دینے والی چیز ہے، وہاں ایک تحفہ بھی ہے۔ ایک نعمت بھی ہے یہ نعمت بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ اگر موت نہ ہو عالم کی آباد کاری نہیں ہو سکتی۔

اللہ اور فرشتوں کے درمیان مکالمہ

ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کو ملائکہ علیہم السلام کے سامنے پیش کیا۔ اربوں، کھربوں انسان جو قیامت تک آنے والے ہیں۔ ملائکہ نے انہیں دیکھ کر عرض کیا۔ یا اللہ یہ زمین میں سمائیں گے کیسے؟ یہ تو تین ارب ہو جائیں گے تو اسی وقت کہیں گے کہ نسل بندی کراؤ، فیملی پلاننگ کرو۔ ایک طوفان برپا ہے۔ اگر وہ پچاس ارب ہو جائیں تو زمین کا کیا حشر ہوگا؟ تو ملائکہ کو یہ خلجان گزرا کہ زمین میں یہ کیسے سمائیں گے؟

حق تعالیٰ نے کہا کہ موت مسلط کر دوں گا۔ آئیں گے بھی جائیں گے بھی، زمین خالی ہوتی رہے گی۔ اگلے آتے رہیں گے، پچھلے جاتے رہیں گے۔ تو میں نے موت کا سلسلہ قائم کیا تاکہ جانے والے جائیں، اور آنے والے خالی جگہ آکر بستے جائیں۔

اس پر ملائکہ نے عرض کیا جب موت مسلط ہو گی تو ہر وقت موت کی فکر لاحق ہو گی، ان کی زندگی تلخ ہو جائے گی۔ نظامِ دنیا کیسے چلے گا؟ ہر وقت موت کی فکر میں غرق رہیں گے ——— فرمایا حق تعالیٰ نے کہ اُمیدیں مسلط کر دوں گا ان کے قلوب پر۔ اُمیدوں میں لگے رہیں گے۔ موت کا دھیان بھی نہیں ہوگا، نظامِ دنیا چلتا رہے گا۔

بہر حال موت جہاں "فزعِ اکبر" ہے گھبرا دینے والی چیز ہے — وہاں آباد کاری کا بھی ذریعہ ہے اگر موت نہ ہوتی تو اس زمین پر آباد کاری ممکن نہ ہوتی۔

تو مسافروں کی طرح آتے ہیں انسان اور چلے جاتے ہیں۔ جگہ خالی کر دیتے ہیں۔

موت دنیوی تحفہ بھی ہے

اور اگر دنیوی لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی موت ایک عجیب نعمت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ الموت تحفة المومن (موت سب سے بڑا تحفہ ہے مومن کے لئے) ۔ اس سے بڑھ کر اللہ کی طرف سے کوئی نعمت نہیں دی گئی ۔اور کیوں ہے وہ تحفہ ؟ اس کی وجہ بھی حدیث میں ہے :۔ الموت جسر یصل الحبیب الی الحبیب (موت ایک پل ہے جس سے گزر کر آدمی اپنے حبیب سے جا ملتا ہے)۔ تو محبوبِ حقیقی سے مل جانا، یہ کوئی گھبرانے کی چیز ہے؟ یہ کوئی مصیبت ہے ؟ یہ تو عینِ خوشی کی چیز ہوئی ۔ بندہ اپنے خدا سے جا ملے ۔ تو جس طرح کسی بچے کی پیدائش پر خوشیاں مناتے ہیں ۔ میں کہتا ہوں موت بھی خوشی کی چیز ہے ۔ (اس پر بھی خوشیاں منانے کا اہتمام ہوا کرے) مگر لوگ تو یوں کہیں گے کہ یہ تو بالکل الٹی بات ہے، عقل کے بالکل خلاف ، لوگ رونے لگتے ہیں خوشی کیسے منائیں گے ؟

میں کہتا ہوں وہ رنج' موت پر نہیں ۔ وہ فراق پر رنج ہوتا ہے ۔ موت کی خوشی ہوتی ہے کہ بندہ اپنے خدا سے جا ملا ۔ اسی لئے کہا کرتے ہیں کہ کسی کی اگر اچھی موت ہو کہ خدا ایسی موت تو سب کو نصیب کرے ۔ تو اگر موت خوشی کی چیز نہ ہوتی تو کیوں کہتے لوگ ؟

معلوم ہوا موت گھبرانے کی چیز نہیں ہے، جو روتے ہیں، وہ موت پر نہیں روتے ۔ جدائی پر روتے ہیں کہ ایک نعمت ہم سے چھن گئی ۔ ایک چیز ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ۔ تو صدمہ فراق پر ہے موت پر نہیں ۔ موت خوشی کی چیز ہے ۔

اس لئے کہ یہ مصیبت تو نہیں ہے کہ بندہ اپنے اللہ سے جا ملے۔ یہ تو عین خوشی کی چیز ہے کہ بندہ محبوبِ حقیقی تک پہنچ گیا۔

موت کی تمنا کرنا علامتِ ولایت ہے

اسی واسطے موت کی تمنا یہ فی الحقیقت ولایت کی علامت بتلائی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ یہود نے دعوٰے کیا تھا کہ ہم اولیاء اللہ ہیں، تو قرآن نے دعوٰے کیا کہ:۔

قل یا ایہا الذین ھادوا ان زعمتم انکم اولیاء للّٰہ
من دون النّاس فتمنوا الموت ان کنتم صٰدقین

تو خود موت کی تمنا بھی ایک نعمت ہے۔ اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے:۔ اللّٰھم حبب الموت الی من یعلم انی رسولک "اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے نبی ہونے کا قائل ہے"۔ اس لئے کہ موت ہی واسطہ ہے اللہ تک پہنچنے کا۔ موت نہ ہو تو بندہ اللہ تک کیسے پہنچے؟ تو موت ذریعہ ہے وصول الی اللہ کا۔ اس لئے موت تحفہ بھی ہے، نعمت بھی ہے اور واسطہ بھی ہے بندہ کا اللہ سے۔ اس لئے فرمایا کہ موت کی تمنا کرنا ولایت کی علامت ہے۔

اولیاء اللہ رات دن موت کی تمنا میں رہتے ہیں۔ ان کی زبان پر تو یہ رہتا ہے:۔

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بردیم — راحتِ جاں طلبم وزپئے جاناں بردیم
تذر کردم کہ اگر آید بسر زیں غم روزے — تا درمیکدہ شاداں و غزل خواں بردیم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے ہوئے دیار کو ہم چھوڑیں گے، اور

شہر مطلوب میں پہنچیں گے، جہاں اللہ سے ہمارا رابطہ قائم ہوگا۔ خدا کرے کہ وہ ساعت جلد آئے تو اولیاء اللہ کے دل میں تو (موت کی) تڑپ رہتی ہے۔

حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھوپالی نقشبندی خاندان میں سے ہیں اور ہمارے عزیزوں میں سے تھے، ان سے بہت فیضان اور (مخلوق کو) فائدہ ہوا۔ مرضِ وفات جب شروع ہوا، اور موت بالکل قریب آئی تو لوگوں نے جاکر تسلی دی کہ حضرت فکر نہ کریں، ان شاء اللہ صحت ہو جائے گی۔ غصہ آگیا مولانا کو، فرمایا :-

"عمر بھر اس وقت کی تمنا میں تھے اور تم اس کو ہٹانے آئے ہو، خدا خدا کر کے وقت آیا کہ موت قریب آئی اور تم موت سے تسلی دیتے ہو کہ اور زندہ رہوں۔ خبردار اس کے بعد یہ جملہ نہ کہیو، دُعاء کرو حسنِ خاتمہ ہو جائے۔ تسلیاں مت دو کہ میری عمر زیادہ ہو۔ عمر بھر میں اس وقت کی تمنا میں تھا۔ وقت آیا تو تم ہٹانے آگئے۔"

طالب علمانہ شبہ

یہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی طالب علم طالب علمانہ طریق سے شبہ کرے کہ ایک حدیث میں تو موت کی تمنا کرنے سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ :-

لا یتمنین احدکم الموت ○ دیکھو تم میں کوئی موت کی تمنا نہ کرے

یہاں تو فرمایا جا رہا ہے کہ موت کی تمنا نہ کرو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعاء دیتے ہیں کہ موت کی محبت ہر قلب مسلم میں ڈال دی جائے۔ تو بظاہر تعارض ہے :-

جواب : میں کہتا ہوں تعارض نہیں ہے جس حدیث میں فرمایا گیا کہ "دیکھو موت کی تمنا نہ کرو" اسی روایت میں یہ لفظ بھی ہیں۔ بعض

نہ ل بہ۔ موت کی تمنا مت کرو دنیا کی کسی مصیبت سے گھبرا کر۔ بیماری سخت ہو گئی کہ موت کیوں نہیں آجاتی؟ افلاس بڑھ گیا، تمنا کرو، اس کی ممانعت ہے کہ دنیا کے مصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا مت کرو، یہ بے اعتمادی ہے حق تعالٰی پر اور یہ بندگی کے خلاف ہے۔ باقی اللہ سے ملاقات کے شوق میں تمنا کرنا یہ ولایت کی علامت ہے۔ تو ہر ولی کامل دل میں شوق رکھے گا اللہ سے ملاقات کا، اور چاہے گا کہ جلد اللہ تک پہنچ جاؤں۔ بہر حال موت جہاں گھبرا دینے والی چیز ہے وہاں ایک عظیم تحفہ اور نعمت بھی ہے

موت۔ چھوٹوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے

میں کہتا ہوں کہ اس لحاظ سے بھی ایک بڑی نعمت ہے کہ اگر قیامت تک سارے بڑے بیٹھے رہا کرتے تو چھوٹوں کے جوہر کھلنے کی کوئی صورت نہ ہوتی۔ چھوٹوں کا نہ علم سامنے آتا نہ کمال مگر بڑوں کا کمال سامنے رہتا، سب اسی میں لگے رہتے اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک دنیا میں تشریف رکھتے تو صحابہؓ کے جوہر نہیں کھل سکتے تھے۔ وہ ہر وقت اطاعت اور اطاعت گزاری میں رہتے۔ مستقل ہو کر آگے آکر اپنی طبیعت اور قلب کے جوہر نہ دکھلاتے۔ نہ صدیق اکبرؓ کے جوہر کھلتے نہ فاروق اعظمؓ کے جوہر کھلتے۔ یہ جبھی ہوا جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، اور یہ قائم مقام بنے، قائم مقامی کا کام انجام دیا تو اس میں تمام جوہر کھلے۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس لحاظ سے بھی موت نعمت ہے کہ چھوٹوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے۔

اگر آج مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہیں ہیں۔ بے شک غم کی چیز ہے لیکن ان کے خلفِ صالح موجود ہیں۔ ان کی ذریتِ صالح موجود ہے، ان کے تلامذہ موجود ہیں جو اس کام کو جاری رکھیں گے اور ان کی طبیعت میں جو جوہر موجود ہیں وہ کھلیں گے۔

اگر مولانا ہی رہتے تو یہ چیزیں کبھی نہ کھلتیں۔ تو یہ بھی ایک فائدہ کی چیز ہے۔ اگلوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے۔ اگلے دنیا کو آباد کریں گے، وہی کلمہ پہنچائیں گے۔

موت اصلاح و تربیت کے تعدد و تفنن کا ذریعہ ہے

موت نہ ہو تو نئی نسل کے دین سمجھنے میں دشواری پیش آتی، کیونکہ ہر زمانے کی نفسیات الگ الگ ہوتی ہیں۔ ہر سو برس بعد نفسیات بدل جاتی ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں وعدہ کیا گیا:۔ ان اللہ یبعث لھٰذہ الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا۔ "ہر قرن پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے کہ جاہلانہ طریق پر جو لوگ تاویلیں کر کے دین میں غلط پیدا کر دیں گے۔ اللہ سو برس کے بعد پھر مجدد پیدا کر دیں گے۔ وہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دے گا، پھر دین کو نکھار دے گا۔ اس لیے کہ سو برس میں ایک نسل ختم ہو کر دوسری نسل کا آغاز ہو جاتا ہے اور ہر آئندہ آنے والی نسل کے نظریات الگ ہوتے ہیں، افکار الگ ہوتے ہیں، نفسیات الگ ہوتی ہیں۔ اس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ اسی دور کے اہلِ علم اپنی نفسیات میں ان کو دین سمجھانے والے ہوں۔ پرانے لوگ اگر ہوتے تو اپنی نفسیات میں سمجھاتے تو وہ لوگ دین کو نہ سمجھ سکتے۔ اس لئے اللہ نے موت کو رکھا تا کہ نئے لوگ جب آئیں تو نئے مجدد بھی پیدا ہوں۔ اسی زمانے کی اصطلاح میں، اسی زبان میں، اسی ڈھنگ سے دین کو پیش کریں اور سمجھائیں، تو موت اس لحاظ سے بھی بڑی نعمت ثابت ہوتی ہے کہ وہ ذریعہ ہے تربیت اور اصلاح کے تفنن اور تعدد کا، تا کہ مختلف الوان سے تربیتِ خداوندی میں داخل ہوں۔

ہر دور کے تقاضوں کے مطابق علمائے وقت نے اسلام پیش کیا

ایک زمانہ تھا کہ روایت کا غلبہ تھا۔ عوام میں سے کوئی اس وقت تک دین کی بات نہیں مانتا تھا جب تک کہ سند پڑھ کر کوئی حدیث نہ سنادی جائے۔ تو یہ روایت کا دور تھا۔ روایتی طور پہ دین کو قائم کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد عقل پسندی کا دور آیا۔ یہ معتزلہ کا دور تھا۔ کوئی شخص دینی مسئلہ نہیں جانتا تھا جب تک کہ عقل کے پیرائے میں نہ سمجھائیں۔ تو ایسے علماء اللہ نے کھڑے کئے۔ امام رازیؒ، امام غزالی کہ انہیں کی زبان میں دین سمجھایا، ان کو تائب کیا۔ پھر ایک زمانہ تصوف پسندی کا آیا، جب تک صوفیانہ رنگ میں کوئی نہ سمجھائے، لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ تو اللہ نے ایسے صوفیائے کرام کھڑے کئے کہ ہر مسئلہ کو صوفیانہ رنگ میں ڈھالتے کہ لوگ ماننے پر مجبور ہو گئے۔

آج حسیات کا دور ہے۔ فلسفۂ قدیم کا دور ختم ہو گیا جو محض نظریاتی طور پر فلسفہ تھا۔ اب حسیات کا دور ہے، مشاہدات کا دور ہے، جب تک ایسے علماء نہ ہوں کہ مشاہدات کے انداز میں سائنس کے انداز میں حسی مثالوں سے دین کو نہ سمجھائیں گے، لوگ نہیں سمجھیں گے۔ اگر بڑے ہی لوگ بیٹھے رہتے تو آج کی اصطلاحات سے ناواقف ہوتے تو دین نہ سمجھا سکتے۔ اللہ نے انہیں اٹھا لیا، ان کے خلفِ صالح پیدا کر دیئے کہ وہ اس دور کے مطابق اسی رنگ میں سمجھائیں، تو بہر حال موت جیسے فزع اکبر ہے، جیسے عظیم ترین مصیبت ہے، ویسے ہی عظیم ترین نعمت بھی ہے، عظیم ترین انعام خداوندی بھی ہے۔ موت کے بارے میں صرف ایک پہلو ہی سامنے نہ رہنا چاہیئے۔ ہائے افسوس، ہائے افسوس کا، بلکہ خوشی کا بھی ایک پہلو ہے کہ یہ تحفۂ مومن بھی ہے۔ یہ طریقہ ہے، راستہ ہے اللہ تعالیٰ کو ملنے کا۔ یہ طریقہ ہے دنیا کی آبادکاری کا۔ یہ طریقہ ہے نئے نئے علوم پیدا ہونے کا، اور نئے نئے مربیوں کے پیدا ہونے کا۔ اس لئے موت کا ایک پہلو نہیں

کہ اس سے ڈریں بلکہ موت میں پہلو خوشی کا بھی ہے کہ اس کا انتظار بھی کرنا ہے، اس کی تمنا بھی دل میں رکھے، تو اس لئے میں نے عرض کیا کہ لوگ موت کو ہر وقت وحشتناک سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ وحشت کی چیز نہیں ہے اگر تعلق مع اللہ مضبوط ہے تو اس سے بڑھ کر نعمت کوئی چیز نہیں اگر غفلت ہے تو بے شک موت عظیم ترین مصیبت بھی ہے۔ اسی واسطے وہ کفار کے حق میں مصیبت ہے، مومن کے حق میں مصیبت نہیں۔

کافر کی تمنّا

اور فرمایا گیا کہ کافر تمنا کرتا ہے کہ زندگی بڑھتی ہی رہے ۔ ولتجدنهم احرص الناس علٰی حیٰوة ۔ ومن الذین اشرکوا ۔ یود احدهم لو یعمر الف سنة ۔

تم ان کفار کو دیکھو گے کہ سب سے زیادہ حریص ہیں دنیا کی زندگی پر۔ موت کے نام سے بھی موت آتی ہے انہیں، اور مشرکین کو اگر ہم ہزار برس کی عمر بھی دے دیں تو اسی کی تمنا کریں گے کہ ایک ہزار برس اور ہو، یہ حال اور خاصہ کفار کا ہے۔ اور مومن کا یہ ہے کہ لمبی عمر ہو جائے تو اکتا جاتا ہے کہ اللہ جلدی بلا لیجئے کہ آپ سے مل لوں۔

تو بالکل برعکس ہے قصہ، تو موت سے فقط ڈرتے رہنا، گھبراتے رہنا غفلت کی علامت ہے، اور یہ غفلت (عن الحق) کفر کا سرا ہے اللہ بچائے ہر ایک کو۔ اور حق تعالےٰ سے موت کی تمنا کرنا یہ بیداری اور تعلق مع اللہ کی علامت ہے۔ اس لئے موت کا ایک ہی پہلو نہیں کہ آدمی رنج کرتا رہے بلکہ رنج کرنے سے روکا بھی ہے۔ طبعی رنج جتنا ہو اس کا مضائقہ نہیں لیکن اس رنج کو پالنا، تازہ کرتے رہنا، اس کو شریعت نے پسند نہیں کیا اور فرمایا ہے۔

لیس منا من ضرب الخدود و شق الجیوب

"وہ ہم میں سے نہیں ہے جو موت کے غم میں بال نوچ ڈالے، رخسارے پیٹ ڈالے، چھاتی پیٹ ڈالے"۔ اس لئے کہ موت آتی ہے بیدار کرنے کے لیے نہ کہ غافل بنانے کے لئے، کہ آدمی اسی میں الجھ کر رہ جائے۔ موت آئی۔ انا للہ پڑھا۔ اس کے بعد مرنے والے کے عمل کو جاری کیا۔ اپنے عمل کو جاری کیا۔ اپنی تیاری شروع کر دی، تو موت بیداری پیدا کرنے والی چیز ہے نہ کہ غافل بنانے والی۔ بیداری جس سے پیدا ہو وہ تو نعمت ہے، مصیبت تھوڑا ہی ہے۔ مصیبت بنی ہے اس کے لئے جس پر غفلت طاری ہو۔

غفلت عن الحق کے بُرے آثار

غافل عن الحق کو موت کے نام سے بھی موت آتی ہے، جو اللہ سے غافل ہو موت کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرے گا، ہر وقت اسی موڑ میں رہے گا۔ پھر اس میں سرکشی تمرد اور بغاوت پیدا ہوگی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ فرعون کی عمر چار سو برس کی ہوئی، اس عمر میں کبھی بھی بیمار نہیں ہوا، کبھی بھی کوئی مصیبت نہیں دیکھی، تو کبر اور نخوت میں اپنے آپے سے باہر ہو گیا، اور کہا:- اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی - یعنی مَیں سب سے بڑا رب ہوں، اور موسیٰ علیہ السلام کی تحقیر و تذلیل کے درپے ہوا، اور کہا:-

الیس لی ملک مصر وھٰذہ الانھٰر تجری من تحتی افلا تبصرون ام انا خیر من ھٰذا الذی ھو مھین- ولا یکاد یبین (زخرف پ ۲۵)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرے پاؤں کے نیچے نہریں جاری ہیں، مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں ہے۔ کرسیاں میری مضبوط ہیں اور میرے مخالفین کو تم

عزت دار سمجھتے ہو جس کے کپڑے بھی ٹھیک نہیں، یعنی موسیٰ علیہ السلام، تو توہین کے درپے ہوا۔

یہ کیوں ہوا توہین کے درپے۔ اس لیے کہ غفلت تھی اللہ سے، تو غفلت والے کو موت کے نام سے موت آتی ہے۔ اور (فرعون کی) جب واقعی موت آنے لگی اور لگا ڈوبنے تو بآواز بلند کہا۔ میں ایمان لایا موسیٰ علیہ السلام پر اور ان کے پروردگار پر، جس کو فرمایا گیا:۔

آلْـٰٔنَ وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین (یونس پ ۱۱)

اب ایمان لایا جب کہ عالم غیب منکشف ہو گیا۔ اور اب تک دنیا میں فساد برپا کرتا رہا۔

بعض روایات میں ہے کہ جبریل علیہ السلام اس کے منہ میں ریت ٹھوس رہے تھے کہ ایسا نہ ہو یہ ایسے کلمات کہے، کہیں نجات ہی نہ ہو جائے۔ بدبخت بخشا نہ جائے۔ ساری عمر تو مخلوقِ خدا کو پریشان کیا اور اب نجات پا جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ علیہم السلام پر غلبہ حال کا ہوتا ہے غلبہ محبت کا یا غلبہ عداوت کا۔ بہر حال جب غفلت طاری رہتی ہے، اللہ سے بری رہتا ہے۔ جب بری رہے گا، موت کو ناپسند کرے گا، اور اگر غفلت کی بجائے بیداری اور قلب میں ذکر اللہ ہے تو اللہ سے قریب ہو گا اور موت کی تمنا بھی کرے گا۔ اور وہ ذریعہ بنے گا قربِ خداوندی کا۔ تو موت کا جہاں پہلو غم کا ہے وہاں خوشی کا بھی ہے۔ جہاں دل بیٹھنے کا ذریعہ ہے وہاں دل کے ابھرنے کا بھی ذریعہ ہے اس واسطے دونوں پہلوؤں کی موت کے اندر رعایت رکھنی چاہیے۔ کوئی میت ہو گئی تو یہ نہیں کہ آدمی غم میں ڈوب کر آپے سے باہر نکل جائے۔ عقل سے بھی کام لے، جو اس کے لیے نفع بخش ثابت ہو۔

میت پر جزع فزع

اگر غم میں بیٹھ کر آدمی نے بین کرنا شروع کیا تو میت کو کیا فائدہ پہنچا، بلکہ میت کو تکلیف پہنچتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ:-

ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ علیہ - جب بین کر کے لوگ روتے ہیں تو میت کو تکلیف پہنچتی ہے اور ایذا پہنچتی ہے یوں کر کے رویا جائے کہ واجبلاہ ہائے تو تو پہاڑ تھا، تو ملائکہ چوکہ لگاتے ہیں کہ کیا واقعی آپ پہاڑ تھے؟ وہ کہتے ہیں واشمساہ کہ تو تو سورج تھا، ملائکہ چبھوتے ہیں کہ کیا واقعی آپ سورج تھے؟ اس سے اذیت پہنچتی ہے میت کو۔ تو رونا، بکار، نوحہ، جزع، فزع یہ میت کے لئے تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔

اسی واسطے حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ میت ہونے پر پہلا کام تو یہ ہے کہ صبر کرو اور انا للّٰہ پڑھو۔ دوسرا کام یہ ہے کہ اس کو نفع پہنچانے کی کوشش کرو، تو وہ رونے سے نہیں پہنچتا، ثواب پہنچانے سے پہنچتا ہے۔ جس کے لئے ایصال ثواب ہوگا۔ اس کے لیے باعثِ خیر و برکت ہوگا۔ تو میت کے لیے ہمیں نافع ہونا چاہیئے اور میت کا کام آئے تو اس کے لئے فائدہ کا سامان پہنچانا چاہیئے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ:-

اذکروا محاسن موتاکم اپنے مرنے والوں کی خوبیاں یاد کرو اور لوگوں کے سامنے بیان کرو، مرنے والوں کی برائیاں مت ذکر کرو۔ اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ اگر اللہ نے بخش دیا ہے تم اگر برائیاں کرتے ہو اس سے کیا ہوتا ہے؟ تمہاری زبان گندی ہوگی، وہ تو مغفور ہو گیا۔ جتنا ممکن ہو خوبیوں اور اچھائیوں کا ذکر کرو۔ تاکہ لوگوں کو اچھا کام کرنے کی رغبت پیدا ہو۔ بہر حال میت ہونے کے بعد دوسرا کام یہی ہے کہ طبعی رنج ہوتا ہے۔ اس سے اللہ نے نہیں روکا۔ لیکن عقلاً روک دیا

ہے کہ غم کو پالنے کے لئے مت بڑھاؤ۔

میت پر ضرورت سے زیادہ غم کرنا رسمی ہوتا ہے، حقیقی نہیں۔ وہ رسمی غم ہوتا ہے جس کا زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا، کہ جب کوئی بڑا آدمی مرجاتا تو وصیت کرکے جاتا تھا کہ مجھے چھ مہینے رویا جائے، مجھے برس تک رویا جائے تو باندھیاں کرلیے پر رکھتے کہ انہیں رونے کی مشق ہوتی ہے، جہاں گردن جھکائی اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے شروع ہوگئے۔ تو کرایہ پر جہاں رونے والی رکھی جاتی ہوں، جہاں انہوں نے دیکھا کہ کوئی تعزیت کے لیے آیا، یا کوئی نیا آدمی آیا وہاں انہوں نے گھیرا بنایا او ہا ہا شروع کی کہ واجبلاہ - واشماہ واقمراہ - ہائے تو تو پہاڑ جیسا تھا وغیرہ، بیٹھی رو رہی ہیں۔ تو راہگیر کہتے تھے کہ کوئی بڑا آدمی مرگیا ہے جو چھ مہینے گزر گئے اور اب تک رویا جا رہا ہے، تو یہ علامت تھی بڑے ہونے کی۔

ظاہر بات ہے کہ یہ رونا کوئی حقیقی رونا تھوڑا ہی تھا۔ یہ تو رسمی اور بناوٹی رونا تھا۔ اسلام نے تصنع اور بناوٹ نہیں سکھلائی۔ حقیقت بتلائی ہے، کہ محض تصنع اور بناوٹ سے کوئی کام کرنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ طبعی غم ہو اس کا مضائقہ نہیں لیکن عقلی طور پر غم کو پالنا اور بڑھاتے رہنا زمانۂ جاہلیت کی رسم تھی۔ اسلام نے یہ رسم نہیں رکھی۔ اس نے تو یہ سیدھی بات بتلا دی کہ جب کوئی انتقال کرے تو صبر جس سے آئے وہ پڑھو ___ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

آیتِ استرجاع میں عقلاً وطبعاً صبر کی تعلیم ہے

اس آیت میں صبر اور تسلی کا پورا سامان موجود ہے۔ جب آدمی نے یوں کہا اِنَّا لِلّٰہِ ہم سب اللہ کی مِلک ہیں۔ اس سے عقلی طور پر صبر آگیا کہ جب ہم

اللہ کی ملک ہیں تو اپنی مملوک میں وہ جو چاہے تصرف کرے۔ چاہے اٹھائے، چاہے دنیا میں زندہ رکھے۔ ہم کون ہیں اس میں دخل دینے والے؟ اس سے صبر آجائے گا عقلی طور پر کہ ہم مملوک ہیں اور مالک کو اختیار ہے، اپنی مملوک میں جو چاہے کرے۔ مگر طبعًا ابھی تک گھٹن موجود تھی، طبعی رنج بھی ہوا تھا، تو دوسرے جملے میں اس کا علاج بتلایا فرمایا:۔ وانا الیہ راجعون۔ کہ جب ہم بھی وہیں جائیں گے۔ ملاقات ہو جائے گی۔ ہمیشہ کے لیے تھوڑا ہی جدائی ہوتی ہے، تو انا للہ کے لفظ سے عقلاً اور انا الیہ راجعون سے طبعًا بھی صبر آجاتا ہے۔ دعا اس لیے بتلائی گئی تاکہ صبر وتحمل کے ساتھ اپنے عمل میں لگیں، فکر آخرت میں لگیں، غم میں نہ گھلیں بیٹھ کر.....
.... (فارسی میں عرفی کا ایک شعر جس کا ترجمہ یہ ہے)

اگر رونے سے مرنے والا واپس آجایا کرتا تو ہم ہزار برس رو لیا کرتے، مگر وہ واپس آنے والا نہیں ہے۔ جو گیا سو گیا۔ اب اس جہان میں دوبارہ آنے والا نہیں ہے اب ملاقات ہو گی تو اس جہان میں ہو گی۔ یہ جہان بھی ختم ہو جائے گا۔

مومن اور کافر کی موت کا موازنہ

مومن کو تو ہر وقت آس لگی ہوتی ہے کہ اپنے عزیزوں سے ملوں گا، دوستوں سے ملوں گا اور فلاں فلاں سے ملاقات ہو گی۔ کافر جس نے ساری زندگی اسی دنیا کو سمجھا ہے مایوس وہ ہے مسلمان نہیں۔ اس لیے کہ اسے کوئی تمنا نہیں ہے تو بہر حال اسی حکم (انا للہ وانا الیہ راجعون) سے صبر آجاتا ہے۔

تو میں نے عرض کیا تھا کہ اس وقت نہ کوئی جلسہ تھا نہ کوئی وعظ کہنا مقصود تھا، نہ کوئی تقریب مقصود تھی، تعزیت مقصود تھی، اور تعزیت ہنگاموں کو نہیں چاہتی، یہ ہمارے مولانا (محمد شریف صاحب مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان) نے بیٹھے بٹھلائے

خواہ مخواہ آپ لوگوں کو تکلیف دی۔ میں تعزیت کے لئے حاضر ہوا تھا تو تعزیت کر کے واپس ہو جاتا۔ لیکن خیر بہر حال جب آپ حضرات تشریف لے آئے اور آپ کا کرم ہوا اور ہماری سعادت ہوئی کہ اتنے بھائیوں کی زیارت نصیب ہو گئی، اتنے بھائیوں سے ملنا ہو گیا۔ تو مجمع کی ہیئت ایسی بن گئی کہ آپ سامنے بیٹھ گئے، مجھے اس کرسی پر بٹھلا دیا، اور سامنے لاؤڈ اسپیکر رکھ دیا، تو خواہ مخواہ بولنا ہی پڑتا ہے۔ یہ ہیئت مقتضی ہوئی، کہ کچھ نہ کچھ کہا جائے۔ اس لئے میں نے وہی چند کلمے کہے جو آنے کے مقصد سے متعلق تھے اور وہ مقصد تھا تعزیت۔ تو تعزیت ہی کے سلسلے میں کچھ موت کا ذکر، کچھ موت کے پہلوؤں کا ذکر، کچھ مولانا (خیر محمد صاحب) مرحوم کی خیر و خوبی کا ذکر، کچھ ان کے پس ماندگان کا ذکر، اور ان کے خلفاء کا ذکر، یہی چیزیں تعزیت میں آسکتی تھیں اس لئے چند جملے عرض کئے گئے۔ حق تعالیٰ شانہٗ صبر کی توفیق دے اور مولانا مرحوم کا نعم البدل ہمیں زیادہ سے زیادہ عطا فرماوے، اور ان کا جو کام تھا حق تعالیٰ اس کو جاری و ساری رکھے۔

اللّٰھم ربنا تقبل منا انک
انت السمیع العلیم

ضروری نوٹ :۔

ہمارے ہاں یہ بات ہمارے قومی مزاج میں داخل ہو چکی ہے کہ ہر نو وارد سے مصافحہ کو ضروری خیال کرتے ہیں اور اس میں دوسرے کی راحت کا خیال پیش نظر نہیں رکھا جاتا، حالانکہ نظم و ضبط مسلمان کا امتیازی نشان تھا۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی تقریر فرما چکے تو ایک اژدہام اسٹیج کی طرف اُمڈ آیا، اور مصافحہ کی کوشش میں ادب و احترام اور ایذاء مسلم کا بھی بالکل پاس نہ رہا، بلکہ ایک دھینگا مشتی کا عالم تھا جو نہایت قابلِ افسوس تھا۔ اور خصوصاً ایسے مجمع میں جہاں علماء کرام اور مدارسِ عربیہ کے

طلبائے کرام کی کثیر تعداد تھی۔ لیکن بایں ہمہ وہ سب کچھ ہوا جس کی توقع کم از کم دینی تعلیم یافتہ اصحاب سے نہ تھی۔ حضرت قاری صاحب مدظلہ العالی نے مجمع کی اس پراگندہ حالت کو دیکھ کر نظم و ضبط کی تعلیم فرمائی۔ اس کے باوجود حضرت قاری صاحب مدظلہ العالی کو اسٹیج سے اپنی رہائش تک رسائی میں انتہائی دقت اور دشواری پیش آئی۔ جلسہ کے منتظمین مجمع عام ہونے کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ معذور تھے۔ یہ چند کلمات بھی جو کہ ہمارے قومی مزاج کی اصلاح کے لئے آپ نے ارشاد فرمائے تھے۔ ذیل میں رقم کئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ سب کو عمل کی توفیق بخشے۔ —— (از مرتب غفرلہٗ)

—— بحیثیت مسلمان ہونے کے آداب شرعیہ اختیار کریں۔ آپ کے اندر نظم و ضبط ہونا چاہیئے۔ مصافحہ باعث برکت چیز ہے اور بہت خیر کی چیز ہے۔ اس پر اجر کے وعدے کئے گئے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ دو مسلمان جب مصافحہ کرتے ہیں، اور دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ آجائے تو ہاتھ جدا نہیں کرپاتے کہ دونوں کے گناہوں کی مغفرت کردی جاتی ہے۔ تو مصافحہ بڑی باعثِ برکت چیز ہے مگر ہر اطاعت کے اندر یہ شرط ہے کہ دوسرے کو اذیت نہ پہنچے، تکلیف کا سامان نہ ہو، ایذار رسانی حرام ہے اور مصافحہ کرنا فرض نہیں۔ ایک مستحب کے لئے ایک مکروہ چیز کا ارتکاب کرے یہ غلط بات ہے۔ لوگ جو مصافحہ کے لئے دوڑتے ہیں، یہ طریقہ آدابِ اسلامیہ کا نہیں ہے۔ اسے بالکل ترک کر دیا جائے اور پھر اس طریق سے ہاتھا دھاپی، جس سے مصافحہ کرتے ہیں وہ بھی عاجز آجاتے ہیں —— یہاں ہم پاکستان میں عاجز ہوتے، تو قاعدے سے تو ہم پولیس کی حراست میں تھے اور ان کی نگرانی میں تھے اور اب قوم کی حراست میں ہوگئے کہ جب تک حلقہ نہ بنے بھگدڑ نہیں کی جاسکتی۔ یہ کیا واہیات بات ہے؟ یہ مصافحہ ہے؟ یہ تو ایذا پہنچانا ہے۔ اس لئے کوئی صاحب مصافحہ کی تکلیف نہ کریں۔ جب میں اٹھوں تو راستہ دے دیں۔ یہ مصافحہ خیر و برکت نہیں ہوگا جس میں اذیت پہنچے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے۔ المسلم من سلم المسلمون من لسانہٖ

ویدہٖ ۔ مسلمان وہ ہے جس کی زبان سے، جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ ہو۔ تو یہ ہاتھ سے تکلیف پہنچانا ہے۔

آپ حج کو جاتے ہیں۔ حجرِ اسود کا بوسہ یا تو مستحب ہے یا واجبات میں سے ہے، مگر جب دوسرے کو تکلیف پہنچے تو شریعت نے اجازت دی ہے کہ اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر اس کو چوم لے، یہ مصافحہ ہو گیا۔ ہاتھ بھی نہ اٹھا سکو تو لکڑی سے اشارہ کرو یہ کافی ہو گیا۔ وہاں تو مصافحہ واجب تھا، اس کے لئے بدل رکھا اور یہاں تو واجب بھی نہیں ہے۔ اس واسطے خواہ مخواہ دوسروں کو اذیت پہنچانا، آپا دھاپی اختیار کرنا، اجر تو اجر، اس پر تو وبال ہو گا ——— اس لئے کوئی صاحب مصافحہ کا ارادہ نہ کریں۔ اور میں ویسے بھی کمزور ہوں، ضعیف اور بیمار ہوں، خود کو تحمل نہیں کہ ایک ہزار آدمیوں سے مصافحہ کروں۔ ہر ایک تو ایک دفعہ کرے گا، مجھے ایک ہزار مرتبہ ہاتھ اٹھانے پڑیں گے۔ مجھ میں یہ طاقت نہیں ہے ——— لہذا بیٹھیں رہیں اور جب اٹھوں تو راستہ دے دیجئے۔

اسلام میں تصورِ آخرت

آخرت کے بارے میں عام طور پر لوگوں نے یہ تصور باندھ رکھا ہے کہ آخرت تو آسمانوں کے اوپر ہے، اور دنیا یہ ہے۔ یہ غلط ہے بلکہ ہماری آخرت اسی دنیا میں چھپی ہوئی ہے۔ اسے نکالنا ہمارا کام ہے۔ یہی کھانے، پینے کے اور سونے جاگنے کے افعال، انہی میں آخرت چھپی ہوئی ہے۔ ان کے ذریعے سے اپنی آخرت نکالو۔ یہ نہیں کہ آخرت کوئی الگ عالم ہے اور دنیا ترک کرو، تب جا کے آخرت میں پہنچو گے ....

از :۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

ترتیب

مضمون | صفحہ نمبر

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ۔ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا۔ من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ۔ و من یضللہ فلا ھادی لہ۔ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ۔ ونشھد ان سیدنا وسندنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسولہ۔ ارسلہ اللّٰہ الی کافۃ للناس بشیرًا ونذیرًا۔ وداعیا الیہ باذنہ وسراجًا منیرًا۔

امّا بعد

بزرگانِ محترم!

دنیا اور آخرت دو چیزیں ہیں — آخرت کے بارے میں عام طور پر لوگوں نے یہ تصور باندھ رکھا ہے کہ آخرت تو آسمانوں کے اوپر ہے، اور دنیا یہ ہے، یہ غلط ہے —— بلکہ ہماری آخرت اسی دنیا میں چھپی ہوئی ہے — اُسے نکالنا ہمارا کام ہے یہی کھانے پینے کے اور سونے جاگنے کے افعال، انہی میں آخرت چھپی ہوئی ہے — ان کے ذریعے اپنی آخرت نکالو۔ یہ نہیں کہ آخرت کوئی الگ عالم ہے، اور دنیا ترک کر دو تب جا کے آخرت میں پہنچو گے۔ دنیا میں رہ کر اس میں سے آخرت نکال لینا، یہ دانشمند کا کام

ہے۔ یہ جو آپ نماز روزہ کرتے ہیں بدن ہی سے تو انجام دیتے ہیں، وہ بدن زمانے میں ہے یا مکان میں ہے، تو اس میں سارے دنیوی ہی افعال ہیں۔ اس سے جنت بن رہی ہے۔ جنت اس نماز سے ہی تو نکلی جو آپ نے بدن سے سر انجام دی۔ آخرت کوئی الگ تو نہیں تھی ــــــــ

یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا، اور ہزاروں نیکیاں لکھی گئیں۔ وہ ہزاروں نیکیاں جنت ہی تو ہیں۔ تو اس دنیا ہی میں آخرت چھپی ہوئی ہے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے ــــــــ افعال صحیح ہو کے آئیں، جنت یہیں سے بن جائے گی۔ افعال غلط ہو کے آئیں، تو جہنم یہیں سے بن جائے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا اگر آدمی کھانا کھانے بیٹھے ــ کھانا ایک طبعی فعل ہے۔ بھوک لگے گی تو آدمی خواہ مخواہ کھائے گا، لیکن اس نیت سے کھانے بیٹھے کہ قوت پیدا ہوگی تو عبادت کروں گا۔ اور "بسم اللہ" سے شروع کرے اور "الحمد للہ کثیرا" پر کھانا ختم کرے۔ فرماتے ہیں کہ اس کے پچھلے گناہ سب بخش دیئے جائیں گے ــ حالانکہ کھائی تو روٹی اور گناہ بخش دیئے گئے، گناہوں کا بخشا جانا یہی تو آخرت ہے اس لئے آخرت دنیا ہی میں ہوئی۔

حدیث میں ہے کہ دو بھائیوں نے مصافحہ کیا اور قلبی محبت سے کیا۔ دونوں کے منہ پر مسکراہٹ آگئی اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ فرماتے ہیں کہ ہاتھ جدا نہیں کرنے پائیں گے کہ پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ ایک طبعی فعل انجام دیا مگر اس سے مغفرت ہوگئی بہرحال اس دنیا ہی سے ہماری آخرت نکلتی ہے۔

آخرت کے بارے میں اسلام اور دیگر مذاہب کا فرق

یہیں سے دوسرے مذاہب اور اسلام میں فرق پڑجاتا ہے۔ دوسرے مذاہب یہ

سمجھتے ہیں کہ آخرت دنیا سے بالکل الگ تھلگ کوئی چیز ہے۔ جب تک ترکِ دنیا نہیں کروگے آخرت نہیں ملے گی۔ مثلاً ہندو مذہب ہے، اس میں سنیاس لیتے ہیں کہ گھر بھی ترک کیا بیوی بچے بھی ترک کیے، اور جاکر کسی کونے میں بیٹھ گئے، ساری لذتیں ترک کیں۔ اب سمجھتے ہیں کہ ہماری آخرت بن گئی۔

عیسائیوں کے ہاں ترکِ لذات ایک مستقل موضوع ہے، کہ گرجا میں آدمی داخل ہو جائے اور یہ عہد کرلے کہ میں نکاح نہیں کروں گا۔ کسی سے ملنے بھی نہیں جاؤں گا۔ بالکل ترکِ دنیا کرکے ایک کونے میں بیٹھ جائے۔ اب سمجھتے ہیں کہ آخرت ملی

اسلام نے ان سب چیزوں کو رد کردیا کہ یہ رہبانیت ہے۔ اسلام نے گوشے میں بیٹھ جانا پہاڑوں میں بیٹھ جانا، سمندر کے کناروں پر اپنے آپ کو گرادینا، اس سے روکا کہ اس سے آخرت نہیں بنتی۔ دنیا میں رہ کر، لوگوں میں رہ کر، ان کی اڑی کڑی جھیل کر اصلاح کی کوشش کرے، اس سے آخرت بنے گی، اسی کھانے اور پینے سے آخرت بنے گی۔ یہ نہیں کہ تم کھانا پینا چھوڑ دو ـــــــــــــــ

قرآن حکیم نے حکم دیا کہ کلوا من الطیبٰت واعملوا صالحا۔ اللہ نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے بنائی ہیں، انہیں استعمال کرو، اور عملِ صالح اختیار کرو جتنی نیت سچی ہوگی اسی میں سے آخرت بنے گی۔ یہ نہیں کہ کھانا پینا چھوڑ دو اور جنگل میں جا بیٹھو، تب آخرت بنے گی۔

اسی طرح لباس ہے۔ تو بعض مذاہب میں ترکِ لباس ہے، صرف لنگوٹا باندھو فرض لباس بھی ترک کیا ـــــــــــ اسلام نے ناجائز قرار دیا کہ یہ رہبانیت ہے ـــــ گرسنگی ہے۔ یہ اسلام میں نہیں ہے۔ لباس پہنو، موٹا پہنو، اچھا پہنو، نیت اچھی رکھو۔ اسی سے آخرت نکلے گی۔ تو کھانا پینا، رہنا سہنا، مکان بنانا، اس سے اسلام نے نہیں روکا۔ مگر نیت صاف رکھنے کو کہا ہے۔ تھوڑی بہت زینت اور طبیعت کے مذاق کرنے سے نہیں روکا۔ مگر نیت صاف رکھنے کو کہا ہے۔ اس سے یہی چیزیں

آخرت بنیں گی۔ تو اور مذاہب میں تو یہ ہے کہ ترکِ دنیا سے آخرت بنتی ہے۔ اسلام میں یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر نیت صحیح کرنے سے آخرت بنتی ہے۔ انہی افعال میں سے آخرت بنے گی۔

اب مکان ہے۔ گیاہ میں ہم نے دیکھا کہ ان لوگوں کے ہاں خدا رسیدہ وہ ہے جس کا نہ گھر ہو نہ در ہو۔ صبح کے وقت ان کے ہاں ایک لشکر نکلتا ہے۔ وہ گھر گھر کھانا مانگتے ہیں۔ ان کے ہاں کھانا وانا نہیں پکتا، کسی نے بھیک دے دی، کھالیا۔ اسلام نے اِسے ممنوع قرار دیا کہ یہ ذلتِ نفس ہے۔ مومن کا یہ کام نہیں کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے۔ بلکہ باوقار رہے — تو کھلائے بھی، پیئے بھی، پہنے بھی، طبعیات کو استعمال کرے اور نیت یہ رکھے کہ اپنی آخرت کے لیے کر رہا ہوں۔ حکم خداوندی ہے تعمیلِ حکم کر رہا ہوں۔ وہی چیز اجر کا ذریعہ بنے گی۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ تُم بھک منگے بن جاؤ۔ دنیا کے اوپر بار بنو۔ بلکہ کماؤ۔ اور کسبِ حلال کو فرض قرار دیا۔ تجارت کرو۔ زراعت کرو۔ دنیا کماؤ، اس سے اپنی خدمت کرو، اپنے بھائیوں کی بھی خدمت کرو۔ یہ راستہ دکھلایا نہ یہ کہ سب چیزیں چھوڑ کر پہاڑ کے گوشے میں جاکر بیٹھ جاؤ ——

یا بعض مذاہب میں یہ ہے کہ اعضاء کو مفلوج کر دو تو آخرت بن جاتی ہے۔ مثلاً ہاتھ اونچا کر دیا، وہ خشک ہو گیا، اب وہ بیکار ہو گیا، اور وہ یہ سمجھے کہ اب آخرت بنی، اسلام نے کہا یہ لغویت ہے، اس سے آخرت کا کیا تعلق —— ؟

یا بولنا چھوڑ دیا اس سے سمجھتے ہیں کہ آخرت بنی۔ اسلام نے کہا کہ یہ آخرت کیسی کہ ایک قوت کو ضائع ہی کر دیا۔ قوت سے کام لینے کا نام آخرت ہے نہ کہ قوت کو معطل چھوڑ دینے کا نام آخرت ہے۔

میرا ایک دفعہ گیاہ میں جانا ہوا، تو وہاں ایک بہت بڑا اور اونچا مندر ہے۔ اس میں بدھ کی تصویریں ہیں۔ اس کے بُت رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں ہم نے دیکھا

کہ بُدھ کا ایک بہت بڑا بُت ہے اور لوگ اس کے ارد گرد گھی کے چراغ جلا رہے ہیں۔ بہت سے پجاری چراغ جلا کر جا رہے ہیں۔ میں نے ایک پجاری سے پوچھا۔ اس گھی کو تم کیوں ضائع کر رہے ہو۔ کوئی آدمی کھاوے گا تو اس کے بدن میں قوت پیدا ہو گی اسے کیوں خواہ مخواہ ضائع کر رہے ہو .... اب وہ سنتا تو ہے مگر بولتا نہیں۔ میں سمجھا کہ شاید یہ بہرہ ہو گا۔ میں نے ذرا زور سے کہا۔ وہ پھر بھی دیکھ رہا ہے جواب کوئی نہیں دیتا۔ میں نے اور زور سے کہا، تو لوگوں نے مجھ سے کہا کیوں اپنا زور صرف کر رہے ہو۔ یہ جواب نہیں دے گا۔ ان کے ہاں چُپ رہنا ایک عبادت ہے۔ یہ شخص چالیس برس سے نہیں بولا، اور یہ پچاس برس سے نہیں بولا۔ تو زبان ایک قوت ہے اس کو ضائع کر دینے کا نام عبادت نہیں ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ اس قوت سے ہی تو آخرت کماؤ گے۔ قوت ضائع کر دی، تو آدمی ناقص رہ گیا تو آخرت بھی ناقص ——

زبان کو استعمال کرو تلاوتِ کلامِ پاک میں، درود شریف پڑھنے میں، اور عبادت میں، لوگوں کی اصلاح میں، نیک مشورے دینے میں، اور سچی باتیں کہنے میں۔ اس میں قوت کو استعمال کرو۔ تو آخرت بنے گی۔ نہ یہ کہ قوت کو ختم کر دو، اور بیکار بیٹھ جاؤ۔ اس سے تو بدی بنے گی ——

ہاتھ ہے آپ اس کے ساتھ مصافحہ کریں گے، اجر ملے گا۔ آخرت بنے گی۔ قرآن کریم کو ہاتھ لگائیں گے، اجر ملے گا۔ بیت اللہ شریف کو چھوئیں گے، اجر ملے گا ہاتھ ہو گا جبھی تو اجر ملے گا۔ اور اگر ہاتھ کو اٹھا کر خشک کر دیا، قوت بھی ختم اور اجر بھی ختم ہو گیا۔ تو جتنے اجر و ثواب کے راستے تھے وہ سارے بند ہو گئے۔

اسی طرح پیر کو مفلوج کر دیا۔ پیر ہو گا تو ہی مسجد کی طرف جائیں گے۔ دوستوں کے گھر بھی جائیں گے، عبادت گاہوں میں بھی جائیں گے۔ مجالسِ وعظ میں بھی جائیں گے۔ اس سے اجر و ثواب کے ڈھیر ملیں گے، اور جب پیر کو کلہاڑا مار کے ختم کر دیا تو نہ مجلس رہی۔ نہ مسجد کی طرف جانا رہا، نہ حج رہا۔ وہ کیا خاک اجر ملا ——؟

تو تمام مذاہب نے تو یہ کہا ہے کہ دنیا ترک کرو۔ تب آخرت ملے گی۔ بدن کو کھو دو تو آخرت ملے گی۔ اسلام کہتا ہے کہ دنیا میں رہ کر آخرت پیدا کرو۔ ترکِ دنیا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا کی نعمتوں کو چھوڑ دو —— ہاں اس میں مبالغہ مت کرو۔ غلو مت کرو۔ حد سے مت گزرو۔ اعتدال کے ساتھ استعمال کرو۔ اس سے اپنا بھی کام چلاؤ۔ اپنے بھائیوں اور عزیزوں کی بھی خدمت کرو۔ تمہاری آخرت بنے گی۔ تو یہ نیت پر اور افعال اختیاری پر ہے کہ مرضئ خداوندی کے مطابق وہ افعال ہوں گے تو دنیا ہی میں آخرت بنے گی ——

افعالِ دنیویہ کے بارے میں اسلام کا نظریہ

اب دنیا کے بڑے افعال سونا، جاگنا، کھانا، پینا، رہنا، سہنا اور مکان بنانا۔ ان سب کو حق تعالٰی نے نعمت شمار کیا ہے فرمایا:۔ قُل من حرم زینة الله التی اخرج لعبادہٖ والطیبٰت من الرزق۔ اے پیغمبر! کون ہے جو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اپنے اوپر حرام کرے اس نے جو پاکیزہ غذائیں اور لباس دیئے ہیں۔ کون ہے جو انہیں حرام کرے؟ ممانعت فرمادی کہ انہیں حرام مت قرار دو۔ —— البتہ حدود بتلا دیں کہ ریشم کا کپڑا ہے۔ مرد کے لئے ناجائز، عورت کے لئے جائز۔ زیورات میں سونا، چاندی عورت کے لئے جائز۔ مرد کے لئے ناجائز۔ تو حدود بتلا دیں۔ ان حدود میں رہ کے استعمال کئے جاؤ ——

مکان ہے اس کے بارے میں اللہ نے احسان جتلایا اور فرمایا کہ والله جعل لکم من بیوتکم سکنا — اللہ نے تمہارے گھروں میں تمہارے لیے سکون اور سکونت رکھی ہے۔ گھر بناؤ، استعمال کرو۔ اور پھر آگے کپڑوں کا بھی گھر ہوتا ہے یعنی کپڑے کا خیمہ۔ اور چمڑوں کا گھر بھی ہوتا ہے۔ یعنی چمڑے کا خیمہ ——

پتھر اور اینٹ کا گھر ہوتا ہے۔ ساری قسمیں گنوا کے احسان جتلایا۔ احسان اسی پر جتلاتے ہیں جو نعمت ہوتی ہے۔ مصیبتوں پر تو احسان نہیں جتلایا جاتا۔ مکانوں کو اللہ نے نعمت قرار دیا۔ تو کون ہے جو اللہ کی نعمتوں کو رد کرے؟ حدود میں رہ کر انہیں استعمال کرو۔ مبالغہ اور غلو نہ کرو۔ ایک عالم شریعت میں جو راحت کے سامان ہیں۔ انہیں آدمی اپنے لیے مہیا کرے۔ تو کھانا ہو، لباس ہو .... بلکہ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ ان اللہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہٖ —— اللہ اپنے جس بندے کو نعمت دے، تو اسے یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا اثر بھی اس بندے پر دیکھے —— تو ڈھنگ کا کھانا ہو، ڈھنگ کا پہننا ہو، ڈھنگ کا رہنا سہنا ہو یہ نہیں کہ پھٹے حال میں آدمی رہ رہا ہے۔ کوڑے کباڑ میں کھڑا ہوا ہے۔ نہ صفائی نہ ستھرائی۔ مکان بنانے کا حکم دیا۔ صفائی ستھرائی کا حکم دیا۔

حدیث میں فرمایا گیا:۔

اپنے گھروں کے صحن چوک بھی صاف رکھو۔ دالان کو صاف رکھو۔ سڑک تک کو صاف رکھو —— لباس کی صفائی کا حکم دیا۔ صفائی اور ستھرائی اسلام کا ایک مستقل موضوع ہے —— یہ چیزیں چھڑائی نہیں گئیں۔ حدود بتلا دی گئیں کہاں سے آگے نہ گزرو —— تو ہماری آخرت اسی دنیا ہی سے نکلتی ہے۔ اسی بدن ہی میں سے تو آخرت پیدا ہو گی۔

اعمالِ ایمانی کی خوشبو

حدیث میں ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے تو ملائکہ علیہم السلام روح کھینچنے کے لیے آتے ہیں تو ہاتھ پیروں کو سونگھتے ہیں کہ اس میں ایمان کی خوشبو نکلتی ہے۔ اعضا کو سونگھتے ہیں۔ کیونکہ ایمانی افعال سرانجام دینے سے بدن میں خوشبو قائم ہو جاتی ہے۔

یہاں ہمیں محسوس نہیں ہوتی۔ آخرت میں محسوس ہو جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ :۔

خلوف فم الصائم اطیب عند اللّٰہ من ریح المسک۔

روزے میں جب آدمی نہیں کھاتا تو منہ میں ایک قسم کی بُو پیدا ہو جاتی ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک یہ منہ کی بُو مشک سے بھی زیادہ خوشبودار ہے۔ یہاں تو یہ بدبُو ہے، وہاں یہ خوشبو۔ وہ خوشبو درحقیقت روزے کی ہے اور روزے میں خوشبو ایمان سے ہے۔ ورنہ ایمان نہ ہو تو روزہ فاقہ ہے۔ وہ ایمان ہی کی خوشبو ہے ملائکہ علیہم السلام بدن میں سے اسی خوشبو کو سونگھتے ہیں کہ کتنی خوشبو آرہی ہے ـــــ بعض مرتبہ ایسا ہوگا کہ آدمی کے ساتھ اعمال نہیں ہیں اور ملائکہ علیہم السلام نے بھی سمجھ لیا کہ یہ جہنم کے لائق ہے، اور وہ ملائکہ آگئے جو کفار کی روح قبض کرتے ہیں۔ ان کی شکلیں ہیبت ناک ہوں گی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو اس کے بدن میں داخل کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پنڈلی سے ایک عمل چپکا ہوا تھا۔ اس نے کسی موقع پر سُبحان اللّٰہ کہا ہے۔ نیکی ہاتھ لگ جاتی ہے تو ملائکۂ رحمت کہتے ہیں کہ تم ہٹو۔ ہم اس کی روح قبض کرتے ہیں۔ تو وہ اعمال اسی بدن ہی میں سے سرزد ہوئے۔ پنڈلی میں سے عمل نکلے گا، جگر میں سے نکلے گا۔ ایسا ہوتا ہے کہ بعض دفعہ آدمی دل کی قوت سے عمل کرتا ہے تو دل پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ کھڑے ہو کے کوئی عمل کرے تو گُردوں کی طاقت سے آدمی کھڑا ہوتا ہے، اس عمل کا اثر گُردوں پر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی بڑی بے جگری سے لڑتا ہے۔ خوب اس نے جہاد کیا۔ اس عمل کا تعلق جگر سے ہوگا۔ تو ہر عضو سے خاص اعمال متعلق ہیں۔ اور ملائکہ وہ پہچانتے ہیں۔ تو انہیں اعضاء میں اعمال کو تلاش کریں گے اور وہ کہیں گے کہ اس کا عمل پنڈلی میں چھپا ہوا تھا۔ لہذا یہ صاحبِ نیکی ہے۔ ملائکۂ عذاب اس کی روح قبض نہیں کر سکتے۔ ہم اس کی روح قبض کریں گے ـــــ تو اسی عمل اور بدن ہی سے آخرت بنی۔

دربارِ خداوندی کی پہلی پیشی

اور یہ بھی ہے کہ مرنے کے بعد مومن آدمی کی رُوح آسمانوں پر چڑھ جاتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام پہلے آسمان پر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ اور ستر ہزار ملائکہ علیہم السلام کے ہجوم کے ساتھ استقبال ہوتا ہے۔ ملائکہ صف باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ قطار کے بیچ میں سے اعزاز و اکرام کے ساتھ گزرتی ہے۔ پھر آسمانِ دوم کے مقربین اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ پھر آسمانِ سوم کے مقربین اس کا استقبال کرتے ہیں .... یہاں تک کہ عرش پر پہنچ جاتی ہے۔ اور وہاں رُوح سجدہ کرتی ہے۔ حق تعالےٰ ابتدائی خطاب ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ فرماتے ہیں،

کیوں آیا؟ کیسے آیا؟ کیا لے کے آیا ——؟

ایک عالِم ہیں ان کی وفات ہوئی۔ تو بعض عارفین پر ان کا حال منکشف ہوا۔ حق تعالےٰ کے سامنے ان کی پیشی ہوئی تو ڈانٹ کر فرمایا، کیوں آیا؟ کیا لے کر آیا؟۔ انہوں نے کہا میں ڈیڑھ سو قرآن شریف ختم کر کے لایا ہوں — فرمایا ایک بھی قبول نہیں۔ کہا اتنے روزے رکھے۔ فرمایا یہ بھی قبول نہیں — کہا اتنے تہجد پڑھے۔ فرمایا یہ بھی قبول نہیں۔ اب یہ حیران کہ کیا چیز پیش کروں۔ اور ادھر سے مطالبہ کہ کیوں آیا — ؟ کیا لیکر آیا ؟— اخیر میں انہوں نے کہا کہ میں آپ کی رحمت کا سہارا لے کر آیا ہوں اور کچھ نہیں —!۔ فرمایا — اب بات ٹھکانے کی کہی۔ میری رحمت تیرے اوپر واجب ہو گئی — کسی وقت یہ نیت کی ہو گی وہ جا کر کام آ گئی۔

وسعتِ مغفرتِ خداوندی

تو آدمی اپنے قلب کے رُخ کو صحیح رکھے۔ عملی کوتاہیاں ہر ایک سے ہوتی

ہیں ہر ایک میں کچھ نہ کچھ گناہ، بڑا ہو یا چھوٹا، ضرور ہوتا ہے۔ سوائے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے، وہ تو معصوم ہیں۔ نبی کے بعد کوئی ایسا نہیں جس سے کوئی زلت یا خطا نہ ہوتی ہو۔ اسی کو ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ان تغفر اللّٰھم تغفر جمّا = وای عبد لك لا المّا

یا اللہ جب آپ کو بخشنا ہی ہے تو سارے گناہ کیوں نہیں آپ بخش دیتے۔ کون بندہ ہے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو۔ آپ کے سامنے سارے گنہگار ہی ہیں۔

اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی۔ فرمایا:۔

رب مغفرتك اوسع من ذنوبی ورحمتك ارجٰی عندی من عملی ـــــ اے میرے پروردگار تیری مغفرت میرے گناہوں سے بہت وسیع ہے۔ کہاں تک گناہ کروں۔ ہزار برس بھی کروں گا تو محدود ہوں گے۔ اور تیری رحمت کی کوئی حد ہی نہیں۔ میرے گناہوں کی تیری رحمت کے سامنے کیا قدر و قیمت ہے۔ نیز میرے عمل محدود ہیں۔ بلکہ کوئی چیز نہیں مگر تیری رحمت اِن سے بہت وسیع ہے ـــــ

توبہ کا راستہ نہ ترک کیا جائے

بہر حال کوئی بندہ بشر ایسا نہیں جس سے کوئی غلطی اور خطا نہ ہوئی ہو۔ انبیاء علیہم السلام اس سے بری ہیں۔ اسی واسطے فضل ہی پر مدار ہے۔ جب توجہ فرمادیں گے، جبھی مغفرت ہو گی۔ نیت اپنی یہ ہونی چاہیئے کہ آدمی حق تعالےٰ پر بھروسہ کرے جب خطا ہو، توبہ کرے۔ گناہ سرزد ہوا فوراً توبہ کرلے تاکہ کھاتہ صاف ہوتا رہے۔ تو اصل چیز نیت ہے کہ آدمی کا رُخ صحیح ہونا چاہیئے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے جو حدیث قدسی ہے کہ:۔

اے بندے اگر تو میرے پاس اتنے گناہ لے کر آئے کہ زمین اور آسمان تیرے گناہوں میں چھپ جائیں تو میں اتنی اتنی (گناہوں سے کہیں بڑھ کر) مغفرت لے کر تجھ سے ملاقات کروں گا۔ بشرطیکہ میری عظمت تیرے دل کے اندر ہو۔ تو اصل چیز عظمتِ خداوندی ہے۔ آدمی وہ قائم رکھے جو وفادار ہوتا ہے وہ غلطی بھی کرتا ہے تو آقا کہتا ہے کہ اس کو معاف کیا جاسکتا ہے ____ اس لئے اگر گناہ سرزد ہو، فوراً توبہ کرے۔ تاخیر ہرگز نہ کرے۔ کیونکہ اگر گناہ کیا اور وہ دل پہ جم گیا۔ پھر گناہ کرتا رہا۔ پھر توبہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ گناہ کے بعد معافی مانگ لے۔ اس سے قلب زنگ آلود نہیں ہوتا اور معصیت ڈھل جاتی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ ایک آدمی نے بہت بڑا گناہ کیا۔ اور ندامت ہوئی تو کہا۔ "یا ربِّ"! .... ابھی یہ نہیں کہا کہ میری مغفرت کر دیجئے، فقط "یا رب" کہا۔ فوراً حق تعالٰی فرماتے ہیں:۔ العلم ان لہ ربًا یواخذہ؛ ____ اچھا یہ جان گیا کہ اس کا بھی کوئی رب ہے جو اس کی پکڑ کرے گا۔ فرمایا اگر یہ جان گیا تو قبل اس کے کہ مغفرت مانگے۔ اس سے پہلے ہی مغفرت کر دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کی مغفرت ہو گئی ____ آکر پھر وہی گناہ کیا جو پہلے کیا تھا۔ لیکن پھر ندامت ہوئی۔ پھر جا کے "یا رب" کہا۔ پھر مغفرت ہو گئی۔ پھر وہی گناہ کیا .... حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے لوگو ____! تم گناہ کرتے کرتے تھک جاؤ گے ____ اللہ بخشتے بخشتے نہیں تھکیں گے۔ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ اس لئے آدمی سے جب غلطی ہو، فوراً توبہ کرے، بس معاملہ صاف ہو گیا۔

اور یہ ایسا ہی ہے جیسے راستے پر لگا ہوا آدمی ٹھوکر لگی، گر پڑا۔ اُٹھا، کپڑے جھاڑ کر پھر چلنا شروع کر دیا۔ پھر گر پڑا۔ پھر چلنا شروع کر دیا بالآخر منزل تک پہنچ جائے گا۔ اور جس نے گرتے ہی راستہ ہی بدل لیا۔ وہ نہیں پہنچے

گا۔ تو راستہ نہ چھوڑا جائے۔ جس وقت گناہ سرزد ہو، توبہ کرے۔ ایک ایک دن منزل پالے گا۔

اسی لیے ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ :۔

سددوا وقاربوا وروحوا واغدوا وشیءٍ من الدنیا

راستے پر لگے رہو۔ اعتدال کے ساتھ چلتے رہو، منزل کھوٹی مت کرو کہ منزل چھوڑ کے کسی سبزہ زار کے اوپر بیٹھ گئے۔ کسی باغ میں بیٹھ گئے بلکہ راستہ پر چلتے رہو۔ ایک نہ ایک دن پہنچ جاؤ گے۔

توبہ کی قُوّت

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب آدم علیہ السلام اور شیطان کی دشمنی ٹھن گئی تو شیطان آدم علیہ السلام کا حاسد اور فریبی دشمن تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو تاجِ خلافت پہنا دیا گیا۔ جنتوں کے وعدے دیئے گئے۔ تو شیطان کو فکر ہوئی، اُس نے کہا۔ یا اللہ ! آدم بہر حال میرا دشمن ہو گیا، مَیں اس کا دشمن۔ اس کے پاس عقل بھی ہے اور اسبابِ ہدایت بھی ہیں۔ یہ تو میرا ناطقہ بند کر دے گا۔ کچھ قُوت مجھے بھی دے دیجئے گا کہ میں اس پر غالب رہوں۔

حق تعالٰے نے فرمایا۔ "ہم نے تجھے اکثریت کی قوت دی"—— آدمؑ کا اگر ایک بیٹا ہو گا، تو تیرے دس (۱۰) بیٹے ہوں گے۔ اس کے سو (۱۰۰) ہوں گے، تیرے ایک ہزار ہوں گے۔ تُو ہمیشہ اکثریت میں رہے گا۔ یہ ایک ارب ہوں گے تُو دس ارب ہو گا۔

مگر وہ بھی بڑا ہوشیار ہے۔ اُس نے دیکھا کہ بعض دفعہ تو اقلیت بھی اکثریت پر غالب آجاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اکثریت ہی کا غلبہ ہو۔

اُس نے عرض کیا ۔

یا اللہ ! بے شک میں اکثریت میں ہو گیا ۔ لیکن اگر طاقت ور اقلیت ہو ، وہ تو اکثریت پر غالب آجاتی ہے ۔ اِس لئے مجھے اور طاقت دیجئے ۔

فرمایا ، ۔ تجھے یہ طاقت دیتے ہیں کہ تو آدم کے بدن میں اس طرح سرایت کر سکے گا جیسے خون رگوں میں دوڑتا ہے ۔

کہنے لگا ـــــ " اب مَیں اُسے پچھاڑ سکوں گا " ـــــ اِس لئے اُس کے اندر گھُس کے قلب میں وسوسے ڈالوں گا ، دماغ کو خراب کروں گا ۔ اور جو چاہے اندر جا کے کروں گا ۔ اب مجھے طاقت مِل گئی ۔ اور وہ مطمئن ہو گیا ۔

اب حضرت آدم علیہ السّلام کو فکر پڑی کہ اس کمبخت کی یہ طاقت کہ میرے اندر گھس جائے ، میرے اندر تو یہ طاقت نہیں کہ اس کے اندر گھُس سکوں تو یہ غالب رہے گا اور سب کو جہنمی بنا دے گا ۔ مجھے بھی تو کوئی قوت دیجئے ۔ (مَیں بھی اِس کا مقابلہ کر سکوں ؟) ـــــــــــــــ

حق تعالٰے نے فرمایا کہ :۔

" آدم کو بھی ہم ایک طاقت دیتے ہیں کہ شیطان کی ہزار برس کی کارروائیاں ایک دم میں سب ملیامیٹ ہو جائیں گی ۔ اور وہ ایسے چت ہو گا کہ چاروں شانے لگ جائیں گے ۔ "

ـــــــــ کفر تک کر لو ۔ توبہ نصیب ہو ، ایک منٹ میں سارا کفر ختم ہو جائے گا ۔ اس نے سو ۱۰۰ برس کفر کرایا ۔ تم نے ایک سچی توبہ کی ۔ وہ سارا سو برس کا کفر ختم ہو جائے گا ۔ اس کی ساری کارستانیاں ختم ہو جائیں گی ـــــ تو توبہ میں اتنی بڑی طاقت ہے کہ شیطان بھی اس سے عاجز ہے ۔ اس لئے آدمی توبہ نہ چھوڑے ۔ ذرا سی بات ہوئی فوراً توبہ کرے ۔ بلکہ استغفار کو مستقل تسبیح کے طور پر پڑھے ۔ کم از کم سو دفعہ روزانہ استغفار کرے ـــــــــــ

استغفر اللہ تعالےٰ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ۔

سو دفعہ پڑھ لے۔ سو گناہ نہیں کرے گا، مگر سو استغفار ہو جائیں گے۔ تو اس کے گناہ ختم ہوتے رہیں گے۔ اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے صرف دس منٹ کی بات ہے۔ صبح کی نماز کے بعد اگر سو دفعہ استغفار پڑھ لے۔ تو کوئی محنت نہیں؛ مشقت نہیں ——— دن بھر میں آدمی سو گناہ نہیں کرتا، مگر توبائیں (توبہ کی جمع) سو ہو گئیں۔ ——— ان شاء اللہ سب گناہ ختم ہو جائیں گے۔

بہر حال قلب کا رُخ صحیح رکھے۔ اعتدال کے ساتھ چلتا رہے۔ جب گناہ ہو معافی مانگ لے۔ ایک نہ ایک روز منزل پر پہنچ جائے گا۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ دُعا کیجئے، اللہ تعالےٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلائے۔ حسنِ اخلاق نصیب فرماوے۔ اور خاتمہ بالخیر فرماوے۔ آمین

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

فضیلۃ یوم الجمعۃ

جُمعہ ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ایک جگہ جمع ہوں، اور جمع ہونے کی صُورت یہ ہے کہ منہ اللہ کی طرف ہو۔ قبلہ کا استقبال کرو۔ جب ایک رُخ ہوگا، مجتمع ہو جاؤ گے۔ جب آمنے سامنے ہوں گے، تب ٹکر پیدا ہوگی۔ جب سب کا رُخ ایک طرف ہوگا، ٹکراؤ کی کوئی وجہ نہیں۔

جیسے یہاں ظاہری طور پہ ہے اگر باطنی طور پر خُدا کی طرف مُنہ کر لیا جائے، تو وہاں بھی وہی شکل پیدا ہو جائے گی — تو جمعہ کا دن بتلاتا ہے کہ جیسے تم ظاہر میں جمع ہو گئے ہو، باطن میں بھی ہم نے تمہیں جمع کیا ہے —

از، حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

ترتیب

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ ونؤمن
بہ ونتوکل علیہ۔ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا
ومن سیئات اعمالنا۔ من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہٗ
ومن یضللہ فلا ھادی لہ۔ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ
وحدہ لا شریک لہ۔ ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولانا
محمدًا عبدہ ورسولہ۔ ارسلہ اللّٰہ الیٰ کافۃ للناس
بشیرًا ونذیرًا۔ وداعیًا الیہ باذنہ وسراجًا منیرًا
صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک و
سلم تسلیمًا کثیرًا کثیرًا۔
امابعد: فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرّجیم
بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
یا ایھا الذین اٰمنوا اِذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ
فاسعوا الیٰ ذکر اللّٰہ و ذروا البیع۔ (الجمعۃ پ ۲۸ ع ۲)
صدق اللّٰہ العلی العظیم

تمہید

بزرگانِ محترم!

میں اس وقت اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سے آپ حضرات کا زیادہ وقت نہیں لے سکوں گا ــــ اس کے علاوہ کہ کچھ تعب و تکان بھی ہے۔ رات تقریباً دو اڑھائی گھنٹے بیان ہوا۔ اس وقت بھی ایک گھنٹے کے قریب ایک نکاح کی مجلس میں بیان ہوا۔ اب کچھ بیان کرنے کی ہمت نہیں۔ لیکن چونکہ اعلان ہو چکا ہے، اس کا بھی احترام ضروری ہے۔ اس واسطے تھوڑا سا وقت آپ حضرات کا لوں گا۔

سب سے پہلے سوال موضوع کا ہے کہ کس موضوع پر بیان کیا جائے، اور میرے لئے یہ مستقل کام ہوتا ہے کہ کون سا موضوع منتخب کیا جائے۔ اس وقت سب سے بہتر موضوع وہی ہے جس کے لئے ہم اور آپ حاضر ہوئے ہیں، اور وہ ہے نمازِ جُمعہ، جو بہترین موضوع، بہترین عبادت اور بہترین قربت بھی ہے۔

ایک حدیث

اسی سلسلہ میں مجھے چند باتیں عرض کرنی ہیں، اور وہ باتیں اپنی نہیں ہوں گی۔ بلکہ ایک حدیث شریف جو ذہن میں آ گئی، اسی کو بیان کرنا ہے اور اس کا ترجمہ کرنا ہے ــــ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ حضرت جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے، اس شان سے کہ ایک آئینہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس آئینہ کے وسط میں ایک سیاہ نقطہ تھا، جو بالکل ممتاز تھا۔ آپؐ نے پوچھا:ــ

"اے جبریل! یہ سیاہ نقطہ کیسا ہے؟ اور یہ آئینہ کیسا ہے؟"

میدانِ مزید

فرمایا کہ یہ سیاہ نقطہ مزید ہے۔ جس کے معنے زیادتی کے آتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ مزید کیا ہے؟ ——— عرض کیا یا رسول اللہؐ! یہ جنت میں ایک میدان ہے اور جنت کے بالائی حصّہ میں ہے ——— یعنی اوپر نیچے سو تلے جنتیں ہیں۔ اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے۔ سب سے اوپر کا حصّہ جو عرش کے نیچے ہے۔ اس میں ایک میدان ہے جو بالکل سفید ہے اس کی گھاس بھی سفید، درخت سفید، غرض ہر چیز سفید اور شفاف ہے ——— اور عرض کیا کہ یہ اتنا بڑا میدان ہے کہ ہزار ہا برس مجھے گھومتے ہوئے ہوگئے ہیں۔ اب تک پوری طرح اس کی کُنہ (اور حقیقت) کو نہیں پا سکا۔

حدیث میں ہے کہ جبریل علیہ السلام کو اصل شکل میں آپؐ نے دو مرتبہ دیکھا ہے۔ اس شان سے کہ زمین سے لے کر آسمان تک اور مشرق سے لے کر مغرب تک ساری فضا ان کے بدن میں گھری ہوئی تھی۔ چھ چھ بازو تھے۔ سورج سے زیادہ روشن تاج ان کے سر پر تھا ——— اندازہ کیجیے کہ وہ میدان کتنا بڑا ہوگا جس میں حضرت جبریلؑ ہزار ہا برس سے گھوم رہے ہیں لیکن ابھی تک پورا نہیں کر سکے ———

پھر آپؐ نے فرمایا کہ اس میدان کی غرض و غایت کیا ہوگی؟

عرض کیا کہ یہ دربارِ خداوندی منعقد ہونے کا موقع ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام کے منبر اس میدان میں بچھائے جائیں گے۔ گول دائرے کی شکل میں نور کے منبر ہوں گے۔ ہر نبیؑ کے منبر کے پیچھے اُمت کی کرسیاں ہوں گی۔ اور وہ پورا میدان ان بیٹھنے والوں کی کرسیوں سے بھر جائے گا۔ دنیا میں جتنا جس کو تعلق نبی اور دین سے تھا، اتنا ہی وہ منبرِ نبویؐ کے قریب ہوگا ——— اور وہ کرسیاں اس شان سے ہوں گی

کہ ایک کے دیکھنے میں دوسرا حائل نہیں ہوگا، جیسے آپ نے دیکھا ہوگا بڑی بڑی مجالس میں کرسیاں اس ترتیب سے بچھاتے ہیں۔ اگلی صف ذرا نیچی، پچھلی اونچی تاکہ ہر شخص بے تکلف سامنے کی اسٹیج کو دیکھ سکے۔ اس انداز سے کرسیاں بچھائی جائیں گی۔ میدان کے کناروں پر کرسیاں نہیں ہوں گی۔ بلکہ کچھ غالیچے، کچھ فانوس ہوں گے۔ اس طرح سے یہ میدان بھر جائے گا۔ اب گویا دربار بن گیا کہ چہار طرف انبیاء علیہم السلام کے منبر ہیں، ان کی پشت پر کرسیاں ہیں۔ بیچ میں حق تعالیٰ شانہٗ کی کرسی آئے گی جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔

حدیث شریف میں اس کرسی کی عظمت و بڑائی بیان فرمائی گئی کہ ساتوں آسمان اور زمین اس کے سامنے ایسے ہیں جیسے ایک میدان میں ایک چھلّہ پڑا ہوا ہوتا ہے۔ اتنی عظیم کرسی ہے۔ آخر جس بادشاہ کی یہ کرسی ہے، اس کی بڑائی اور عظمت کے مناسب اس کی شان ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ اس کرسی و تخت پر بیٹھتے نہیں۔ وہ جسم سے بری اور صورت سے منزہ ہیں۔ لیکن ان کی صفت "مَلِكٌ" بادشاہ ہے۔ چنانچہ بادشاہت کے جتنے لوازم ہیں، وہ سب جمع کئے گئے۔ تختِ سلطنت بھی ہے جس کا نام عرشِ عظیم ہے۔ عرش مثل قُبّہ کے ہے جو ساری کائنات پر چھایا ہوا ہے اور ڈھانپے ہوئے ہے۔ عرش کے اوپر رحمت کی تجلی مستوی ہے۔ فرمایا گیا:۔

الرحمٰن علی العرش استویٰ ـــــ تو عرش کے اوپر رحمت چھائی ہوئی ہے اور عرش کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات کے اوپر رحمت چھائی ہوئی ہے۔ یعنی اللہ نے اپنے بندوں کے ساتھ جو تعلق قائم کیا ہے، وہ رحمت کے ساتھ ہے، غضب کے ساتھ نہیں۔ غضب اگر سامنے آجائے تو مخلوق کا پتہ بھی نہ چلے۔ رحمت ہی نے سنبھال رکھا ہے۔

تو رحمت کی تجلی عرش پر مستوی ہے۔ اس رحمت سے احکام پھوٹتے ہیں۔ ہدایت و رہنمائی، کُتب سماوی، قوانینِ خداوندی اور قضا و قدر سب وہیں سے چلتی ہیں۔

جیسے مُلک کی تمام تجاویز و احکامات تختِ سلطنت سے جاری ہوتے ہیں۔ اسی طرح عرشِ عظیم سے تختِ سلطنت قائم کیا گیا۔ عرش کے نیچے عظیم سمندر ہے جس پر عرش قائم ہے۔ اس سمندر کے نیچے سو جنتیں ہیں۔ ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے۔ سو جنتوں کے نیچے پھر آسمان تہہ بتہہ ہیں۔ اور اس کے نیچے پھر ہفت زمین تہہ بتہہ ہیں۔ یہ کائنات کا ایک (عجیب) سلسلہ ہے کہ نیچے زمین، اوپر فضا، اس کے اوپر آسمان، اس کے اوپر جنتیں، اس کے اوپر سمندر، اور اس کے اوپر عرشِ عظیم۔ عرش پر پہنچ کر مخلوق کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے —— تو عرش اور جنتوں کے درمیان میں یہ میدان ہے۔ جس کی عظمت و بڑائی یہ ہے کہ اس میں دربارِ خداوندی منعقد ہوگا۔ بیچ میں کرسئ حق بچھائی جائے گی۔

میدانِ مزید میں اہلِ جنت کی حاضری

تمام اہلِ جنت اس دربار میں شرکت کے لئے اپنی اپنی سواریوں پر پہنچیں گے، ان کی سواریوں کی یہ شان آئی ہے کہ بعض تختِ ہوا پر سوار ہوں گے۔ اُڑتے ہوئے تخت ہوں گے۔ اور مختلف قسم کی سواریاں ہوں گی جن کے ذریعے اہلِ جنت پہنچیں گے، اور ایسا وقت آئے گا کہ کل دربار منعقد ہو گا۔ تمام اہلِ جنت جمع ہوں گے — اور انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے منبروں پر ہوں گے۔ بیچ میں حق تعالےٰ کی کرسی ہو گی جب سارا دربار جم جائے گا تو اب بندے محسوس کریں گے کہ اب تجلیاتِ حق کا ظہور ہو رہا ہے۔ گویا کرسی پر حق تعالےٰ کی تجلی مستوی ہے ——!

حدیث میں ہے کہ وہ کرسی باوجود اس عظمت کے اس طرح چرچرائے گی، جیسے بوجھ سے دب کر کوئی چیز ٹوٹنے کے قریب ہوتی ہے۔ وہ ہیبتِ حق کا بوجھ ہوگا، کوئی جسمانی بوجھ نہیں ہو گا۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ داؤد علیہ السلام کو آواز کا معجزہ دیا گیا تھا۔ اتنی پاکیزہ آواز تھی کہ جب وہ مناجات پڑھتے تو چرند و پرند اِن کے اِرد گرد جمع ہو جاتے اور محو ہو جاتے ——— انسان تو بجائے خود جانوروں پر بھی ایک غنودگی کی کیفیت طاری ہوتی تھی ——— حضرت داؤد علیہ السلام کو فرمایا جائے گا کہ ان تمام درباریوں کو اپنے مضمون سے مستفیض کریں — حضرت داؤد علیہ السلام اس اعجازی خوش آوازی سے مناجات و مضامین پڑھیں گے کہ اہلِ جنت پر کیف طاری ہو جائے گا، جس طرح شرابِ طہور کا وعدہ فرمایا گیا ———

ملائکہ علیہم السلام کو فرمایا جائے گا کہ تقسیم کرو۔ یہ شرابِ طہور دنیا کی شراب جیسی نہیں ہوگی۔ دنیا کی شراب میں تلخی ہوتی ہے، اس میں شیرینی ہوگی۔ دنیا کی شراب سے عقلیں جاتی رہتی ہیں۔ اس سے عقلوں میں تیزی اور معرفت و بصیرت پیدا ہوگی۔ وہ سُکر اس سُکر کے مشابہ ہوگا جو حضرات صوفیاء پر کثرتِ ذکر سے معرفت کا ایک نشہ سا طاری ہوتا ہے۔ اور ایک استغراق ہوتا ہے اس میں ان پر احوال و علوم اور مواجید منکشف ہوتے ہیں۔ گویا دنیا میں جو معرفت کا سُکر دیا گیا تھا، جنت میں "شرابِ طہور" اس کی صورت مثالی ہوگی ——— اسی طرح سے عقلوں پر کیف طاری ہوگا۔ روحوں میں بھی کیف بڑھے گا۔ معرفتِ خداوندی اور بصیرت بڑھتی جائے گی۔

میدانِ مزید میں اہلِ علم کی احتیاج

اُس وقت اللہ تعالےٰ فرمائیں گے سلونی ماشئت جو جس کا دل چاہے مانگے، طلب کرے۔ سب کو خطاب عام فرمایا جائے گا ——— تو سب مل کر عرض کریں گے، کہ کونسی نعمت ہے جو آپ نے عطا نہیں فرما دی۔ ہمیں ساری نعمتیں مل چکی ہیں۔ بس ہماری درخواست یہ ہے کہ اپنی رضا ہمیں

عطا فرما دیجئے۔

حق تعالیٰ فرمائیں گے۔ یہ نعمت مِل چکی۔ اگر مَیں راضی نہ ہوتا تو تمہیں اس مقام پر گھسنے نہ دیتا۔ مَیں راضی ہوں اور ایسا راضی ہوں کہ ابد الآباد تک کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ یہ مقام تمہیں مل چکا۔ کچھ اور مانگو ——— سب حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں گے کہ کیا چیز مانگیں۔ ؟ —— کون سی نعمت ہے جو ہمیں نہیں مِل گئی ——— اس وقت سب مِل کر علماء کی طرف رجوع کریں گے۔ ان سے استفسار کریں گے کہ کیا چیز رہ گئی ہے جو ہم مانگیں ؟ —— ہمارے علم کے اعتبار سے تو ہر نعمت مل چکی ہے ——— گویا علم اور اہل علم کی احتیاج وہاں بھی باقی رہے گی۔ لوگ دنیا میں علماء سے مستغنی ہونا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حاجت مندی وہاں بھی قائم رہے گی۔ وہ کسی کی ذات کی احتیاج نہیں ہوگی۔ وہ علم کی احتیاج ہوگی۔ اور ابد الآباد تک آدمی علم کا محتاج ہے۔ اس لئے کہ علم اللہ کی صفت ہے۔ جیسے ذات لامحدود ہے، اس کی صفات بھی لامحدود ہیں۔ انسان کتنے ہی بڑے مقامات طے کرلے، پھر بھی لامتناہی مقامات رہتے ہیں جن کی طلب رہے گی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قطعہ ہے جو وہ پڑھا کرتے تھے (جس کا ترجمہ یہ ہے) کہ جُوں جُوں مجھے زمانہ ادب سکھاتا ہے۔ مجھ پر میری عقل کا نقصان وارد ہوتا ہے، جو ادب کا مقام طے کیا تو سمجھ میں آیا کہ اب تک میری عقل نے یہ نہیں پایا تھا۔ اِس مقام تک میری عقل ناقص ہے۔ پھر اگلا مقام طے ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی اب تک میری عقل نہیں پاسکی تھی ——— اسی طرح جوں جوں مقامِ ادب آتے رہے میری عقل کا نقصان مجھ پر واضح ہوتا رہا۔ اور جیسے جیسے مراتبِ علم بڑھتے رہے، میری جہالت مجھ پر واضح ہوتی رہی۔ جب کسی علم کے مقام پر پہنچا، معلوم ہوا کہ اب تک مَیں اس سے جاہل تھا ——— مراتبِ علم کھل رہے ہیں تو میرے نفس کی جہالت کے مقامات بھی میرے نفس پر کھل رہے ہیں۔

—— لامحدود حد تک انسان جاہل اور محدود حد تک عالم ہوتا ہے جو ہمیں معلومات ہیں وہ محدود ہیں۔ اور جو غیر معلوم چیزیں ہیں، وہ لامحدود ہیں۔ اس لئے کہ علم اللہ کی صفت ہے۔ علم انسان جتنا بھی پڑھتا جائے، چاہے وہ علم کے کروڑوں مقامات ہوں، پھر بھی ان گنت مقامات باقی رہیں گے، کیونکہ لامحدود کی طرف بڑھ رہا ہے —— اس لئے میں نے عرض کیا کہ علم کی محتاجگی دنیا میں ہی نہیں جنت میں بھی باقی رہے گی۔ کیونکہ صفتِ خداوندی وہاں پہنچ کر محدود نہیں بن جائے گی۔ علم اور معرفت کے مقامات وہاں بھی لامحدود رہیں گے —— تو لوگ علماء کی طرف رجوع کریں گے کہ ساری نعمتیں مل گئیں۔ کونسی چیز باقی ہے جو ہم مانگیں —— ؟۔ علماء مل کر ایک مشورہ دیں گے کہ ایک چیز رہ گئی ہے جو طلب کرو، وہ نہیں ملی۔ اور وہ یہ ہے کہ حق تعالےٰ اپنا جمال مبارک دکھاوے۔ دیدارِ خداوندی ابھی تک باقی ہے۔ یہ نعمت نہیں ملی۔ قرآن مجید میں وعدہ فرمایا گیا۔ وجوہ یومئذ ناضرۃ الیٰ ربھا ناظرۃ —— بہت سے چہرے تروتازہ اور شاداب ہوں گے، جو اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے —— جیسے کفار کے بارے میں دھمکی دی گئی کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون —— یہ (سیاہ چہرے والے) وہ لوگ ہیں کہ ان کے اور پروردگار کے درمیان حجابات حائل ہوں گے۔ یہ زیارت نہیں کر سکیں گے، ان کے لئے ابدی محرومی ہوگی ——

تو دیدارِ خداوندی کا وعدہ دیا گیا۔ اس وعدے کا ظہور وہاں ہوگا —— علماء مشورہ دیں گے کہ ایک نعمت رہ گئی ہے، وہ طلب کریں —— "اور وہ ہے دیدارِ خداوندی" —— تو سب مل کر یک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ ہمیں یہ نعمت عطا فرما دیجئے، اپنا جمال مبارک دکھلا دیجئے۔ اسی کی تمنا میں ہم نے عبادتیں کیں … عمریں گذار دیں۔ مشاہدۂ حق اصل مقصود تھا۔ اب اس مقام پر مشاہدہ نہ ہوا تو اور کون سا مقام ہوگا جہاں مشاہدۂ حق ہوگا۔ درخواست قبول کر لی جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے۔ صرف ایک حجاب کبریائی اور عظمت کا باقی رہ جائے گا۔ باقی سب حجابات اٹھ جائیں گے اور بندے اپنے خدا کو دیکھیں گے۔ اس شان سے کہ نہ سمت ہے، نہ جہت ہے، نہ رنگ ہے۔ اور پھر مشاہدہ ہو رہا ہے اور دیکھ رہے ہیں —— یہ اس مزید کا موضوع ہے جس کا نام "میدان مزید" ہے۔ —— گویا وہ درباری مقام ہے —— یہ ایک حدیث ہے جس کا میں نے ترجمہ اور تفسیر آپ کے سامنے عرض کی۔

دُنیا میں "میدان مزید" کی مثال

یہ جنت میں میدان مزید ہے۔ اور ہفتے میں ایک بار اجتماع ہو گا۔ جب دربار ختم ہو گا تو اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو فرمائیں گے "جاؤ اپنے اپنے مقامات پر"۔ اہلِ جنت واپس ہوں گے۔ جنت میں اپنے اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے۔

دنیا میں اس دربار کی مثال جمعہ کو رکھا گیا۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ یہ دربارِ خداوندی ہے جو دنیا میں منعقد ہوتا ہے۔ خطیب اور امام وہ نائبِ حق ہوتا ہے جیسا کہ تجلیاتِ ربانی کرسی پر ہوتی تھیں۔ یہاں خطیب منبر پر بیٹھتا ہے گویا وہ نمائندۂ حق ہے، اور خطابت کی تجلی اس میں ظہور کر رہی ہے۔ اس لئے کہ اصل خطیب حق تعالےٰ شانہٗ ہیں۔ ان کے بعد خطباء انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اسی لئے حدیث میں آپ فرماتے ہیں۔ انا قائدھم وانا خطیبھم —— قیامت کے دن میں ہی ساری امتوں کا قائد اور میں ہی خطیب ہوں گا۔ میں ہی ان کے سامنے خطبہ دوں گا —— تو انبیاء علیہم السلام اس تجلی کے بارے میں جو خطبات کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے، نمائندگانِ حق ہیں۔ اصل خطیب حق تعالےٰ شانہٗ ہیں۔ اس دنیا میں ان کا نمائندہ امام اور خطیب ہوتا ہے۔

خطبۂ جمعہ کے آداب عام خطبات سے زیادہ ہیں

یہی وجہ ہے کہ عام مواعظ اور خطبوں کے جو آداب ہیں۔ اس خطبے کے آداب ان سے زیادہ ممتاز ہیں۔ فرمایا گیا۔ اذا خرج الامام فلا صلوٰۃ ولا کلام۔ خطبہ کے لئے جب امام اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہو، تو اب نہ سلام و کلام جائز ہے نہ نوافل پڑھنی جائز ہیں۔ صرف یہ کام ہے کہ امام کو خطبہ کی حالت میں دیکھو۔ فرمایا گیا جو کنکریوں سے کھیلنے لگا، اس نے لغو حرکت کی۔ مکروہ کا ارتکاب کیا۔ عام وعظوں میں اگر کوئی کنکری اٹھالے، کوئی کراہت نہیں ــــ لیکن خطبۂ جمعہ میں اگر کنکریوں سے، یا چٹائی کے تیلوں سے کھیلنے لگے، اس پر نکیر کی گئی ہے۔ خطبہ شروع ہونے کے بعد نماز بھی جائز نہیں۔ تلاوتِ قرآن بھی جائز نہیں۔ درود شریف جیسی طاعت بھی جائز نہیں۔ خطبہ شروع ہونے کے بعد سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اس وقت خطیب کو دیکھا جائے۔ اس کے خطبہ پر کان لگائے جائیں، جو زیادہ سے زیادہ اس کو دیکھنے کی عادت ڈالے گا، اُسے میدانِ مزید میں زیادہ سے زیادہ حق تعالےٰ کا دیدار میسر ہوگا، وہاں تجلیاتِ حق سامنے ہوں گی۔

اسی لئے فرمایا گیا کہ جمعہ میں جو اذان سے پہلے اول وقت آگیا۔ صفِ اولیٰ میں اسے جگہ ملی۔ وہ ایسا ہے جیسے ایک اونٹ قربانی کا ذبح کر دیا۔ اس کے بعد اس سے کم درجہ ہے کہ گائے ذبح کی پھر اس سے کم درجہ ہے کہ بکرا ذبح کیا۔ اس کے بعد جو آیا وہ ایسا ہے کہ اس نے مرغی ذبح کی۔ جب امام خطبہ کے لئے کھڑا ہو گیا تو ملائکہ علیہم السلام اپنے صحیفے لپیٹ کر خطبہ سننے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر درجاتِ عالی کا کوئی مقام نہیں رہتا کہ اس میں نام لکھا جائے۔ ایسے میں جو آئے گا بس اس کا فرض ادا ہو جائے گا ــــ اور جو یہاں صفِ اولیٰ میں ہوگا وہ وہاں بھی

انبیاء علیہم السلام کے پیچھے صفِ اولیٰ میں جگہ پائے گا، جو یہاں جتنا پیچھے ہو جائے گا وہاں بھی اتنا ہی پیچھے ہو گا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر لگا تار تین جُمعے چھوڑ دیئے، بلا کسی شرعی یا طبعی عذر کے، تو ظنِ غالب یہ ہے کہ پھر اُسے عمر بھر جمعہ پڑھنے کی توفیق نہیں ہو گی۔ جب تک سچی توبہ نہ کرے اور رجوع نہ کرے ـــــ تو جمعہ کی نماز بھی بے شک فرض ہے مگر عام فرائض سے اس میں کچھ زیادہ خصوصیت ہے۔ اور یہ خطبہ عام خطبوں سے بڑھ کر ایک نئی شان رکھتا ہے، جو امتیازی شان ہے ـــــ

علماء لکھتے ہیں کہ ظہر کے چار فرض ہیں۔ جُمعہ کے دو ہوتے ہیں۔ دو فرضوں کے قائم مقام یہ دو خطبے ہوتے ہیں جو امام کھڑے ہو کر دیتا ہے۔ اسی لئے ان خطبوں کے آداب عام خطبات سے زائد ہیں کہ امام کو دیکھو، تلاوت مت کرو، عبادت بھی نہ کرو۔ بڑی عبادت یہ ہے کہ خطبہ سُنو اور امام کو دیکھو۔ گویا یہ دو خطبے بمنزلہ نماز کے ہیں، تو چار رکعتیں ہو جاتی ہیں، اس شان سے کہ دو رکعتیں جُمعہ کی اور دو رکعتیں ان دو خطبوں کے قائم مقام۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے اس جمعہ کو دنیا میں میدان مزید کا نمونہ اُتارا ہے۔ اسی لئے شریعت کی اصطلاح میں جمعہ کا نام "یوم المزید" ہے۔ اس لئے یوم المزید کہا گیا کہ جنت کا میدان اس دنیا میں ہے ـــــ جنت میں جا کر میدان مزید وہاں کی شان کے مطابق ہو گا۔ تو ساری دنیا کے جُمعے اور جامع مسجدیں مِل کر میدانِ مزید کا دنیا میں ایک نقشہ ہیں۔ ان کے مجموعوں کو اٹھا کر آخرت میں لے جائیں گے، اور یہ خطبے اور یہ جنتوں میں پہنچائے جائیں گے۔ تو وہاں کے دربارِ خداوندی کا یہاں ایک نمونہ ہے۔ اسی واسطے جُمعہ کو سیّد الایام کہا گیا ہے کہ تمام دِنوں کا سردار ہے۔

حق تعالٰی کا انتخاب

حق تعالٰی شانہٗ کا ارشاد ہے:۔

وربک یخلق مایشآء ویختار - تیرا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے جس چیز کو چاہتا ہے اپنے لیے چھانٹ لیتا ہے۔ سات آسمان بنائے، ساتویں کو پسند کیا، منتخب کر لیا۔ وہ مقبول زمین ہے جنتوں کی بُنیاد ہے ساتویں آسمان پر جنتوں کا علاقہ ہے جو مقام کریم ہے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے، جو جبریل علیہ السلام کا مقام ہے - اور قرآن کریم میں فرمایا گیا - عند سدرۃ المنتھیٰ ○ عندھا جنۃ الماوٰی -

سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے - سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے۔ سدرہ کے پاس مقام جنت ہے تو جنتوں کا علاقہ ساتویں آسمان سے شروع ہوتا ہے۔ سرکاری مہمان خانہ اسی میں بنایا گیا ہے —— سات زمینیں پیدا کی تو اوپر کی زمین منتخب کی کہ وہ سیدالانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کا مقام ہے، اور ساتویں زمین کی تہہ میں جہنم ہے، جیسے جنت سات آسمانوں سے بالاتر ہے، جہنم سات زمینوں سے نیچے ہے۔

قیامت کے دن صُور پھونکا جائے گا۔ آسمان توڑ دیئے جائیں گے، تو جنتیں نمایاں ہو جائیں گی۔ زمینیں ختم کر دی جائیں گی، تو جہنم نیچے سے نمایاں ہو جائے گی —— واذا الجحیم سعرت - واذا الجنۃ ازلفت —— جہنم دھونکا دیا جائے گا، اور جنتیں سامنے کر دی جائیں گی، زمینوں اور آسمانوں کے بیچ میں جو پردے حائل ہیں یہ سب توڑ پھوڑ کر برابر کر دیئے جائیں گے، تو زمینوں میں اوپر کی زمین کو اپنے لئے پسند کیا، اور آسمانوں میں اوپر کے آسمان کو پسند کیا۔ پیدا کئے سات اور منتخب کر لیا ایک - جنتیں سات پیدا کیں اور اپنے لئے جنت الفردوس کو پسند کیا، جو انبیاء علیہم السلام کا مقام ہے اور سب سے اوپر کی جنت ہے - پہاڑ اللہ نے ہزاروں بنائے طورِ سینا، کو پسند کر لیا کہ اسے اپنی تجلی گاہ بنایا - دنیا میں اس کے شہر ہزاروں لاکھوں ہیں مگر "بلد الامین" کو پسند کر لیا جس میں حرم واقع ہے یعنی مکۃ المکرمۃ۔

زمین کے ٹکڑے کروڑوں بنائے۔ سب سے زیادہ پسندیدہ ٹکڑا وہ ہے جس میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں ـــــــــ

ہمارے علماء لکھتے ہیں کہ وہ ٹکڑا عرش سے بھی افضل ہے، اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ عرش کو حق تعالےٰ سے نسبت ہے، مگر حق تعالےٰ اس پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں، وہ تو جسم سے پاک ہیں۔ اور وہ ٹکڑا جو قبر مبارک ہے اس کو بدنِ مبارک لگا ہوا ہے، اور جس حصّہ زمین کو بدنِ نبویؐ صلی اللہ علیہ وسلم چھو جائے وہ یقیناً عرش سے افضل ہوگا۔ کیونکہ حق تعالےٰ شانہ عرش سے چھوئے ہوئے نہیں ہیں کیونکہ وہ جسم سے بری و بالا ہیں۔ صرف ایک نسبت ہے اور یہاں نسبت نہیں بلکہ اتصال و ملاپ ہے تو زمین کے ٹکڑے ہزاروں بنائے یہ زمین منتخب کرلی اور یہ ٹکڑا منتخب کرلیا۔

راتیں سات بنائیں اور لیلۃ القدر کو پسند کرلیا، اور فرمایا کہ لیلۃ القدر خیر من الف شہر ـــــ لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ گویا ہزار مہینے جو شخص رات دن عبادت کرے، اس محنت سے جس مقام پر پہنچے گا، اگر لیلۃ القدر کو زندہ کیا تو اس مقام پر ایک ہی رات میں پہنچ سکے گا ـــــــ تو لیلۃ القدر کو اپنے لئے پسند کرلیا۔ اسی طرح سے سات دن بنائے ان میں سے اپنے لئے یوم الجمعۃ کو پسند کرلیا کہ ہمارے دربار کا دن ہے۔

جنّت کا موسم

جنت میں بھی اسی دن میں دربار ہوگا، حالانکہ جنّت میں رات اور دن نہیں۔ وہاں تو یکساں ایک وقت رہے گا۔ وہاں سورج کی گردش نہیں ہے کہ رات اور دن بنیں۔ رات اور دن کا بننا، کبھی دھوپ اور کبھی چھاؤں، کبھی رات اور کبھی دن، یہ گردشِ آفتاب کے آثار ہیں۔

حدیث میں ہے جنت میں عرش کا چاندنا ہوگا۔ عرش کی نورانیت یکساں پھیلی ہوئی ہوگی۔ اس نورانیت کی تمثیل اور تشریح دی گئی ہے کہ گرمی کے زمانہ میں صبح صادق کے بعد سورج نکلنے سے پہلے جب ٹھنڈی روشنی اور دودھ سا چاندنا ہوتا ہے، جنت میں روشنی کی یہ نوعیت ہوگی کہ آدمی دھوپ میں نہ بیٹھ سکے۔ روشنی بھی ہے، ٹھنڈی بھی ہے، برد و سلام بھی ہے مگر تیزی نہیں ہے۔ وہ خوشگوار ہے، نگاہوں کو بھلانے والی اور یکساں رہے گی، وہاں نہ رات ہے نہ دن ہے، نہ سونا۔ بلکہ جاگنا ہی جاگنا ہے۔ اس لئے کہ سو جانا تھکن اور غفلت کی علامت ہے۔ وہاں تعب و تکان نہیں کہ آدمی پڑ کے سو جائے۔ وہاں تو رات دن کا عیش ہے اور رات دن کی بادشاہت ہے اس لئے نہ رات ہے نہ دن۔ تعب ہوتا تو رات رکھی جاتی کہ آرام سے سو جاتے۔ جب تکان نہیں تو رات کی ضرورت نہیں۔ اس لئے یکساں دن رہے گا۔

سیدُ الایام

پھر یہ جو فرمایا گیا کہ ہفتے میں ایک مرتبہ دربارِ خداوندی منعقد ہوگا یعنی جتنی تمہارے یہاں ایک ہفتہ کی مسافت و مدت ہوتی ہے اتنی مدت کا حساب لگالو۔ اتنے اتنے وقفے کے بعد دربار خداوندی منعقد ہوگا۔ وہ ہفتے میں ایک بار سمجھ لیجئے اس لمحے کا نام مزید رکھا گیا ہے۔ دنیا میں ساتویں دن کا نام "یومِ مزید" رکھ دیا، جو دنیا میں جنت کا نمونہ ہے۔ اس لئے اس کو سید الایام فرمایا گیا کہ یہ سب سے پاکیزہ، سب سے بڑا اور بہترین دن ہے ——— جتنے بھی عظیم و اعظم اُمور ہیں وہ اسی دن میں ظاہر ہوئے۔ فرمایا گیا ——— فیہ جمع طین آدم ———

"جمعہ" اس کا مادہ (ج۔م۔ع) ہے۔ جامعیت کی شان جمعہ میں موجود ہے ——— منتشر چیزوں کو ایک جگہ جمع کر دینا، بکھری ہوئی چیزوں کو

ملا دینا یہ جمعہ کا مادہ ہے۔ جتنی بھی بڑی بڑی چیزیں منتشر تھیں، وہ اس دن میں جمع کی گئیں، آدم علیہ السلام کی مٹی جو پوری زمین سے لی گئی وہ جمعہ کے دن میں ہی جمع کی گئی، اور ان کا پتلا بنایا گیا ——

حدیث میں ہے کہ آدم علیہ السلام جس دن جنت میں داخل کیے گئے وہ جمعہ کا دن تھا۔ جنت سے زمین پر لائے گئے، وہ بھی جمعہ کا دن تھا، صحف آدم آسمانوں سے اتارے گئے، وہ بھی جمعہ کا دن تھا —— جیسے قرآن کریم میں تفسیر بتلائی گئی اور احادیث میں زیادہ شرح ہے کہ چھ دن میں اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو تیار کیا، اور اس کے چھ دن تمہارے چھ ہزار سال کے برابر ہیں۔

وان یوما عند ربک کالف سنۃ مما تعدون ط

تو چھ ہزار سال میں کائنات تیار ہوئی۔ گویا اتوار سے بننی شروع ہوئی اور جمعہ پر ختم ہوئی — اس میں زمین بچھائی گئی، پھر آسمان بنائے گئے، پھر زمین میں قوتیں رکھی گئیں، پھر جمادات و نباتات پیدا کیے گئے، پھر آسمانوں میں ستارے پیدا کیے گئے —— اس کی تفصیلات آئی ہیں —— جب ساری کائنات بن کر تیار ہو گئی، تو جمعہ کی آخری ساعت میں آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا۔ یہ زمین کا فرش بچھایا گیا، آسمان کا خیمہ تانا گیا، چاند اور ستاروں کے انڈے لٹکائے گئے۔ دریا جاری کیے گئے، غذائیں جمع کی گئیں۔ یہ کس کے لئے تھیں ——؟

وان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرۃ۔

ساری دنیا انسان کے لیے بنائی گئی —— انسان معبود کے لئے بنایا گیا۔ آپ جب کسی کو مہمان بلاتے ہیں تو پہلے آپ کوٹھی منتخب کرتے ہیں، وہاں مہمانداری کا سامان کرتے ہیں۔ کھانے کا، پینے کا، رہائش کا، جب سب کچھ مہیا ہوتا ہے تب کہتے ہیں کہ تشریف لائیے۔ تو مہمان آتا ہے۔ ساری چیزیں اس کے استعمال میں آتی ہیں۔ تو آدم علیہ السلام ساری دنیا کے مہمان ہیں، ان کو لانے سے پہلے ساری دنیا مکمل کر دی گئی۔

زمین کو فرش بنا دیا گیا، آسمان کو چھت بنا دیا گیا، سورج اور چاند کے چراغ لٹکائے گئے تاکہ روشنی ہو، اور پھر عجیب طریقے سے زمین کو گودام بنا دیا، اس میں سے غذائیں نکل رہی ہیں، زمین کو واٹر ورکس بنا دیا جس میں سے پانی نکل رہا ہے۔ ایک صندوق بنا دیا جس میں سے لباس بھی نکلتے چلے آرہے ہیں۔ تو زمین ساری ضروریات کا ذخیرہ ہے۔ حتیٰ کہ زندگی کا بھی اور موت کا بھی۔ اسی سے آدمی پیدا ہوتا ہے اسی میں کھپ جاتا ہے۔ منہا خلقنٰکم وفیہا نعیدکم ومنہا نخرجکم تارۃً اخریٰ ○

"جُمعہ" میں شانِ جامعیت

تو زمین ہماری قرار گاہ بھی ہے، ہماری موت گاہ بھی ہے۔ ہماری دنیا بھی ہے، ہمارا برزخ بھی ہے۔ ساری چیزیں جمع کر دی گئیں۔ اس کے بعد آخر میں آدم علیہ السلام لائے گئے، تو جُمعہ کا دن تھا۔ آخری ساعت تھی جس میں آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے۔ —— اسی واسطے فرمایا گیا کہ جمعہ کے دن میں ایک ایسی ساعت ہے وہ اگر کسی پر گذر جائے تو اس میں جو دعاء مانگتا ہے یقیناً قبول ہوتی ہے —— علماء لکھتے ہیں کہ یہی وہ ساعت ہے جس میں آدم علیہ السلام کی پیدائش عمل میں آئی۔ تو جتنے بڑے بڑے امور ہیں، سب اسی دن واقع ہوئے ہیں۔ آدمؑ کی پیدائش، آدمؑ کی مٹی کا جمع کرنا، آدمؑ کو دنیا میں اتارنا —— تو اس دن کو آدمی سے کوئی خاص مناسبت ہے اور ایام بھی انسانوں کے لئے ہیں۔ مگر جمعہ کے دن ولادت، موت وحیات وجمعیت اور جنت سے نزول ہوا۔ دنیا میں آگئے تو صورتاً نزول ہوا، حقیقۃً عروج ہوا۔ اس لیے کہ دنیا میں نہ آتے تو خلافت نہ پاتے، ظاہر میں تو نیچے اتارے گئے، اور حقیقت میں اس عمل گاہ کے ذریعے سے جب انسان نے عمل کرنے شروع کئے تو بڑے بڑے مراتب اور درجات بلند ہوئے۔ تو معنوی طور پر انسان بلند ہوا۔ ظاہری طور پر اسے نیچے اتارا گیا۔ تو وہاں کھلا ہوا حسّی ورود تھا یہاں

حسی نزول اور معنوی خلافت کا تاج رکھا گیا۔ انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے، علمائے ربانی پیدا ہوئے۔ ہر ایک کے جوہر ظاہر ہوئے۔ تو دنیا مظہر کمالات ہے۔ دنیا نہ ہوتی تو کمالات کا ظہور نہ ہوتا۔ اگر یہ ساری اولاد جنت میں پیدا ہوتی تو بادشاہوں کی طرح بسر کرتی۔ رات دن کھانے پینے اور عیش اڑانے میں لگے رہتے۔ لیکن دنیا میں لاکر مصائب میں مبتلا کیا گیا۔ تاکہ ان مصائب کے توڑ اور دفعیہ کے لیے انسان کے اندر سے جوہر نمایاں ہوں ـــــ مصیبت رکھی گئی تاکہ دفاع کی طاقتیں کام میں آئیں ـــــ اقوام کو اقوام کے مقابلہ پر ڈالا گیا، تاکہ شجاعتوں کا ظہور ہو، صبر و تحمل کا ظہور ہو۔ جنت میں نہ جنگ ہوتی نہ لڑائی ہوتی، نہ دفعیہ کی تدبیریں سوجھتیں، نہ صبر و تحمل کام آتا ـــــ انسان کے بہت سے جوہر چھپے ہوئے رہ جاتے۔ دنیا کو ان کے لئے ظہور گاہ بنایا گیا۔ تو آدم علیہ السلام ظاہراً تو جنت سے نیچے اتارے گئے جو نزول ہوا، حقیقت میں عروج ہوا کہ جب تک دنیا میں نہ آئیں کمالات کا ظہور نہیں ہو سکتا ـــــ قیامت بھی قائم ہوگی تو جُمعہ کے دن ہوگی .... جس میں اولین و آخرین جمع کئے جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن میں جامعیت کا ایک مادہ موجود ہے۔ آدم علیہ السلام کی بکھری ہوئی مٹی یوم جُمعہ میں جمع کی گئی۔ جو کمالات چھپے ہوئے تھے، وہ جمع ہو کر جمعہ کے دن نمایاں ہوئے ـــــ قیامت ہوگی تو کروڑوں اربوں انسان زمینوں میں چھپے پڑے ہوئے ہوں گے۔ لیکن اپنی اپنی قبروں سے اُٹھ کر میدانِ حشر میں جمع ہوں گے۔ جُمعہ کا دن انہیں جمع کر دے گا ـــــ غرض اس میں جامعیت کی شان ہے۔

تو دنیا میں جمعہ لایا گیا تاکہ انسان جیسے اس کی تکوینی طور پر چیزیں جمع ہوئی ہیں، اپنے ارادے سے جمعیت کی شان اپنے اندر پیدا کرے۔ یعنی جمع ہونا سیکھیں۔ قلوب کی یکسانی سیکھیں، قلوب کا میل ملاپ اور اتحاد سیکھیں۔ اختلاف سے بچیں۔ گروہ بندیوں سے بچیں۔ اس کے لئے جُمعہ کو نمونہ بنا دیا گیا۔ کہ شکلیں مختلف، عقلیں مختلف، رنگ مختلف، مگر سب آکر جمعہ کے اندر جمع ہوتے ہیں۔ دیہات کے قصبوں کے

لوگ اور محلوں کے بھی ایک جگہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں — باوجود اختلافِ مذاق کے پھر ان میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔ یہ جمعہ ہی کی برکت ہے۔ جب ہفتہ میں ایک دن جمع ہونا سیکھ لیا تو بقیہ ایام میں بھی ان کے لئے جمع ہونا آسان ہو جاتا ہے۔ ان میں اجتماع کی خُو پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر انسان اس وقت جہنم میں ہے، اس سے نکلنے کی تدبیر

جُمعہ کا دن اجتماعیت کی دعوت دیتا ہے کہ باہمی میل ملاپ اور محبّت پیدا ہو۔ باہمی یگانگت پیدا ہو۔ تمہارے اندر اتحادِ باہمی ہو — مگر اس کا ذریعہ کیا ہے؟ واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا — امام خطبہ دیتا ہے، وہ قرآن پڑھتا ہے۔ نماز میں بھی قرآن پڑھا جاتا ہے، وہ اللہ کی رسی ہے جس کو پکڑنے کے بعد آدمی اوپر پہنچے گا —

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قرآن اللہ کی رسی ہے۔ جو آسمان سے لے کر زمین تک لٹکا دی گئی، جس نے مجھ تک آنا ہو، اسی رسی کو مضبوط تھام لے۔ جب ہم رسّی کھینچیں گے، جو اس میں لٹک جائے گا، وہ لٹک کر ہم تک پہنچ جائے گا —

شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ لکھتے ہیں کہ یہ آسمانوں سے نیچے کی جگہ سارا علاقہ جس میں ساتوں زمینیں شامل ہیں۔ یہ سب جہنم کا علاقہ ہے۔ قیامت کے دن اسی میں جہنم تپے گی — اسی میں آگ، اسی میں سانپ، اور بچھو، اور اسی میں وہ سارے عذابات ہوں گے۔ تو ہم اور آپ گویا اس وقت جہنم میں موجود ہیں — قرآن کی رسّی ٹانگ دی گئی، جسے اس جہنم سے نکل بھاگنا ہو، وہ اس رسی کو مضبوطی سے پکڑ لے، جو نہیں پکڑے گا، اسے جہنم میں بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود بخود جہنم کے اندر موجود ہے۔ اس سے نکلنے

کے لیے صرف ایک ہی ذریعہ ہے ۔ اور وہ اللہ کی رسّی ہے ۔ وہ رسی ٹوٹ نہیں سکتی ۔ البتہ اگر کوئی مضبوط نہ پکڑے تو چھوٹ سکتی ہے ۔ تو پوری قوت کے ساتھ اس کو مضبوط تھام لیا جائے ۔

اس روز بھی قرآن پورے شہر کے آگے پڑھا جاتا ہے ۔ تاکہ لوگ پیغامِ خداوندی سُن کر اس سے وابستہ ہوں ۔ اور اپنے اندر اجتماعی شان پیدا کریں ۔

جُمعہ یومِ امتحان

جُمعہ کا دن گویا عبرت و موعظت بھی ہے ۔ اور ایک امتحان بھی ہے ۔ یہ اُمتِ مرحوم جمعہ کی وجہ سے امتحان میں کامیاب ہوئی ۔ امتحان میں کامیابی کی فضیلت اس کو حاصل ہوئی ۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ نے اقوام کا امتحان لیا ۔ یہود سے کہا کہ تم عبادت کے لئے ایک دن منتخب کرو جو ہمارے علم میں متعین ہے ۔۔۔ انہوں نے یوم السبت مقرر کیا ۔ شنبہ کا دن کہ ہفتہ کے دن بجز طاعت و عبادت کوئی کام مت کرو ۔۔۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہود سے فرمایا اے یہود ! یوم السبت کا احترام کرو ۔ جب دعوٰے کرتے ہو کہ وہ مقدس دن ہے تو اس کی تقدیس کرو ۔۔۔ نصارٰی سے کہا گیا کہ تم بھی ایک دن طے کرو ، وہ ہمارے علم میں طے شدہ ہے ۔ دیکھتے ہیں تم پہنچتے ہو یا نہیں ؟ ۔۔۔ نصارٰی نے اتوار کا دن عبادت کے لئے تجویز کیا ۔ اسی میں ان کے لئے عبادت فرض کر دی گئی ۔

مسلمانوں سے کہا گیا تم بھی ایک دن منتخب کر لو ۔ تو ہمارے پیغمبر (فداہ روحی و ابی و امی) صلے اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کا دن منتخب فرمایا ۔۔۔ فرمایا یہی ہمارے علم میں طے شدہ تھا ۔ تو اس وقت کو وحیِ خداوندی سے مناسبت دی گئی ۔ اب

پوری امت اپنے پیغمبر کے قائم مقام ہے، جو اللہ کے علم میں طے تھا، وہی طے پا گیا۔

حق فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ساتھ گھومتا ہے

جیسے حضرت عمرؓ کی فضیلت بیان کی گئی کہ پچھلی اُمتوں میں کچھ محدث ہوتے تھے۔ جن سے حق تعالےٰ کلام فرماتا۔ میری امت میں وہ حضرت عمر ہیں۔ فرمایا گیا کہ جدھر عمرؓ گھومتے ہیں حق بھی ادھر ہی کو گھوم جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ جدھر حق گھومتا ہے عمرؓ گھومتے ہیں۔ گویا اس درجہ فاروقِ اعظم سراپا صدق اور حق بن چکے ہیں کہ جدھر وہ گھومتے ہیں۔ حق بھی ادھر گھوم جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بارہ، تیرہ مسئلوں میں جو حضرت عمرؓ کی رائے تھی، وہی آسمان سے وحی اتری۔ اس لئے آپؐ نے فرمایا:۔

لو کان بعدی نبیا لکان عمرؓ

اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی اور میرے بعد کوئی نبی آتا، تو وہ عمرؓ ہوتے لیکن چونکہ دنیا میں نبوت باقی نہیں، اسی واسطے کوئی نبی نہیں ہو گا۔ مگر حضرت عمرؓ میں صلاحیت ہے کہ اگر دنیا میں نبی آنے والا ہوتا تو وہ نبی بنائے جاتے۔ یعنی ان کے ذوق کو ذوقِ نبوت سے مناسبت تھی، وحی سے مناسبت تھی۔ رائے وہ قائم کرتے تھے، جس پر وحی آنے والی ہوتی تھی۔ وحی ان کے معاون بن کر اترتی تھی۔ مخالف بن کر نہیں اترتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل میں سے یہ عظیم فضیلت ہے کہ ان کے ذوق کو وحی خداوندی سے کامل مناسبت تھی۔

مجموعۂ امت میں ذوقِ نبوت

مجموعی طور پر یہ امت مل کر اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے تو مجموعۂ امت میں بھی

نبوت کا ایک خاص ذوق ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قائم مقام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریعت اصلیہ لے کر آئے۔ امت نے اجتہاد سے وہ مسائل قرآن و حدیث سے نکالے، اور لا (LAW) اور قانون کی شکل میں پیش کیے۔ پہلے وہ مسائل نہیں تھے اس اُمت کے مجتہدین کے علم میں آئے تو انہوں نے قرآن سے نکال کر پوری شریعت کو گلدستہ بنا کر پیش کر دیا۔ اگر پیغمبر پر وحی اتری تھی تو اس امت کے مجتہدین پر الہام ربانی منکشف ہوا۔ وہ اصلی شریعت لے کر آئے۔ انہوں نے اس شریعت میں سے شریعت وضع کی۔ گویا پیغمبر کے قائم مقام ہو گئے کہ جیسے پیغمبر شرائع لائے تھے۔ اس امت کے مجتہدین بھی شرائع لے کر آئے اور شریعتیں پیش کیں۔ مگر وہ شریعتیں اصل شریعت میں سے نقل تھیں۔ اس لیے علماء لکھتے ہیں کہ القیاس مظھر لا مثبت۔

مجتہد جو قیاس کر کے اجتہاد کرتا ہے تو قیاس کسی مسئلہ کو ثابت نہیں کرتا بلکہ ظاہر کر دیتا ہے۔ مسئلہ شریعت میں پہلے ہی ثابت شدہ ہے۔ مجتہد کا اجتہاد اسے شریعت کے اندر سے نکال کر لاتا ہے۔ ہم میں اور آپ میں وہ فہم نہیں کہ ہم نکال لیں مجتہدین کو وہ فہم دیا گیا کہ وہ نکال کر پیش کر دیتے ہیں۔

بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے کنواں ہے اس میں پانی بھرا ہوا ہے۔ ڈول رسی جس کے ہاتھ میں ہے پانی وہی نکالے گا۔ گویا مجتہد کا اجتہاد بمنزلہ ڈول رسی کے ہے کہ وہ قوت سے کھینچتا ہے، اور پانی کو نالیوں میں، نہروں میں اور جنگلوں میں بہا دیتا ہے جس سے کھیت سیراب ہوتے ہیں۔

اُمتِ محمدیہ کی مثال

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری لائی ہوئی شریعت کی مثال ایسی ہے۔ جیسے آسمان سے شدید قسم کی بارش اتری، اور موسلا دھار پانی زمین پر برسنا شروع ہوا۔

پانی آکر پڑا۔ تو زمین کے تین حصّے ہو گئے۔ ایک ٹکڑا نہایت پاکیزہ، نہایت عمدہ تھا۔ اس نے پانی کو جذب کیا۔ اور جذب کر کے طرح طرح کے پھل اور پھول چمن اور رنگ برنگ کے باغ لگائے، اور دنیا کو مہکا بنا دیا ـــــ ایک ٹکڑا ایسا تھا کہ کچھ اُگا تو نہیں سکا، مگر اس نے بارش کے پانی کو جمع کر لیا۔ بڑے تالاب بھر دیئے کہ لوگ اس سے پانی لے جاتے ہیں، سیراب بھی ہوتے ہیں، تو وہ زمین اگر پھل پھول نہ نکال سکی، تو اس نے پانی جمع کر لیا۔

اب تیسرا ٹکڑا ایسا تھا کہ وہ چٹیل میدان تھا۔ نہ پانی کو جذب کر سکا نہ جمع کر سکا۔ پانی آیا اور بہہ کر اِدھر اُدھر نکل گیا، اور وہ خالی کا خالی رہ گیا۔

فرمایا اس طرح سے وحی کا پانی اترا، تو قلوب کی دنیا تین حصوں میں منقسم ہو گئی ـــــ ایکؔ وہ قلوب جنہوں نے وحی الٰہی اور علمِ ربانی کے پانی کو جذب کیا، یہ طبقہ فقہاء اور علماءِ ربانی کا تھا۔ دوؔسرے وہ قلوب جنھوں نے جذب تو نہ کیا مگر پانی جمع کر لیا یہ طبقہ حفاظ اور محدثین کا تھا۔ تیؔسرے وہ قلوب جن پر کوئی اثر نہیں ہوا اور یہ طبقہ کفار کا ہے۔

علمائے اُمّت محمدیہ کی خدمات

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اصل شریعت لے کر آئے اور اس امّت کے مجدّدین و مجتہدین نے اس شریعت میں سے مسائلِ استنباطیہ نکالے۔ ان پر وحی تو نہیں آتی تھی۔ مگر ان کے قلوب پر الہام ہوتا تھا۔ انبیاءؑ کے ہاتھوں پر معجزات ظاہر ہوئے، ان کے ہاتھوں پر کرامتیں ظاہر ہوئیں۔

اس مضمون کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ـــ گو حدیث ضعیف ہے مگر علماء اس حدیث سے جگہ جگہ استدلال کرتے رہے ہیں کہ

میری اُمت کے علماء ایسے ہوں گے جیسے بنی اسرائیل کے پیغمبر۔ یعنی پیغمبر تو نہیں ہوں گے، مگر کام وہ کریں گے جو پیغمبروں نے کیا۔ ان کے کام کی نوعیت وہ ہوگی، جو انبیاءؑ کے کام کی تھی، جیسے ایک نبی جس خطے میں آتا ہے تو اس خطے کو ایمان سے رنگ دیتا ہے، اور لوگ مومن بنتے چلے جاتے ہیں۔ عالم وعارف بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس امت کے علماءِ ربانی اور مجتہدین وہ ہیں کہ ایک عالمِ ربانی جہاں بیٹھ گیا، ہزاروں کے ایمان کو سنبھال گیا... ہزاروں کو ایمان سے رنگ دیا —— امام ابو حنیفہؒ ہیں پورا ہندوستان تو کیا، پاکستان (بنگلہ دیش) افغانستان اور پورا ترکستان حنفی۔ ایک عالمِ ربانی، ایک مجتہد اٹھا، کروڑوں کے ایمانوں کو درست کیا۔ کروڑوں کو جنت تک پہنچا دیا —— امام شافعیؒ مکہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی عمر مکہ میں گذاری۔ اخیر عمر مصر میں، اور وہیں وفات پائی۔ تو حجاز تقریباً سب کا سب شافعی ہے۔ ایک عالمِ ربانی اترا، اس نے ملکوں کو ایمان سے رنگ دیا، اور لاکھوں متبع شریعت پیدا کئے۔ جتنے حنابلہ ہیں وہ کثرت سے ادھر ہی مغربی ممالک میں زیادہ مالکیہ ہیں۔ امام مالکؒ کا ظہور ادھر ہوا، اور ہزاروں علماء پیدا ہوئے۔ امام بخاریؒ عبداللہ ابن مبارکؒ امام نوویؒ امام اسحٰقؒ یہ سب وہ ہیں جو صاحبِ مذہب تھے اب یہ الگ چیز ہے کہ یہ مذاہب ختم ہو گئے۔ ان چار مذاہب کو قبولِ عام ہو گیا یہ کوئی ارادی اور اختیاری چیز نہیں ہے۔ یہ منجانب اللہ ہے جیسے صوفیائے کرام کے سلاسل تو بہت سے ہیں لیکن قبولِ عام زیادہ تر چار سلسلوں کو ہوا۔ سلسلہ چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ۔ تو یہ قبولیت منجانب اللہ ہے —— حاصل یہ ہے کہ اس امت میں ہزاروں آفتاب و ماہتاب پیدا ہوئے، جن کی روشنی سے دنیا مستفیدہ ہوئی۔ جہاں ایک بیٹھ گیا، کروڑوں کے ایمان درست ہو گئے

آفتابِ عالم آمتاب صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد آمد

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت کے علماء، انبیاءِ بنی اسرائیل کی

مثل ہوں گے۔ یعنی پہلی امت میں جو کام نبیؐ سے چلتا تھا۔ اس امت میں ختم نبوت کے طفیل وہ کام مجتہدین و مجددین اور علمائے سے چلے گا۔ گویا ایک ہی نبوت اتنی قوی ہوگی کہ اور نبوتوں کی قوت باقی نہیں رہے گی ——— جیسے مثلاً رات ہو جائے، تو آسمانوں پر ہزاروں ستارے طلوع کرتے ہیں۔ اربوں، کھربوں ستارے۔ جدھر دیکھو ستارے۔ کروڑوں ستارے روشنی دار جمع ہیں مگر رات کا دن نہیں بنتا۔ ہے رات کی رات، یعنی تاریکی کلیۃً زائل نہیں ہوتی ——— تو ستاروں نے روشنی پھیلائی۔ اس میں لوگ کچھ کام کاج بھی کرتے ہیں مگر انڈوں کی ضرورت ہے، ٹیوب لائٹوں کی ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہ رات کا دن ہو جائے ——— لیکن جونہی آفتاب عالم تابؐ کی آمد آمد ہوتی ہے۔ ابھی پو پھٹی ہے۔ آفتاب نے طلوع نہیں کیا۔ صبح صادق نے خبر دی کہ آفتابِ عالم تاب جو روشنی کا بادشاہ ہے، آ رہا ہے ——— آمد کی خبر تھی کہ ستارے بھی غائب، رات بھی غائب، اور دن نمودار ہونا شروع ہو گیا۔ اور جب سُورج آتا ہے تو سارے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ستاروں کا نور چھن گیا بلکہ اتنا ماند پڑ گیا کہ مدھم ہو جاتا ہے کیونکہ سُورج کے نُور میں کوئی امتیازی طور پر دکھلائی نہیں دیتا اگر آفتاب یوں کہے کہ میرے بعد کوئی ستارہ نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں خاتم الانوار ہوں۔ نور کا خزانہ ہوں۔ میرے آنے کے بعد اب کسی ستارے کی حاجت باقی نہیں۔ سارا دن گذر جائے گا، میری روشنی کام دیتی رہے گی۔ میدانوں میں میری دُھوپ پڑے گی۔ اس سے کام لے۔ اگر کوئی میدان میں نہ آسکے، تو گھر کے دروازے کھول دے۔ اس میں بھی چاندنی پہنچ جائے گی۔ اور اگر کوئی تہہ خانے میں بیٹھا ہوا ہے تو کم از کم کچھ دمک چمک ہی پیدا ہو جائے گی۔ اس سے بھی کام کر سکتا ہے۔ تاریک سے تاریک کوٹھڑے میں میری روشنی پہنچے گی۔ دن میں چراغ جلانے کی ضرورت نہیں۔ سوائے اس کے کہ کوئی آنکھوں کا نین سکھ ہی بن جائے کہ دن میں بھی بجلیاں جلائے، اُس کا تو کوئی علاج نہیں، ورنہ سُورج نے ہر روشنی سے مستغنی کر دیا ہے۔

اسی طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام آسمانِ نبوت کے ستارے ہیں۔ یکے بعد دیگرے

انبیا علیہم السلام طلوع ہوئے۔ ایک ایک وقت میں ہزاروں نبی تھے۔ نبی اسرائیل میں
• چار چار ہزار نبی ایک وقت میں آئے ——— تو آسمانِ نبوت پر آدم علیہ السلام کا ستارہ طلوع ہوا۔ نوحؑ کا ستارہ طلوع ہوا۔ ابراہیم خلیل اللہؑ آئے۔ موسیٰ و عیسیٰ (علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام) آئے مگر رہی رات، دن نہیں نکلا۔ جونہی آفتابِ نبوت کی بشارت دی گئی۔ پو پھٹی، اور صبح صادق ہوئی، یعنی عیسےٰ علیہ السلام نے پانچ سو برس پہلے آکر کہا ——— مبشرًا برسول یاتی ——— من بعدی اسمہ احمد (پ۲۸) ۔ میں ایک ایسے رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئیں گے۔ ان کا نامِ نامی احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا۔

صبح صادق کا نمایاں ہونا تھا کہ قلوب میں جگمگاہٹ شروع ہوگئی۔ ای جاہلیت کے دور میں دل توحید و رسالت کی طرف مائل ہونا شروع ہوئے۔ جہالتیں رفع ہونا شروع ہوئیں۔ اور جب فاران کی چوٹیوں سے آفتاب طلوع ہوگیا تو جس دل میں ذرا سی بھی استعداد تھی، اس میں نور داخل ہوا اور روشنی آنی شروع ہوئی۔ قیامت تک یہ دن لمبا دن ہے، جو ہزاروں برس کا ہوگا۔ جیسے کہ اب بارہ گھنٹے کا دن ہوتا ہے۔ تو صبح صادق تو گھنٹے سوا گھنٹے کی ہوتی ہے۔ جتنا بڑا دن اتنی بڑی صبح صادق ——— یہ دن چونکہ ہزاروں برس کا تھا، تو اس کی صبح بھی پانچ سو برس کی ہوئی ——— عیسےٰ علیہ السلام کے دور سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک تک ——— اس کے بعد قیامت کا دن ہوگا۔ صبح قیامت کا دوسرا دن ہوگا۔ تو قیامت کی صبح تک اب آفتاب عالم تاب کی روشنی کافی ہے، کسی اور ستارے کی ضرورت نہیں۔ یہی ایک ستارہ (آفتاب) پورے عالم کو نور پہنچائے گا، اور پہنچا رہا ہے۔

مختلف صورتوں میں ایک ہی نور

اس کی روشنیوں کے ظہور مختلف ہیں۔ مجددین میں اس کی روشنی کا ظہور رہا ہے۔

علمارِ ربانی میں اس کی روشنی کا ظہور ہے۔ صوفیائے کرام میں اسی کی روشنی کا ظہور ہے۔ کسی نے عالمِ باطن کھولا، کسی نے عالمِ ظاہر کھولا۔ کسی نے مسائل شرعیہ پیش کئے، کسی نے مسائلِ باطنیہ پیش کئے۔ کسی نے نفس کی الجھنیں دور کیں۔ کسی نے مکائدِ نفس پر روشنی ڈالی۔ کسی نے فضائلِ اخلاق پیش کئے اور رذائل اخلاق کو دھکا دیا۔ ایک ہی نور ہے جو مختلف صورتوں سے کام کر رہا ہے — اور یہ پوری امت اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے۔

اُمتِ محمدیہ سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا

فرما دیا گیا — لا تجتمع امتی علی الضلٰلۃ — میری پوری اُمت مل کر کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ حق کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ فرقے ہوں گے، گروہ بندیاں ہوں گی۔ مگر ایک فرقہ ناجیہ ضرور ملے گا، وہ وہی کرے گا جو میں کر رہا ہوں وہی کہتا ہے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔ وہی باتیں پیش کرے گا جو میں کر رہا ہوں۔ فرمایا۔ اس اُمت میں ہر صدی پر ایک نہ ایک مجدّد آتا رہے گا۔ جماعت کی شکل میں ہو یا فرد کی شکل میں۔ مختلف خطوں میں مختلف مجدد ہوں گے جو دین کو نکھارتے رہیں گے —

آپؐ نے فرمایا۔ وہ امت کیسے ضائع ہو سکتی ہے جس کے اوّل میں تو میں ہوں، اور آخر میں مسیح علیہ السلام آسمان سے نزول کریں گے، اور بیچ میں حضرت مہدی علیہ السلام ہوں گے۔ وہ اُمت کیسے ضائع ہوگی — جس میں اتنے بڑے بڑے مجدد پیدا ہوں گے۔ تو صدی پر وعدہ کیا، مجموعۂ اُمت پر (عدم گمراہی کا) وعدہ کیا۔

پھر صدی کے اندر ہر دن کے لئے بھی وعدہ ہے۔ فرمایا:۔ اس اُمت میں ہمیشہ سلف سے خلف علم حاصل کرتے رہیں گے، جو اخلاف رشید ہوں گے وہ اسلاف سے علوم لیتے رہیں گے۔ اور اس علم کے ذریعے غلو کرنے والوں کی تحریفات کا پردہ چاک

کریں گے۔ ان کے غلو کو کھول کر رکھ دیں گے۔ اور کم عقلوں اور جاہلوں کی تاویلات کا پردہ چاک کر کے قرآن وحدیث کا اصل روپ پیش کر دیں گے۔ جس سے روز بروز دین نکھرتا رہے گا۔ تو مجموعی طور پر اُمت حق پر مجتمع ہے۔ ہر صدی پر مجدد آئیں گے صدی کے اندر علماء پیدا ہوں گے۔ اُمت ضائع نہیں ہوگی۔ تو پوری امت مجموعی طور پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام ہے، اور جتنے کام آپؐ کے ہیں وہ اس اُمت میں بٹے ہوئے ہیں ـــــ آپؐ نے تلاوتِ آیات کی تو حفاظ کا طبقہ کھڑا ہو گیا جو تلاوت کر رہا ہے۔ آپؐ نے تعلیماتِ کتاب کیں، تو علماء اور فقہاء کا طبقہ کھڑا ہو گیا جس نے کتاب کی تعلیم دینا شروع کی۔ آپؐ نے تعلیمِ حکمت دی، اسوہ حسنہ پیش کیا، تو صوفیاء کا طبقہ کھڑا ہو گیا جس نے وہی کردار اور کریکٹر بنا کر دکھلا دیا، اور لوگوں کو اس پر چلایا۔ جو آپؐ کا کردار تھا۔ آپؐ نے تزکیۂ نفس کیا۔ ریاضت ومجاہدے سے نفوس کو مانجھا، تو اُمت میں صوفیاء کا طبقہ کھڑا ہوا۔ جس نے قرآن وحدیث کی روشنی میں ریاضت اور مجاہدے کے اصول مرتب کئے، اور امت کی تربیت کی۔

جو فرائض پیغمبر کے تھے، وہ بجنسہٖ آج بھی باقی ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ علماء میں بہت سی خطائیں ہوں، بہت غلطیاں بھی ہوں، بہر حال وہ معصوم تو نہیں لیکن حق منقطع ہو جائے" یہ نہیں ہو سکتا۔ لوگوں کا کام یہ ہے کہ ان کے بیان کردہ مسائل پر چلیں۔ ان کے ذاتی کردار سے قطع نظر کریں اگر کوئی برائی ہے تو ذات کے لئے چھوڑ دیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کا زریں مقولہ

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں سوائے انبیاء علیہم السلام کے کوئی آدمی ایسا نہیں جس میں صرف خیر ہی خیر ہو، اور کوئی ایسا نہیں جس میں شر ہی شر ہو۔ خیر بھی ہے شر بھی ہے۔ بھلائی بھی ہے بُرائی بھی ہے۔ نیکی بھی ہے بدی بھی

ہے ـــــ دانشمند وہ ہے کہ اس کی ہر ایک نیکی سے فائدہ اٹھائے اور اس کی بدی اس کے لئے چھوڑ دے۔ کہ تو جانے اور تیرا خدا جانے ـــــ تو پوری امت فرشتہ دکھائی دے گی۔ یوں معلوم ہوگا کہ سب خیر ہی خیر ہے ـــــ آج ہم ہر شخص کی شر کو لیتے ہیں، اور خیر کو دھکا دے دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساری امت میں شر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ ساری خیر ماند پڑ گئی۔ تو دانشمندی کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کی خیر سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر اس میں شر ہے وہ خدا کے حوالہ کرو۔ تم سے اس کے شر کا سوال نہیں ہوگا، اسی سے سوال ہوگا وہ نمٹے گا۔ تم اس کی خیر کو اپناؤ۔ (ہوسکے تو اس کے لئے دعا ہی کردو) ـــــ یہ تو انبیاء علیہم السلام کی صفات ہیں کہ ان کا چلنا پھرنا، کہنا سننا، سب حجت ہے۔ ہر گناہ، ہر برائی سے معصوم ہیں، انبیاء علیہم السلام کے بعد اور کوئی معصوم نہیں، اولیاء اللہ محفوظ ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود محفوظیت کے امکان ہوتا ہے کہ غلطی سرزد ہو جائے اور ہوتی رہتی ہے ـــــ تو آپ کا یہ کام نہیں ہے کہ آپ ان کی کمزوریوں پر نظر کریں۔ آپ کا کام یہ ہے کہ جو علم ان کے اندر سے نکل رہا ہے، وراثت کے طور پر اس کو اختیار کریں، اور ان کی برائی کو ان پر چھوڑ دیں، یا اگر خیر خواہی کا جذبہ ہو تو آپ تنہائی میں ادب سے کہیں کہ یہ غلطی ہے آپ اسے چھوڑ دیں۔ وہ آپ کے ممنون ہوں گے۔

حُسنِ ظن اختیار کرنے کی ضرورت

لیکن ہر شخص کی برائیوں کو اچھالنا، اس سے پوری قوم کو رسوا کر دینا ہے ـــــ فرمایا گیا: ـــــ ظنوا بالمؤمنین خیرًا ـــــ مومنوں کے ساتھ حُسنِ ظن اختیار کرو۔ حُسنِ ظن کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ بدظنی کے لئے جب تک کوئی دلیل نہیں ہوگی، بدظنی کی اجازت نہیں ـــــ یہ فرض ہے کہ ہر شخص حسنِ ظن رکھے ـــــ جب ایسے دلائل ہی مہیا ہو جائیں کہ برائی پیدا ہی ہوگئی تو بے شک بدظنی قائم ہے۔

اب اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ آپ اسے اچھالتے پھریں۔ نصیحت کریں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے اور فرمایا:-

"اے اللہ! میں مکار دوست سے پناہ مانگتا ہوں کہ اس کی آنکھیں دیکھتی رہیں۔ میری ہر نقل و حرکت کی رقیب بنی رہیں، اگر بدی سامنے آئے اُسے اچھال دیا۔ نیکی سامنے آئی اسے دفن کر دیا۔ ایسے مکار دوستوں سے میں پناہ مانگتا ہوں ——"

ہمیں اور آپ کو ایسا دوست نہیں بننا چاہیئے۔ بلکہ کسی کی نیکی سامنے آئے تو اسے اچھال دو۔ بدی سامنے آئے تاویل کر دو —— پیار و محبت سے سمجھا دو، نصیحت کرو۔ نہیں مانتا تو خدا کے حوالے کرو۔ وہ جانے اس کا خدا جانے —— پھر بھی اس میں کوئی نیکی ہے، علم کی بات ہے تو ہم اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

ہر جگہ سے آدمی حصولِ خیر کرتا رہے

مولانا حبیب الرحمٰن، حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری ؒ کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ بڑے صاحبزادے مولانا خلیل الرحمٰن صاحب تھے جو جمعیۃ علماء ہند کے ناظم رہے تھے —— وہ بڑے بلا کے ذہین تھے۔ ان کی ذکاوت ضرب المثل ہو گئی تھی۔ ان کی ذکاوت و ذہانت عجائبات تھی۔ شروع عمر جوانی میں کوئی بُرائی ایسی نہیں جو ان سے سرزد نہ ہوئی ہو۔ یعنی جوا تک کھیلا، غضب کیا۔ دوسروں کا مال و دولت جھپٹ لیا —— یہ واقعہ ہے کہ علمی استعداد اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ دیوبند تشریف لاتے تو طلباء مٹے ہوئے تھے۔ ان کے علم کی وجہ سے ان پر قربان تھے —— اسٹیشن سے شہر کی طرف آ رہے ہیں۔ طلباء کے ہاتھوں میں ہدایہ ہے۔ ہدایہ کا سبق ہو رہا ہے۔ اور طلباء پیچھے پیچھے ہیں۔ دیوبند میں پہنچے۔ بازار میں بنیا رہتا تھا۔ بلا اس کا

نام تھا۔ بہت جواری تھا۔ اس کے مکان کے نیچے بنیئے کو آواز دی۔ وہ سامنے آیا تو کہا کہ "تو پَٹ لے گا جوتا، یا چت لے گا" اس نے کہا پَٹ۔ بس جوتا پھینکا وہ چت گرا۔ دس ہزار کی شرط ٹھہری۔ دس ہزار لے کر آگے روانہ ہوئے۔ بنیا شرط ہار گیا ــــ اور ساتھ ساتھ سبق بھی ہو رہا ہے۔

ایک دفعہ ایک بنیئے سے قرض لیا۔ بیس ہزار روپے کی دستاویز لکھ دی۔ دستخط کر دیئے۔ میعاد طے ہو گئی کہ برس دن بعد ادا کریں گے ــــ برس دن بعد، بنیئے نے مانگا کہ میرا روپیہ۔ کہا کیسا روپیہ؟ ــــ کہا کہ حضرت وہ جو آپ نے لیا تھا۔ فرمایا! مکار! ہم نے کب لیا تھا۔ اس نے کہا صاحب دستاویز لکھی ہے۔ کہا غلط ہے۔ کوئی دستاویز نہیں، بھاگ جا یہاں سے۔

اس نے جا کر عدالت میں دعوٰے دائر کر دیا۔ دستاویز اس کے پاس تھی۔ مولانا کے اس پر دستخط تھے۔ کہا کہ انہوں نے بیس ہزار روپیہ مجھ سے لیا، اور دستاویز جج کے میز پر رکھ دی۔ مولانا نے کہا کہ حضور میں بھی دستاویز دیکھ سکتا ہوں ــــ انہوں نے کہا دیکھو، تمہارے لئے تو حجت ہے .... تو اس نے اس طرح سے وہ کاغذ پکڑا یا کہ اوپر کا سرا تو جج کے ہاتھ میں تھا اور نیچے جہاں ان کے دستخط تھے، دوسرا ان کے ہاتھ میں تھا ــــ خدا جانے انگوٹھے میں کوئی مسالہ لگا کر گئے تھے۔ کیا صورت تھی۔ اس طرح سے اس کو پکڑ کر مسلا ہے کہ جب کاغذ میز پر رکھا، وہ دستخط غائب تھے، سادہ کاغذ تھا ــــ مولانا نے کہا کیا یہ دستاویز آپ کو بنیئے نے دی ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ فرمایا کہ جعلی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر تو دستخط نہیں، گمنام ہے۔

دیکھا تو اس پر کسی کے دستخط نہیں تھے۔ جج نے غصے کے لہجے میں بنیئے سے کہا۔ گمنام دستاویز لے کر یہاں آئے ہو؟ ــــ اس نے کہا حضور! دستخط تھے، میں حلف کرتا ہوں۔ اس نے کہا تھے تو کہاں گئے؟ کوئی جن کھا گیا۔ کوئی اسے لے گیا۔ کہاں گئے دستخط؟ بنیئے نے سر پیٹ لیا۔ آخر مولانا کی

ڈگری ہوئی۔ بیس ہزار روپے کا اور دعویٰ کر دیا کہ میری حیثیت کی ہتک ہوئی ہے بیس ہزار اور وصول کر لیے ـــــ یہ کیفیت تھی۔

سُنار کو گھر بلایا کہ زیورات کی ضرورت ہے۔ شادی ہونے والی ہے۔ دس پندرہ ہزار کے زیورات لینے ہیں ـــــ فرمایا کہ اتنی مہلت ہے، اجازت ہے کہ ہیں گھر کی عورتوں کو دِکھلا آؤں۔ اس نے کہا ضرور دِکھلا دیجئے۔ کوئی بے اعتباری تھوڑا ہی ہے۔ بس وہاں سے لے جاکر آدھ گھنٹہ میں جو کام کیا کہ سارے نگ اکھاڑ کر چھوٹے چھوٹے پرچوں پر دستخط کر کے نیچے رکھ دیئے، اور نگوں کو اس طرح جڑ دیا جس طرح تھے۔ اور لاکر واپس کر دیئے۔ وہ لے کر چلا گیا ـــــ

مولانا نے جاکر عدالت میں دعوےٰ دائر کر دیا کہ سُنار میرے گھر سے پندرہ ہزار روپے کے زیورات چرا کر لے گیا ہے۔ اور پتہ نہیں ہے کہ کہاں ہیں ـــــ تو فوراً سمن جاری ہوا۔ اس کی طلبی ہوئی۔ عدالت میں حاضر ہوا۔ مولانا کا دعویٰ تھا کہ پندرہ ہزار کے زیور لے گیا ہے۔ اس نے کہا صاحب! میں کسی کے زیور نہیں لایا۔ دِکھلانے کے لئے لے گیا تھا ـــــ مولانا نے کہا یہ جھوٹا ہے۔ چرا کے لے گیا ہے۔ بات بنا رہا ہے کہ میں دِکھلانے کو لے گیا تھا۔ ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی۔ میں خود دکان پر جاکر دیکھ آتا۔

جھڑپ شروع ہوئی۔ تو جج نے کہا "کوئی ثبوت"؟ مولانا نے کہا کہ ثبوت یہ ہے کہ اس کے سارے زیور عدالت میں طلب کر لئے جائیں۔ میں اپنے زیور پہچان لوں گا۔ چنانچہ سارے زیور عدالت میں حاضر کئے گئے۔ مولانا نے جتنے ان کی نگاہ میں آچکے تھے، سب الگ کر دیئے۔ اور کہا کہ "یہ ہیں وہ سب زیور"۔ ـــــ سُنار نے شور مچایا کہ صاحب ان کے کہاں سے آئے؟ یہ میری دکان کے زیور ہیں، ان کے نہیں ـــــ

جج نے کہا "ثبوت"؟ ـــــ انہوں نے کہا کسی زیور کا نگ اکھاڑ کر دیکھ لیجئے ہر نگ کے نیچے میرے نام کے دستخط موجود ہیں۔ اب جس نگ کو اٹھاتے نیچے مولانا

کے دستخط تھے ــــــ

پندرہ ہزار کے زیوروں پر دستخط موجود تھے۔ آخر وہ زیور مولانا کو مل گئے اور گھر لے کر چلے آئے ــــــ یہ حالت تھی اور ساتھ ہی علمی استعداد کا یہ حال کہ سڑک پر بھی جا رہے ہیں تو طلبا ر پیچھے ــــــ مگر خیر آخر میں اللہ تعالےٰ نے توبہ نصیب فرمائی۔ اور اس درجہ پر پہنچے کہ پوری پوری راتیں نوافل و تلاوت قرآن مجید، اور درود شریف میں گزری ہیں .... یہ ان کا عام معمول تھا کہ جمعہ کی پوری رات درود شریف پڑھ کر گزارتے۔ سوتے نہیں تھے ـــ جیسے حضرت سفیان ثوریؒ نے کہا ہے کہ ہم نے علم دنیا کی طلب کے لئے حاصل کیا تھا۔ مگر علم نے کہا کہ میں غیر کی طرف نہیں جاؤں گا۔ تو ہمیں بھی اللہ سے ملا دیا ــــــ انہوں نے علم سیکھا تو بالآخر اس علم نے اپنی طرف کھینچا۔ یہ چیزیں ختم ہوئیں۔ اخیر عمر ان کی نہایت مقدسانہ اور نہایت پاکیزہ زندگی بن گئی ــــــ مگر میں نے اس پر یہ عرض کیا کہ باوجود ان خرافات کے، ان کی برائیوں کے چونکہ علم تھا، تو طلبا ان کے جوئے کے درپے نہیں تھے۔ ان کے علم کے درپے تھے کہ یہ ہمیں مل جائے۔ ان کا جوا ان کے ساتھ ہے، اللہ جانے اور وہ جانیں۔

پوری اُمت میں خیر کیسے نمایاں ہو سکتی ہے

اگر پوری اُمت میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہر شخص کی خیر سے فائدہ اٹھاؤ، اور اس کی شر کو اس کے لئے چھوڑ دو۔ تو ساری امت نیک نظر آئے گی۔ اور اگر پوری امت کے ایک ایک فرد کی بُرائیاں اچھالیں گے اور نیکیاں دفن کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ساری اُمت بُرائیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس اُمت میں کوئی نیک آدمی نہیں۔ اس جذبے سے ہم پوری اُمت کو بُرا کر کے دکھلا رہے ہیں۔ نہ اجتماعیت باقی ہے، نہ اتحاد و وحدت، اور نہ قلوب کی یگانگت۔ اس لئے ہر شخص کی نظر بُرائی پر ہے۔ اپنی

جانب سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں سب سے اونچا اور دوسرا حقیر ——— اور دوسرا یہ سمجھتا ہے کہ میں سب سے اونچا اور وہ حقیر۔ سات فقیر ایک کمبل میں سو سکتے ہیں مگر دو بادشاہ ایک ملک میں جمع نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ فقیر میں تواضع ہے اور بادشاہ میں کبر ——— تو کبر دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہونے دیتا۔ ہر شخص نے کبر و نخوت کو پیشہ بنا لیا۔ اس لئے فسادات اور جھگڑے بھی ہیں۔

تواضع پیدا ہو جائے تو جھگڑے ختم ہو جائیں۔ جب آپ دوسرے سے یوں کہیں گے کہ آپ بڑے ہیں۔ میں آپ کا خورد ہوں۔ وہ کہے گا کہ آپ بڑے ہیں، میں آپ کا خورد ہوں۔ لڑائی کیسے ہوگی؟ ——— لڑائی اس سے ہوگی کہ آپ کہیں میں عزت والا ہوں تم ذلیل ہو۔ اس نے کہا میں عزت والا ہوں تم ذلیل ہو۔ بس لاٹھی چل پڑے گی۔ جب ہر شخص یہ کہے کہ حیثیت تو آپ کی ہے، میں تو آپ کا خادم ہوں۔ تو پاؤں میں پڑے سانپ کو بھی کوئی نہیں مارتا ——— بہر حال امت میں آپ جہاں دیکھیں کہ جھگڑا چلتا ہے، تو سمجھ لیں کہ کوئی متکبر آگیا، کوئی صاحب نخوت موجود ہے، جسے اقتدار کی ہوس ہے۔ جاہ پسندی اس کے اندر گھر کئے ہوئے ہے۔ وہیں جھگڑا شروع ہوتا ہے۔

دو ہی چیزیں ہیں جو امت کو تباہ کرنے والی ہیں۔ ایک حُبّ جاہ اور ایک حُبّ مال۔ جاہ اللہ کی دین ہے اسے استعمال کیا جائے۔ اس پر فخر نہ کیا جائے۔ مال اللہ کا انعام ہے۔ اس کے بتلائے ہوئے مصارف میں اس کو استعمال کیا جائے۔ نہ کہ مال کو کوئی خدا بنانے کی چیز ہے کہ آدمی سربسجود ہو کر جھک جائے۔ یہ تو استعمال کی چیزیں ہیں۔ بندہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو اس کی جاہ کی جاتی ہے محنت کرتا ہے تو اسے مال دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں خدا کی ہیں ——— خدا ہی کے لئے استعمال میں آتی ہیں۔ اس واسطے کہ اگر ان چیزوں کو ہم مخلوق کے لئے استعمال کریں۔ اپنی نخوتوں کا سامان نہ بنائیں تو پوری اُمت میں خیر نمایاں ہوگی۔

بحیثیت مجموعی اُمّت بھی معصوم ہے

تو میں اس پر عرض کر رہا ہوں کہ پوری اُمّت اپنے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام ہے۔ جیسے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم معصوم تھے، بحیثیت مجموعی اُمّت بھی معصوم ہے۔ اس میں طبقات بُرے ہوں گے، افراد بھی بُرے ہوں گے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے اُمّت معصوم ہے۔ یعنی دین ضائع نہیں ہو سکتا، کہ دین ختم ہو جائے، اور گمراہی عام ہو جائے۔ ہدایت بالکل باقی نہ رہے ——— اہل ہدایت باقی رہے گی۔ تو مجموعی حیثیت سے گویا عصمت کے مقام پر ہے کہ اُمّت ضائع ہو کر کسی دوسری اُمّت کا وجود ہو۔ یہ نہیں ہو گا۔ جیسے پہلی امتیں ختم ہوتی تھیں۔ نئی اُمّت کی بُنیاد پڑتی تھی ——— تو وہ یہ ہوتا تھا کہ ایک نبوت ختم ہوئی دوسری نبوت کی بُنیاد پڑی۔ اب نبوت ایک ہے جو قیامت تک رہے گی۔ تو امت بھی ایک ہے کہ قیامت تک رہے گی۔ اس لئے اس میں حق بھی رہے گا۔ یہ نہیں ہو گا کہ حق منقطع ہو جائے، اور گمراہی پھیل جائے ———

ہمہ وقت اللہ کا دھیان رہے

تو ساری ہدایتوں کا اجتماع جُمعہ کے طفیل ہوا۔ جمعہ ہی آدم علیہ السلام کو نیچے لانے کا ذریعہ بنا۔ وہ نیچے آئے تو اولاد پیدا ہوئی، اور پیغمبریاں بھی ظاہر ہوئیں، نبوتیں بھی نمایاں ہوئیں۔ علم و کمال نمایاں ہوئے۔ پاکیزہ اخلاق بھی نمایاں ہوئے، اور اب تک یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ تو جمعہ کا دن ان تمام کمالات کا جامع اور سبب ہے۔ اس سے ہم فائدہ اٹھائیں کہ جس طرح ہم یہاں جمع ہوئے، کاش باہر جا کر بھی

ہم بھائی بھائی بنے ہوئے ہوں۔ اسی طرح ہمارے قلوب میں یکسانی ہو۔ مسجد اور باہر کا فرق کیا ہے؟ ــــ یہ کہ جب آپ باہر جائیں گے تو دنیا سامنے ہوگی۔ جب جمعہ کے لئے مسجد کے اندر آئے تو اللہ میاں سامنے ہیں ــــ معلوم ہوا خدا سامنے ہو تو وحدت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا سامنے ہو تو انتشار پیدا ہوتا ہے۔ ــــ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ دنیا کو چھوڑ دو۔ کسب حلال تمہارے اوپر فرض ہے۔ ــــ اسلام میں یہ ہے کہ دنیا پر قابو پا کر اس کی محبت ترک کردو۔ دنیا کو استعمال کے لئے رکھو۔ اور تمہاری شان ہو کہ:۔

ع دل بیار و دست بکار

ہاتھ پیر کام میں لگے ہیں اور دل اپنے مالک میں لگا ہوا ہے۔ گویا اپنے پروردگار سے باتیں کر رہا ہے۔ غرض ترک دنیا اسلام میں اس معنیٰ پر نہیں ہے کہ شہروں کو چھوڑ دو۔ آبادیوں کو چھوڑ دو۔ لذات کو ترک کردو۔ حکم دیا گیا۔

كلوا من الطيبٰت واعملوا صالحًا

پاک غذائیں کھاؤ۔ اور عملِ صالح اختیار کرو ــــ فرمایا گیا

فانكحوا ما طاب لكم من النسآء مثنىٰ وثلٰث وربٰع ــــ نکاح بھی کرسکتے ہو، ضرورت پڑے تو چار بھی کرسکتے ہو۔ بشرطیکہ ضرورت پڑے اور عدل اجازت دے۔ اور دل میں عادل بنو تب ویسے نہیں ــــ مکان بنانے کے بارے میں قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے احسان جتلایا ہے۔

واللہ جعل لكم من بيوتكم سكنًا۔

ــــ اللہ نے تمہارے لئے سکون کی جگہ رکھی۔ سکونت کی جگہ رکھی کپڑوں کے گھر دیئے، چمڑوں کے گھر دیئے۔ اگر گھروں میں بسانا منظور نہ ہوتا، جنگلوں میں بسانا منظور ہوتا تو احسان کیوں جتلایا جاتا۔ تو کھلنے کی اجازت،

پینے کی اجازت۔

اور فرمایا:۔ قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبٰت من الرزق۔

کہہ دے اے پیغمبر! کون ہے جو اللہ کی دی ہوئی نعمت و زینت کو اپنے لئے حرام کرے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ حلال طریقے پر لذات کو استعمال کرو، اور شکرِ خداوندی بجالاؤ، اور عملِ صالح اختیار کرو۔

اسلام میں ترکِ دنیا کا مفہوم

اِسلام میں ترکِ دنیا کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آدمی شہروں کو چھوڑ کر ساری لذات سے منہ موڑ کر جنگلوں میں پہاڑوں میں جا بیٹھے۔ بلکہ یہ معنیٰ ہیں کہ مال کمائے، شہر بسائے آباد کرے۔ سب میں رہے پھر بھی اللہ سے متعلق رہے۔

معبود ایک ہے۔ یہ چیزیں پرستش کے لائق نہ بنائیے۔ تو روپے پیسے کو معبود مت بناؤ۔ اللہ نے یہ دولت خادم بنا کر دی ہے، مخدوم بنا کر نہیں دی کہ آدمی ان کی پرستش میں لگ جائے۔ جاہ و عزت آدمی کو اللہ نے اس لئے دی ہے کہ اس کے ذریعے باطل کو دفع کیا جائے۔ اس اقتدار سے مدافعت میں کام لیا جائے۔ اس لئے نہیں دی گئی کہ آدمی غرور کی شکل میں بولے۔ بڑا بول بھرے، متکبر بنے، اور عقل کے لئے مال دیا گیا ہے۔ مال کے لئے وہ چیزیں جمع کرو جو نافع ہوں اور جاہ کے ذریعے ان چیزوں کو دفع کرو جو نفس کے لئے مضر ہوں۔ مقاصد کو چھوڑ کر آلات و وسائل میں پڑ جاؤ۔ یہ دانش مندی کے خلاف ہے۔

جمعہ کی تعلیم

بہرحال جمعہ ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ایک جگہ جمع ہوں اور جمع ہونے کی صورت یہ ہے کہ منہ اللہ کی طرف ہو۔ قبلہ کا استقبال کرو۔ جب ایک رُخ ہو گا، مجتمع ہو جاؤ گے۔ جب آمنے سامنے ہوں گے تب ٹکر پیدا ہو گی۔ جب سب کا رخ ایک طرف ہو گا، ٹکراؤ کی کوئی وجہ نہیں۔

آپ میں سے جو حضرات حج کے لئے گئے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ طواف کرنے کی جگہ میں کئی لاکھ آدمی طواف کرتے ہیں۔ بیت اللہ شریف میں ایک ہی مقام پر لاکھوں آدمی جمع ہیں۔ مرد و عورت کا ایک ہجوم ہے۔ کندھے سے کندھا چلتا ہے لڑائی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ سب ایک ہی رُخ میں گھومتے ہیں۔ اگر کچھ ادھر کو چلتے، کچھ اُدھر کو تو مڈ بھیڑ ہوتی۔ اچھا خاصا تصادم ہوتا۔ کیونکہ رُخ ایک ہے۔ اس لئے لاکھوں جمع ہیں، ان میں کوئی ٹکر نہیں ——

جب آپ جامع مسجد میں آئیں گے تو سب کا رُخ ایک ہی طرف ہو گا، تو یگانگت پیدا ہو گی۔ آپس میں کوئی ٹکراؤ نہیں جب باہر جائیں گے تو کسی کا منہ دکان کی طرف، کسی کا منہ دفتر کی طرف، ہر کوئی دوسرے کے سامنے۔ اس میں تصادم ٹکراؤ اور جھگڑے شروع ہوں گے۔

جیسے یہاں ظاہری طور یہ ہے اگر باطنی طور پر خدا کی طرف منہ کر لیا جائے وہاں بھی وہی شکل پیدا ہو جائے گی — تو جُمعہ کا دن بتلاتا ہے کہ جیسے تم ظاہر میں جمع ہو گئے ہو۔ باطن میں بھی ہم نے تمہیں جمع کیا ہے —— اس لئے جب تم باہر جاؤ تو باطن کا رُخ ایک طرف رکھو۔ اللہ سے لَو لگائے رکھو۔ تم میں تفریق پیدا نہیں ہو گی۔

بہرحال جمعہ یومِ امتحان بھی ہے کہ یہ امت کامیاب ہوئی .... جمعہ یومِ جامعیت بھی ہے جس نے تمام بکھری ہوئی چیزیں جمع کیں۔ جمعہ یومِ فضیلت بھی ہے جس میں انسانوں کو فضیلت ملی۔ جمعہ یومِ مزید بھی ہے، جس میں دربارِ خداوندی میں حاضری کی عادت پڑی۔ اس لئے جمعہ کو انتہائی ذوق و شوق سے ادا کرنے کی ضرورت ہے، اور اذانِ جمعہ سے پہلے آکر مسجد میں صفِ اولیٰ میں بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ فضائل و برکات حاصل ہوں۔

اس مختصر سے وقت میں یہی موضوع جمعہ کا سامنے تھا۔ اسی کے متعلق میں نے چند باتیں عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمادے۔

اللّٰھم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ اللّٰھم توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین غیر خزایا ولا مفتونین۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہٖ محمدٍ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔ برحمتک یا ارحم الراحمین۔ آمین

★

سنتِ حضرت خلیل علیہ السلام

جس طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک صورت ہے، اور ایک روح ہے۔ اسی طرح اعمالِ شرعیہ میں بھی ایک روح ہے، اور جیسے وہاں ہر صورت کی ایک خاص روح ہے جو دوسری صورت میں نہیں آسکتی۔ اسی طرح یہاں ایک روح دوسرے میں نہیں آسکتی۔

اب سمجھئے کہ سارے اعمالِ شرعیہ کا مقصود تقویٰ ہے، مثلاً نماز سے عاجزی و انکساری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے، روزے میں تزکیہ نفس کی صورت میں۔ جہاد میں شجاعت کی صورت میں، صدقہ میں انفاقِ مال کی صورت میں اور قربانی سے جاں نثاری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے ــــــــ

اگر آپ نے قربانی کی بجائے نماز پڑھ لی، تو نماز سے عاجزی اور بندگی کا تقویٰ تو ملا۔ مگر قربانی (کی صورت میں حاصل ہونے والا تقویٰ) کا تو نہ ملا۔ پس اگر کوئی شخص قربانی نہ کرے اور صدقہ دے دے تو قیامت کے دن اس کو صدقہ کا ثواب مل جائے گا، مگر قربانی کا مطالبہ باقی رہے گا۔ اور یہ سوال ہوگا کہ قربانی کیوں نہیں کی؟

از:- حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

ترتیب

صفحہ نمبر	مضمون
۳	تمہید
۴	اصولِ ثلاثہ تکوینیہ
۷	اصولِ ثلاثہ شرعیہ
۸	محبوباتِ نفس کی قربانی
۱۰	روحِ قربانی اور شبہ کا جواب
۱۳	قربانی کی حقیقت
۱۵	قربانی اور صدقہ میں فرق
۱۶	منکرینِ قربانی پر طریقِ رد
۱۷	طریقِ رد ۲
۲۳	متعلقاتِ قربانی کی وضاحت

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہٗ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ۔ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریك لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ۔ ارسلہ اللہ الیٰ کافۃ للناس بشیراً ونذیراً وداعیا الیہ باذنہٖ وسراجًا منیرًا۔

اما بعد :۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما عمل ابن اٰدم من عمل یوم النحر احب الی اللہ من اھراق الدم وانہ لیاتی یوم القیامۃ بقرونھا واشعارھا واظلافھا وان الدم لیقع من اللہ بمکان قبل ان یقع بالارض فطیبوا بھا نفسًا (ترمذی و ابن ماجہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بقرہ عید کے دن انسان کے تمام نیک اعمال میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب عمل قربانی کا ہے اور یہ قربانی قیامت کے دن اپنے سینگ بال اور کھر کے ساتھ (صحیح سالم) آئے گی اور یقیناً (قربانی کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے حق تعالےٰ کے یہاں مقبولیت کا مقام حاصل کر لیتا

(او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہے، سو قربانی خوش دلی سے کیا کرو۔

تمہید

بزرگانِ محترم!

یہ حدیث جو اس وقت آپ کے سامنے تلاوت کی (اور جس کا ترجمہ بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے) احکام قربانی پر مشتمل ہے۔ جو اس وقت تقریر و جلسہ کا موضوع ہے، تقریر تو مختصر ہو گی۔ اس لئے کہ اول تو یہ مسئلہ جزئی ہے، اور جزئیات میں تفصیل نہیں ہوتی کیونکہ بسط و تفصیل تو اصول میں ہوا کرتی ہے

اس کے علاوہ یہ ایک عام مسئلہ ہے اور اس سے کوئی مسلمان بھی ایسا نہیں جو واقف نہ ہو۔ قربانی کا عمل کوئی سال کا عمل نہیں بلکہ صدیوں سے یہ عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس لیے بھی اس میں تفصیل کی ضرورت نہیں۔ تو نہ نفس مسئلہ میں تفصیل کی گنجائش، اس کے عام ہونے کی بناء پر نہ تفصیل کی ضرورت۔

اصولِ ثلاثہ تکوینیہ

اصولِ اوّل مسئلہ کی شرح سے پہلے ایک اصول سمجھ لیجئے، اور یہ اصول جس طرح تکوینی ہے اسی طرح تشریعی بھی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا ذرہ ذرہ دو چیزوں سے ملا کر بنایا ہے۔ ایک روح ایک جسم۔ یعنی ہر چیز کی ایک صورت ہے، ایک اس کی حقیقت۔ ایک اس کی ہیئت اور ایک ماہیت۔ یا یوں کہیئے کہ ایک اس کا ظاہری حصہ ہے اور ایک باطنی ـــــ غرض تمام انسان، کل حیوانات، نباتات، جمادات کی جہاں ایک صورت ہے وہاں اس کی ایک حقیقت بھی ہے، ایک اس کا بدن اور

ایک اس کی روح ہے۔ اور ہر بدن میں خدا تعالےٰ نے اس کے مناسب روح ڈالی ہے۔ جب حق تعالےٰ کی توجہ کائنات کی طاقتوں اور بدن بنانے کی طرف متوجہ ہوئی، تو یہی اصول مدنظر تھا۔

سب سے پہلے انسان ہی کو لیجئے کہ اول انسان کا بدن تیار کیا جاتا ہے جس کی ابتداء "نطفہ" یعنی ایک گندے قطرہ سے ہوئی ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہے۔

ولقد خلقنا الانسان من سللة من طين ○ ثم جعلنٰه نطفة فى قرار مكين۔ ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظامًا فكسونا العظٰم لحمًا۔ ثم انشانٰه خلقا اٰخر۔ فتبٰرك الله احسن الخالقين

(مومنون پ۱۸ ع ۱)

یعنی ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ (یعنی گندے قطرے) سے بنایا۔ پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنا دیا۔ پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ پھر ہم نے اس کو ایک دوسری ہی مخلوق بنا دیا۔ سو کیسی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔

تو روح ڈالنے سے پہلے ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے جس کی تیاری میں زمین کی قوتیں بھی متوجہ ہوتی ہیں، آسمان کی بھی۔ آفتاب کی طاقتیں بھی متوجہ ہوتی ہیں اور ہواؤں کی بھی۔ غرض جب کائنات کی ساری قوتیں مل کر ڈھانچہ تیار کر لیتی ہیں تو پھر اس میں روح ڈال دی جاتی ہے۔ یہی صورت سارے جمادات، نباتات اور حیوانات کی ہے۔

دوسرا اصول

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اس کائنات کی کوئی چیز باقی نہیں رہ سکتی جب تک بدن اور روح ملے ہوئے نہ ہوں۔ گویا بدن کی بقا روح پر موقوف ہے اور روح کی بقا بدن پر

اگر آپ نے بدن کو پھوڑ کر خستہ و خراب کر دیا یا وہ خود ہی قدرتی طور پر خراب ہو گیا، اور اس میں سکت باقی نہ رہی تو پھر اس میں روح نہیں ٹھہرتی، بلکہ پرواز کر جاتی ہے۔ اس لئے کہ بدن ہی روح کو سنبھالے رکھتا ہے۔

غرض انسان میں جب تک روح ہے تو وہ انسان ہے ورنہ لاشہ ہے جو بیکار ہے۔ پھر جس طرح مجموعۂ بدن کے لئے مجموعہ روح ہے اسی طرح بدن کے ہر ہر جز کے لیے ایک روح ہے جو اسی کے ساتھ رہ سکتی ہے اگر اس جز کو ختم کر دیا جائے تو یہ روح بھی نہ رہے گی۔ یہ نہ ہو گا کہ اگر ایک جز کو ختم کر دیں تو اس کی روح کسی دوسرے جز میں پہنچ جائے۔ مثلاً آنکھ ہے اس کی روح قوتِ بینائی ہے، اگر آنکھ پھوڑ دی جائے تو یہ نہیں ہوتا کہ دیکھنے کی قوت مثلاً ناک میں آ جائے بلکہ یہ قوت ہی باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح ناک ہے اس میں سونگھنے کی قوت ہے وغیرہ۔

حاصل یہ کہ خداوند تعالٰی نے جس قدر قویٰ پیدا کئے ہیں ان میں روح اور قوت بھی ساتھ ساتھ پیدا کر دی ہے اور یہ دونوں مل کر کائنات کا حصہ بنتے ہیں۔ اگر دونوں کو الگ کر دیا جائے تو اسی حقیقت کو "موت" کہتے ہیں اور اس علٰحدگی سے کائنات کی تمام اشیاء ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک دوسرا اصول اور سمجھ لیجئے جو اسی سے متعلق ہے کہ بدن کے اندر جو قوتیں چھپی ہوئی ہیں ان کی پہچان ان ابدان ہی کے ذریعے سے کی جاتی ہے۔ مثلاً قوتِ بینائی کی شناخت آنکھ سے کی جاتی ہے اور قوتِ سماعت کی کان سے۔ غرض یہ صورتیں ان قوتوں کے تعارف کا ایک ذریعہ ہیں اگر یہ صورتیں نہ ہوں تو یہ تعارف ختم ہو جائے۔ اس اصول کا حاصل یہ ہوا کہ "بدن روح کی پہچان کا ذریعہ ہے"

تیسرا اصول اب تیسرا اصول اور سمجھ لیجئے کہ اگر آپ روح تک کوئی اثر پہنچانا چاہیں تو وہ بدن ہی کے ذریعے پہنچا سکتے ہیں۔ اس عالم میں براہِ راست روح کو متاثر کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

مثلاً اگر آپ روح پر گرمی کا عمل کرنا چاہیں تو بدن کو آگ کے سامنے لے جائیں گے جب پہلے بدن گرم ہو جائے گا، اس کے بعد روح کو گرمی پہنچے گی۔ اور اگر ٹھنڈک پہنچانا چاہیں تو آپ بدن پر پانی ڈالیں گے، یا اس پر برف ملیں گے یا وضو کریں گے وغیرہ۔ غرض ہر تاثیر کے لیے بدن ذریعہ ہے۔ بغیر بدن کے روح پر اثرات نہیں پہنچ سکتے۔

اُصولِ ثلاثہ تشریعیہ

تو اب تین اصول معلوم ہوئے کہ بدن سے تین کام لیے جاتے ہیں۔ اول روح کے قرار و قیام کا۔ دوسرے روح کے تعارف اور پہچان کا۔ اور تیسرے تاثیر کا۔ اور یہ تینوں باتیں اس قدر ظاہر ہیں کہ ان پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

اور یہ تینوں اصول جس طرح تکوینی ہیں، اسی طرح تشریعی بھی ہیں۔ یعنی اعمال شرعیہ میں بھی ایک صورت ہے اور ایک روح۔ اور بغیر صورت کے روح کا باقی رہنا ناممکن ہے اسی طرح اگر روح تک کوئی اثر پہنچانا چاہیں تو وہ صورت ہی کے ذریعہ پہنچ سکتا ہے اس کی مثالوں سے شریعت بھری پڑی ہے —— مثال کے طور پر وضو کو لیجئے کہ اس کی ایک صورت ہے اور ایک روح۔ اس کی صورت تو وہ خاص ہیئت اور افعال ہیں جو انسان وضو کرنے کے وقت اختیار کرتا ہے۔ یعنی ایک خاص طرح بیٹھ کر اعضاء کا دھونا وغیرہ۔ اور یہی ہیئت اس کے تعارف کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ آپ وضو کر رہے ہوں تو ہر شخص آپ کو دیکھ کر پہچان لے گا کہ آپ وضو کر رہے ہیں۔ کھانا نہیں کھا رہے۔ کیونکہ کھانا کھانے والے کی ہیئت اور ہے —— یہ تو اس کی صورت ہے، اور ایک اس کی روح ہے۔ یعنی طہارت حاصل کرنا تاکہ انسان دربارِ الٰہی میں حاضری کے قابل ہو سکے —— اور ایک اس کی تاثیر ہے یعنی وہ خاص قسم کا انشراح جو انسان کے قلب میں وضو کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ طہارت اور انشراح

بغیر وضو کی صورت اختیار کیے کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتا ——— اسی طرح غسل کی بھی ایک صورت ہے یعنی تمام جسم کو دھونا، اور ایک اس کی روح ہے یعنی طہارت اور صفائی ——— اور اس کی تاثیر فرح و انبساط ہے ——— اب اگر کوئی شخص تمام عمر غسل نہ کرے تو اس کو فرح و انبساط کی وہ خاص کیفیت کبھی بھی نصیب نہ ہوگی۔ الغرض ہر چیز کی روح حاصل کرنے کے لیے اس کی صورت کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح آپ نماز کو لیجیے کہ اس کی صورت نیت باندھ کر کھڑا ہونا اور رکوع و سجود وغیرہ ادا کرنا ہے، اور اس کی روح خدا تعالےٰ کا تقرب حاصل کرنا اور اپنی عبدیت و بندگی کا اظہار کرنا ہے، اگر آپ نماز کی ہیئت اختیار نہ کریں تو بندگی کی یہ خاص صورت کبھی بھی حاصل نہ ہوگی۔ اس طرح زکوٰۃ اور روزہ وغیرہ عبادات ہیں کہ ہر ایک کی ایک روح اور ایک صورت ہے

محبوباتِ نفس کی قربانی

تو یہ جو "قربانی" ہے۔ اس کی بھی ایک صورت ہے اور ایک روح۔ صورت تو جانور کا ذبح کرنا ہے اور اس کی حقیقت ایثارِ نفس کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور تقرب الی اللہ ہے تو ظاہر ہے کہ یہ روح بغیر جانور ذبح کئے کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ بات پہلے معلوم ہو چکی کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے۔ نماز میں نماز کی روح۔ زکوٰۃ میں زکوٰۃ کی روح اور قربانی میں قربانی کی روح ڈالی جاتی ہے۔ غرض خدا تعالےٰ نے اس کی جو صورت مقرر کر دی ہے۔ وہی اختیار کرنا پڑے گی۔ تب وہ روح اس میں ڈالی جائے گی۔ اگر وہ کسی چیز کی قربانی طلب کریں تو قربانی دینی ہوگی۔

لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون۔ — یعنی تم خیرِ کامل کبھی حاصل نہ کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے۔

اور مال محبوب چیز ہے۔ مال میں سے بھی جانور زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ کیونکہ جاندار

ہونے کی وجہ سے اس سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی بے جان چیز ضائع ہو جائے تو آدمی دوسری گھڑ کر بنا سکتا ہے بخلاف جاندار کے کہ اگر فنا ہو گیا تو دوسرا نہیں ملتا ——— اور یہ مال تو ایسی چیز ہے کہ فنا ہو کر ہی نفع پہنچاتا ہے۔ اگر کسی کے پاس ایک کروڑ روپیہ رکھا ہوا ہو تو وہ بیکار ہے، اس سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک کہ اس کو خرچ نہ کرے۔ تو جب دنیوی منافع اس کو خرچ کئے بغیر نہیں مل سکتے تو "رضاءِ حق" جو اعلیٰ ترین نفع ہے وہ محبوبات قربان کئے بغیر کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟

اور محبوبات کیا ہیں؟ جان، مال، اولاد، عزت آبرو وغیرہ۔

چنانچہ ارشاد ہے:۔

ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم	یعنی بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جانوں
واموالھم بان لھم الجنۃ۔	اور مال کو جنت کے بدلے میں خرید لیا۔

غرض آپ کو ان میں سے ہر چیز لٹانی ہوگی۔ تب کہیں بندگی کا اظہار ہوگا۔ درحقیقت جنت تو ایمان کے بدلے میں ملے گی۔ اور اعمال تو ایمان کی شناخت کا ذریعہ ہیں۔ جیسے اگر سونا خریدا جائے تو اس کو کسوٹی پر گھسا کر دیکھا جاتا ہے اگر کھرا ہے تو اس کی قیمت ادا کرتے ہیں، ورنہ نہیں۔ تو اس جگہ قیمت سونے کی ہوتی ہے، لکیروں کی نہیں جو کسوٹی پر پڑ جاتی ہیں ———

بس اسی طرح آخرت کے بازار میں جنت کے عوض ایمان کی قیمت ادا کرنا ہوگی اور یہ ہمارے اعمال ان لکیروں کی طرح ہمارے ایمان کی پختگی کی علامت ہیں۔ اس لئے جنت حاصل کرنے کی غرض سے ہمیں "محبوباتِ نفس" کو قربان کرنا لازمی ہے۔ اگر مال خرچ کرنے کا حکم ہو تو مال خرچ کرو۔ جان دینے کا حکم ہو تو جان نثار کرو۔ عزت کی ضرورت ہو تو وہ بھی قربان کرو۔ یہی عشق کی پختگی کی علامت ہے۔

ایک صحابی رضؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے

اور عرض کیا کہ .... یارسول اللہ ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو؟ ——— انہوں نے پھر یہی عرض کیا۔ اور آپ نے پھر وہی فرمایا، کہ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو —؟ انہوں نے تیسری بار بھی یہی عرض کیا کہ مجھے آپ سے محبت ہے — تو آپ نے فرمایا کہ پھر مصیبتیں جھیلنے کو، فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے کو، اور آفتیں جھیلنے کو تیار ہو جاؤ ——— اور ظاہر بات ہے کہ عاشق اپنی محبت کا ثبوت اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک مصیبتیں نہ جھیلے۔ اسی لئے ارشاد ہے :-

الم احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنا وھم لا یفتنون۔ ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکٰذبین

یعنی کیا لوگوں کا خیال ہے کہ محض "اٰمنا" کہنے سے ان کا چھٹکارا ہو جائے گا۔ اور ان کی آزمائش نہ ہوگی .... حالانکہ ہم نے آزمایا ان سے پہلے لوگوں کو پس ضرور معلوم کرلے گا اللہ تعالےٰ سچے لوگوں کو، اور ضرور معلوم کرلے گا جھوٹوں کو۔

رُوحِ قربانی اور شبہ کا جواب

غرض اصل بیان یہ تھا کہ جس طرح اعمال کی روح ضروری ہے اسی طرح ان کی صُورت بھی مطلوب ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں صورت اصل ہے اور روح اس کے تابع۔ اور آخرت میں معاملہ برعکس ہوگا، روح اصل ہوگی اور صُورت تابع ——— تو اب یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیا میں جس طرح ہر چیز کی روح کی بقا کے لئے صُورت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اعمالِ شرعیہ کی روح کی بقا کیلئے انکے جسم و صُورت کی ضرورت ہے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ اعمال میں تو اصل روح ہے۔ اس لیے روح کو لے لو اور صورت کو چھوڑ دو۔ تو اس کو چاہیئے کہ یہ عمل پہلے اپنے اوپر جاری کرے کہ اپنے بدن کو ختم کر دے اور خود کشی کرے کہ بس میں تو روح کو باقی رکھوں گا۔ لیکن اگر خود بغیر صورت کے نہیں رہ سکتے تو پھر آخر اعمالِ شرعیہ میں یہ عملِ جراحی کیوں کیا جاتا ہے ؟

جیساکہ شروع میں معلوم ہو چکا کہ کائنات میں جس طرح مجموعۂ بدن کے لیے مجموعۂ روح ہے۔ اسی طرح ہر ہر جز کی علٰحدہ علٰحدہ روح بھی ہے۔ جیسے آنکھ میں بینائی کی قوت اس کی روح ہے۔ وغیرہ —— اسی طرح سارے اعمالِ شرعیہ کی ایک روح ہے اور پھر ہر ہر عمل کی علٰحدہ علٰحدہ بھی روح ہے، اور اس روح کا نام "تقویٰ" ہے۔ چنانچہ قربانی کے متعلق ارشاد ہے۔

لن ینال اللہ لحومها ولا دماؤها ولکن ینالہ التقوی منکم۔ (ع پ ۱۷ ع ۵)۔	یعنی خدا تعالٰی کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ لیکن تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

تو قربانی کی روح بھی تقویٰ ہے۔ سو اگر کوئی یہ کہے جب قربانی سے تقویٰ مقصود ہے تو قربانی کرنے کی کیا ضرورت ہے، بلکہ تقویٰ اختیار کر لو۔ کافی ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر سارے اسلام کو چھوڑ کر بس تقویٰ ہی اختیار کر لو۔ کیونکہ روزہ کے متعلق ارشاد ہے :۔

کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔ (بقرہ پ ۲ ع ۲۳)	تم پر روزوں کا حکم ہوا جیسے تم سے اگلے لوگوں پر حکم ہوا تھا۔ شاید کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔

تو روزہ کا حاصل بھی تقویٰ ہی ہے —— نماز کے متعلق ارشادِ باری ہے کہ

ان الصلٰوۃ تنهٰی عن الفحشاء والمنکر (عنکبوت پ ۲۱ ع ۵)	نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔

جس کا حاصل تقویٰ ہے۔ لہٰذا نماز اور روزہ بھی چھوڑ دیئے۔ پھر ارشاد ہے کہ:۔

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملٰئکۃ والکتٰب والنبیٖن واٰتی المال علی حبہ ذوی القربٰی والیتٰمٰی والمسٰکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا۔ والصٰبرین فی الباساء والضراء وحین الباس اولٰئک الذین صدقوا واولٰئک ھم المتقون (البقرہ پ ۲ ع ۲۲)

مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینا نیکی نہیں ہاں نیکی یہ ہے کہ جو اللہ اور قیامت کے دن اور ملائکہ اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے۔ اس کی محبت پر مال دے رشتہ داروں کو، یتیموں، مسکینوں مسافروں، سوالیوں کو، اور گردنیں چھڑانے میں۔ اور نماز قائم کرے، اور زکوٰۃ دے۔ اور جو لوگ اپنے عہد پورے کریں، اور تنگی و سختی میں صبر کرنے والے۔ یہی لوگ سچے ہیں۔ اور یہی متقی ہیں۔

لیجئے سارے اسلام کا حاصل تقویٰ نکلا۔ اس لئے سب کو چھوڑ کر بس تقویٰ اختیار کر لیجئے ــــ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ جس طرح ہر ہر جز کی روح علیحدہ ہے۔ اسی طرح ہر عبادت کا تقویٰ جداگانہ ہے۔ تو جو تقویٰ گوشت پوست کے ذریعہ پہنچتا ہے اور حاصل ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسری عبادت، صدقہ وغیرہ سے کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ مثلاً زید کی روح کو گدھے کے قالب میں اگر منتقل کر دیا جائے۔ تب بھی وہ زید نہ بنے گا۔ بلکہ گدھا ہی رہے گا۔ اسی طرح صدقہ صدقہ ہی رہے گا۔ قربانی کا قائم مقام اسے کیسے کہا جا سکتا ہے تو دنیا میں چونکہ بغیر صورت کے چارہ نہیں۔ اس لئے قربانی کرنی ہی پڑے گی۔ ہاں آخرت میں پہنچ کر آپ قربانی نہ کریں کیونکہ وہاں صورت ضروری نہیں۔ لیکن اگر آپ نے دنیا میں اعمال کی صورت کو ترک کر دیا تو یقین رکھیے

کہ آپ نے اس کی روح کو بھی فنا کر دیا۔ اسی لئے نبی کریم علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ :۔

الایمان سر والاسلام علانیۃ — ایمان پوشیدہ چیز ہے اور اسلام ظاہر۔

اور چونکہ قربانی کا قائم مقام صدقہ یا کوئی عبادت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ما عمل ابن اٰدم من عمل یوم النحر احب الی اللہ من اھراق الدم۔ — بقرعید کے روز سب سے زیادہ محبوب عمل قربانی ہی ہے۔

تو اس روز سوائے اس عمل کے دوسرا عمل کیسے اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا :۔

یارسول اللہ ما ھذہ الاضاحی — یارسول اللہ یہ قربانیاں کیا ہیں ؟

آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

سنۃ ابیکما براھیم — تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے

صحابہ رضؓ نے استفسار کیا کہ :۔

فمالنا فیھا یا رسول اللہ۔ — یارسول اللہ اس میں ہمارا کیا نفع ہے ؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

بکل شعرۃ حسنۃ — قربانی کے ہر بال پر ایک نیکی ملے گی۔

تو یہ اجر و ثواب صدقہ وغیرہ پر کیسے مرتب ہو سکتا ہے ؟ کیونکہ صدقہ میں بال کہاں ہیں تو بات دراصل وہی ہے کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے۔

قربانی کی حقیقت

اصل میں قربانی کی حقیقت تو یہ تھی کہ عاشق خود اپنی جان کو خدا تعالےٰ کے حضور

میں پیش کرتا۔ مگر خدا تعالےٰ کی رحمت دیکھئے، ان کو یہ گوارا نہ ہوا۔ اس لئے حکم دیا تم جانور ذبح کر دو ہم یہی سمجھیں گے کہ تم نے خود اپنے آپ کو قربان کر دیا ـــــــ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا تعالےٰ کی طرف سے خواب کے ذریعے بشارت دی گئی کہ آپ اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کی قربانی پیش کریں ـــ اب دیکھئے کہ یہ حکم اول تو اولاد کے بارہ میں دیا گیا۔ اور اولاد بھی کیسی، فرزند اور فرزند بھی ناخلف نہیں بلکہ نبی معصوم ـــــ ایسے بچے کو قربان کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ حقیقت میں انسان کو اپنی قربانی پیش کرنا آسان ہے۔ مگر اپنے ہاتھ سے اپنی اولاد کو ذبح کرنا بڑا سخت مشکل کام ہے مگر حکم خداوندی تھا۔ اس لیے آپ نے اپنے بیٹے کی محبت کو پس پشت ڈالا، اور حکم خداوندی کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو لے کر منیٰ کے منحر میں تشریف لائے اور فرمایا بیٹا! ـــــ مجھے خدا تعالےٰ نے حکم دیا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کر دوں .... تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے فوراً فرمایا۔

افعل ما تؤمر — جو آپ کو حکم ہوا ہے ضرور کیجئے

اگر میری جان کی ان کو ضرورت ہے تو ایک جان کیا؟ اگر ہزار جانیں بھی ہوں تو نثار ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رسیوں سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے چھری تیز کی۔ اب بیٹا خوش ہے کہ میں خدا کی راہ میں قربان ہو رہا ہوں۔ اِدھر باپ خوش ہے کہ میں اپنے بیٹے کی قربانی پیش کر رہا ہوں۔ چنانچہ حکم خداوندی کی تعمیل میں اپنے بیٹے کی گردن پر چھری چلائی، تو چھری کند ہو گئی اور اس وقت حکم ہوا۔

قد صدقت الرؤیا۔ انا کذٰلک — بے شک آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا
نجزی المحسنین۔ — ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں

اب ہم اس کے عوض جنت سے ایک مینڈھا بھیجتے ہیں، اور تمہارے بیٹے کی جان کے عوض ایک دوسری جان کی قربانی مقرر کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی دن سے گائے، مینڈھا یا بکری وغیرہ قربانی کے لئے فدیہ مقرر ہو گیا۔

قربانی اور صدقہ میں فرق

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ذبح کا اصل مقصد جان کو پیش کرنا ہے، چنانچہ اس سے انسان میں جاں سپاری اور جاں نثاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہی اس کی رُوح ہے، تو یہ رُوح صدقہ سے کیسے حاصل ہوگی۔ کیونکہ قربانی کی رُوح تو جان دینا ہے اور صدقہ کی روح مال دینا ہے ـــــ پھر اس عبادت کا صدقہ سے مختلف ہونا اس طرح بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ کا کوئی دن متعین نہیں۔ مگر اس کے لیے ایک خاص دن مقرر کیا گیا ہے اور اس کا نام بھی یوم النحر اور عید الاضحیٰ یعنی قربانی کا دن رکھا گیا۔

جہاں تک قربانی کے مسئلہ کا تعلق ہے تو یہ سلفاً خلفاً ایسی ہی ہوتی چلی آئی ہیں حضرات انبیاء علیہم السلام کا بھی اور امت کا بھی اس پر اجماع ہے۔ انبیاء بنی اسرائیل میں سب کے یہاں قربانی تھی۔ ائمہ کرام کا بھی اس پر اجماع ہے ـــ یہ اور بات ہے کہ امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابو یوسفؒ کے یہاں قربانی سنت ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے۔ یہ اس کے حکم میں اختلاف ہے اور آئمہ کے وقائق ہیں۔ مگر قربانی کی مشروعیت میں سب متفق ہیں ـــــ اور اگر یہ کوئی غیر شرعی عمل ہوتا تو احادیث میں اس کی صفات وغیرہ کیوں بیان کی جاتیں۔؟

چنانچہ صحابہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی:۔

ان نستشرف العین والاذن	ہم قربانی کی آنکھ اور کان کو خوب دیکھ بھال لیا کریں
وان لا نضحی بمقابلة و	ہم ایسے جانور کی قربانی نہ کریں جس کا
لا مدابرة ولا شرقاء ولا	کان آگے سے کٹا ہوا ہو اور نہ جس کا

خرقاءُ۔ کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو اور نہ جس کا کان
چرا ہوا ہو۔ اور نہ جس کے کانوں میں سوراخ ہو۔

اس کے علاوہ بھی بعض اوصاف مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے احکام صدقہ سے بالکل جدا ہیں۔ اس لیے اس میں صدقہ کے احکام سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ پھر ساری اُمت آج تک بلا اختلاف اس عمل کو کرتی چلی آ رہی ہے، اور تعامل امت سب سے بڑی دلیل ہے۔

مُنکرینِ قُربانی پر طریق ردّ

قربانی کے متعلق تو اب بیان ہو چکا لیکن اگر کہا جاوے کہ آپ تو حدیث سے استدلال پیش کر رہے ہیں حالانکہ ہم حدیث کو حجت ہی نہیں مانتے۔ تو ایسے لوگوں سے پھر قربانی کے مسئلہ میں جھگڑا نہیں۔ بلکہ پھر تو حدیث کے حجت ہونے میں گفتگو ہے۔ یہ ایک اُصولی اختلاف ہے ایسے لوگوں سے یہ سوال کیا جاوے گا کہ آپ قرآن مجید کو جو کلام اللہ تسلیم کرتے ہیں تو اس کا کلام اللہ ہونا کیسے معلوم ہوا؟ ——

اگر یہ جواب ہے کہ خود قرآن سے معلوم ہوا۔ تو یہ "مکابرہ" ہے یعنی جو دعوےٰ ہے وہی دلیل ہے۔ اور یہ صریح غلطی ہے۔ ورنہ پھر یہ بھی تسلیم کر لیجئے کہ حدیث کا کلامِ رسولؐ ہونا حدیث سے ثابت ہے —— درحقیقت جو شخص احادیث کا انکار کر رہا ہے وہ قرآن مجید کے کلامُ اللہ ہونے کا بھی منکر ہے۔ کیونکہ قرآن بغیر حدیث کے حجت نہیں بن سکتا جس طرح کوئی شخص بغیر رسولؐ کے خدا تک نہیں پہنچ سکتا اسی طرح کلامُ اللہ تک بغیر کلام رسولؐ کے رسائی ناممکن ہے۔ کیونکہ لغت کے زور سے اگر کلام اللہ کو حل کیا گیا تو وہ خدا تعالیٰ کی مراد نہ ہو گی، بلکہ اس شخص کی اپنی مراد ہو گی۔ جب تک پیغمبر یا پیغمبر کے نائبین کسی آیت کی مراد کو بیان نہ کریں وہ شریعت نہیں بن سکتی۔

کیونکہ کلام کی بعض خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو کاغذ پر نہیں آسکتیں، بلکہ لب و لہجہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ میں اس کی مثال اردو کے ایک جملے سے دیا کرتا ہوں۔ وہ جملہ ہے "کیا بات ہے" ۔ اس کے لب و لہجہ بدلنے سے معنیٰ بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ کبھی اس کو استفسارِ حال کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی تعجب کے لئے، کبھی تعظیم شان کے لیے، اور کبھی تحقیر کے لیے۔ اب اگر یہ جملہ کاغذ پر لکھ کر کسی کو بھیج دیں تو کیا وہ شخص اس کو پڑھ کر متکلم کی مراد کو سمجھ سکے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ جو کچھ وہ سمجھے گا وہ اس کی اپنی مراد ہوگی۔ چنانچہ اگر یہ شخص اس وقت تعجب کی حالت میں ہوگا تو اس کو تعجب کے لیے سمجھے گا اور اگر استفسارِ حال کا اس پر غلبہ ہوگا تو اسی کے لیے سمجھے گا۔ تو یہ کیفیات کاغذ پر نہیں آسکتیں۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید!
لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

یعنی مصور تو صرف محبوب کی صورت بنا سکتا ہے۔ اس کے ناز و انداز کو کیسے اس میں ڈھال سکتا ہے؟

طریق رد ۲

اس کے علاوہ ایک چیز "عرف" ہے۔ یعنی کلام میں بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ اہلِ عرف کے پاس رہ کر ہی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ چنانچہ دیوبند میں ایک صاحب تھے جو کلکٹر کے یہاں میر منشی تھے۔ کلکٹر اگرچہ انگریز تھا۔ مگر اس کو یہ خیال تھا کہ میں اردو بہت اچھی جانتا ہوں، چنانچہ اکثر وہ ان میر منشی صاحب سے بھی کہا کرتا تھا کہ

"ول میر منشی! ہم تم سے زیادہ اردو جانتے ہیں"۔

اور یہ بے چارے منشی اس کا یہ جملہ سن کر خون کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتے کیونکہ ملازمت کا سوال تھا ——— آخر ایک روز اس نے کسی بات پر میز پر ہاتھ

مار کر کہا "ول میر منشی! ہم تم سے زیادہ اُردو جانتے ہیں" ـــــ اس مرتبہ ان کو بھی جوش آگیا اور انہوں نے سوچ لیا کہ ملازمت رہے یا نہ رہے مگر کم از کم ایک مرتبہ اس کو جواب تو دے ہی دُوں ۔ چنانچہ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میز پر مُکّا مار کر کہا کہ

"صاحب بہادر! اُردو کی ابجد بھی نہیں جانتے"۔

یہ سُن کر وہ انگریز بڑا حیران ہوا ، اور کہا کہ تم ہمارا امتحان لو ۔ انہوں نے کہا اگر میں امتحان لوں تو صاحب بہادر بغلیں جھانکنے لگیں ۔ اب تو صاحب بہادر واقعی بغلیں جھانکنے لگے کہ اس کا کیا مطلب ہوا ۔ بہت غور کیا ، مگر خاک سمجھ میں نہ آیا ۔ آخر کہا کہ تین دن کی مہلت دو ۔ انہوں نے کہا کہ سات دن کی مہلت ہے ۔ غرض اس نے اس جملے کو لغت میں تلاش کیا مگر لغت میں کیا ملتا ۔ لغت میں تو بغل مل گیا ، اور جھانکنا مل گیا ۔ مگر یہ پورا جملہ کہاں ملتا ـــــ آخر اس نے سات دن کے بعد کہا کہ اس کا مطلب یہی ہے کہ اس طرف بغل کو اٹھا کر دیکھ لیا اور ادھر کی بغل کو اسی طرح دیکھ لیا ۔ میر منشی یہ سُن کر ہنس پڑے ۔ تب اس نے پوچھا کہ پھر اس کا مطلب کیا ہے ؟ میر منشی نے کہا کہ اس شرط پر بتاؤں گا کہ پھر کبھی اُردو دانی کا دعوٰے نہ کرو ۔ چنانچہ اس نے اقرار کیا ۔ اور انہوں نے اس کا مطلب بتایا کہ دراصل یہ جملہ تحیّر سے کنایہ ہے ۔ یعنی اگر صاحب بہادر کا امتحان لیا جائے تو وہ حیرت میں پڑ جائیں ـــــ اور اس قسم کی غلطیاں واقع ہونے کے متعدد واقعات ہیں ۔ غرض کلام کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جو "عرف" سے متعلق ہیں ۔ غیر اہلِ عرف ان کو سمجھ ہی نہیں سکتے ۔ جب ہماری زبان اور کلام میں محاورات ہیں تو قرآن مجید میں بھی ایسی چیزیں ہیں کہ ان کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب تھی ۔ تو اب جو لوگ قرآن مجید کو سمجھنا چاہیں ان کو چاہیئے کہ اہل عرف کی طرف رجوع کریں ۔ یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف ۔ اور جو معنی وہ بتائیں ان کو صحیح سمجھیں ۔ اسی لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے ۔

ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم اٰیاتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتب والحکمۃ و ان کانوا من قبل لفی ضلٰل مبین (الجمعہ پ ۲۸ ع ۱)۔	خدا تعالٰے نے اپنی رحمت سے ان پڑھ لوگوں میں ایک رسول بھیجا جو انہی میں سے ہے۔ ان کو خدا تعالٰے کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے قلوب کو صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں تعلیم

کرتا ہے۔ حالانکہ وہ لوگ اس سے قبل صریح گمراہ تھے۔

اب دیکھئے۔ اس آیت میں خدا تعالٰے نے پیغمبر علیہ السلام کے تین فرائض بیان فرمائے۔ یعنی تلاوت، تزکیہ و تعلیم۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کا کام صرف آیتیں پڑھ کر سنا دینا ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کے مطالب و معانی کی تعلیم بھی پیغمبر علیہ السلام کے فرائض میں داخل ہے کہ آپ لوگوں کے قلوب کو پاک کریں۔ تاکہ وہ قرآن کے معانی سمجھنے اور اس کو محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ آیت میں "تزکیہ" کو تعلیم پر مقدم کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ تزکیہ حاصل کئے بغیر انسان کو قرآن مجید کے معانی سمجھنے کی استعداد حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے قلوب کا ایسا تزکیہ کیا کہ وہ حضرات پھر قرآن کے معانی کو اسی طریقے سے سمجھنے لگے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی ــــ پھر صحابہؓ نے تابعین کے قلوب کا تزکیہ کیا اور انہوں نے تبع تابعین کا۔ غرض اسی طرح سلسلہ وار آج تک یہ معانی و مطالب محفوظ ہیں ــــ اس لئے ہمیں ادنیٰ سے ادنیٰ نکتہ بھی بغیر استاذ کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے ــــ قرآن مجید ہمارے پاس امانت ہے جس طرح ہم لفظوں کے امین ہیں اسی طرح ہم معانی کے بھی امین ہیں ــــ اور ہم کیا؟ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی الفاظ و معانی دونوں کے امین تھے۔ چنانچہ آپ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپ شروع شروع میں آیات کو رٹنے کی کوشش فرماتے تاکہ بھول نہ جائیں۔ اس لئے وحی نازل ہوئی:۔

لا تحرک بہ لسانک	آپ قرآن پڑھنے کی خاطر وحی کے دوران

لتعجل بہٖ۔ میں زبان بھی نہ ہلایئے۔

——— اور زبان کیوں نہ ہلایئے اس لئے کہ:۔

ان علینا جمعہٗ وقرأنہٗ ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور آپ سے پڑھوانا۔

پھر آپؐ کو کیا کرنا چاہیئے ———؟

فاذا قرأنٰہ فاتبع قرأنہٗ جب وحی نازل ہو رہی ہو اس وقت سنتے

ثم ان علینا بیانہٗ۔ رہیئے۔ پھر ہم ہی اس کا مطلب بیان کریں گے

اس آیت میں حق تعالےٰ صاف صاف فرما رہے ہیں کہ اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔ اگر اس کے مطالب و معانی خود سمجھ میں آسکتے تو یہ کیوں فرمایا جاتا، اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھ میں نہ آسکتے تھے تو کسی اور کا تو کیا منہ ہے؟

یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم کسی آیت کے متعلق آپؐ سے سوال کرتے تو آپؐ اس پر غور فرماتے رہتے۔ پھر کبھی تو من جانب اللہ آپؐ کے قلب مبارک میں اس کا مطلب ڈال دیا جاتا۔ ورنہ آپ حضرت جبریل علیہ السلام سے استفسار فرماتے۔ اگر ان کو معلوم ہوتا تو آپؐ سے عرض کر دیتے۔ ورنہ وہ فرماتے کہ میں حق تعالےٰ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ تو قرآن مجید کے معانی اس طرح آپ کو من جانب اللہ بتائے گئے اور جب صحابہؓ اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معانی کے متعلق استفسار کی ضرورت پڑتی تھی۔ حالانکہ آپؐ اہل زبان بھی تھے۔ نور نبوت سے منور بھی تھے۔ پھر کسی اور کو کیا حق ہے کہ وہ بغیر حدیث کے قرآن فہمی کا دعویٰ کرے ——— غرض آپؐ قرآن مجید کے موجد یا مخترع نہ تھے بلکہ الفاظ و معانی میں امین تھے۔ جو کچھ خدا تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوتا وہ آپؐ صحابہؓ کو تعلیم فرما دیتے۔ اس طرح آپؐ نے صحابہؓ کے قلوب کو مانجھا اور تزکیہ فرمایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہؓ بھی مسائل پر اسی طرح غور کرتے جس طرح آپؐ غور فرمایا کرتے تھے ——— پھر انہوں نے تابعین کے دلوں کو اسی طرح مانجھا اور انہوں نے اپنے شاگردوں کو اسی طرح

تزکیہ باطن سے آراستہ کیا، اور یہ سلسلہ آج تک اسی طرح جاری ہے۔ ہم کو قرآن مجید کے جو مطالب پہنچے ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں سے پہنچے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانہ میں ہر شخص قرآن مجید کا مفسر نہ بن سکتا تھا۔ جب تک کسی ایسے ہی استاذ کا شاگرد نہ ہو اور جو شخص قرآن مجید یا حدیث کی تفسیر وغیرہ بیان کرتا اس سے سند پوچھی جاتی تھی۔ اگر وہ شخص مستند ہوا، اس کی بات قابلِ قبول سمجھی جاتی تھی ورنہ رد کر دی جاتی تھی۔

مگر آج کل چونکہ ناواقفیت کا زمانہ ہے اور خدا کا خوف لوگوں کے دلوں میں کم ہے اس لیے ہر وہ شخص جو ذرا عربی جانتا ہو وہ مفسرِ قرآن بننے کا مدعی ہے اور لوگ بغیر کسی تحقیق کے اس کی پیروی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید کے مطالب صرف ان ہی لوگوں سے حاصل کرنے چاہئیں جو خود صحیح سمجھتے ہوں۔ یعنی بزرگوں کے صحبت یافتہ اور عالموں کے شاگرد ہوں تاکہ ان کے اندر بھی تزکیۂ نفس کا وہ وصف موجود ہو جس کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا۔

حقیقت میں صحابہ رضی اللہ عنہم جو ساری امت سے افضل ہیں وہ اسی صحبت کی برکت سے ہیں کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی شخصیت کی صحبت نصیب ہوئی، جس سے ان کے دل صاف ہو گئے، کہ اس میں صرف حق بات ہی سما سکتی تھی۔ پھر انہوں نے اپنے شاگردوں کو اس نہج پر ڈالا، اور ان کے قلوب کی صفائی و تزکیہ کیا۔

اولئک اصحاب محمد۔ واصحاب ابوبکر۔ واصحاب عمر۔

غرض یہ حضرات تھے کہ ان پر حق کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔

حاصل یہ کہ کتاب اللہ تک ہم بغیر رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں پہنچ سکتے۔ اور ہم کو کتاب اللہ کے اندر غور و فکر کرنے کی بھی جبھی اجازت ہے جب کہ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا مطلب بیان فرماویں۔ چنانچہ خدا تعالٰی کا ارشاد ہے:۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین	اور ہم نے نازل کیا آپ کی طرف قرآن مجید کو
للناس ما نزل الیھم	تاکہ آپ بیان فرماویں لوگوں کے لئے جو ان

یتفکرون۔ (نحل پ ۱۴ ع ۶) کی طرف نازل ہوا، تاکہ وہ فکر کریں۔

دیکھئے اس آیت میں خدا تعالےٰ نے "لتبین للناس" فرمایا کہ پہلے آپؐ قرآن مجید کا مطلب بیان کریں اس کے بعد "یتفکرون" ہے۔ یعنی اس کے بعد لوگوں کو غور و فکر کی اجازت ہے۔ تاکہ لوگ غور و فکر کرنے میں شریعت کی حدود سے نہ نکل جائیں

درحقیقت اگر ہر شخص اپنی اپنی عقل اور فہم کے مطابق غور کرنا شروع کر دے تو قرآن مجید ایک کھیل تماشہ بن جائے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کیلئے بھی حدود و قیود مقرر کی جائیں۔ چنانچہ کر دی گئیں۔ اب کسی کو بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے "بیان" کے قرآن مجید کی تفسیر کی اجازت نہیں ——— اور چونکہ کلام اللہ کا مطلب سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اس لئے ہمیشہ حق تعالےٰ نے ہر کتاب کے ساتھ ایک نبی ضرور بھیجا چنانچہ اگر تورات آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تشریف لائے۔ صحف آدم علیہ السلام اگر دنیا میں آئے تو آدم علیہ السلام بھی تشریف لائے۔ اور انجیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور زبور کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ اور سب سے آخر میں قرآن مجید کے ساتھ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا ——— ورنہ اگر صرف عربی دانی اور لغت کے زور سے کلام الٰہی کو حاصل کیا جا سکتا تو حضرات انبیاء علیہم السلام کی تشریف آوری کی کیا ضرورت تھی ——— ؟ بلکہ یہ ہوا کرتا کہ ایک کتاب کسی فرشتہ کے ذریعہ سے بیت اللہ کی چھت پر رکھوا دی جایا کرتی اور اعلان کرا دیا جاتا کہ لوگو! یہ خدا کی کتاب ہے اس پر عمل کرو۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ کیونکہ کتاب کے ساتھ ساتھ اس کو سمجھانے اور پڑھانے کی بھی ضرورت تھی۔ ورنہ ہر شخص قرآن مجید سے اپنے نفس کے مطابق مطلب گھڑ کر استدلال کر لیا کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خوارج سے مناظرہ کرنے کو بھیجا تو ہدایت فرمائی کہ ان کے سامنے قرآن سے استدلال مت کرنا۔ بلکہ احادیث سے استدلال کرنا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو تعجب ہوا اور سوال فرمایا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ حالانکہ قرآن مجید کو میں خاص طور پر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے حق میں دعاء فرمائی: اللّٰھم علمہ القراٰن — یا اللہ! ابن عباس رضؓ کو قرآن کا فہم عطا فرما۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بے شک تم قرآن مجید کو صحیح سمجھتے ہو مگر القراٰن ذو وجوہ (یعنی قرآن مجید کے الفاظ سے متعدد مطالب نکل سکتے ہیں) اس لئے تم صحیح مطلب بیان کرو گے اور لوگ اس کا غلط مطلب بیان کر دیں گے۔ اور الفاظ سے کسی ایک کی بات متعین نہ ہو گی۔ اس لئے تم حدیث سے استدلال پیش کرنا۔ کیونکہ حدیث نے قرآن کے معانی متعین کر دیئے ہیں، جس میں کسی تاویل اور کید نفس کی گنجائش نہیں رہی۔

یہی وجہ ہے کہ زمانہ سابق میں بھی جب کبھی کوئی فرقہ ایسا ہوا کہ اس نے دین میں تحریف کا ارادہ کیا تو اس نے سب سے پہلے حدیث کا انکار کیا۔ کیونکہ حدیث ہوتے ہوئے کسی قسم کی تحریف کا احتمال بھی نہیں رہتا۔ اس لئے اس نے پہلے اس کانٹے کو راہ سے ہٹایا مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ آج وہ لوگ ختم ہو گئے اور ان کے ساتھ ان کی تحریفات بھی ختم ہو گئیں۔ اور حدیث پر عمل کرنے والے اب بھی باقی ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گے — الغرض حدیث کے بغیر قرآن نہیں سمجھ میں آ سکتا۔ اور عجیب بات ہے کہ علماء صلحاء کا تو قول حجت ہو مگر نبی کا کلام حجت نہ ہو۔

تقریر کا اصل موضوع تو قربانی کا مسئلہ تھا جس میں زیادہ تفصیل نہ تھی مگر درمیان میں چونکہ کچھ اصولی بحث آ گئی اس لئے بات ذرا طویل ہو گئی اگرچہ اس اصولی بحث کو بہت مختصر بیان کیا گیا۔ تاہم بحمد اللہ ضروری باتیں آ گئیں اور یہ معلوم ہو گیا کہ حدیث پر بھی ایمان ضروری ہے۔ اب پھر اصل مسئلہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

متعلقاتِ قربانی کی وضاحت

اس جگہ یہ اشکال کہ قربانی کرنے سے جانور ختم ہو جائیں گے۔

سو اوّل تو یہ خیال ہی غلط ہے کیونکہ روزانہ جو لاکھوں جانور بطور ذبیحہ کے کاٹے جاتے ہیں عید کے دن وہ ذبح نہیں ہوتے اس طرح کچھ معمولی سا فرق پڑتا ہے جو کسی طرح بھی قابل اعتنا نہیں۔ پھر اس روز بعض ایسے لوگوں کو بھی گوشت پہنچ جاتا ہے جو سال میں ایک آدھ دفعہ ہی کھا سکتے ہیں۔ پھر اُن کی ساری کھالیں غرباء و مساکین میں تقسیم ہوتی ہیں —— غرض بہت سے منافع اس سے حاصل ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جو روپیہ قربانی میں صرف ہوتا ہے، اس کو مہاجرین وغیرہ کی امداد میں صرف کیا جائے۔ تو بے شک مہاجرین کی امداد ضروری ہے مگر ہر کام کے لئے اسلام کے گلے پر چھُری کیوں چلتی ہے۔ کچھ اپنی خواہشاتِ نفس پر بھی تو چھُری چلایئے اور غیر شرعی اخراجات کو بند کر کے مہاجرین کی امداد کیجیے۔ مثلاً سینما ہے شراب ہے، اور دوسرے فضول اخراجات ہیں۔

حاصل یہ کہ اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک صُورت ہے اور ایک روح ہے۔ اسی طرح اعمالِ شرعیہ میں بھی ایک روح ہے۔ اور جیسے وہاں ہر صورت کی ایک خاص روح ہے جو دوسری صورت میں نہیں آ سکتی۔ اسی طرح یہاں بھی ایک روح دوسرے میں نہیں آ سکتی۔

سو اَب سمجھئے کہ سارے اعمالِ شرعیہ کا مقصود تقویٰ ہے۔ مثلاً نماز سے عاجزی وانکساری کی صُورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ روزے میں تزکیۂ نفس کی صُورت میں، جہاد میں شجاعت کی صُورت میں، صدقہ میں انفاق مال کی صورت میں۔ اور قُربانی سے جاں نثاری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے —— اب اگر آپ نے قُربانی کے بجائے نماز پڑھ لی، تو نماز سے عاجزی اور بندگی کا تقویٰ تو ملا، مگر قُربانی (کی صورت میں حاصل ہونے والا تقویٰ) کا نہ ملا۔ پس اگر کوئی شخص قربانی نہ کرے اور صدقہ دے دے تو قیامت کے دن اس کو صدقہ کا ثواب مل جائے گا مگر قربانی کا مُطالبہ باقی رہے گا۔ اور یہ سوال ہوگا کہ قربانی کیوں نہیں کی؟ بالکل اسی طرح جیسے کوئی نماز تو پڑھتا

رہا اور روزہ نہ رکھا تو روزہ کا مطالبہ ہو گا کہ کیوں نہ رکھا تھا ——— اس کو ایک مثال سے سمجھ لیجئے کہ آپ نے ایک نوکر رکھا، جس کے سپرد آپ نے کھانا پکانے اور کھانا کھلانے کی خدمت سونپی۔ اب اس نوکر نے یہ کیا کہ کھانا تو پکایا نہیں مگر گھر کو صاف کر کے آئینہ بنا دیا۔ ہر چیز قرینہ سے رکھ دی جھاڑو بھی دی، فرش بھی دھویا، جالے بھی صاف کئے۔ اب جب آپ گھر پہنچے اور دیکھا کہ ملازم نے گھر کو بہت صاف ستھرا کر رکھا ہے تو یقیناً آپ خوش ہوں گے مگر جب کھانے کے وقت آپ کو معلوم ہو گا کہ اس نے کھانا نہیں پکایا، تو یقیناً آپ اُس سے باز پرس کریں گے کہ تو نے کھانا کیوں نہیں پکایا؟ تو کیا وہ ملازم جواب دے سکتا ہے کہ صاحب میں نے گھر تو صاف کر دیا۔ اب کھانے کا مطالبہ کیسا؟ ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ یہاں جو کام تیرے سپرد کیا تھا وہ تو تو نے کیا نہیں اور ایک ایسا کام کیا جو فی الجملہ اگرچہ اچھا ہے مگر تیرے سپرد نہ تھا۔ اس لیے تجھ کو یہ کام کھانا کھلانے کے بعد کرنا چاہیئے تھا۔ اسی طرح صدقہ و خیرات تو عبادات نافلہ میں، اور قربانی واجب ہے۔ تو صدقہ دینے سے اس کا مطالبہ باقی رہے گا۔

حاصل یہ کہ آپ جو صورت اختیار کریں گے، اسی کی روح اُس میں ڈالی جائے گی۔ جیسے انسان کی صورت میں انسان کی روح۔ اور حیوان کی صورت میں حیوان کی۔ پھر قربانی کی روح صدقہ میں کیونکر آ سکتی ہے؟ اس لیے کہ قیامت میں ہر ایک عمل کی مختلف صورتیں ہوں گی۔ مثلاً جو شخص مسجد بناتا ہے اس کو جنت میں مکان ملتا ہے۔ روزہ دار کے لیے قیامت کے دن دستر خوان بچھایا جائے گا۔ اسی طرح قربانی کے متعلق ارشاد ہے کہ:۔

انہ لیاتی یوم القیامۃ بقرونھا واشعارھا واظلافھا

قیامت کے دن قربانی کا جانور اپنے سینگوں، بالوں اور کھالوں کے ساتھ موجود ہو گا۔

اس جگہ ان اجزاء کا ذکر ہے، جن کو ہم بے کار سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ یعنی

اس کے ردی اجزاء پر بھی ثواب دیا جائے گا۔ تو جو اصلی چیز یعنی گوشت ہے اس پر کیوں ثواب نہ ملے؟ ۔ پھر آگے ارشاد ہے :۔

ان الدم لیقع من اللہ بمکان قبل ان یقع بالارض ۔ فطیبوا بھا نفسہا۔	قربانی کا خون زمین پر گرنے سے قبل، خدا تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ تم اس عمل کو کر کے اپنا دل ٹھنڈا کرو۔

تو یہ مقبولیت کا درجہ بھی قربانی کے ساتھ خاص ہے۔

مسئلہ کا بیان تو ہو چکا۔ مگر ایسے جزئی مسائل میں جو اجماعی چیزیں ہیں شبہ پیش آنا انتہائی تنزل اور انحطاط کی علامت ہے ۔ اب تک علماء کو صرف اصول کو ثابت کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ مگر افسوس اب جزئیات و مسلمات کو بھی ثابت کرنا پڑتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ علماء کے ذمہ اس کا ثابت کرنا نہیں یہ تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں۔ مگر میرا مقصد یہ ہے کہ اگر ہماری یہی رفتار رہی تو کہاں تک جزئیات کو ثابت کیا جائے گا۔ کچھ چیزیں مسلمات سے بھی رہنے دیجئے یہ تو نہ ہو کہ ہر چیز کے لئے دلیل کی ضرورت پڑنے لگے۔ یہ انتہائی پستی اور تنزل کی دلیل ہے جس کی وجہ علم دین کی طرف سے لاپرواہی اور بے توجہی ہے جس کا علاج بجز اس کے کہ آپ لوگ علم دین حاصل کرنے کی طرف توجہ کریں۔ کچھ نہیں ——— اور میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ دوسرے علوم و فنون حاصل نہ کریں۔ بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کریں۔ تاکہ روزمرہ کے موٹے موٹے مسائل میں آپ کو شبہات پیش نہ آئیں۔ اور آپ کو ہر شخص اپنی خواہشات کا غلام نہ بنا سکے۔ بلکہ آپ کو خود بھی حق و باطل میں امتیاز کی تھوڑی سی بصیرت حاصل ہو۔ قرآن مجید کا ترجمہ بھی کسی سے تعلیم کے طور پر حاصل کریں، خود دیکھنے میں ہزاروں غلطیوں کا احتمال ہے۔

اگر آپ کو کسی مسئلہ میں شبہ ہو اور اس کی وضاحت کی ضرورت ہو تو خود اپنی عقل سے کوئی رائے قائم کرنے کی بجائے علماء کی طرف رجوع کیجئے کہ دین بالکل بے غبار ہے بشرطیکہ آپ سمجھنے کا قصد رکھتے ہوں اور آپ کی بحث کا پیرایہ تحقیقی و تعمیری ہو — ہٹ دھرمی اور ضد کو اس میں ادنیٰ بھی دخل نہ ہو۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ خدا تعالےٰ ہم کو شر و فتن سے بچائے اور راہ مستقیم پر قائم رکھے ، اور ایمان پر خاتمہ نصیب ہو۔ آمین یارب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین محمد و آلہٖ و اصحابہٖ و اتباعہٖ اجمعین۔

برحمتک یا ارحم الراحمین

حقیقتِ نکاح

سب سے بڑا سلسلہ دنیا میں انسانوں کو ملانے والا نکاح کا سلسلہ ہے جس سے دو اجنبی جُڑ جاتے ہیں، جن میں پہلے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور اچانک ان میں ایسا جوڑ لگتا ہے کہ منافع مشترک، اتحادِ باہمی اور خاندانی اشتراک سے ایسی محبت و مودّت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے پہلے اتنی محبت اور مودّت نہیں دیکھی گئی۔ نکاح جوڑ لگانے کا سلسلہ ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام اس سلسلے کے حامل ہیں۔

از:- حضرت حکیم الاسلام مدظلہ،

ترتیب

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا ۔ من یھدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ۔ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ ۔ ونشھد ان سیدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہٗ ۔ ارسلہ اللہ الیٰ کافۃ للناس بشیرًا ونذیرًا ۔ وداعیًا الیہ باذنہٖ وسراجًا منیرًا اما بعد : ـــــ فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ومن اٰیٰتہٖ ان خلق لکم من انفسکم ازواجًا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ ۔ ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یتفکرون ۔ (روم پ ۲۱ ع ۳)

صدق اللہ العلی العظیم ؛

احوالِ واقعی

بزرگانِ محترم !

ابھی آپ کے سامنے نکاح کی تقریب انجام پائی ہے ۔ اور اس میں اپنے عزیزوں میں سے ایک عزیز کا نکاح ہوا ۔ اس تقریب کا تقاضا یہ ہے کہ میں نکاح ہی

کے سلسلہ میں کچھ کلمات گزارش کروں، جو نکاح کے احکام اور ثمرات پر مشتمل ہوں۔ چونکہ موقع کے مناسب کوئی بیان ہوتا ہے، تو وہ نفع دیتا ہے۔ جو وقت کا تقاضا ہو۔ اسی کے مطابق بیان کیا جائے۔ گویا اس تقریب نے تقریر کا موضوع متعین کر دیا۔ اسی موضوع کے سلسلہ میں کچھ بیان کیا جائے گا۔

اس وقت دو، تین باتیں عرض کرنی ہیں۔ ایک یہ کہ نکاح کی حقیقت کیا ہے؟ دوسرے نکاح کی غرض و غایت، اور یہ کہ نکاح کے احکام کیا ہیں؟ —— یہ تین باتیں اس تقریر کا موضوع ہوں گی ——

دنیا جنت اور جہنم سے مرکب ہے۔ (تمہید)

ان تین باتوں کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک مختصر سی بات بطور تمہید کے سمجھ لیجئے۔ پھر یہ تینوں باتیں سمجھنا آسان ہو جائیں گی۔

وہ یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ نے دو سلسلے پیدا کئے ہیں۔ ایک خیر کا سلسلہ ہے، اور ایک شر کا —— ایک سلسلہ بھلائی، خوبی اور نیکی کا ہے، اور ایک سلسلہ بدی، برائی اور شر کا ہے۔ ہر اصل کے مقابلے میں، جو اچھی اصل ہے، کوئی نہ کوئی اس کی ضد ساتھ لگی ہوئی ہے۔ یہ دنیا اکہری نہیں ہے۔ بلکہ بھلائی اور برائی دونوں سے مرکب ہے۔ جو خیر آپ کے سامنے آئے گی، اس کے مقابلے میں کوئی شر ضرور ہوگی جو اس کی ضد کہلائے گی۔ اگر اللہ نے دنیا میں اسلام کو پیدا کیا، تو مقابلے میں کفر بھی پیدا کیا۔ اگر دنیا میں سچ آیا تو مقابلے میں جھوٹ بھی آیا۔ اگر نور دنیا میں لایا گیا، تو مقابلے میں ظلمت بھی لائی گئی۔ اگر تقویٰ طہارت لایا گیا تو مقابلے میں فسق و فجور بھی لایا گیا —— غرض ہر چیز کی اصل کے مقابلے میں کوئی ضد ضرور ہے —— اگر دن لایا گیا، تو مقابلے میں رات لائی گئی۔ یہ ایک سلسلہ ہے خیر و شر کا۔ اگر آپ کو محض خیر کی تلاش ہو، جہاں برائی کا نشان نہ ہو، وہ جنت کا عالم ہے، کہ

وہاں سوائے خیر اور بھلائی کے کچھ نہیں — اور اگر شر ہی شر دیکھنی ہے، جس میں کہیں بھلائی کا نشان نہ ہو، تو وہ جہنم کا عالم ہے کہ وہاں سوائے بُرائی، کدورت اور تکلیف کے کچھ نہیں۔ دُنیا کو اللہ نے جنت اور جہنم سے مرکب بنا دیا ہے، کہ کچھ خیر جنت سے لائی گئی، اور کچھ شر جہنم سے لائی گئی۔ دونوں سے ملا کر ایک عالم بنا دیا گیا، جس کا نام دُنیا ہے۔ اس لیئے یہاں خیر بھی ہے شر بھی۔ نیکی بھی ہے، بدی بھی۔ بُرائی بھی ہے بھلائی بھی۔ اسلام بھی ہے کفر بھی۔ نور بھی ہے، ظلمت بھی۔ ہر اصل کے مقابلے میں ایک ضد لگی ہوئی ہے۔

عالمِ غیب میں خیر و شر کا سلسلہ

اس کائنات میں اوپر سے لے کر نیچے تک یہی سلسلہ ہے۔ غیب کو دیکھا جائے۔ یعنی وہ مخلوق جو آنکھوں سے اوجھل ہے، وہاں بھی یہ دونوں سلسلے ہیں۔ ایک طرف ملائکہ علیہم السلام ہیں، جو خیرِ محض ہیں۔ ان کے مقابلے میں شیاطین ہیں، جو شرِ محض ہیں۔ ملائکہؑ ہر بات میں خیر کی طرف چلتے ہیں۔ شیاطین ہر معاملے میں شر کی طرف چلتے ہیں۔ ملائکہؑ کے لئے فرمایا گیا۔

بل عباد مکرمون ○ لا یسبقونہٗ بالقول وھم بامرہٖ یعملون ○

— یہ اللہ کے پاکباز اور مکرم بندے ہیں۔ لا یعصون اللہ ما امرھم۔ ان کا شیوہ یہ ہے کہ اللہ کی ذرہ برابر نافرمانی یا عصیان کا کوئی شائبہ تک ان میں نہیں، سوائے اطاعت، پاکیزگی اور برگزیدگی کے۔ تو ان کو کہا گیا لا یعصون اللہ عصیان کا نشان نہیں۔ اور شیاطین کو کہا گیا وکان الشیطٰن لربہٖ کفورًا۔ شیطان کا کام ہی کفر کرنا اور کفرانِ نعمت ہے۔

ملائکہؑ جہاں ہوں گے، خوشبو کی طرف دوڑیں گے۔ شیاطین جہاں ہوں گے بدبو کی طرف دوڑیں گے۔ حدیث میں ہے کہ مساجد اور ذکر اللہ کی مجلس میں،

ملائکہ کا ہجوم ہوتا ہے۔ جتنی کوڑیاں اور گندگی کی جگہیں ہیں، وہاں شیاطین کا ہجوم ہوتا ہے۔ اُنہیں وہ پسند ہے، اِنہیں یہ پسند ہے۔ یہ خیر کی طرف جاتے ہیں۔ وہ شر کی طرف جاتے ہیں۔

ملائکہ کا کام کیا ہے؟ ہر مخلوق کی خیر خواہی کرنا، ہر ایک کے لئے دعا کرنا، ہر ایک کے لئے بھلائی چاہنا۔ شیاطین کا کام ہے، ہر ایک کی برائی چاہنا، ہر ایک کو ایذاء پہنچانا۔ ہر ایک کے لئے تکلیف کا سامان کرنا۔ ملائکہ کی شان قرآن کریم میں فرمائی گئی کہ:— الذین یحملون العرش ومن حولہ یسبحون بحمد ربھم و یومنون بہ ویستغفرون للذین اٰمنوا ——

جو ملائکہ عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں، ان سے زیادہ مقرب کون ہوگا — ؟ وہ اتنے نزدیک ہیں حق تعالیٰ کے، کہ ملائکہ میں سے کسی کو اتنا قرب حق تعالیٰ کا میسّر نہیں ہے۔ اور جو ان کے اردگرد اربوں کھربوں ملائکہ ہیں۔ ان کا کام کیا ہے؟ یسبحون بحمد ربھم ویومنون بہ ویستغفرون للذین اٰمنوا —— حق تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں، اور زمین والوں کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ ہماری اولادوں کے لئے، ہماری بیویوں کے لئے، اہل و عیال کے لئے دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ! ان کے لئے دنیا میں، آخرت میں، بھلائی کرے — یہ ان کا کام ہے۔

اور شیاطین نے کیا کیا؟ سب سے پہلے بڑے شیطان نے اللہ ہی کے سامنے کہا کہ:— قال فبعزتک لاغوینھم اجمعین — تیری عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک ایک انسان کو گمراہ کر کے رہوں گا۔ ایک ایک انسان کو بھٹکا کے رہوں گا۔ کبھی خیر پر نہیں آنے دوں گا۔

حق تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ میں بھی اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں، تیرے متبع ایک ایک کو جہنم میں ڈال کے رہوں گا، اور جہنم کو بھر دوں گا۔ — تو ملائکہ کہتے ہیں یا اللہ! سب کو بھیج جنت میں، خیر ان کے لئے پیدا کر

شیطان کہتا ہے کہ میں گمراہ کروں گا، تاکہ ایک ایک کو جہنمی بنا کے چھوڑدوں۔ تو وہ انتہائی خیر خواہ، یہ انتہائی بدخواہ ــ وہ نیکی کی طرف لاتے ہیں، یہ بدی کی طرف۔

حدیث میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر انسان کے قلب کی دائیں جانب فرشتہ بیٹھا ہوا ہے۔ اور بائیں جانب شیطان بیٹھا ہوا ہے۔ فرشتہ کا کام کیا ہے ؟۔ خیر کا راستہ دکھلاتا ہے، قلب میں خیال ڈالتا ہے کہ یہ بھی نیکی کرلے۔ یہ بھی نیکی کرلے ــ شیطان کہتا ہے، یہ بھی بدی کر، یہ بھی بدی کر۔ اس میں بڑی لذت ہے۔ زناکاری کر اس میں بڑا لطف آئیگا۔ چوری کر، اس میں مال بڑھ جائے گا ــ یہ بدی کو مزین اور آراستہ کرکے پیش کرتا ہے، تاکہ انسان دل لُبھادے اور مبتلا ہوجائے ــ فرشتہ نیکی کا راستہ دکھلاتا ہے کہ گناہ میں لذت تو آجائے گی، مگر انجام کو سوچ لے کہ جہنم بھی بھگتنا پڑے گا۔ معصیت کے اندر نفس کو نہایت لذت آتی ہے، مگر تھوڑی دیر کے لئے۔ اس کے بعد قلق، کدورت اور تشویش پیدا ہوتی ہے۔ انسان میں نفرت بڑھتی ہے ــ نیکی کرنے میں ابتداءً تکلیف ہوتی ہے۔ مگر انجام کار قلب میں راحت، سکون، بشاشت اور ایک نُورانیت پیدا ہوتی ہے ــ تو فرشتہ خیر کی راہ دکھلاتا ہے۔ اور شیطان شر کی راہ دکھلاتا ہے۔ فرشتہ نیکی کے خطرات ڈالتا ہے۔ اور یہ بدی کے وساوس ڈالتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا، یہ جو بعض اوقات انسان کش مکش میں مبتلا ہوتا ہے۔ کبھی تو جی چاہتا ہے کہ لاؤ نیکی کرلوں۔ اور کبھی سستی آتی ہے کہ دیکھی جائے گی۔ کبھی دل میں خیال آتا ہے کہ تہجد پڑھ لوں۔ پھر خیال آیا کہ رات کا اخیر ہے، بڑی میٹھی نیند ہے، کون پڑھے، کل کو دیکھی جائے گی۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ یہ فرشتے اور شیطان کی جنگ ہوتی ہے، جس کی وجہ سے انسان ڈانواں ڈول ہوتا ہے۔ جو غالب آجائے، وہی انسان کر گزرتا ہے۔ ادھر ہی کو طبیعت مائل ہوجاتی ہے۔

شیطان کے کہنے سے نیکی بھی درست نہیں

اسی واسطے فرمایا گیا۔ کہ شیطان انسان کا انتہائی دشمن ہے۔ اس کے کہنے سے نیکی بھی مت کرو۔ نیکی اپنے ضمیر کے تقاضے سے کرو۔ وہ اگر یوں بھی کہے کہ نماز پڑھ لو۔ سمجھو کہ اس میں بھی کوئی مکاری اور شر پوشیدہ ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سو رہے تھے۔ اتفاق سے شیطان نے وسوسے ڈالے۔ بہر حال نبی اور معصوم تو نہیں تھے۔ حضرات صحابہؓ کو بھی ابتلاء ہو سکتا ہے۔ تو اس کی کچھ حرکت اور تصرف سے ان کا تہجد قضا ہو گیا ــــ شیطان بہت خوش ہوا کہ ایک جلیل القدر صحابیؓ کا تہجد قضا کرا دیا۔ فرض تو چھڑا نہیں سکتا تھا۔ صحابیؓ ہیں۔ نفل چھوٹ سکتی تھی، وہ چھوٹ گئی ـــ مگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اتنا صدمہ گزرا کہ برسوں کا میرا معمول چھوٹ گیا۔ سارے دن روئے، استغفار کیا، بیسیوں نفلیں پڑھیں۔ توبہ کی ــــ اگلا دن جب ہوا، تو ارادہ کر کے سوئے کہ آج ان شاء اللہ ضرور اٹھوں گا۔ اور آج میرے اوپر نیند کا غلبہ نہیں ہونا چاہیئے۔

ابھی اٹھنے نہیں پائے تھے۔ ایک شخص نے آ کر پیر ہلایا کہ امیر معاویہ! اٹھیے اٹھیے۔ تہجد کا وقت آ گیا۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، کہ میرے اٹھانے کے لئے میرے محل سرائے میں رات کے وقت کون اجنبی آیا ــــ؟ ہاتھ پکڑا تو معلوم ہوا یہ شیطان ہے ــــ وہ بھی صحابیؓ ہیں۔ قوی الایمان ہیں۔ فرمایا۔ مردود تو یہاں کیوں آیا ــــ؟ اس نے کہا کہ آپ کی خیر خواہی پیش نظر تھی۔ کل آپ کا تہجد قضا ہو گیا تھا۔ میں نے کہا آج میں ہی جا کے اٹھا دوں۔ آپ کو تکلیف دی تھی ــــ کہا۔ منحوس! ۔ تو؟ اور خیر خواہی؟ ــــ اللہ نے کہا ہے کہ ان الشیطن لکم عدو فاتخذوہ عدوا۔ شیطان تمہارا دشمن ہے، اسے دشمن ہی سمجھو۔ یہ مت سمجھنا کہ دوست ہے۔ تُو اور دوستی کرے اور خیر خواہی کرے۔ سچ سچ بتلا، تو

نے مجھے نماز کے لئے کیوں اٹھایا، کوئی مکاری اس میں ضرور پوشیدہ ہے۔ کوئی اس میں شر ہے۔ کہا۔ کہ نہیں خیر خواہی پیشِ نظر تھی۔ فرمایا کہ تو اور خیر خواہی؟ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اللہ نے کہہ دیا کہ تو دشمن ہے، یہ ممکن نہیں کہ تو دوستی کرے۔

میں بھی صحابی ہوں۔ روحانیت میری بھی قوی ہے۔ آج میں تجھے انتہائی طور پر پکڑ کے پیٹوں گا، ورنہ بتا اصلیت کیا ہے؟ ــ ہاتھ پکڑا ہوا ہے۔ چھوڑتا نہیں ــ وہ اگر مزاج کا لطیف تھا۔ تو یہ روحانیت کے لحاظ سے قوی تھے، ان میں بھی لطافت تھی ــ کوئی ہم جیسا ہوتا، شیطان کبھی کا دھکا دے کے بھاگ بھی جاتا ــــــ تب وہ بات کھلی۔

اس نے کہا اصل قصہ یہ ہے کہ کل میں نے کچھ تصرف کیا تو آپ کا تہجد قضا ہو گیا۔ آپ نے توبہ کی، استغفار کیا۔ پچاسوں نفلیں پڑھیں تو اتنا ثواب ملا کہ تہجد کا بھی اتنا نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ لاؤ اٹھا دوں کہ ثواب کچھ تو تھوڑا ہو جائے ــ دن بھر محنت کریں گے، پچاس رکعتوں کی بجائے یہ چار رکعتیں ہی سہی ــ فرمایا۔ اب بات تو نے ٹھیک کہی، پھر اس کو چھوڑ دیا، کہ دُور ہو ملعون۔ تجھ پر لعنت۔ تو شیطان خیر خواہی کبھی نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ بد خواہی کرتا ہے۔ وہ اگر خیر کا راستہ بھی دکھلائے۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی شر ہو گی۔ اس کے کہنے سے خیر بھی نہیں کرنی چاہیئے۔ جب دل میں اور ضمیر میں آجائے۔ تبھی آدمی کرے۔ تو ملائکہ علیہم السلام انتہائی خیر خواہ ہیں، اور شیاطین انتہائی بد خواہ ہیں ــــــ

تو غیب کا عالم ہے۔ دونوں سلسلے وہاں بھی قائم ہیں۔ ایک خیر کا، وہ ملائکہ علیہم السلام ہیں۔ اور ایک شر کا، وہ شیاطین ہیں۔

دنیا میں خیر و شر کا سلسلہ

دنیا میں آنے کے بعد یہ سلسلہ یہاں بھی قائم ہے۔ انسانوں میں مقدس ترین طبقہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جو خیرِ محض ہیں۔ ان میں شر کا نشان نہیں ہے۔ ہر چیز میں

بھلائی، ہر چیز میں خیر اور ہر انسان کے خیر خواہ ـــــ اور اس درجہ خیر خواہ کہ بعض اوقات حق تعالےٰ کو روکنا پڑتا ہے کہ اس درجہ خیر خواہی بھی مت کرو ـــــ حضورؐ رحمت للعالمین ہیں۔ آپ ہدایت فرماتے کوئی ہدایت کو نہ مانتا، تو بیٹھ کر گھٹتے۔ محبت اور مخلوق کی خیر خواہی کی وجہ سے قلبِ مبارک کو تکلیف پہنچتی۔ کہ کیوں نہیں یہ سیدھے راستے پر آتے، کیوں برائی کے راستے پر چل رہے ہیں؟ کیوں تھوڑی سی لذت کے لئے اپنی آخرت کو تباہ کر رہے ہیں۔ کیوں نہیں انہیں سمجھ اور عقل آتی۔ تو جب نہیں مانتے تھے تو آپ گھٹتے تھے۔ حق تعالےٰ نے روکا:۔

لعلك باخع نفسك ان لا يكونوا مؤمنين ـــــ کیا ان کی ہدایت کی طمع میں آپ اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے ـــــ آپؐ نے ہدایت کر دی نہیں کوئی مانتا تو جائے جہنم میں۔ آپ اس میں کیوں مبتلا ہیں کہ قلب میں ضیق اور گھٹن ہے۔ ـــــ تو روکنے کی نوبت آئی، اس لیے کہ خیر خواہی انتہائی درجہ کی تھی۔ ہر ایک کے لئے چاہتے تھے کہ ایماندار بن جائے۔ جنتی بن جائے۔ اسی لئے جو خلاف کرتا تھا تو آپؐ کو تکلیف پہنچتی تھی۔ تو انبیاء علیہم السلام خیرِ محض ہیں۔ انتہائی محبت رکھتے ہیں۔ اور محبت ہی دنیا میں پھیلاتے ہیں۔

دُنیا میں جو انبیاءؑ کے مقابل ہیں۔ وہ دجال کہلاتے ہیں۔ ہر نبیؑ کے مقابلے میں کوئی نہ کوئی دجال آیا۔ اور انبیاءؑ کے زمانے میں دجال آئے۔ انہوں نے نبوت کا دعوےٰ کیا۔ دجل کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ ظاہر کچھ اور باطن کچھ۔ آدمی تلبیس پیدا کرے۔ دعوےٰ نبوت کا، اور اندر سے کفر بھرا ہوا۔ یوں تلبیس کر کے دنیا کو کفر پہ لاتے تھے۔ تو نبی کا ٹھیک مقابلہ دجال سے ہوتا ہے۔ نبی خیرِ محض اور دجال شرِ محض ہے۔ ہر نبی کے مقابلے میں ایک نہ ایک دجال لایا گیا ہے کہ نبی مخلوق کو خیر کی طرف لائے، اور دجال شر کی طرف لائے۔

چونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اور نبوت، علم اور ایمان کا کمال غرض سارے مراتبِ نبوت حضور صلے اللہ

علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر ختم ہو چکے ہیں، آپؐ سے بڑھ کر کوئی کامل الایمان نہیں ہے۔ آپؐ سے بڑھ کر کوئی کامل الہدایت نہیں ہے۔ سارے مراتب خیر آپؐ کی ذاتِ بابرکات پر ختم ہیں۔ اسی لئے آپؐ خاتم النبیین ہیں کہ نبوت کا ہر درجہ اور مرتبہ آپؐ کی ذات پر آکر ختم ہو گیا۔ اس لئے آپ کی امت میں جو دجال آئے گا وہ اتنا بڑا دجال ہو گا کہ کوئی دجّال ایسا نہیں گزرا ہو گا۔ اس لئے کہ اتنے بڑے نبیؐ سے مقابلہ ہے تو اتنا ہی بڑا دجل وفریب ہونا چاہیئے ——— یہی وجہ ہے کہ اور دجّالوں نے نبوت کے دعوے کئے۔ اسلام میں جو اخیر میں دجّال آئے گا، وہ خدائی کا دعوٰے کرے گا۔ اس پر شر کے مراتب ختم ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کی پشتِ مبارک پر مہر نبوت تھی، جس پر آپؐ کے خاتم النبیین ہونے کی علامت بھی، اور اس پر لکھا ہوا تھا سر حیث شئت فانک منصور۔ جہاں بھی جاؤ، خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہے۔ خیر تمہارے ساتھ ہے۔ خیر کے مراتب تم پر ختم ہیں ——— تو آپؐ کے لئے یہ مُہر نبوت تھی۔ جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ آپؐ خیرِ مجسم اور ایمانِ مجسم ہیں ——— دجّال کی پیشانی پر کفر لکھا ہوا ہو گا۔ ک۔ ف۔ ر تو یہ کفرِ مجسّم ہے۔ وہاں مہرِ نبوّت بھی، یہاں کفر کی مہر ہے۔ وہاں ایمان کے مراتب ختم، یہاں کفر کے مراتب ختم ——— تو انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ دجّالوں سے ہے۔ انبیاءؑ خیر و محبت لے کر آتے ہیں ۔ دجّال عداوت اور شر لے کر آتے ہیں ——— تو وہاں ملائکہؑ اور شیاطین کا مقابلہ تھا یہاں انبیاءؑ اور دجّالوں کا مقابلہ ہے۔

انبیاءؑ کے ماننے والوں میں جو اعلےٰ مقام پر پہنچتے ہیں۔ انہیں امام کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا :-

وجعلنٰھم أئمۃ یھدون بامرنا۔	ہم نے ان لوگوں کو امام بنایا، وہ خیر کے راستے کی ہدایت کرتے ہیں۔

دجّالوں کے جو اعلےٰ ترین متبع ہیں، ان کو آئمۃ الکفر کہا گیا ہے :-

وجعلنٰھم ائمۃ یدعون الی النار۔ ہم نے ایسے امام بنائے ہیں، جو جہنم کی دعوت دیتے ہیں۔ لوگوں کو آگ کی طرف لے جاتے ہیں۔

یہ امام شر کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ امام خیر کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ امام ایمان کے ہیں۔ یہ امام کفر کے ہیں۔ پھر ان ائمہ کے متبع ہیں۔ آئمۂ ہدایت کے جو متبع ہیں، ان کا لقب اولیاء الرحمٰن ہے۔ اور آئمۂ کفر کے جو متبع ہیں، ان کا لقب اولیاء الشیطٰن ہے۔ ایک حزب اللہ ہے اور ایک حزب الشیطٰن ہے۔ ایک کے لئے کہا گیا۔ الا ان حزب اللہ ھم المفلحون۔ اللہ ہی کے لشکر کو انجام کار فلاح نصیب ہوگی۔ ادھر کہا گیا۔ الا ان حزب الشیطٰن ھم الخسرون۔ شیاطین کے جو لشکر ہیں، وہ انجام کار گھاٹے، خسارے اور ٹوٹے میں رہیں گے۔

غرض اوپر سے لے کر نیچے تک دو سلسلے ہیں۔ ایک خیر کا، ایک شر کا۔ اُدھر ملائکہؑ، اِدھر شیاطین۔ اُدھر انبیاءؑ، اِدھر دجال۔ اُدھر آئمۃ الایمان، اِدھر آئمۃ الکفر۔ اُدھر اولیاء الرحمٰن، اِدھر اولیاء الشیطٰن۔ یہ دو متضاد سلسلے دنیا میں چلے آ رہے ہیں۔

خیر و شر کے سلسلوں کے کام

اس خیر کے سلسلہ کا کام کیا ہے؟ یہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے۔ جو بچھڑ جاتے ہیں، ان کو ملاتا ہے۔ جن میں عداوت ہو، ان میں محبتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جن میں لڑائی ہو، ان میں صلح کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ملائکہ، انبیاء اور اولیاء الرحمٰن کا سلسلہ یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا بس ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائے۔ سب کے قلوب ایک بن جائیں، سب ایک دوسرے سے محبت کریں، ایک دوسرے سے ملیں، ایک دوسرے کی خیر خواہی میں غرق ہو جائیں ــــــ شیاطین، دجالوں، اور آئمۃ الکفر کا سلسلہ یہ چاہتا ہے کہ جو جڑے ہوئے ہیں، ان میں بھی تفریق پیدا

ہو جائے، جو ملے ہوئے ہیں، ان میں پھوٹ پڑ جائے۔ جو محبتیں کر رہے ہیں، اُن میں عداوتیں پھیل جائیں۔ جو ایک دوسرے کی خیر خواہی کر رہے ہیں، وہ ایک دوسرے کی بد خواہی میں لگ جائیں۔ ہر ایک دوسرے کے راستہ میں کانٹے بچھائے، ہر ایک دوسرے کو ذلیل و خوار کرنے کی کوشش کرے۔ دنیا میں فتنہ و فساد پھیلے۔ یہ دجالوں کا، شیاطین کا اور آئمۃ الکفر کا تقاضا و مقتضیٰ ہے۔ تو انبیاءؑ محبتیں پیدا کرانے، اور دجال عداوتیں پیدا کرانے کے لئے آئے ہیں۔

انبیاءؑ کا کام یہ ہے کہ جو بندے خدا سے بچھڑ جائیں، انہیں خدا سے ملا دیں۔ جو آپس میں بچھڑ جائیں، انہیں آپس میں ملا دیں۔ شیاطین چاہتے ہیں کہ بندے خدا سے بھی ٹوٹ جائیں۔ بندے بندوں سے بھی آپس میں ٹوٹ جائیں۔ بھائی بھائی میں لڑائی ہو۔ گھر گھر میں فساد ہو۔

اسی واسطے جتنے سلسلے محبتیں اور اتحاد کے ہیں، انبیاء علیہم السلام ان کے حامل ہیں۔ اور جتنے سلسلے لڑائی، فتنے اور دنگے فساد کے ہیں، شیاطین ان کے حامل ہیں۔

انسانوں کو ملانے والا سب سے بڑا سلسلہ

سب سے بڑا سلسلہ دنیا میں انسانوں کو ملانے والا نکاح کا سلسلہ ہے، جس سے دو اجنبی جُڑ جاتے ہیں، جن میں پہلے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور اچانک ان میں ایسا جوڑ لگتا ہے کہ منافع مشترک، اتحاد باہمی اور خاندانی اشتراک سے ایسی محبت ہو جاتی ہے۔ ایسی مودت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے پہلے اتنی محبت اور مودت نہیں دیکھی گئی۔ نکاح جوڑ لگنے کا سلسلہ ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام اس سلسلے کے حامل ہیں۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

النکاح سنتی - فمن رغب عن سنتی فلیس منی - (الحدیث)

نکاح میری سنت ہے، جو اس سے بھاگے گا، گریز کرے گا، وہ میری جماعت سے خارج ہے۔ وہ میری جماعت میں شامل نہیں - اس واسطے کہ نکاح اتحاد کا ذریعہ ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا مقصد ہی یہ ہے کہ وحدت و محبت باہمی پیدا ہو۔

شیاطین اس کے حامل ہیں کہ یا نکاح ہونے نہ پائے، یا ہو کر ٹوٹ جائے ایسی تفریق ان میں پڑے کہ نکاح ٹوٹ جائے، کہیں طلاق ہو جائے، آپس میں پھوٹ پڑ جائے۔ وہ یہ چاہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نکاح سے محبت رکھتے ہیں۔ طلاق اگرچہ جائز ہے، اور مجبوری کے وقت میں اسے استعمال بھی کیا جاتا ہے لیکن حق تعالیٰ کے نزدیک جائز ہو کر بھی اس سے بُغض ہے۔ ارشاد ہے:

ابغض المباحات عند اللہ الطلاق -

وہ چیز جو جائز ہے، پھر اللہ کو اس سے عداوت اور بغض ہے، وہ طلاق ہے۔ اس لئے کہ طلاق نکاح کو توڑنے والی ہے، جس سے لوگ بچھڑ جائیں گے عداوتیں پیدا ہوں گی۔ اور یہ انبیاءؑ کے موضوع کے خلاف ہے۔ اس لیے انبیاءؑ نکاح سے محبت رکھتے ہیں۔ شیاطین طلاق سے محبت رکھتے ہیں۔ اللہ و رسول کے نزدیک طلاق مبغوض ہے۔ مجبوری کی بات الگ ہے مگر مبغوض ہے۔ نکاح کے بارے میں کہا گیا۔ النکاح سُنتی۔ اور یہ نہیں کہا گیا کہ الطلاق سُنتی طلاق میری سنت ہے۔ یہ تو مجبوری کی چیز ہے، کوئی عاجز آجائے، ایسے وقت میں اجازت دی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے چونکہ طلاق نکاح کو توڑنے والی ہے، اوّل تو اس سے بُغض کیا گیا۔ اور پھر اس کی تقسیم کی گئی۔ وہ یہ کہ ایک طلاقِ سنت ہے، اور ایک طلاقِ بدعت۔ طلاقِ سنت یہ ہے کہ آدمی تین طلاق ایک دفعہ میں نہ دے۔ الگ الگ دے۔ اس لئے ہر طلاق کے بعد موقع رہتا ہے کہ پھر رجوع کرے۔ نکاح کی ضرورت نہ پڑے۔

تو سنت یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ مجبوری یا ضرورت پیش آئے۔ تینوں طلاقیں ایک دم ہاتھ سے نہ نکالے، پھر وہ بائنہ ہو جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ ڈرانے دھمکانے کی خاطر دینا ہی ہے تو ایک دے۔ تاکہ تین مہینے اور دس دن جو عدت ہے، اس میں پھر آدمی کو رجوع کا حق رہے۔ اس کے بعد بھی اگر نوبت آئی، پھر ایک اور دے دے۔ پھر تین، چار مہینے موقع رہے گا کہ پھر رجوع کرے۔ اور تین طلاق ایک دم ختم کر دیں، سارے تیر ترکش سے نکال دیئے۔ آگے رجوع کا کوئی موقع نہیں۔ اکٹھی تینوں دے دینا، اسے طلاقِ بدعت کہا گیا۔ اور طلاقِ سنت یہ ہے کہ ایک ایک کر کے دے۔ تاکہ رجوع کرنے کا موقع رہے ——— بہرحال انبیاء علیہم السلام ہر ایسے طریق کو چاہتے ہیں، جس سے رشتہ جڑا رہے۔ یہ تعلق قائم رہے۔ اس لئے کہ یہ اتحادِ باہمی کا ذریعہ ہے۔

عورت کے ذریعہ خاندانوں میں محبت قائم ہوتی ہے

ایک اور دو کے اتحاد کا ذریعہ نہیں کہ خاوند اور بیوی مل جائیں۔ ایسی بات ہے کہ جب خاوند بیوی آپس میں مل گئے تو خاوند کے عزیز، بیوی کے عزیزوں سے، اور بیوی کے عزیز خاوند کے عزیزوں سے ملیں گے۔ یہ دو کا ملنا نہیں ہے۔ یہ کئی کا ملنا ہے۔ یہ دو خاندانوں کا ملنا ہے، دو خاندانوں کا آپس میں جُڑ جانا ہے۔ پھر حقوق قائم ہو جاتے ہیں۔ محبتیں ہو جاتی ہیں۔

جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمائے۔ اور نو ازواجِ مطہرات ہوئی ہیں۔ ان کی مصلحت یہی تھی کہ ان خاندانوں سے جوڑ لگایا جائے۔ جن کے ذریعہ سے آپؐ کو اسلام کے لئے کام لینا تھا۔ جب خاندانوں میں نکاح ہو گیا، وہ مربوط ہو گئے۔ ٹوٹ نہیں سکتے تھے۔ ان سے آپؐ نے تبلیغِ دین میں کام لیا۔ ان نکاحوں کی برکت سے قبیلے کے قبیلے اسلام میں داخل ہوئے ——— اس لئے کہ عرب میں اس کی بڑی رعایت کی جاتی تھی کہ جہاں سلسلہ ورشتہ دامادی کا قائم ہو گیا،

وہ کئی کئی پشتوں تک اس کی رعایت کرتے تھے۔ اور ان حقوق کو مانتے تھے۔

جب مصر فتح ہوا تو مصر سے جو قیدی پکڑ کر لائے گئے ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں۔ عورتیں بھی۔ حضرت صفیہؓ، جو زوجہ مطہرہ ہیں۔ وہ مصر سے پکڑی ہوئی آئی تھیں۔ آ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں۔ آپؐ نے نکاح فرما لیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ دیکھو مصر سے سُسرال کا رشتہ قائم ہو گیا۔ اس کی رعایت کرنا۔ پوری اُمّت پر حق عائد کر دیا کہ مصر والوں کی رعایت کرو۔ کیونکہ وہ میری سسرال بن گئی۔ یہ جو دامادی اور خُسر کا رشتہ ہے، یہ گویا اتنا لگاؤ پیدا کر دیتا ہے کہ خاندان اس سے مربوط ہو جاتے ہیں ——— تو انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ عزیز نکاح کا تعلق ہے ——— حتیٰ کہ آپؐ نے فرمایا کہ:-

حبب اِلیّ من دنیاکم ثلاث۔	تمہاری دنیا میں سے مجھے تین چیزیں پسند ہیں۔

ان میں سے ایک چیز فرمائی کہ وہ عورت ہے۔ عورت کو اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ وہ معاذ اللہ شہوت رانی کا ذریعہ ہے۔ اس لئے کہ وہ تعلق و محبت کے قائم ہونے کا ذریعہ ہے۔ محبتیں عورت کے راستے سے قائم ہوتی ہیں۔ مرد تو اپنے کام کاج میں لگے رہتے ہیں۔ کوئی دکان پر، کوئی دفتر میں کوئی کھیتی باڑی میں۔ یہ جو رشتہ داریاں جڑتی ہیں، اور حقوق ادا ہوتے ہیں۔ یہ زیادہ عورتوں کے ذریعہ سے ہوتے ہیں ——— اگر عورت بد سلیقہ ہو، وہ توڑ پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے اندر سلیقہ ہو، خاندانوں کو ملا دیتی ہے۔ محلِ محبت فی الحقیقت عورت ہے۔ اس لئے کہ اسی سے محبتوں کے اگلے سلسلے چلتے ہیں ——— تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حبب الی من دنیاکم ثلاث۔ تمہاری دنیا میں مجھے تین چیزیں پسند ہیں۔ اس میں سے خوشبو کو پسند فرمایا۔ نماز کو پسند فرمایا، اور عورت کو پسند فرمایا ——— اس واسطے کہ خوشبو لگے گی، تو ملائکہؑ کا ہجوم ہو جائے گا۔ یہ بھی محبتِ باہمی کا ذریعہ بن جائے گی۔ عورت آئے گی، یہ بھی خاندانوں کے جُڑ جانے کا

ذریعہ بن جائے گی۔ اس سے بھی محبت و اتحاد قائم ہوا۔ تو نکاح کی بڑی غرض و غایت وحدتِ باہمی اور سکونِ باہمی ہے۔

نکاح کی غرض و غایت

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جو نکاح کی غرض و غایت ذکر کی گئی، وہ سکونِ باہمی ذکر کی گئی ہے۔ لیکن نسل بڑھنا، یہ تو طبعی طور پر بڑھے گی۔ غرض و غایت اصلی جو ہے وہ یہ ہے:— ومن اٰیٰتہٖ ان خلقلکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃً ورحمۃ — اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ تم ہی میں سے تمہارا جوڑی جوڑا نکال دیا۔ مرد میں سے عورت نکال دی، عورت میں سے مرد نکال دیا۔ ورنہ دونوں سلسلے الگ الگ ہیں۔ مرد میں سے اگر کوئی نکلتا تو مرد ہی نکلتا۔ عورت میں سے عورت نکلتی — یہ اس قدر عجیب قدرت کی صناعی ہے کہ مرد میں سے عورت نکال دی۔ اور عورت میں سے مرد کو پیدا کیا — فرمایا کہ یہ ہماری قدرت کی نشانی ہے کہ تم میں سے تمہارا جوڑا نکالا۔ اگر عورت انسانوں کی جنس میں سے نہ ہوتی، فرشتوں میں سے یا جنات میں سے ہوتی، کبھی محبتِ باہمی قائم نہ ہوتی۔ دوسری جنس کے ساتھ میلان ہی نہیں ہوتا۔ جانوروں میں ہر طبقے میں ہزاروں مادائیں ہیں — شیر ہے تو شیرنی بھی ہے۔ بھیڑیا ہے تو اس کی مادہ بھی ہے۔ انسانوں کا کبھی رجوع نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ غیر جنس ہے کبھی میلان نہیں۔ اپنی جنس کی طرف میلان ہوتا ہے — اس لئے فرمایا کہ ہماری قدرت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے میں سے تمہارا جوڑا پیدا کیا، تمہاری جنس میں سے اور تمہارے اندر میں سے، تاکہ تمہارا جب جُٹ بنے تو تمہارے میں محبت قائم ہو۔ اگر غیر جنس کا جوڑا ملا دیتے۔ جنّنی عورت بنا دیتے تمہارا رابطہ کبھی نہ ہوتا۔ وہ مقصد اور موضوع ختم ہو جاتا — تو —— ان خلقلکم من انفسکم۔ تم میں سے، تمہارے نفسوں میں سے

پیدا کیا۔ ازواجاً تمہارے جوڑوں کو ـــــ کیوں پیدا کیا ــ ہے لتسکنوا الیھا تاکہ تم اس سے سکون حاصل کرو۔ وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ ۔ اور تم خاوند بیوی میں محبت اور مودت پیدا ہو۔ تم ایک دوسرے کے خیر خواہ بنو۔ ایک دوسرے میں تم میں محبت پیدا ہو۔ اس لیے ہم نے جوڑا بنایا ـــــ اور فرمایا۔ ان فی ذالک لاٰیت لقوم یتفکرون ۔ جو لوگ فکر رکھتے ہیں، وہ اس چیز کی قدر کریں گے ، جو ہم کہہ رہے ہیں ۔ جو بے فکرے ہیں، عقل ہی نہیں رکھتے ، انہیں کیا خبر ہو گی کہ اس میں کیا مصلحت ہے ہے ــ لیکن جب تم زندگی میں گزرو گے ، اور اس مقام پر آؤ گے ۔ تمہیں قدر آئے گی کہ ہم نے تم کو کتنی بڑی نعمت دی ہے ۔ جو تمہارا جوڑا تم میں سے پیدا کیا۔ تاکہ تم میں سکون پیدا ہو۔

نکاح اللہ کی قدرت کی نشانی بھی ہے

نکاح کو آیت کہا گیا۔ آیت قدرت کی نشانی کو کہتے ہیں کہ خدا ہی کر سکے ، اسے دوسرا نہ کر سکے ۔ اُسے آیت کہتے ہیں ۔ جیسے قرآن کریم کی آیتیں ہیں۔ آیۃ کرسی ہے ، آیتِ استخلاف ہے ، آیت الرحمٰن ہے ، آیتِ رحمت ہے۔ یہ اللہ کی آیتیں اور قدرت کی نشانیاں ہیں ۔ کوئی دوسرا ایسا کلام نہیں لا سکتا ـــــ اسی طرح سے اس کے افعال میں بھی کچھ آیتیں ہیں ۔ فرمایا۔ وایۃ لھم الارض المیتۃ احیینھا ـــ یہ ہماری آیتوں میں سے ہے کہ زمین ہمیں بنا سکتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں ۔ زمین مردہ ہو جاتی ہے ، بارش برسا کے ہم اسے دوبارہ زندہ کر دیتے ہیں ـــ کہیں فرمایا۔ ان الشمس والقمر اٰیتان من اٰیٰت اللہ لا ینخسفان من موتِ احدٍ ولا لحیاتہٖ ۔ سورج اور چاند اللہ کی قدرت کی آیتوں میں سے دو آیتیں ہیں ، جیسے قرآن کی آیت کا جواب نہیں ان آیتوں کا بھی کوئی جواب نہیں لا سکتا کہ اس جیسا کوئی سورج بنا دے ۔ چاند جیسا

چاند بنادے۔ تو زمین، سورج اور چاند کو بھی آیت کہا ــــ اور فرمایا۔ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ اللَّيْلُ ــ یہ جو رات ہے۔ یہ ہماری قدرت کی نشانی اور آیت ہے۔ اسی کے اندر سے جب ہم کھینچتے ہیں، تو دن نکل آتا ہے۔ اندھیریوں میں سے چاندنا نکل آتا ہے۔ ابھی دنیا پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کہیں نور کا نشان نہیں تھا۔ انسانوں نے بیچاروں نے محنت کر کے مصنوعی انڈے، قمقمے لاکھوں جلائے۔ چاندنا تو ہوگیا۔ مگر رات بدستور رہی۔ دن نہیں نکلا۔ ہماری قدرت دیکھو۔ جب دن نکالنا چاہتے ہیں۔ بس سورج کی آمد آمد ہوئی، اور رات غائب ہوئی۔ یا تو دُنیا پر ظلمت چھائی ہوئی تھی یا ایک دم چاندنے کی حکومت قائم ہوگئی۔ ایک دم عالم میں نور پھیل گیا۔ یہ ہماری قدرت کی نشانی ہے۔

اسی طرح سے قدرت کی نشانی نکاح کو بھی کہا گیا۔ آپ کہیں گے نکاح میں نشانی ہونے کی کیا بات ہے؟ دو مرد عورت کا نکاح کر دیا۔ اس میں نشانی ہونے کی کیا بات ہے؟ کہ اللہ ہی بنا سکتا ہے اور کوئی نہیں۔ تو نکاح میں آیت ہونے کی کیا شان ہے؟ خطیب نے خطبہ پڑھ دیا۔ مولانا انصاری صاحب نے بڑا عمدہ خطبہ پڑھا، ایجاب و قبول ہوگیا۔ اس میں قدرت کی نشانی کیا ہے؟

اس میں قدرت کی نشانی یہ ہے کہ دو بول پڑھے جانے سے پہلے مرد کو عورت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بالکل ایک اجنبیت تھی۔ اگر رشتہ داری بھی ہو گی، تو رشتہ داریاں ہزاروں سے ہوتی ہیں، لیکن یہ کہ اس مرد کا قلب کا لگاؤ اس عورت سے تھا، قطعاً نہیں یا اس عورت کا لگاؤ مرد سے تھا، قطعاً نہیں۔ وہ بالکل اجنبی، یہ بالکل اجنبی، اُس کا دل اِس سے بیگانہ، اِس کا دل اُس سے۔ لیکن جہاں چار حرف پڑھے گئے، اور ایجاب و قبول ہوا۔ ایک دم انقلاب پیدا ہوا۔ اب اس مرد کے دل کا تعلق اس عورت سے قائم ہوا۔ ایسے وقت اگر یہ خبر آئے کہ میری بیوی کو تکلیف ہے، اسے دُکھ پہنچے گا ــ اگر اُسے پہلے خبر پہنچتی تو کہتا ہزاروں عورتیں تکلیف میں ہوں گی۔ لیکن چار حرف پڑھے گئے، اور قلب کا

رابطہ قائم ہوگیا ــــــ عورت کو اگر اطلاع ہو جائے کہ جس سے میرا نکاح ہوا ہے، خدانخواستہ وہ کسی تکلیف میں ہے۔ وہ پریشان ہو جائے گی۔ لیکن نکاح پڑھے جانے سے پہلے پچاس خبریں آئیں۔ وہ کہتی ہزاروں مرد ہیں، عزیز بھی ہیں، رشتہ دار بھی ہیں، مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ ــــ یہ دُو حرف پڑھنے کے بعد جو انقلاب عظیم برپا ہوا، یہ اللہ کے سوا کون کر سکتا ہے؟ دلوں کو ایک دم موم اور مائل کر دیا۔ ابھی اجنبیت تھی، ابھی یگانگت پیدا ہو گئی۔ ابھی بے تعلقی تھی، منٹ بھر کے بعد تعلق پیدا ہوگیا۔ یہ مرد عورت بے واسطہ تھے، اب ایک قسم واسطہ پیدا ہوگیا۔ ایسے میں اگر کوئی خوشی کی خبر بیوی کی نسبت آئی، خاوند کا دل بڑھ جائے گا، کہ جس سے میرا نکاح ہوا، اس کی کیسی عمدہ خبر سُنی۔ خاوند کی طرف سے کوئی خوشی کی خبر پہنچے، اس کا دل بڑھ جائے گا کہ جس سے میرا رشتہ قائم ہوا۔ اس کیلئے بڑی عزت کا سامان ہے۔ وہ عورتوں میں سر اونچا کرے گی کہ میرے لئے فخر کی بات ہے۔ یہ مردوں میں سر اونچا کرے گا۔ لیکن جب تک چار حرف نہیں پڑھے گئے تھے، نہ اِس کا سر اونچا تھا، نہ اُس کا سر اونچا تھا۔ یہ جو ایک دم عظیم انقلاب برپا ہوگیا، یہ خُدا کے سوا کون کر سکتا ہے؟ میرا آپ کا کام تو نہیں ہے۔ یہی معنے ہیں نشانی ہونے کے، کہ قلوب میں، روحوں میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے ــــ ابھی کچھ تھا، ابھی کچھ ہوگیا۔ اس لئے فرمایا۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ ــــ اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم میں سے تمہارا جوڑا نکالا، اور اسی کی نشانی یہ بھی کہ تم میں دو حرف کے پڑھے جانے سے اچانک سکون و مودّت پیدا کر دیا۔

ــــ حق تعالےٰ شانہٗ نے اسے موضعِ انعام میں ذکر فرمایا۔ معلوم ہوتا ہے اللہ کو یہ محبوب و مطلوب ہے کہ یہ خاوند بیوی ملیں۔ ان میں محبت پیدا ہو۔ غرض و غایت نکاح کی یہ ذکر کی گئی۔ تو جب اللہ کا منشاء یہ ہے کہ مرد عورت جن کا نکاح ہے، وہ محبت سے ملیں۔ تو انبیاءؑ کیسے نہیں پسند کریں گے؟ انبیاءؑ وہی چیز پسند کرتے ہیں جو اللہ کو پسند ہو۔ وہ اللہ کے ترجمان بن کے آتے ہیں۔

تو انبیاء علیہم السلام کو بھی یہ پسند ہے کہ محبت باہمی پیدا ہو جائے۔

خانگی زندگی میں سکون کا راز

یہی وجہ ہے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم بعض اوقات ایسی چیزیں عمل میں لاتے تھے جس سے محبت بڑھے۔ حدیث میں ہے آپ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بیٹھ کر ایک برتن میں کھانا کھاتے۔ اور ایسے دنوں میں جب وہ نماز نہیں پڑھ سکتی تھیں ــــ زمانۂ جاہلیت میں دستور یہ تھا، ایام حیض میں عورت کو اچھوت سمجھتے تھے۔ اس کے سائے کو بھی ناپاک سمجھتے تھے۔ ایک الگ کوٹھری میں بٹھا دیتے تھے، روٹی پانی بھی دیتے تھے تو بانس کے نلکے سے دیتے تھے کہ کہیں اس کا سایہ نہ پڑ جائے۔ یہ نجس ہو گئی۔ اسلام نے اس خیال کو مٹایا کہ یہ بیہودگی ہے۔ وہ نجاستِ حکمی ہے۔ اللہ کا حکم ہے۔ کوئی اس کا عین اور اس کا اندر اور بدن تھوڑا ناپاک ہوا ہے۔ وہ تو ایسا ہے جیسے کوئی استنجا کر کے آئے، تو وضو کرنی واجب۔ وہ حکمی نجاست ہے۔ یہ تھوڑا ہی کہ بدن کو کوئی برائی اور گندگی لگی ہوئی ہے ــــ حکمی طور پر نجاست ہے۔ حکم ہے کہ پاک بنا لو۔ طاہر بن جاؤ۔ اسی طرح سے ایام حیض میں جو نجاست ہے، وہ حکمی ہے، یہ نہیں کہ بدن پر نجاست لگی ہوئی ہے۔ اس کا دھونا ضروری ــ حکمِ خداوندی ہے نجس سمجھو، پاک بناؤ۔ مگر زمانۂ جاہلیت والے اس نجاست کو اتنی بڑی نجاست سمجھتے تھے کہ عورت کو اچھوت سمجھتے تھے۔ اس کا کھانا پینا اور مکان تک الگ۔ اس کے سائے سے بچتے تھے۔ اسلام نے یہ کیا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے عین اس زمانے میں جب صدیقہ رضؓ پر ایام حیض گزر رہے ہیں۔ ایک برتن میں کھانا کھاتے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ یہ بھی حدیث میں ہے صدیقہ رضؓ لقمہ لیتیں، منہ میں رکھ لیا، زبان لگا دی۔ آپؐ نے ان کے پاس سے چھین کے خود تناول فرما لیا۔ تاکہ امت کو بتلا دیں

کہ عورت کی ذات میں کوئی نجاست نہیں آتی - اس سے محبت قطع کر دینا، اُسے اچھوت بنا دینا، یہ انسانیت کے خلاف بات ہے ــ یہ اسی لئے تھا تاکہ اس تعلق کی مضبوطی زیادہ سے زیادہ ہو- اس واسطے اس قسم کی چیزیں آپؐ عملاً فرماتے ـ

حدیث میں ہے ایک دفعہ آپؐ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا آؤ ہم اور تم مل کر دوڑیں ــ آپس میں بھاگ ہوئی کہ کون آگے نکلتا ہے - آپؐ آگے نکل گئے، صدیقہؓ پیچھے رہ گئیں ــ اخیر عمر میں جب بدنِ مبارک بھاری پڑ گیا- پھر ایک دفعہ فرمایا کہ اچھا ہم اور تم مل کے بھاگیں- کون آگے نکلتا ہے -اب کے صدیقہؓ آگے نکل گئیں ـ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک بھاری پڑ گیا تھا- فرمایا تلك بتلك -چلو برابر سرابر قصہ ہو گیا- ایک دفعہ ہم جیت گئے تھے- ایک دفعہ تم جیت گئی سہی-

اب کوئی کہے، انبیاءؑ کو بھاگ دوڑ سے کیا تعلق ہے حقیقت یہ ہے کہ عورت کے دل کو مٹھی میں لینے کے لئے، اس کی دلداری کرنے کے لئے یہ چیزیں فرمائی ہیں ـــ اور فرمایا، ہر وہ لہو لعب جو حرام ہے، بیوی کے ساتھ جائز ہے ـ تاکہ اس کا دل مٹھی میں آئے، اس کی دلداری و دل جوئی ہو ـــ مقصد یہ ہے، اس کے لئے تسلی کا سامان ہو- اس کے ساتھ محبت و یگانگت کا معاملہ ہو ـــ

آپؐ نے ارشاد فرمایا: ـــ

ان اکرم المؤمنین احسنکم اخلاقاً الطفکم اھلاً۔ — تم میں سب سے زیادہ قابلِ تکریم مسلمان وہ ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں ــ اور بیویوں کے ساتھ لطف و محبت اور مدارات کا برتاؤ کرتا ہو ـــ

سخت گیری نہ کرتا ہو، تیز و تند لب و لہجے سے نہ بولتا ہو- ہر وقت ڈرانے اور دھمکانے کے فکر میں نہ رہے، جیسے بے وقوف خاوندوں کی عادت ہوتی ہے-

اپنی شوخی اور قوت جتانے اور حکومت قائم رکھنے کے لئے سخت کلامی سے پیش آتے ہیں۔ جب آئیں تو ناک منہ چڑھی ہوئی ہے، تاکہ بیوی بیچاری ڈر جائے، کہ کوئی شیر اور بھیڑیا آگیا۔ تاکہ میرا رعب قائم رہے۔ یہ نہایت لغو حرکت ہے۔ انسانیت و محبت کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔

ایک صحابی ہیں حضرت انجشہؓ۔ انہوں نے کہیں اپنی بیوی کو مارا۔ آپؐ غضبناک ہوئے۔ چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا۔ فرمایا:۔

اے انجشہ! کانچ کی شیشیوں کو توڑ ڈالنا کوئی جوانمردی کی بات ہے؟ عورت پر ہاتھ اٹھایا ہے؟ لڑنا تھا تو کسی مدِمقابل سے لڑتے۔ اپنے سے زیادہ قوی سے لڑتے، اگر تمہیں کوئی شوخی اور طاقت دکھلانی تھی۔ عورت پر ہاتھ اٹھایا ہے؟ نازک صنف کو مارنا شروع کیا، تاکہ آپ کی بہادری واضح ہو۔ اتنے بڑے بہادر ہو، عورت کو مارا۔ اور آکے فخر کیا کہ میں نے مارا۔ بھئی کسی پہلوان پہ ہاتھ اٹھایا ہوتا۔ کسی جوانمرد کے مقابلے پہ آتے۔ تم ایک مارتے، وہ چار رسید کرتا۔ جوانی معلوم ہو جاتی۔ عورت کے مقابلے پہ جوانی دکھلانا کہ میں بڑا طاقت ور ہوں۔ یہ تو کمینوں کی سی بات ہے۔ شرافت کی بات نہیں ہے۔ آپؐ ناراض ہوئے، خفا ہوئے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ تو یہ تھا کہ ایک پیالے میں کھانا کھاتے ہیں۔ بعض اوقات بھلگنے دوڑنے کو فرمایا، تاکہ عورت کا دل مٹھی میں رہے، اس کی مدارات ہو۔ اس کے ساتھ لطف و کرم کا برتاؤ ہو۔ اور دوسرا برتاؤ جو حضرت انجشہؓ نے کیا، تو آپؐ نے ڈانٹا۔ خفا ہوئے اور ناراض ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا، انبیاء علیہم السلام کا مقصد یہ ہے کہ دونوں خاوند بیوی میں مدارات کا برتاؤ رہے ـــــ اور وجہ اس کی یہ ہے اگر یہ دونوں مدارات اور لطف کا برتاؤ کریں گے، خانگی زندگی بہتر بن جائے گی۔ جس گھر کے اندر خاوند بیوی ایک ذات ہوں، ایک دل اور ایک جان ہوں۔ اولاد میں بھی محبت پیدا ہو گی۔ عزیزوں میں بھی محبت پیدا ہو گی۔

اور جہاں خاوند بیوی میں لڑائی ہے۔ یہ اس کی صورت دیکھ کے منہ بھسور رہا ہے۔ وہ اس کی صورت دیکھ کر منہ بھسور رہی ہے، اس کا نتیجہ ہوگا کہ اولاد میں بھی وہی چیزیں پیدا ہوں گی۔ اور گھر جہنم بن جائے گا۔ اس کا منہ اُدھر کو، اس کا منہ اِدھر کو۔ وہ گھر کیا ہوا۔ وہ تو دوزخ ہو جائے گی۔ جنت جب بنے گا گھر، جب ایک کو دیکھ کر دوسرا خوش ہو۔

نیک بیوی، آدمی کی سعادت کی علامت ہے

حدیث میں فرمایا گیا ہے آدمی کی خوش نصیبی اور سعادت کی تین علامتیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آدمی کا رزق اس کے وطن میں اترے، اس کے لئے مارا مارا نہ پھرے کہ دنیا میں رزق کی تلاش کرتا ہوا جا رہا ہے۔ جہاں گھر ہے وہیں رزق کا سامان اللہ نے کر دیا۔ پہلی علامت خوش نصیبی کی یہ ہے۔

دوسری علامت یہ فرمائی گئی، اس کو گھر وسیع ملے، تنگ کوٹھری نہ ہو، کہ دیکھ کر اس کے دل میں تنگی اور گھٹن پیدا ہو جائے۔ صحن اس کا وسیع ہو، مکان ذرا اچھا ہو، اس لئے کہ مکان کی خوشنمائی سے دل میں بھی وسعت پیدا ہوتی ہے، اور مکان کی تنگی اور گھٹن سے دل میں بھی تنگی اور گھٹن پیدا ہوتی ہے۔ تو دوسری علامت خوش نصیبی کی یہ فرمائی گئی کہ مکان اور اس کا صحن وسیع ہو، گھر اچھا ملے۔ تاکہ دل میں بھی وسعت پیدا ہو ——

اور تیسری علامت یہ ہے کہ بیوی نیک بخت ملے۔ جب اس کی صورت دیکھے، دل میں خوشی پیدا ہو جائے۔ اور جب اُسے گھر میں چھوڑ کر جائے تو وہ مرد کی عزت و ناموس کی حفاظت کرے۔ ایسی صالحہ بیوی کہ وہ اللہ کا بھی حق ادا کرے، اپنے خاوند کا بھی حق ادا کرے۔ فرمایا، وہ آدمی خوش نصیب ہے جس کے پاس یہ تین چیزیں ہوں۔ گھر بھی درست ہو، بیوی بھی درست ہو۔ روزی بھی اس کی اس کے

وطن میں اُترے۔ باہر مارا مارا نہ پھرے۔ یہ تین علامتیں خوش نصیبی کی فرمائی گئیں۔ ان میں بڑی علامت یہ ہے کہ بیوی صالحہ ملے۔

—— جب اُسے دیکھے، دل کے اندر خوشی بھر جائے اور جب اس کے ساتھ برتاؤ اور معاملہ کرے، خوشی پیدا ہو کہ بڑی سمجھدار ہے اور جب اسے گھر پہ چھوڑ کے جائے تو اتنا مطمئن رہے کہ میرے گھر میں کوئی خرابی نہیں آسکتی، میری بیوی سلیقہ مند ہے، خوش نصیب ہے۔ تو واقعی بیوی کی صلاحیت وسوجھ مندی اور اعلیٰ درجہ کی ہوش مندی نہایت ہی بڑی نعمت، اور ایک بڑی مسرت ہوتی ہے۔

فن نحو کے امام یحییٰ ابن اکثمؒ ہیں۔ ان کے واقعات میں ہے۔ بڑے جلیل القدر عالم تھے۔ مگر انتہائی بدصورت، رنگ بھی کالا، ہونٹ بھی موٹے، آنکھوں میں زردی اور دانتوں میں بھی زردی —— غرضیکہ جتنی بدصورتی کی علامتیں ہوسکتی ہیں وہ سب جمع تھیں۔ اور بیوی اتنی حسین وجمیل تھی کہ ملکوں میں اس کا جواب موجود نہیں۔ جتنی علامتیں حسن وجمال کی ہوسکتی تھیں، وہ بیوی میں تھیں —— جب دونوں خاوند بیوی بیٹھتے، جیسے دھوپ چھاں بیٹھی ہوتی ہے۔ ایک طرف دھوپ چھن رہی ہے۔ دوسری طرف رات نظر آرہی ہے۔ جب ایک دوسرے کے سامنے بیٹھتے، تو یحییٰ ابن اکثمؒ بیوی کو خطاب کر کے کہتے۔ تو بھی یقیناً جنتی ہے۔ میں بھی یقیناً جنتی ہوں۔ دونوں جنتی ہیں —— کیوں؟ —— اس واسطے کہ مجھے تو ملی۔ تجھ جیسی بیوی۔ تو میرا کوئی منٹ شکر گزاری سے خالی نہیں ہوگا۔ شکر کے راستے سے تو میں جنت میں جاؤں گا۔ اور تجھے ملا مجھ جیسا خاوند کہ کوئی منٹ بھی تیرا صبر سے خالی نہیں —— تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچ جائے گی۔ میں بھی جنتی، تو بھی جنتی۔

حقیقت یہی ہے اگر بیوی صالحہ ہو اور حسن وجمال بھی ہو۔ دونوں کی خوش نصیبی ہے۔ وہ اسے دیکھ کے خوش ہے، وہ اس سے راضی ہے ——

تو محبتِ باہمی مقصود ہے۔

بیوی کے انتخاب کا معیار

مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رکھ لینا چاہیئے کہ محبت عورت سے محض صورت کی وجہ سے نہ کرنی چاہیئے۔ صورت ڈھلتی ہوئی دھوپ ہے آج اچھی صورت ہے، کل کو بگڑ گئی۔ بڑھاپے میں تو کم سے کم بگڑ ہی جاتی ہے۔ اور اللہ بھلا کرے بخار کا کہ وہ تین دن ہی میں حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ تین دن بخار آیا، نہ رنگت رہی، نہ عنفوانی رہی۔ گلاب کا سا رنگ تھا وہ ختم ہو گیا قصہ۔ اور اگر بخار نہ آئے تو بڑھاپا تو کہیں گیا ہی نہیں۔ بڑھاپا آ کے صورت کو بگاڑ دیتا ہے۔ اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت کہیں گئی ہی نہیں۔ وہ سب کی صورتیں ختم کر دیتی ہے۔ صورت ایک آنی جانی چیز ہے۔ اس لئے اگر کوئی بیوی سے محبت محض صورت کی وجہ سے کرے گا، وہ محبت غائب ہو جائے گی۔ اس لئے کہ جب صورت ڈھلی، محبت بھی ڈھل جائے گی ——

اس واسطے محبت کاہے سے کرنی چاہیئے؟ حدیث میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا معیار ارشاد فرمایا —— فرمایا:۔

تنکح المرأة لاربع۔ لمالها ولحسبها ولجمالها ولدینها۔

—— عورت سے چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، کبھی تو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے۔ صاحبِ جمال ہے۔ آدمی کا دل چاہا، نکاح کر لیا۔ کبھی اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے کہ نکاح کریں گے تو جائیداد قبضے میں آئے گی۔ رئیس بن کے بیٹھ جائیں گے۔ کبھی اس کی حیثیتِ عرفی کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے کہ بڑے اونچے خاندان کی ہے، اس کا نام بلند ہے۔ اس کے ماں باپ کی عزت دنیا میں قائم ہے۔ میں ایسی عورت سے نکاح کروں گا تو میری بھی عزت بڑھ جائے گی۔ اور کبھی

اس کی دینداری کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، کہ اس کا دین بہت اعلیٰ ہے ــــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ فاظفر بذات الدین ـــــــ ۔ نہ صورت کو دیکھو، نہ حسب کو دیکھو، نہ دولت کو دیکھو، دین کو دیکھو ــــــ اس لئے کہ اگر دین کی وجہ سے محبت قائم کریں گے، تو مرتے دم تک قائم رہے گی۔ اس میں ڈھلاؤ کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اگر صورت کی وجہ سے محبت کی، تو جہاں جوانی ڈھلی، محبت میں کمی آگئی۔ اور آپس میں لڑائی شروع ہو گئی۔ دولت کی وجہ سے محبت کی۔ تو دولت کو رات دن آفت آتی رہتی ہے۔ جائیداد وغیرہ خدانخواستہ ختم ہو گئی، محبت کو بھی خیرباد کہیں گے، جب وہ بات ہی نہیں رہی، جس کی وجہ سے محبت تھی۔ اور اگر حیثیتِ عرفی، یا ظاہری عزت کی وجہ سے کی۔ تو عزت و ذلت تو اضافی چیز ہے، کبھی عزت ہو جاتی ہے، کبھی ذلت ہو جاتی ہے۔ کبھی وقار، کبھی بے وقاری ـــــــ تو جہاں بے وقاری پیدا ہوئی۔ آپ کی محبت ختم ہو جائے گی ـــــــ لیکن اگر دین کی وجہ سے محبت ہے، فرض کرلو عورت کالی کلوٹی ہے۔ آدمی یہ سمجھے گا، حق تعالےٰ نے اس کا حق میرے اوپر قائم کیا، میرا فرض ہے کہ میں اس کا حق ادا کروں۔ چاہے یہ گوری ہے، چاہے یہ کالی ہے۔ چاہے یہ دولت مند ہے۔ چاہے یہ مفلس ہے۔ چاہے یہ باحیثیت ہے، چاہے یہ بے حیثیت ہے۔ میری قسمت میں لکھ دی گئی، میرے اوپر اس کا حق آگیا۔ میرا فرض ہے کہ مرتے دم تک اس کا حق ادا کروں۔ دین کی وجہ سے مرد و عورت کا معاملہ سدا بہار ہو جاتا ہے۔ اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نکاح دین کی وجہ سے کرو۔ تاکہ محبت میں دوام حاصل ہو جائے۔ حقوق کی ادائیگی دائمی طور پر ہو جائے ـــــــ

تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہاں نکاح سنت ہے اس لئے کہ وہ محبت اور اتحادِ باہمی کا ذریعہ ہے۔ شیاطین کے ہاں نکاح سے بغض ہے۔ اس لئے کہ وہ اتحاد کا ذریعہ ہے۔ شیاطین چاہتے ہیں کہ لڑائیاں ہوں، پھوٹ پڑے،

نکاح ہونے نہیں دیتے، انہیں نکاح سے برائی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آدمی زناکاری اور بدکاری کی طرف چلے، اس لئے کہ بدکاری کا انجام لڑائی، پھوٹ، قلب کی کدورت اور قلق ہے۔

زوجین میں لڑائی بڑے فتنے کا پیش خیمہ بنتی ہے

یہی وجہ ہے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ شیطان روزانہ عصر کی نماز کے بعد سمندر کے کنارے یا پانی کے اوپر اپنا تخت بچھاتا ہے اور اس پر بیٹھتا ہے۔ پانی پر اس لئے بچھاتا ہے کہ اللہ میاں سے مقابلہ کرتا ہے۔ ان کا پانی کے اوپر عرش ہے۔ تو میں بھی اپنا عرش بچھاتا ہوں —— فرق اتنا ہے کہ ان کا عرش جو پانی پر ہے وہ نہایت لطیف اور پاک ہوتا ہے۔ اور یہ کڑوا، نمکین، اور بعض اوقات اس سے اذیت بھی پہنچتی ہے۔ یہ مادی پانی ہے۔ وہ روحانی پانی ہے۔ مگر بہر حال شیطان ظاہری صورت بناتا ہے کہ اگر اللہ میاں عرش پر ہے تو میں بھی عرش پر ہوں۔ ان کا عرش پانی پر، تو میرا عرش بھی پانی پر۔ کیونکہ یہ حق کے مقابلے میں ہے۔ تو وہاں بھی کمبخت مقابلہ ہی ٹھانتا ہے۔ صورت ہی مقابلے کی بنا لیتا ہے، روزانہ سمندر پر تخت بچھا کر اس کے اوپر بیٹھتا ہے —— کیوں بیٹھتا ہے؟ اس کے شتونگڑے، اس کی اولاد و ذریت دن بھر میں جو لوگوں سے بدکاریاں کراتی ہیں۔ ہر ایک آکر اس کے پاس رپورٹ دیتا ہے۔ ایک آتا ہے میں نے فلاں کی نماز قضا کردی۔ شیطان کہتا ہے۔ کام تو بہت عمدہ کیا، مگر کوئی بڑی بات نہیں کی۔ کہ تجھے انعام یا شاباش دوں۔ دوسرا آتا ہے میں نے فلاں سے زنا کروا دیا۔ کہتا ہے کہ ہاں بات ٹھیک کی۔ مناسب کام کیا۔ کوئی بڑا قابلِ قدر کام نہیں کیا۔ ایک آتا ہے میں نے جھوٹ بلوا دیا، جھوٹی گواہی دلوا دی۔ کہتا ہے۔ تو نے بھی اچھا کام کیا۔ مگر کوئی بڑی بات نہیں ہوئی۔ ایک آتا ہے

کہتا ہے کہ میں نے آج خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔ حدیث میں ہے اس کو سینے سے لگاتا ہے کہ تو ہے میرا سپوت۔ تو نے بڑا کام کیا۔ تیرے سے میں خوش ہوں۔ تیرے سے زیادہ بہترین میری دوسری اولاد نہیں ہے۔ تو نے یہ کام کیا کہ خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔ تو سینے سے لگاتا ہے، چمٹاتا ہے، اسے شاباش دیتا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زنا کا فعل بُرا ہے۔ اس پر شاباش دینی چاہیئے تھی۔ یہ خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔ یہ تو گھروں میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ لڑائی بھی ہو جاتی ہے، صلح بھی ہو جاتی ہے ـــــ

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کیوں خوش ہوتا ہے؟ اس لئے کہ خاوند بیوی کی لڑائی دو کی لڑائی نہیں ہے، بلکہ سَو کی لڑائی ہے۔ اس لئے کہ جب خاوند بیوی لڑیں گے، تو خاوند کے جتنے عزیز ہیں، وہ خاوند کی حمایت کریں گے۔ بیوی کے جتنے رشتے دار ہیں، وہ بیوی کی حمایت کریں گے۔ تو دو آدمیوں میں نہیں چلی، بلکہ دو گھرانوں میں چل گئی ـــ اب گھرانے ایک دوسرے سے منہ پھیرے ہوئے بیٹھے ہیں۔ وہ اِن کے مدِمقابل، وہ اِن کے مدِمقابل۔ پھر ان دونوں گھرانوں کے لوگ آدھے اِدھر آجائیں گے، آدھے اُدھر آجائیں گے۔ بیوی والے بیوی کی طرف، خاوند والے خاوند کی طرف۔ تو دو گھروں میں نہیں چلی، دو خاندانوں میں چل جاتی ہے۔

اور اگر خاوند بیوی باحیثیت ہیں ـ جیسے ملک اور ملکہ، بادشاہ اور بادشاہ بیگم ہیں ان میں لڑائی ہو جائے، تو فوجیں کٹ مرتی ہیں۔ دو ملکوں میں لڑائی ہو جاتی ہے اور جنگِ عظیم برپا ہوتی ہے۔ تو دو کی لڑائی، یہ درحقیقت سینکڑوں کی لڑائی ہے ـــ اور جب دو خاندانوں میں چلتی ہے، پھر کیا ہوتا ہے؟ بدگوئی الگ، وہ اسے بُرا کہیں گے وہ اُسے۔ غیبت کا گناہ سرزد ہوا۔ یہ اس کے ایذاء رسانی کے درپے ہے۔ وہ اس کے درپے ہے۔ یہ ایذا رسانی کا گناہ الگ۔ اس کے بعد مقدمہ بازی چلی ـــ وہ الگ بے عزتی، یہ الگ بے عزت۔ پھر مقدمہ بازی میں جانبین کا روپیہ خرچ ہوا۔ لاکھوں انہوں نے برباد کئے، لاکھوں انہوں نے، جائیداد ختم ہوئی۔ تو ایک گناہ

میں سینکڑوں گناہ چھپے ہوئے ہیں۔ جب دو میں لڑائی ہوگی، تو غیبتیں الگ ہوں گی۔ چغلخوریاں الگ ہوں گی۔ مقدمہ بازی الگ ہوگی، مال الگ ختم ہوگا، گھر الگ بے عزت ہوگا، شہر میں الگ فتنہ برپا ہوگا۔ لوگ کہیں گے، "میاں دیکھا۔ فلاں ڈوبڑے بن رہے تھے۔ کیسی جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔ دیکھا آپ نے لڑائی ہو رہی ہے؟ وہ الگ تحقیر کر رہا ہے، الگ برائی بیان کر رہا ہے۔ تو بدنامی الگ، مال کی بربادی الگ عزت کی تباہی الگ، سکونِ دل الگ مٹا۔ بیوی خاوند کی لڑائی ایک گناہ نہیں، بلکہ سینکڑوں گناہ اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ اس لیے شیطان خوش ہوتا ہے کہ اس میں فتنہ پھیلتا ہے، اور ہزاروں گناہ اپنے اندر رکھتا ہے ـــــ اگر کسی نے جھوٹ بول دیا۔ بس ایک گناہ ہے، ختم ہوگیا، لیکن اس گناہ میں غیبت بھی ہے۔ عزت کی تباہی ہے، مال کی بربادی ہے، وغیرہ وغیرہ ـــ شیطان کے لئے کتنا خوشی کا موقع ہے؟۔

تو انبیاء علیہم السلام نکاح کے ختم ہونے پر خفا اور ناراض ہیں۔ اور شیاطین نکاح کے کمزور ہونے اور ٹوٹ جانے پر خوش ہیں۔ اس لئے کہ نکاح ٹوٹنے سے فتنہ پھیلے گا۔ اور اگر نکاح جڑا رہے گا، تو امانت داری پھیلے گی۔ انبیاءؑ امانت کے حامل ہیں، شیاطین فتنہ کے حامل ہیں، وہ فتنہ پردازی پر خوش ہیں۔ یہ امانت داری پر خوش ہیں۔ انبیاء کو نکاح سے محبت ہے اور شیاطین کو اس کے ٹوٹ جانے سے محبت ہے۔

بیوی پر خاوند کی انتہائی اطاعت واجب ہے

اس لئے خاوند سے کہا گیا ہے کہ تو عورت سے لطف و کرم کا معاملہ کر۔ عورت کو کہا گیا ہے کہ تو اپنے خاوند کے سامنے انتہائی اطاعت سے پیش آ۔ حدیث میں ہے اگر خاوند کسی کام کا حکم دے۔ اور عورت نہ مانے، تو جس دن اور رات میں اس نے حکم نہیں مانا، اس دن اور رات میں تمام ملائکہ اس عورت کے اوپر لعنت کرتے ہیں، کہ تو نے خاوند کی نافرمانی کی۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اگر میں غیر اللہ کے لیے کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو بیویوں کو حکم دیتا کہ اپنے خاوندوں کو سجدے کیا کرو۔ بیوی کے مقابلے میں اتنا واجب الاحترام شریعت اسلام نے خاوند کو بنایا، کہ اگر غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام نہ ہوتا تو سجدے کرنے کی اجازت دے دیتا۔ اس حد تک کے لئے میں تیار ہو جاتا ــــــ معلوم ہوا، بیوی کے اوپر انتہائی اطاعت لازم ہے۔

گویا یوں سمجھو، کہ ایک تو رب حقیقی ہے، جو اللہ رب العزت ہے۔ عورت کے حق میں اس کا خاوند رب مجازی ہے، جو اس کی پال پرورش کرتا ہے، محنت کر کے کماتا ہے۔ بیوی کے ہاتھ پہ لا کے دیتا ہے، تو اس کے حق میں گویا وہ ایک مجازی طور پر رب ہے۔ اس واسطے عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس خاوند کی جو رب مجازی ہیں۔ اور اللہ کا سایہ ہیں اس کے اوپر، کی اطاعت کرے۔

اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ جب نکاح ہو گیا تو ظاہر بات ہے عورت پر ماں باپ کا تو کوئی حق باقی نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ تعظیم و توقیر کرے۔ لیکن یہ کہ خاوند کے مقابلے میں ماں باپ کوئی امر یا حکم دیں، اس کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔ جب عورت اپنے ماں باپ کے گھر سے آ گئی۔ وہ گھر اس سے منقطع ہو گیا۔ ماں باپ کے حقوق ختم ہو گئے ــــــ اب وہ خاوند کے رحم و کرم پر ہے ــــــ اگر یہ اطاعت کرے گی۔ وہ رحم و کرم کرے گا۔ تو اسی کا تو گھر بنے گا۔ اور اگر اس نے لڑائی جھگڑا اٹھا لیا، اور اس نے سختی کی۔ ماں باپ کا تو گھر رہا نہیں کہ وہاں جا کے پناہ پکڑے۔ خاوند کو الگ ناراض کر دیا۔ نہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی رہی ــــــ تو دانشمندی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ خاوند کی اطاعت کرے۔ نافرمانی کرنے میں نہ اس گھر کی رہے گی نہ ماں باپ کے گھر کی رہے گی ــــــ تو ادھر سے عورت کو یہ حکم دیا کہ تو انتہائی اطاعت کر۔ اور اگر تو نہیں کرے گی۔ ملائکہ علیہم السلام تجھ پر لعنت کریں گے ــــــ ادھر خاوند کو کہا کہ انتہائی شفقت کر۔ انتہائی مدارات کر۔ لطف و کرم کا برتاؤ کر۔ تو نے اگر ذرا کمی کی تو تیری گردن قیامت میں نپے گی کہ تجھے

ہم نے بادشاہ بنایا تھا۔ تُو نے اپنی رعیت کے ساتھ ظلم کیوں کیا؟ عورت تیرے عیال میں تھی، تیری زیرِ تربیت تھی۔ تجھے اس کے اوپر سختی کرنے کا کیا حق تھا؟

پھر یہ کہ عورت تجھے باندی بنا کے تھوڑا ہی دی گئی ہے کہ تیری محکومہ ملازمہ ہے، وہ تو برابر کی شریکِ زندگی ہے۔ جو تیرا حق ہے، وہی اس کا حق ہے۔ کوئی باندی، ملازمہ اور نوکر نہیں ہے۔ تجھے کیا حق ہے کہ تو اُسے حقیر سمجھے یا کم مرتبہ سمجھے؟ تو مرد کو کہا گیا کہ تو اس کی انتہائی توقیر کر۔ انتہائی محبت کر۔ عورت کو کہا تو انتہائی اطاعت کر۔ جب اِدھر سے اطاعت، اُدھر سے شفقت ہوگی۔ تو گھریلو زندگی کی گاڑی اچھی طرح سے چلے گی۔ اگر اِدھر سے اطاعت، اُدھر سے شفقت نہ ہو، تو گھر کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ گھر تباہ ہو جاتا ہے۔ اولاد ہوئی تو وہ بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ رشتہ دار اور ماں باپ الگ پریشان ہوتے ہیں۔ اس واسطے فرمایا گیا ہے کہ دونوں مل کر اس گھر کو چلاؤ۔ جیسے بیل گاڑی ہوتی ہے، دو بیل آگے جُڑتے ہیں تو بیل چلتی ہے۔ اگر ایک کندھا ڈال دے، گاڑی آگے نہیں چلے گی تو گھر کی گاڑی نہیں چل سکتی جبتک خاوند بیوی محبت سے مدارات سے نہ چلیں۔ اس واسطے جگہ جگہ تاکید کی گئی۔

کم خرچ نکاح میں برکت دی جاتی ہے

مگر اس میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے۔ وہ یہ کہ یہ چیز جب ہوگی جب نکاح میں برکت ہو۔ اگر نکاح میں خدانخواستہ برکت نہ ہوئی، پھر بُرے آثار پڑتے ہیں۔ اور نکاح میں برکت کب ہوتی ہے؟ فرمایا گیا، جس نکاح میں خرچ کم ہوگا اس میں برکت زیادہ ہوگی۔ جس نکاح میں خرچ زیادہ ہوگا، برکت اٹھالی جائے گی۔ اس لئے کہ خرچ عموماً فخر و مباہات کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے کہ برادری میں ناک نہ کٹ جائے۔ ہم ذرا اونچے سمجھے جائیں۔ اس لئے آدمی حیثیت سے بڑھ کر خرچ زیادہ کرتا ہے۔ اور یہ غلطی ہے۔ اس لئے کہ جسے برادری کہتے ہیں، وہ

ہر صورت میں ناک کاٹنے ہی کے فکر میں رہتی ہے۔ کتنا ہی خرچ کرے، آدمی کی ناک نہیں رہتی — اس لئے کہ بھائی برادر اس فکر میں رہتے ہیں کہ ذرا سی کمزوری ملے، اُسے ہی اچھالتے ہیں۔ تو جسے ناک کہیں، وہ پھر بھی نہیں رہتی۔ تو مایہ بھی کھوئی، اور ناک بھی کٹوائی، فائدہ کیا ملا؟

وہ کسی ساہوکار نے اپنی بیٹی بیاہی، تو اُس نے یہ سوچا کہ میں اتنا خرچ کروں کہ دنیا میں آج تک کسی نے نہ کیا ہو۔ تاکہ دنیا میں میرا نام ہو جائے — تو اس نے ایک ہزار آدمی کی تو بارات بلائی۔ اور خدا جانے پچیس چالیس قسم کے کھانے پکوائے۔ تمام کمرہ کھانوں سے بھر گیا۔ اور ہر ہر مہمان کے لئے کہیں بستر کہیں تکیے۔ غرض سامان کی انتہا کر دی۔ اور چلتے ہوئے فی مہمان دس دس گنیّ بھی دیں۔ دس دس پونڈ بھی پیش کئے جو آج تک کسی نے نہیں دیئے تھے — مقصد یہ تھا کہ میرا نام ہو جائے کہ بھائی ساہوکار نے بڑی شادی کی۔ یہ سب کچھ کر کرا کے جب بارات رخصت ہوئی۔ لاکھوں روپے کا سامان بھی اپنی لڑکی کو دیا۔ تو ساہوکار ذرا میل بھر آگے چلا گیا، کہ کسی جھاڑی میں چھُپ کر بیٹھوں۔ تاکہ میری تعریف کرتے ہوئے لوگ جاویں گے، کہ بھائی لالہ جی نے بڑا کام کیا۔ اور ساہوکار نے بڑا جہیز دیا۔ تو ذرا دل میرا بڑھے گا۔ اس واسطے بارات کو رخصت کر کے، گھوڑے پر سوار ہو کر، دوسرے راستے سے میل بھر آگے جا کے آپ جھاڑی میں جا کر بیٹھ رہے، جہاں سے بارات گذرنی تھی۔ کہ لوگ جب تعریفیں کرتے ہوئے گذریں گے، میرا دل خوش ہو گا، اور میری محنت وصول ہو جائے گی — میں نے اپنا گھر کھویا ہے۔

گھر تو کھویا گیا، دل تو نہ کھویا جائے — جب وہاں بارات پہنچی۔ اتفاق سے وہاں زمین ناہموار تھی۔ اونچ نیچ تھی۔ مٹی بہت جمع ہو گئی تھی۔ اندیشہ تھا کہ اگر گاڑیاں گذریں، تو الٹ جائیں گی اور لوگ گریں گے۔ تو یہ ارادہ کیا گیا کہ بھئی پہلے مٹی درست کر لو۔ یہ جو مٹی جمع ہو گئی۔ اسے کھود کر ایک طرف پھینک دو۔ تو پھاوڑے کی تلاش ہوئی، جس سے مٹی کھودا کرتے ہیں۔ اتفاق سے

پھاوڑا کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ اب کسی کو کیا خبر تھی کہ ہمیں راستہ میں سڑک بھی بنانی پڑے گی جو پھاوڑا رکھتے، کسی نے بھی نہیں رکھا۔ لوگوں نے کہا، بھئی! تلاش کرو، جہیز میں ہوگا، سارے جہیز میں تلاش کیا، پھاوڑا نہ ملا — ساروں نے کہا۔ سسرے نے دیا ہی کیا، پھاوڑا تک تو دیا ہی نہیں — بس ساہوکار اٹھے کہ لعنت اس بارات کے اوپر، لعنت اس خرچ کے اوپر، سارا گھر کھو دیا، اور اب بھی میں سسرا ہی بنا رہا۔ اور یہ کہ کیا دیا سسرے نے، پھاوڑا تک تو دیا ہی نہیں —

اور جو کچھ دیا تھا، وہ سب اکارت — تو جسے ناک کہتے ہیں۔ ناک رہ جانا، برادری والے کسی کی ناک نہیں رہنے دیتے۔ وہ ناک کاٹ کے ہی رہتے ہیں۔ — پھر آدمی بے وجہ فضول اپنا گھر بھی تباہ کرے، ناک بھی کٹوالے؟ موقع سے اعتدال کا جو درجہ ہے، اس کے مطابق خرچ کرے۔ بیٹی کو دینا ہے، ساری عمر دے سکتا ہے۔ یہ کیا ضروری کہ آج ہی دے۔ آج جو دے رہا ہے وہ محض نام آوری کے لئے دے رہا ہے۔ بیٹی پیشِ نظر نہیں ہوتی۔ ناک پیشِ نظر ہوتی ہے۔ شریعت یہ کہتی ہے اگر کچھ دو تو بیٹی کو دو۔ ناک کو کچھ مت دو — یہ رہنے والی نہیں، یہ تو کٹ جاتی ہے۔ بیٹی کو دے، تو ساری عمر دے سکتا ہے۔ مگر وہ بھی اعتدال کے ساتھ دے۔ اس لئے کہ اگر ایک ہی بیٹی ہے، چلو بہت سا دے دیا۔ لیکن اگر اور بھی بیٹی ہے، تو اور اولاد کا بھی حق ہے۔ اب نام آوری کے لئے سارا گھر ایک کے اوپر خرچ کر دیا، کل کو جب دوسری شادی ہوگی، اور ہاتھ پلے کچھ نہیں ہوگا۔ لوگ یہی کہیں گے کہ بڑا بے وقوف آدمی تھا۔ پہلی پہ تو اتنا خرچ کر دیا۔ دوسری اولاد کیا سوتیلی تھی، حقیقی نہیں تھی؟ اس کے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ جب ناک نہیں کٹی تھی۔ تو اب کٹ جائے گی۔ اس واسطے آدمی مال خرچ کرنے میں اعتدال سے کام لے — حدیث میں فرمایا گیا۔ اس نکاح میں برکت دی جاتی ہے، جس میں خرچ کم ہو۔ اور جس میں خرچ زیادہ ہوتا ہے،

اس سے برکت اٹھالی جاتی ہے، یا کم کردی جاتی ہے۔

معاملات میں سب سے زیادہ آسان نکاح ہے

—— اس کی بنا یہی ہے کہ وہ زیادہ خرچ مفاخرت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نام آوری یا نمود کی وجہ سے۔ یہی خراب کرنے والی چیز ہے۔ ورنہ نکاح کو اللہ نے سب سے زیادہ معاملات میں آسان بنایا ہے جسے ہم نے سب سے زیادہ مشکل بنا رکھا ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نکاح ایسی سادہ چیز تھی کہ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہٗ، جو جلیل القدر صحابی ہیں۔ اور ایسے جلیل القدر صحابی ہیں کہ بعض اوقات آپ صلے اللہ علیہ وسلم سفر میں جاتے تو اپنا نائب بنا کر جاتے تھے۔ اتنے بڑے لوگوں میں ہیں۔ اور جنت کی بشارت جن دس لوگوں کو دی گئی ہے، ان میں عبدالرحمٰن ابن عوف رضؓ بھی شامل ہیں۔ تو دنیا ہی میں جنتی ہیں۔ اتنے جلیل القدر ہیں۔ ایک دن مجلس نبویؐ میں حاضر ہوئے تو کپڑے اور چہرے پر زرد دھبے تھے۔ فرمایا:

عبدالرحمٰنؓ! یہ کیا بات ہے؟

عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے نکاح کیا ہے —— اس زمانے میں جب نکاح ہوتا تھا تو ایک خاص قسم کا عطر ہوتا ہے، جو زعفران سے بنتا تھا۔ اس کو لگاتے تھے تو کپڑے پر کوئی دھبہ بھی آجاتا تھا۔ جیسے بعض عطر مخصوص ہوتے ہیں۔ جو نکاح ہی کے دن لگائے جاتے ہیں، جیسے لڑکی کو نخ جلا کر بسایا جاتا ہے — نخ یہ چھوٹے چھوٹے چوپائے سے ہوتے ہیں، ان کو جب جلاتے ہیں، تو خوشبو مہکتی ہے کپڑوں میں وہ خوشبو لگاتے ہیں تو کپڑے مہک اٹھتے ہیں۔ اس کو نخ بسانا کہتے ہیں۔ وہ شادی ہی کے دن لگائی جاتی ہے۔ ویسے اس کو کوئی نہیں لگاتا۔ ایسا ہوتا ہے، رواج کی بات ہے ——

تو آپؐ نے فرمایا یہ زرد رنگ کیسا —؟ عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں نے

نکاح کیا ہے۔ اور نکاح کے دن خوشبو لگائی ___ فرمایا کنواری سے نکاح کیا ہے یا بیوہ سے؟ ___ عرض کیا ___ یا رسول اللہ! بیوہ سے ___ فرمایا کیوں؟ ___ عرض کیا۔ یا رسول اللہ! پہلی بیوی مرگئی تھی، اس کی کچھ اولاد تھی۔ کنواری سے کرتا، تو پال نہ سکتی۔ بیوہ بیچاری خدمت کردے گی۔ اولاد کو پال دے گی۔ آپؐ نے برکت کی دعا دی۔

___ آپ نے دیکھا کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے بڑھ کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا عاشق کون ہو سکتا تھا۔ صحابی بھی جلیل القدر ہیں۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر محبوب کون ہو سکتا تھا؟ ___ ان کی دنیا اور آخرت آپؐ کی محبت کے اندر پوشیدہ ہے۔ ایمان نام ہی محبت کا ہے۔ تو عبدالرحمٰن ابنِ عوفؓ عاشقِ صادق، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم محبوبِ کامل۔ نکاح کرتے ہیں، اور حضورؐ تک کو نہیں بلاتے۔

___ یہاں نکاح ہوتا ہے کہ جب تک نویل نہ پھرے، جب تک برادری، اور کنبے کے سر نہ جمع ہوں، یہ ناک کی مصیبت ہے کہ کہیں یہ نہ کٹ جائے۔ چاہے گھر میں کچھ ہو نہ ہو، لیکن ناک کی وجہ سے جمع کریں گے۔ اور وہاں اللہ کے رسولؐ تک کو دعوت نہیں دی۔ اور آپؐ نے بھی بُرا نہیں مانا۔ یہ نہیں فرمایا۔ بھئی! ہمیں تو تم نے بلایا ہی نہیں۔ نہ کوئی شکایت کی۔ معلوم ہوا نکاح جیسی سادہ چیز اسلام میں کوئی نہیں تھی، کہ نکاح کریں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کو خبر نہ ہو ___ معلوم ہوا گھر میں بیٹھ کر کرلیا۔ اتنی سادہ چیز تھی۔

نکاح میں معمولی ۲ دو خرچ ہیں

نکاح کے بڑے اخراجات دو ہی ہیں۔ ایک مہر کا خرچ ہے۔ ایک ولیمہ کا خرچ ہے۔ خاوند کے ذمہ یہی ہے کہ ولیمہ کرے اور مہر ادا کرے ___ یہ اتنے آسان بنا دیئے کہ ولیمے کے بارے میں تو فرمایا:۔ اولم ولو بشاۃ۔ اگر کچھ بھی نہ ہو، تو ایک بکری ذبح کرکے کھانا کھلادو۔ بکری بھی نہ ہو۔ جو ہاتھ لگے ہے، وہی کھلادو۔

اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شادی ہوئی گھر میں کچھ تھا نہیں کہ ولیمہ کریں۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے کہ کیا کھلاؤں۔ گھر میں تو فقر و فاقہ ہے۔ اسی وقت ایک شخص ہدیہ میں کچھ کھجوریں لے کر آیا، اور ایک مٹکا لے کر آیا۔ آپؐ نے گٹھلیاں نکلوا کے مٹکے میں ملوا کے چمڑے کے دستر خوان پہ ڈال دیا۔ حاضرین سے فرمایا۔ کھاؤ، یہ ہمارا ولیمہ ہے —— تو بکری نہیں لانی پڑی، جو پاس تھا کھلا دیا۔ بس ولیمہ ہو گیا۔ ایک خرچ نکاح میں یہ تھا۔ یہ اتنا سادہ، اور ایک مہر کا خرچ ہے۔ تو فرمایا گیا۔ دس درہم بھی اگر کسی کے پاس ہوں، نکاح ہو جائے گا۔ دس درہم کی ہندوستانی قیمت اڑھائی روپے بیٹھتی ہے۔ تو اڑھائی روپے میں نکاحِ شرعی ہو سکتا ہے۔

نکاح میں زیادہ خرچ کا نتیجہ

یہ جو آدمی اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرتا ہے۔ تو نکاح تو ہو جاتا ہے۔ تھوڑی بہت واہ واہ بھی ہو جاتی ہے۔ مگر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گھر برباد ہو جاتا ہے۔

—— ہمارے ہی عزیزوں میں سے تھے شیخ ظفر حسین صاحب مرحوم۔ بہت بڑے رئیس تھے، ان کی حویلی آج بھی دیوبند میں کھڑی ہوئی ہے، یُوں معلوم ہو کہ شاہی قلعہ ہے۔ ہاتھی کے گھسنے کا دروازہ اور بڑی بڑی چیزیں —— انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کا نکاح کیا۔ تو ولیمہ جو کیا ہے وہ فقط سارے دیوبند کا نہیں بلکہ دیوبند کے ارد گرد جتنے دیہات تھے، سب کو مدعو کیا۔ ہزاروں دیہات والے۔ پھر ایک وقت کا نہیں، بلکہ ایک ہفتے تک دعوت کی۔ پورے سات دن یعنی چودہ وقت کھانا کھلایا۔

اور یہ بھی اعلان تھا کہ دیہاتیوں کو آنے میں زحمت ہوگی، کوئی دس میل سے آئے گا کوئی بیس میل سے۔ تو کھانے پک پکا کے بہلیوں پہ گاؤں گاؤں پہنچے ہیں۔ اور

گھر گھر تقسیم ہوئے۔ ایک ہفتے تک کھانے پہنچتے رہے، بڑا نام ہوگیا، دنیا میں ایسا ولیمہ کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ دنیا ایک وقت کا ولیمہ کرتی ہے، انہوں نے چودہ وقت کھلایا —— مگر نتیجہ یہ نکلا کہ نکاح تو ہوگیا، لیکن آج اگر جاکے دیکھا جائے۔ ان کی اولاد کا گزر بھیک کے ٹکڑوں پر ہے (العیاذ باللہ) کسی نے خدا واسطے دے دیا، کھانا کھالیا۔ نہیں تو نہیں۔ ایسی شادی سے فائدہ کیا؟ یہ خانہ آبادی نہیں یہ تو خانہ بربادی ہے۔

نکاح میں پاک ثمرات کب ظاہر ہوتے ہیں

میں اس یہ عرض کر رہا تھا کہ پاک ثمرے جب ظاہر ہوتے ہیں جب نکاح میں برکت ہو۔ اور برکت جب ہوتی ہے، جب نکاح میں خرچ کم ہو —— اس لئے جو رائج الوقت مہر ہو اس کو باندھ دو۔ کوئی خاص مہر تلاش کرنا، یا جہیز کے سلسلے میں بہت زیادہ حدود سے گزر کر خرچ کرنا، یہ سب غلط چیزیں ہیں۔ مسلمانوں کی جائدادیں اسی میں تباہ ہوئی ہیں۔ یا شادی کی رسوم میں، یا غمی کی رسوم میں —— مرنے والا مرتا ہے، وہ تو گیا۔ اس کے بعد اب برادری کے کھانے ہو رہے ہیں۔ چالیس دن کا الگ ہو رہا ہے۔ دس دن کا الگ ہو رہا ہے۔ برسی الگ ہو رہی ہے، اور چہلم الگ ہو رہا ہے۔ نہیں ہوتا تو قرض لے لے کر کرتے ہیں —— تو مسلمانوں کی جائدادیں برباد ہوئی ہیں۔ حکومتیں چھن گئیں۔ شادی کی رسموں میں، یا غمی کی رسموں میں۔ رسوم کی وجہ سے مسلمان تباہ ہوئے۔ اور اب تک بھی ہوش نہیں آتا، اسی میں مبتلا ہیں ——

بہر حال میں نے اس لئے عرض کیا کہ نکاح کی غرض و غایت باہمی سکون و مودت ہے۔ مودت و محبت کا اثر جب پڑتا ہے، جب نکاح با برکت ہو۔ بابرکت جب بنتا ہے جب اخراجات میں کمی کی جائے۔ نام و نمود اور شہرت کے جذبات

سے خالی ہو۔ فرض کی ادائیگی پیشِ نظر ہو کہ اولاد کا فرض ہے۔ اللہ کا حکم ہے۔ اس کو ادا کر رہے ہیں۔ اس میں دین پیشِ نظر ہو۔ خاوند کے پیشِ نظر بھی یہ ہو کہ میں لڑکی سے اس کے دین کی وجہ سے نکاح کر رہا ہوں۔ وہ خوب صورت ہو یا بدصورت۔ اس کے ساتھ دین کی وجہ سے معاملہ کروں گا۔ میرے ذمے تو حق ہے۔ مرتے دم تک مجھے ادا کرنا ہے۔ وہ مالدار ہو یا بے مال ہو۔ میرے ذمے اس کا حق ادا کرنا ہے۔ جب اللہ نے میرے حصے میں لگا دیا ہے، مجھے حقوق کی ادائیگی پیش نظر ہے۔ جب اللہ نے حکم دیا کہ محبت سے برتاؤ کر، میرا فرض ہوگا کہ میں اپنی بیوی کا دل مٹھی میں رکھوں، اس کی مدارات کروں، اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤں۔ اس میں پھر ایسی برکت ہوگی کہ اولاد میں برکت ہوگی، گھر بار میں برکت ہوگی، معاملات میں بھی برکت ہوگی۔

ادھر عورت کا یہ فرض ہے۔ وہ یوں سمجھے کہ خاوند کا حق مجھ پر عائد کر دیا گیا۔ یہ خوبصورت ہو، یا بدصورت۔ میرا فرض ہے اس کا حق ادا کرنا۔ میرے لئے تو وہ ربِ مجازی بنایا گیا ہے۔ یہ انتہائی بدصورت سہی، مگر میرے لئے تو سرتاج ہے۔ میرا فرض ہوگا میں اس کے حقوق ادا کروں گی۔ یہ جذبات ہوں گے تو حقوق کی ادائیگی مرتے دم تک ہوگی۔ گھر جنت بن جائے گا۔ عارضی چیزوں پر مدار ہوگا۔ دولت، عزت، حیثیت، یہ آنی جانی چیزیں ہیں۔ آتی بھی ہیں، جاتی بھی ہیں، ان پر اگر مدار رکھ دیا، محبت بھی عارضی ہوگی۔ چند دن کے بعد ختم ہو جائے گی۔ تو مقصودِ اصلی اور غرض و غایت نکاح کی یہ ہے

لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ۔ اس لئے تم میں سے تمہارا جوڑا پیدا کیا۔ تم میں انس، سکون ہو۔ تم ایک دوسرے کے ساتھ محبت و مودت کا برتاؤ کرو۔ اگر تم غور و فکر کرو تو یہ اللہ کی بڑی قدرت کی نشانی ہے۔

نکاح کے احکام

نکاح کی یہ غرض و غایت رکھی گئی۔ اس غرض و غایت کے تحت احکام وہ

رکھے گئے جن سے میل ملاپ پیدا ہو ــــ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خاوند بیوی میں جھڑپ بھی ہو جاتی ہے۔ فرشتے تو ہیں نہیں، انسان ہی تو ہیں۔ اس کا مضائقہ نہیں ــ بعض دفعہ خاوند ناخوش ہو جاتا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ کر دیتا ہے ــ بعض دفعہ بیوی بھی ناخوش ہو جاتی ہے، اُسے بھی ناز ہوتا ہے۔ وہ بھی خاوند کو چار باتیں کہہ دیتی ہے۔ ایسا بھی گھروں میں ہوتا ہے۔ جب وہ بشر ہیں تو ہوگا۔ اس میں ہدایت یہ کی گئی ہے کہ اگر ایسا ہو تو حکمت سے کام لے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا۔ یہ عورت جو ہے، یہ بائیں پسلی کی پیدائش ہے بائیں بھی پسلی آدم علیہ السلام کی نیچے والی۔ جو زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہے، اس سے پیدا ہوئی۔ اس کے مزاج میں ٹیڑھ ہے، اور تھوڑی سی کجی ہے ــــ فرمایا نہ اُسے بالکل ویسے ہی چھوڑ دو، ورنہ اور ٹیڑھی بنے گی۔ اور نہ بالکل سیدھی کرنے کی فکر میں رہو، ورنہ ٹوٹ جائے گی۔ تو نہ بالکل سیدھی کرو، نہ ویسے ہی چھوڑ دو ــ کچھ نرمی، کچھ گرمی، کچھ مدارات، کچھ ڈانٹ ڈپٹ، کچھ سمجھانا، بجھانا، دونوں چیزیں رہنی چاہئیں۔

درشتی و نرمی بہم در بہ است

فرمایا گیا نہ بالکل ویسے آزاد چھوڑ دو، زیادہ ٹیڑھی ہو جائے گی۔ نہ اتنی سختی کرو کہ وہ بالکل ٹوٹ جائے۔ اعتدال کا معاملہ رکھو۔

اسی واسطے قرآن حکیم میں اس کی ہدایت کی گئی۔ برداشت اور صبر کے برتاؤ کا حکم دیا گیا۔ فرمایا گیا:۔ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ــــ نیک بیبیاں کون ہیں؟ نیک ازواج کون ہیں؟ جو صالحات ہیں۔ وہ اللہ کی عبادت گزار بندیاں ہیں، جو اپنے نماز روزے، دین و دیانت کی پابند ہیں۔ وہی صالح بن سکتی ہیں ــ چکنی چپڑی باتیں کرنے والی صالح نہیں ہوتیں۔ حق ادا کرنے والی صالح ہوتی ہیں ــــ حٰفِظٰتٌ۔ جو غیب کی حفاظت کریں۔ غیب سے مراد خاوند کے راز اور اسرار ہیں۔ وہ کسی پہ

ظاہر نہیں کرتیں ـــــــ

خاوند کی ناقدری کا انجام

بعض عورتوں کو عادت ہوتی ہے۔ کسی محفل میں بیٹھیں۔ اس نے کہا تیرا خاوند ایسا بُرا، اس نے کہا تیرا ایسا بُرا۔ رات دن اسی لعن طعن میں مبتلا ہیں ـــــــ اگر اس (تقریر) میں میری بہنیں بھی شریک ہوں، جو سن رہی ہوں۔ وہ بھی کان کھول کر سن لیں۔ جہاں میں نے ان کے لیئے یہ کہا ہے کہ خاوند کا فرض ہے " ان کی مدارات کرے۔ حقوق ادا کرے۔ یہ کرے وہ کرے ـــ کچھ ان کے ذمے بھی حقوق ہیں۔ کچھ ان میں بھی کجی اور ٹیڑھ ہے۔ وہ اپنی اصلاح و حفاظت کریں۔

حدیث میں ہے۔ آپؐ نے عید کے دن عورتوں میں وعظ فرمایا۔ عورتیں ایک طرف تھیں، مرد ایک طرف تھے۔ آپؐ تشریف لائے۔ اور عورتوں کے گروہ میں وعظ فرمایا۔

تصدقن یا معشر النساء

فانی اریتکن اکثر اھل النار

اے عورتوں کے گروہ! صدقہ کثرت سے دیا کرو۔ اس لیے کہ جہنم میں میں کثرت سے عورتوں کو دیکھتا ہوں۔ صدقہ دو گی تو بلیات رد ہوں گی۔ حدیث میں ہے:

الصدقۃ تطفیٔ غضب الرب کما یطفیٔ الماء النار ـــــــ صدقہ اس طرح سے اللہ کے غضب کو بجھا دیتا ہے، جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے ـــ تو فرمایا صدقہ کثرت سے کیا کرو۔ اس لیے کہ عورتوں کو جہنم میں میں کثرت سے دیکھتا ہوں ـــــــ حدیث میں ہے۔ ایک عورت کھڑی ہوئی، اس کا حلیہ بھی آتا ہے۔ کالے رنگ کی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹ تھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کوئی حبشی ہو گی۔ کہنے لگی۔ وبم یا رسول اللہ ؐ ـــ یا رسول اللہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم ہی جہنم میں زیادہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا

میں بھی ہم ہی چولہا جھونکیں ۔ یہاں بھی آگ وہاں بھی آگ ۔ دونوں جگہ آخر ہماری کیا مصیبت آئی ۔ ایسا آخر کیوں ہے ؟ ۔

آپؐ نے اس کی وجہ ارشاد فرمائی ــــ وہ میری بہنوں کی سننی کی ہے اور اس کو پلّے باندھ لیں ۔ اس لئے کہ انہوں نے یا مردوں نے مجھے اس کرسی پر بٹھلایا ہے یہ کرسی معالج کی ہے ، جو دلوں کا علاج کرتا ہے ۔ معالج جن جن کے امراض سامنے رکھ دے کہ یہ کھوٹ ہے ، یہ بیماری ہے ۔ تاکہ علاج کر سکیں ۔ وہ طبیب بہت خائن ہو گا کہ وہ تعریف کے کلمات کہہ جائے ، اور کھوٹ کو ظاہر نہ کرے ۔ وہ حکیم نہیں ۔ وہ علاج نہیں کر سکتا ۔ اس واسطے اگر میری بہنیں یہاں ہوں ، تو بُرا نہ مانیں ۔ بہر حال جو اصلی بات ہے وہ کہہ دوں تاکہ علاج کی طرف متوجہ ہو جائیں ــــ اور یہ میں تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں ۔ یہ تو اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا ۔ میں نقل کر رہا ہوں ۔ اس واسطے میرے سے بُرا ماننے کی ضرورت نہیں ۔ میں تو ناقل ہوں ، حکم شرعی جو ہے وہ پہنچا دیا ۔ اب تم بُرا مانو یا بھلا ۔ تو اللہ کے رسولؐ سے اس عورت نے جب کہا وبم یا رسول اللہ ؟ ۔ آخر ہمیں کیوں آگ میں ہیں ۔ یہاں بھی وہاں بھی ۔ یہ ہماری قسمت میں ہی کیوں آگ رہ گئی ۔ آپؐ نے اس کی دو وجہیں ارشاد فرمائیں :۔

تکثرن اللعن و تکفرن العشیر ــــ تم میں دو بیماریاں ، اور دو روگ ہیں ۔ ایک تکثرن اللعن ــــ لعن کی تم میں کثرت ہے ۔ جس مجلس میں عورتیں بیٹھیں گی ، لعن طعن ۔ نام رکھنا ، تیرا زیور بہت بُرا میرا زیور بہت اچھا ۔ اس کی صورت اچھی نہیں ، میری صورت اچھی ، اس کا لباس خراب میرا لباس اچھا ۔ دنیا بھر کی بات اگر مجلس میں ہے تو وہ یہ کہ فلانی بُری اور میں اچھی ۔ صورت بھی میری اچھی ۔ زیور بھی میرا اچھا ۔ کسی لفظ سے بھی مطلب اس کا یہی نکلتا ہے کہ بُرائی میری طرف ہے ، اور بُرائی دوسرے کی طرف ہے ۔ یہ لعن طعن ہے تو تم میں کثرت سے لعن طعن کرنی کی عادت ہے ۔ اور دوسرے کو طعن وہ دے گا جو اپنی حیثیت

سے بے خبر ہو۔ جاہل کا کام دوسرے کو طعن دینا ہے کیونکہ ان میں جہالت زیادہ ہوتی ہے، اس واسطے دوسرے کو طعنے دیتی رہتی ہیں۔ اگر اپنے عیب پیشِ نظر ہوں۔ دوسرے کو طعن دینے کی کبھی جرأت نہیں ہو سکتی۔ اس کی بنا یہ ہے کہ اپنی چیز پیشِ نظر ہوتی ہے۔ دوسرے کی ہوتی نہیں۔ اپنی بُرائی سامنے ہے نہیں۔ بس دوسروں کی برائی نظر آتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے آئینہ ہے تو صُورت تو اچھی نظر آرہی ہے، اور دل کا آئینہ ہے نہیں کہ یہ دیکھے، دل میں کیا کارگزاری ہے۔ اس واسطے فرمایا :۔ ایک بات تم میں یہ ہے کہ تم کثرت سے لعن طعن کرتی ہو۔ ایک مرض تو تم میں یہ ہے۔

اور فرمایا۔ وتکفرن العشیر — دوسرے یہ کہ خاوندوں کی ناقدری اور کفرانِ نعمت یہ بھی تمہارے اندر زیادہ ہے — یہ میں نہیں کہتا، حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ میں تو اسے نقل کر رہا ہوں — خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں، ایک خاوند عمر بھر سلوک کرے، جب وہ زیور مانگے، تو زیور بھی لا کے دے، اور جب خاوند کے ساتھ اس کی لڑائی ہو گی تو کیا کہے گی ؟ ما رایت منک خیرًا قط ۔ مَیں نے تو اس اجڑے گھر میں آ کے کبھی خیر دیکھی ہی نہیں۔ مصیبت ہی میں مبتلا رہی، سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ عمر بھر جو اس نے سلوک کیا تھا، وہ ایک جملے میں ختم کر دیا، کہ میں نے تو کبھی اس گھر میں خیر دیکھی ہی نہیں۔ بس ڈولے میں آئی تھی اور کھٹولی میں نکل جاؤں گی۔ بیچ میں یہی مصیبتیں میری تو قسمت میں تھیں۔ یہ ناقدری کا حال ہے۔ اب وہ خاوند غریب دیکھ رہا ہے کہ میں نے چوری کر کے، ڈکیتی ڈال کے اس کے لیے اشیا فراہم کر دیں اور اس نے یہ قدر دانی کی کہ ما رایت منک خیرًا قط۔ میں نے تو کبھی اس اجڑے گھر میں آ کے خیر دیکھی ہی نہیں — اب وہ بیچارہ جواب دے تو کیا دے۔ اپنا سا مُنہ لے کر چپکے سے آجاتا ہے۔ یا تو خفا ہو، پھر لڑائی بنتی ہے۔ سوائے اس کے کہ صبر کرے۔ اس عورت سے کون لڑے۔ غریب آجاتا ہے۔

ہمارے مولانا عبد الرب صاحب مرحوم تھے۔ انہوں نے عورتوں کی ذہنیت نمایاں کرنے کے لئے بڑی مقفیٰ بات کہی۔ کہنے لگے اگر خاوند ان سے پوچھے۔ گھر

میں تمہارے پاس کچھ ہیں کپڑے ؟ تو کہیں گی۔ آئے تھے کپڑے وہ چار چیتھڑے پڑے ہوئے ہیں، کون سا میرے لئے لباس بنایا تھا ؟ اور اگر کہے کہ تمہارے پاس جوتا بھی ہے ؟ تو کہیں گی۔ آئے تھے جوتے، وہ دو لیتھڑے پڑے ہوئے ہیں۔ لاکے دیئے تھے تم نے جوتے ۔۔ اور پوچھے کہ بھئی برتن بھی ہیں گھر میں ؟ ۔ دھرے تھے برتن، وہی چار ٹھیکرے پڑے ہوئے ہیں۔ خود باپ کے گھر سے لے آئی تھی۔ وہ کام آ رہے ہیں، ورنہ تم نے کون سے لاکے دیئے تھے ـــــــ غریب کے سارے کئے کرائے پہ پانی پھیر دیا۔ اس نے محنت کی، عمر بھر کما کما کے دیا۔ یہ اس کی قدر نکلی کہ چار چیتھڑے ملے، دو لیتھڑے ملے، اور چار ٹھیکرے ملے۔ یہ اس کی قدر دانی ہوئی۔ خاوندوں کی ناقدری کرنا تمہارا شیوہ ہے۔

اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اتنی ناقدری کرتی ہیں کہ عمر بھر کے احسان کا بدلہ دو لفظ میں چکا دیتی ہیں ـــــــ فرمایا یہ وجہ ہے کہ جہنم میں کثرت سے جاؤ گی۔ اس کا علاج بتایا کہ صدقہ کثرت سے دو۔ تاکہ غضب خداوندی بجھے۔ اس لئے کہ لعن طعن کرنے سے اللہ کا غصہ بڑھتا ہے۔ کفرانِ نعمت سے اللہ کا غضب بڑھتا ہے۔ صدقہ دو گی، یہ غضب ٹھنڈا ہو جائے گا۔ جتنی غریبوں کی خبر گیری صدقات خیرات سے کرو گی۔ تو اس برائی کی تلافی ہو جائے گی، جو تمہارے اندر ہے ـــــــ تب جا کے اس عورت کو بات ذرا تسلیم ہوئی ـــــــ

عورت مرد کو اپنی ہدایت پر نہ چلائے

اور اس میں آپ نے یہ بھی فرما دیا کہ ہو نا تم ناقصات العقل ـــ ؟ اس پر کھڑی ہو گئی کہ ہم میں کیا نقصانِ عقل ہے ؟ گویا اپنے نزدیک وہ بڑی افلاطون بھی، ارسطو بنی ہوئی تھی کہ ہم سب سے زیادہ عقل مند ہیں۔ اور بعضیوں کو تو یہ دعویٰ ہوتا ہے

کہ مردوں میں کیا عقل رکھی۔ عقل تو ہمارے اندر ہے ——— اور یہ ایک حد تک انہوں نے صحیح بھی کہا —— حدیث میں آپؐ فرماتے ہیں :۔

ما رایت من ناقصات عقل و دین اذھب للب الرجل الحازم من احدٰ لکن

فرمایا کہ ہے تو یہ ناقص العقل! مگر بڑے بڑے مردوں کی جو کامل العقل ہوتے ہیں، ان کی عقلیں اُچک لی جاتی ہیں، اسے پاگل بنا کے چھوڑتی ہیں۔ ایسے اتار چڑھاؤ سے بات کریں گی، اچھا خاصا عقلمند آدمی ان کے سامنے بیوقوف بن جائے گا، اور جو کہیں گی، وہ کرنا پڑے گا ———

چنانچہ ان رسوم کے بارے میں جب لوگ کہتے ہیں کہ بھئی تم عقلمند ہو، تم یہ کیا کر رہے ہو، کہ جی عورتیں نہیں مانتیں۔ گویا عورتیں حکام ہیں۔ آرڈر وہاں سے آتا ہے۔ یہ حضرات نیاز مند اور غلام ہیں۔ تعمیل کرنا ان کا فرض ہے۔ یہ جواب دیتے ہیں۔ ——— تو ان کا ایک حد تک دعوٰے بھی صحیح ہے کہ ہم عقل مند ہیں۔ جب عقلمندوں کو بے وقوف بنانے کی قدرت ہے تو اور اس سے زیادہ کیا عقل مندی ہوگی ——؟ مگر فرمایا کہ ناقص العقل اور ناقص الدین ——— اس پر ایک عورت نے عرض کیا۔ یا رسولَ اللہ! ہم میں کیا نقصانِ عقل ہے اور نقصانِ دین کیا ہے ؟

فرمایا۔ مہینہ میں بیس دن نماز پڑھو گی، دس دن سوؤ گی، تو دین سے محروم ہی رہیں ؟ اور نقصانِ دین کیا ہوتا ہے ؟ اتنے دن دین سے بالکل محروم نہ نماز نہ روزہ، اور نقصانِ عقل یہ ہے۔ اگر عدالت میں شہادت ہو تو دو عورتیں ایک مرد کے برابر لی جاتی ہیں۔ گویا وہ آدھے مرد کے برابر ہیں۔ تو عقل بھی آدھی رہ گئی۔ یہ آپؐ نے جواب دیا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ عورت کی جو خلقت ہے، وہ مرد کی نسبت کمزور ہے۔ جیسے قویٰ ظاہری کمزور ہیں، قویٰ باطنی بھی کمزور ہیں۔ (فہم اور عقل وغیرہ)۔ مگر بھئی! یہ جنس کی بات کہہ رہا ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض عورتیں ایسی بڑی بڑی عقل مند گزری ہیں کہ ہزاروں مرد بھی عقل و فہم میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ افراد کی

بات ہے، یہ جنس کی بات ہے۔ جنس مرد کی قوی ہے۔ عورت کی جنس ضعیف ہے۔ اب اگر اتفاق سے کوئی عورت پہلوان بن جائے تو جنس اپنی جگہ رہے گی۔ افراد ایسے ہی نکلیں گے۔

جیسے ہمارے ہاں ہندوستان میں ایک حمیدہ بانو پہلوان ہے۔ بڑے بڑے پہلوانوں کو اس نے پچھاڑ دیا۔ اس کا دعوےٰ ہے کہ مجھے کوئی نہیں پچھاڑ سکتا۔ ہر لڑائی کے اندر وہی پالا جیتتی ہے۔ اب جنس تو اس کی کمزور رہے گی۔ اتفاق سے ایک عورت ایسی بھی قوی نکل آئی۔ جنس تو ناقص العقل رہے گی۔ لیکن اتفاق سے بعضی عورتیں ایسی کامل العقل بھی گزری ہیں کہ انہوں نے سلطنتیں چلائی ہیں۔ مردوں میں وہ عقل کی قوت نہیں ہے، جو ان کے اندر ہے، تو وہ افراد کا قصہ ہے، افراد، آحاد دانش مند بھی نکلیں، شاعر بھی نکلیں، ادیب بھی نکلیں، محدث و مفسر بھی نکلیں۔ مگر جنس جو ہے اس کی عقل میں بہر حال نقصان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا۔ لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ ۔۔۔ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنی سلطنت کے کاروبار عورت کے ہاتھ میں دے دیئے۔ یعنی اس کی عقل پہ چھوڑ دیئے۔ وہ لے کے سارے کنبے کو ڈوبے گی۔ اس کی جبلی عقل ہے اس کے مطابق چلے گی ۔۔۔ عورت کی عقل مرد کے اعتبار سے کمزور ہوتی ہے۔ اتفاق سے کوئی اعلیٰ ترین عقل والی نکل آئے، تو وہ ایک فرد کی بات ہوگی، جنس کی نہیں۔ جیسے مردوں کی جنس عقل مند ہے۔ لیکن بعضے اتنے احمق ہوتے ہیں کہ ان سے زیادہ کوئی بے وقوف ہی نہیں، بلکہ بعضوں کو گدھوں سے بھی کم عقل ہوتی ہے۔ بعضے ایسے بھی انسان نکلتے ہیں۔ مگر یوں نہیں کہا جائے گا کہ انسانوں کی جنس بے عقل ہے۔ مردوں کی جنس عقلمند، عورتوں کی جنس کم عقل، بعضی عورتیں بڑی عقل مند، بعضے مرد بڑے بے وقوف۔ یہ الگ قصہ ہے ۔۔۔ غرض حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ نقصانِ عقل بھی ہے، نقصانِ دین بھی ہے۔ اس واسطے تمہارا فرض ہے کہ مردوں کی ہدایت پر چلو۔ انہیں اپنی ہدایتوں پر مت چلاؤ۔ ورنہ

وہ بھی ڈوبے گا، اور پورا کنبہ بھی ڈوبے گا اگر تمہاری ہدایتوں پر چلا۔

عورت اپنے خاوند کیسے مہربان ہو سکتا ہے

تو میں نے چند باتیں عرض کیں۔ ایک یہ کہ نکاح کی غرض و غایت کیا ہے؟ وہ باہمی سکون و مودّت ہے۔ نسل کی تکثیر خود بخود ہو گی۔ احکام کیا ہیں کہ مرد کے ذمّے شفقت واجب ہے۔ عورت کے ذمّے اطاعت واجب ہے۔ مرد کا کام یہ ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ لطف و کرم کا برتاؤ کرے۔ بیوی کا کام یہ ہے کہ کامل اطاعت کا برتاؤ کرے۔ اور اپنے خلاف بھی ہو، تو سننے کی عادت ڈالے۔ یہ نہ ہو کہ جہاں خاوند نے مزاج کے خلاف بات کہی اور اس کی ناک چڑھی ہوئی ہے۔ ایک کیا چار جواب دینے کو تیار۔ اس سے بے مہری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ گھر کی گاڑی جب چلتی ہے، جب عورت خاوند کی مطیع ہو، اور خاوند عورت کا مطیع بن جائے۔ مگر مطیع کب بنے گا؟ جب عورت انتہائی محبت اور ایثار کا برتاؤ کرے گی۔ اطاعت اطاعت کو کھینچتی ہے۔ سرکشی کرے گی تو اسے بھی نفرت پیدا ہو جائے گی —— اگر کوئی عورت یہ چاہتی ہے کہ میرا خاوند بالکل میرے کہنے میں رہے، میرا غلام بن جائے۔ تو پہلے خود غلام اور باندھی بن جائے۔ وہ بھی مجبور ہو کے غلام بن جائے گا۔ غلام بنانا، غلام بننے سے ہوتا ہے۔ پہلے خود عملاً باندھی بن کے دکھلائے وہ خود بخود غلام بن جائے گا۔ اطاعت سے راحت ہوتی ہے، جتنی اس کی اطاعت کی جائے گی، وہ بھی اس کی اطاعت کرے گا —— تو عورت کا یہ فرض ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے اس فکر میں رہے کہ کن چیزوں سے میرا خاوند ناخوش ہوتا ہے، میں وہ بات نہ کروں، اور جن چیزوں سے وہ خوش ہوتا ہے، قصداً ہی وہ چیزیں کروں کہ اس کا دل راضی ہو، جتنا راضی ہو گا، میرے اوپر مہربان بن جائے گا، میرا گھر چلے گا —— اور مرد کا یہ فرض ہے

کہ وہ یہ دیکھے کہ اس بیوی کی ذہنیت کیا ہے۔کن چیزوں سے یہ خوش ہوتی ہے ۔ وہ چیزیں کرے ۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ اپنی عورت کو راضی کرنے کے لئے اس کی خواہشات کچھ پوری کرے۔آخر اس کا کچھ حق بھی تو ہے۔ وہ گھر میں آتی ہے، اپنے جذبات لے کر آتی ہے ۔ اگر خاوند اِن جذبات کی رعایت نہیں کرے گا۔ تو کیا محلے والے رعایت کریں گے ؟ یہ خاوند کا فرض ہے ۔ جانبین سے جب یہ بات ہوگی، تو گھر کی گاڑی عمدگی کے ساتھ چلے گی۔ پھر سکون و محبت اور باہمی مودّت پیدا ہو جائے گی ۔

عورت کی طرف سے نافرمانی پر تنبیہ کے درجات

اس میں اگر اتفاق سے کوئی ناچاقی پیش آگئی، تو جانبین کو ذرا صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے ۔ یہ نہ ہو کہ ایک دم آپے سے باہر نکل کے وہیں جنگ چھڑ جائے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس کے بارے میں ہدایت کی ۔ فرمایا ۔ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ۔ نیک بیبیاں کون ہیں ؟ جو قانتات ہیں، عبادت گزار ہیں۔ اس لئے کہ جو اللہ کا حق ادا کرے گی ، وہی خاوند کا حق ادا کر سکتی ہے ۔جو حق تعالیٰ کی نافرمانی کرے، وہ کسی کی مطیع نہیں بن سکتی۔ آگے فرمایا :۔ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ ۔ غیب کی حفاظت کریں، مرد کے رازوں اور اسرار کی ۔بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ غیب سے مراد خاوند کا مال و دولت ہے۔ اس کی حفاظت کرے۔ یہ سمجھے کہ میں اس کی نگراں ہوں۔اگر وہ باہر جائے تو گھر میرے سپرد ہے ۔ پوری طرح سے اس کی حفاظت کرے ۔

آگے فرماتے ہیں :۔ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ ۔ جن عورتوں سے تمہیں یہ خطرہ ہو کہ اب یہ نافرمانی کریں گی۔ اس کا پارہ تیز ہو گیا ہے۔ اب ممکن ہے یہ جنگ پہ آجائے ۔ اور مقابل آجائے ۔ اس کی ہدایت دی۔ یہ نہ ہو کہ

تم یہ محسوس کرو کہ بیوی میں غصہ بڑھ گیا ہے۔ یہ مد مقابل آئے گی۔ تم چار بُرے بھلے کہہ کے اس کے دل کو بیزار کر دو — فرمایا۔ جس سے نافرمانی کا خوف ہو، وہ خفا ہو چکی ہے۔ کچھ زبان سے کہہ بھی رہی ہے، بکواس بھی کر رہی ہے۔ لیکن اندیشہ ہے کہ بالکل بات ٹوٹ جائے۔ تو پہلا درجہ یہ نہیں ہے کہ اس کو بُرا بھلا کہہ کے گھر سے نکال دو — نہیں — فعظوھن۔ کچھ وعظ و نصیحت بٹھلا کے کرو۔ اور یوں کہے، کہ شریف زادیوں کے یہ دستور نہیں ہوا کرتے۔ شریف گھرانے کی بیبیوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ شرافت سے رہیں، اس طرح سے رہیں۔ یہ غلط طریقہ ہے تو پیار محبت سے سمجھایا جائے۔ جو شریف الطبع عورت ہو گی۔ وہ یہ لفظ سُن کر فوراً پگھل جائے گی۔ اور غصہ سب ڈھیلا پڑ جائے گا — تو چار لفظوں سے نصیحت کرنا، یہ کارگر بن جائے گا، اور جھگڑا و فساد ختم ہو جائے گا۔ گھر جنّت بن جائے گا —

لیکن اگر کوئی ایسی بے وقوف ہے کہ نصیحت نے اس پر اثر نہ کیا، اب بھی یہ نہیں کہا کہ اُسے جُدا کر دو۔ یا معاذ اللہ اُسے طلاق دے کر نکاح توڑ دو۔ نہیں۔ فرمایا جب نصیحت سے نہیں مانی۔ تو واھجروھن فی المضاجع۔ دوسرا علاج یہ ہے کہ اس کو بستر سے تنہا چھوڑ دو، اپنا مردانے میں آ کے لیٹنا شروع کر دو۔ جو شریف زادی ہے، طبیعت میں رعایت ہے، وہ سمجھے گی خاوند کی نگاہ پھر گئی ہے، راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ وہ تو گھر چھوڑ کے باہر بیٹھ گیا۔ مردانہ میں سونے لگا۔ اب گھر میں نہیں آ رہا ہے — ایسا نہ ہو کہ کہیں مجھ سے بالکل ہی بیزار ہو جائے۔ کہیں گھر ہی اجڑ جائے، تباہ ہو جائے۔ تو اب پیام سلام شروع ہو جائیں گے۔ آدمی پہنچے گا، گھر تشریف لایئے۔ ذرا بات چیت کیجئے۔ وہ جو ایک بُعد تھا، وہ ختم ہو جائے گا — تو اول درجہ یہ ہے کہ نصیحت کر دے، نصیحت سے نہ مانے تو اُسے گھر میں تنہا چھوڑ کے باہر قیام کر لے۔ ایک رات نہیں گزرنی پائے گی کہ دماغ سیدھا ہو جائے گا۔

لیکن اگر کوئی ایسی کوڑ مغز ہے کہ اس کو نہ نصیحت کا اثر ہوا نہ باہر کا۔ اس نے کہا میری جوتی سے اگر باہر لیٹ جائے، لیٹ جائے جا کے۔ پھر آوے گا۔ دو دن میں آوے گا، چار دن میں آوے گا، جھک مارے گا، پھر آوے گا — یہ جو ایسی کوڑ مغز ہے تو اس کے بارے میں فرمایا:۔ واضربوھن۔ تھوڑی سی تنبیہ، تھوڑی سی مار پٹائی بھی ایسے حالات میں جائز ہے۔ مگر شریعت نے مار پٹائی کی صورت بھی بتلائی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ لکڑی لے کے اس کے سر ہو جاوے۔ غریب کے ہاتھ پیر توڑ دو، یہ نہیں ہے۔

امام شافعیؒ نے واضربوھن۔ (مار سکتے ہیں) کی تفسیر یہ کی ہے کہ اسی کا دوپٹہ لے کر ذرا اُسے البیٹ دے کے دو چار مار دو۔ اس سے تم کو یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی طرف سے مجھے یہ بھی اختیار حاصل ہے۔ مارنا پیٹنا مقصود نہیں ہے۔ تھپڑوں سے مارے یا لکڑی سے مارے۔ یہ نہیں، بلکہ اس کی صورت یہی ہے کہ اسی کا دوپٹہ یا رومال لے کر ایک دو البیٹ دے کے رسید کرے۔ چوٹ ووٹ تو اسے لگے گی نہیں۔ وہ یہ سمجھ لے گی کہ اوہو یہ کام بھی اس کو آتا ہے۔ کل اگر اس کے ہاتھ میں لکڑی آگئی، تو کیا ہوگا؟ گھبرائے گی۔ مگر یہ اس کا علاج ہے جو کوڑ مغز ہو۔ جس پر نہ نصیحت اثر کرے، نہ بستر پہ تنہا چھوڑ دینا اثر کرے۔ ایسی کوڑ مغز کا تو یہی علاج ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کی اجازت نہیں کہ اُسے چھوڑ دو۔ یا نکاح توڑ دو۔

فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلا — اب اس کے بعد اگر اطاعت کرلے، تو بس اب راستہ چھوڑ دو۔ زیادہ اسے تنگ مت کرو۔ مقصد پورا ہو گیا —

لیکن اگر کوئی ایسی احمق ہے کہ نہ نصیحت نے اثر کیا، نہ خاوند کے چھوڑ کر چلے جانے نے اس پر اثر کیا، اور دو چار دوپٹے البیٹ دے کے اس نے کھینچ مارے، اس کا بھی اثر نہ ہوا — معلوم ہوا بڑی احمق ہے۔ اس کے دل میں کوئی کجی اور عناد

بھرا ہوا ہے۔ الٹی کھوپڑی کی ہے —— اس کے لئے اب چوتھا علاج ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اب اسے نکاح سے جُدا کر دو۔ یہ اب تک بھی اجازت نہیں دی۔ —— علاج یہ کہ اب تحکیم کا سلسلہ جاری کرو۔ حکم بناؤ۔ ایک حکم عورت کی طرف سے آئے، ایک حکم مرد کی طرف سے۔ دونوں طرف سے ایک ایک ثالث مقرر ہو۔ وہ دونوں ثالث مل کر فریقین کی شکایتیں پیش کریں۔ بیوی کا ثالث کہے کہ بیوی کو یہ یہ شکایتیں ہیں۔ خاوند کا ثالث کہے کہ خاوند کو یہ یہ شکایتیں ہیں —— فرماتے ہیں حق تعالےٰ —— ان یریدا اصلاحًا یوفق اللہ بینھما —— اگر نیک نیتی سے یہ دونوں ثالث بات چیت کریں گے، تو اللہ ضرور اصلاح فرما دے گا۔ اور صلح صفائی ہو جائی گی۔ اور وہ جو کدورت بیٹھ گئی تھی، وہ نکل جائے گی ——

عند الضرورت آداب طلاق

—— لیکن اگر اتنا کوڑ پڑ گیا ہے کہ نصیحت و مار پٹائی بجائے خود ثالث بھی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے مزاجوں میں توافق نہیں ہے۔ عمر بھر ان میں کھٹ پٹ ہی رہے گی۔ لڑتے ہی رہیں گے —— اب اجازت دی گئی کہ اتنے مرحلے گزارنے کے بعد اس حالت میں طلاق دے سکتے ہو —— لیکن طلاق میں میں نے جیسے عرض کیا۔ ایک طلاق سنت ہے ایک طلاق بدعت ہے۔ تو طلاقِ بدعت ممنوع ہے —— طلاقِ سنت یہ کہ ایک طلاق دے، تاکہ مُدتِ عدۃ میں پھر تمہیں رجوع کرنے کا حق رہے۔ اگر ایک دم تینوں دے دیں۔ اور پڑ گئیں —— اس کا مطلب یہ ہے کہ بائنہ ہو گئی، بات ہاتھ سے نکل گئی۔ بہت ممکن ہے۔ بعد میں پچھتاوا پیدا ہو، کہ بھئی ایسے جھگڑے تو روز ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنی بیوی کو الگ کر دیا۔ پھر بیٹھ کے

روئے گا۔ اور بیوی بھی روئے گی۔ اس لئے فرماتے ہیں اگر مجبور ہوگئے ہو اور طلاق دینی ہی پڑے تو طلاقِ سنت ہی دو۔ ایک طلاق دینے کے بعد عدۃ کی مدت گزارے۔ عدۃ میں بلا نکاح رجوع کر سکتا ہے۔ طلاق دینے کے بعد ممکن ہے دل میں آئے میں نے بڑی غلطی کی کہ طلاق دے دی۔ معاملہ سُلجھ سکتا تھا۔ تو جدید نکاح کی ضرورت نہیں۔ بس رجوع کرلے۔ اس سے معاملہ شروع کر دے۔ وہ اس کی بیوی ہے۔ پھر بھی اگر نباہ نہیں ہو سکا، پھر آگے دوسری طلاق کا حق ہے پھر آگے اس کی عدۃ ہے۔ اس میں پھر رجوع کرنے کی گنجائش ہے۔ جب کوئی بھی گنجائش نہ ہو۔ اور معلوم ہو کہ یہ عورت ہی اُلٹے مزاج کی ہے۔ اور یہ گھر ہی کو تباہ کر کے رہے گی۔ جب تیسری طلاق دے کے قصہ پاک کیا جا سکتا ہے۔

آپ نے اندازہ کیا کہ شریعت نے کتنی داشت کی ہے۔ اگر لڑائی کا خوف ہو تو نصیحت کرو، نصیحت سے نہ مانے تو ذرا گھر میں اس کو تنہا چھوڑ دو۔ اس سے نہ مانے تو اس کے دوپٹے سے ذرا اس کو تنبیہ کر دو۔ اس سے بھی نہ مانے۔ تو ثالث مقرر کرلو۔ اور اس سے بھی نہ مانے تو طلاقِ سنت دے دو۔ نکاح کو قطع مت کرو۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے ہاں نکاح کتنی محبوب چیز ہے کہ اسے توڑنا نہیں چاہتے۔ اور شیاطین کے ہاں اتنی مبغوض چیز ہے وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح نکاح ٹوٹ جائے۔ اور ناچاقی پھیل جائے۔ خاوند بیوی کو لڑانے والا شیطان بھی آتا ہے، تو اسے بڑا شیطان گلے لگاتا ہے کہ تو ہے میرا سپوت۔ تو نے بڑا کام کیا۔ اس سے واضح ہوا کہ نکاح انبیاء ع کو محبوب اور عزیز ہے۔ اور شیاطین کو نکاح کا ٹوٹنا عزیز ہے۔

اللہ کے جوڑ کو باقی رکھنے والے ہی نیک نہاد ہیں

تو نیک نہاد وہ ہوں گے جو انبیاء علیہم السلام کے راستے پر چلیں گے۔ اور نکاح کرنے کے بعد دل میں عہد باندھیں کہ ہمیں صبر و تحمل سے اپنی بیوی کی داشت کرنی ہے۔ اس کے

حقوق ادا کرنے ہیں۔ اگر وہ تھوڑی بہت زیادتی بھی کرے گی، ہمیں صبر و تحمل کرنا ہے، درگزر کرنا ہے۔ اس لئے کہ ہمیں گھر بگاڑنا نہیں ہے۔ اور گھر بھی الگ رہا۔ دو خاندانوں کو لڑوانا نہیں ہے۔ دو قبیلوں کو باہم لڑوانا نہیں ہے۔ یہ خاوند اور بیوی کے مزاج کے اوپر موقوف ہے۔ یہ نیک نیتی سے سچا معاملہ رکھیں گے تو دو گھر بھی جڑے رہیں گے، دو خاندان جُڑے رہیں گے۔ دو برادریاں آپس میں جُڑی رہیں گی۔ انہوں نے بے وقوفی کی تو دو خاندانوں اور برادریوں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ دار و مدار ان دو کے اوپر ہے۔ اگر وہ دونوں حقوق پہچان لیں۔ نکاح کی غرض و غایت، آداب اور وہ حقوق پہچان لیں جو شریعت نے بیان کئے ہیں تو گھر بار، برادری سب عزیز و اقارب درست اور اپنی جگہ رہیں گے۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے کہ ایک آدمی پوری برادری کو سنبھالنے کا ذریعہ بن جائے۔ اور وہ کتنا بُرا انسان ہوگا جو پوری برادری میں پھوٹ ڈلوانے کا ذریعہ بن جائے۔ اس واسطے نکاح کا مرحلہ بڑا نازک بھی ہے اور آسان بھی ہے۔

—— آسان تو یہ کہ چار بول پڑھے گئے، اور وہ جُڑ گئے، نازک اس لئے کہ ذمہ داریاں اس میں بہت آجاتی ہیں۔ عورت کی بھی ذمہ داری بڑھ گئی۔ مرد کی بھی ذمہ داری بڑھ گئی۔ ان کا نبھانا صبر و تحمل والے کا کام ہے، جو ذرا ذرا سی چیزوں میں آپے سے باہر نکل جانے کا عادی ہو، وہ تو لڑائی ہی کرا کے رہے گا۔ خاندانوں میں بگاڑ ہی پیدا کرا کے رہے گا۔

—— حق تعالیٰ شانہ نے اس لئے نکاح کو اپنی آیت بتلایا، کہ یہ ہماری قدرت کی ایک بڑی نشانی ہے۔ ہم ہی دلوں کے بدلنے والے۔ جب اللہ دلوں میں جوڑ لگا دے۔ تو نیک طینت بندہ وہ ہے جو اللہ کے جوڑ کی عزت کرے۔ اسے مرتے دم تک باقی رکھے۔ اور اس کی غرض و غایت کہ تم سکون حاصل کرو، مرد عورت کی طرف رجوع کر کے سکون حاصل کرے، عورت مرد کی خدمت کر کے سکون حاصل کرے۔ اور ان دونوں کے درمیان میں مودّت، محبت اور رحمت کا علاقہ ہو، غضب و قہر اور توڑ پھوٹ کا علاقہ نہ ہو —— ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یتفکرون۔

اس نکاح میں قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں —— میں کہتا ہوں ان ساری چیزوں کو ادا کیا جائے۔ تو ہر ہر چیز مستقل ایک قدرت کی نشانی ہے۔ اگر خاوند اور بیوی اس پر تیار ہوں اور عمل کریں تو ساری چیزیں نشانیاں بن جائیں گے۔ مگر ان کے لئے جو غور و تفکر کرتے ہیں اور عقل لڑاتے ہیں۔

تبریک

اس آیت کی روشنی میں یہ چند باتیں میں نے اس لئے عرض کیں کہ اس وقت نکاح کی تقریب تھی۔ عزیز و اقرباء نے تو مبارک باد پیش کی۔ میری مبارک باد یہ ہے کہ میں نے نکاح کے بارے میں اس کے حقوق و آداب عرض کئے۔ ان الفاظ کے ساتھ میں بھی مبارک باد پیش کرتا ہوں، ان دونوں خاندانوں کے سامنے۔ لڑکے والوں اور لڑکی والوں کے لئے بھی —— بس فرق اتنا ہی ہے کہ آپ حضرات نے عزیز داری کے ضمن میں مبارک باد دی۔ میں ایک خادم قوم ہونے کی حیثیت سے مبارک باد دیتا ہوں۔ اور خادم قوم کا کام یہی ہے کہ خدمت کے طریقے پیش کر دے۔ یہ سب سے بڑی مبارک باد ہے اگر خاوند بیوی ان نصائح پر عمل کریں۔

تو سب سے بڑی مبارک باد کی بات فی الحقیقت یہی ہوگی۔ اور وہی نکاح باعثِ خیر و برکت ثابت ہوگا۔ اب آپ سب حضرات دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں خاوند بیوی میں باہمی محبت نصیب فرمائے۔ جو دو گھرانے آپس میں جڑے ہیں۔ ان دونوں کے اندر محبت و مودّت کا رشتہ قائم ہو۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی میں لگے رہیں، اور ایک دوسرے سے محبت و مدارات کا نفع حاصل کریں۔ ان کے دلوں میں سکون و تحمل رہے، اور ایک دوسرے کے لئے خوشی کا باعث بنیں۔

اللھم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

ربنا ھب لنا من ازواجنا و ذریتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماما — واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

[illegible]